PAGES MISSING
WITHIN THE
BOOK ONLY

زمامِ ابلقِ ایام در دستِ ہمایوں شد
ز دورِ خوش کامیِ ایں طبعِ موزوں شد

بیادگارِ علامۂ فضیلت آب جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں (مرحوم)

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

مرتبہ

میاں بشیر احمد بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء۔ ایڈیٹر۔

مولانا تاجور نجیب آبادی (فاضل دیوبند) جائنٹ ایڈیٹر۔

منشی محمد صادق مینیجر رسالہ ہمایوں نے
مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

فہرستِ مضامین بابت ماہ جولائی ۱۹۲۲ء

جلد ۲ — **نمبر ۱**

حصۂ نثر

حصۂ نظم

جذباتِ عالیہ

جہاں نُما

ہندوستان میں تعلیمی اخبار نویسی۔ ہندوستان بیدار ہو رہا ہے۔ لیکن اس کی تعلیمی اخبار نویسی کس مپرسی کی حالت میں ہے۔ اس لئے تعلیمی اخبار نویسوں کی تعداد نہایت قلیل ہے۔ جن کی تعلیم عُمدہ ہو ذرائع وسیع ہوں اور جو اپنا تمام تر وقت محض اپنے اخبار پر صرف کرتے ہوں نیز اُن کے نامہ نگار اس قابلیت کے نہیں ہوتے۔ کہ تعلیمی پہلوؤں پر سنجیدہ اور پختہ خیالات پیش کر سکیں۔ اسکے علاوہ دوسری دقت یہ ہے۔ کہ ہندوستان میں اُستادوں کی انجمنیں نہیں ہیں جیسی کہ انگلستان اور امریکہ میں ہیں بعض مقامات پر اُستادوں کی مقامی انجمنیں ضرور پائی جاتی ہیں۔ لیکن اُن سے وہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ جو ہونا چاہیئے اگر اس قسم کی صوبجاتی انجمنیں مرتب کی جائیں۔ تو یقیناً ہندوستا کی تعلیمی اخبار نویسی کا پایہ بلند ہو سکتا ہے۔

افغانستان شاہ راہِ ترقی پر۔ ٹائمز لنڈن کے نامہ نگار خصوصی مسٹر آر للر مُور نے سیاحت افغانستان کے بعد ایک مضمون لکھا ہے۔ جس میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ آج کل افغانستان کس طرح تیزی کے ساتھ شاہراہ ترقی پر گامزن ہے۔

"امیر کابل نے افغانستان" میں ترقی کرنے کا شوق پیدا کر دیا ہے۔ اور یہ شوق اب جنون کی حالت تک پہنچ گیا ہے۔ ہر طرف بیداری کے آثار نمایاں ہیں۔ کچھ قابل نوجوانوں کو معدنیات کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے یورپ بھیجا گیا ہے۔ اُن کی واپسی پر افغانستان آنکھیں جمائے ہوئے ہے۔ افغانوں کو یقین کامل ہے۔ کہ اُن کے مُلک میں بے شمار معدنیات ہیں۔ اور وہ دن دُور نہیں جب افغانستان اُن کی بدولت مالامال ہو جائیگا۔ اور اتنا ہی نہیں۔ دربار کابل نے فوج کی آراستگی اور تعلیم نسواں کی طرف بھی کافی توجہ دینا شروع کر دیا ہے"

جاپان کا مذہب۔ جاپان نے ایک کمشن اس غرض سے مقرر کیا ہے کہ وہ اس امر کا تصفیہ کرے کہ جاپان کے لئے کون سا مذہب اختیار کرنا سود مند ثابت ہوگا تحقیقاتی کمیٹی تمام دُنیا میں دورہ کریگی۔ اور مختلف مذاہب کے نمائندوں کی شہادت فراہم کرنے کے بعد اپنی رپورٹ پیش کریگی۔ یہ کمیٹی ہر ایک گواہ سے قریباً مندرجہ ذیل سوالوں کے جوابات طلب کرے گی۔

۱۔ آپ کا مذہب اختیار کرنے سے ہمیں کیا آسانی حاصل ہو گی؟

۲۔ آپ کا مذہب اختیار کرنے سے ہمیں کیا تسلی ہو گی؟

۳- آپ کے مذہب کو دیگر مذاہب پر کیا فوقیت حاصل ہے؟

۴- آپ کا مذہب ہماری آزادی پر پابندیاں تو عائد نہ کر دے گا؟

۵- آپ کا مذہب ہماری دنیوی ترقی کے راستے میں حائل تو نہ ہوگا؟

۶- آپ کا مذہب ہماری روحوں میں خوف کی آمیزش تو نہ کر دیگا؟

۷- آپ کے مذہب میں خدا کا کیا درجہ ہے؟

۸- آپ کے مذہب میں عورت کی کیا حیثیت ہے؟

۹- آپ کا مذہب عدم تشدد کے متعلق کیا کہتا ہے؟

اُس برتن کو (جس میں وہ رکھی گئی ہے) نہ دھووو ورنہ وہ شخص دشمن ہو جائیگا۔

۵- اگر کوئی نوجوان لڑکی چولھے کے قریب گائے، تو اُس کی شادی بوڑھے رنڈوے کے ساتھ ہوگی۔

۶- سفر پر روانہ ہوتے وقت سانپ کا دیکھنا خوش نصیبی میں شامل ہے۔

۷- جب جلتے جلتے چراغ کی لو مدھم ہو جائے، تو سمجھ لو کہ اُس کے قریب کوئی بھوت کھڑا ہے۔

۸- جب جنگل میں روٹی کھانا ہو۔ تو روٹی پر نمک چھڑک لو ورنہ اُس کی غذائیت کو جنات چوس لیں گے۔

۹- جو شخص بیاہ سے پہلے غسل نہیں کرتا۔ اُس کی بیوی اُس پر سخت گیری سے حکومت کریگی۔

جزائر فلپائن کے توہمات۔ جزائر فلپائن کے لوگ انتہا درجہ کے توہمات پسند ہیں۔ کسی چیز کی کوئی حرکت بھی اُن کے خیال میں خالی از علت نہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے

۱- بلی دروازے کی چوکھٹ کو چاٹے تو سمجھ لو کہ کوئی شخص مر رہا ہے۔

۲- نیا چاند اگر نئے مکان میں دیکھو، تو بہت جلد امیر ہو جاؤ گے،

۳- سوتے وقت اگر کسی شخص کا ہاتھ نیچے لٹک رہا ہو۔ تو وہ ناگہانی موت مرے گا۔

۴- اگر کسی شخص نے کوئی سوغات بھیجی ہے۔ تو

حبشیوں کی بیداری۔ امریکہ کے نیگرو (حبشی) اس وقت تک کافی ہوشیار اور بیدار ہو چکے ہیں لیکن وہ ابھی تک اس ترقی پر مطمئن نہیں۔ اب اُنکی کوشش یہ ہے کہ افریقہ کے حبشیوں کے ساتھ برادرانہ تعلقات پیدا کئے جائیں۔ اور اُنکو مہذب اور متمدن بنانیکی سعی کیجائے۔ اس باب میں اُنہوں نے ایک سوسائٹی قائم کی ہے جس کی طرف سے ایک ماہوار رسالہ کروسیڈر (CRUSADER) شائع ہو رہا ہے اور ایک ہفتہ وار اخبار لبریٹر (LIBERATOR) شائع ہونیوالا ہے۔ اس سوسائٹی کی خواہش ہے کہ افریقہ کے حبشیوں میں کام کرنیکے لئے لیکچرار روانہ کئے جائیں۔ اور اُن کو بتایا جائے۔ کہ اُنکے لئے بھی دنیا میں ترقی کرنیکی گنجائش ہے ؛

علمی شعاعیں

ایک نئی ٹریم گاڑی - جن اصحاب کو کلکتہ، بمبئی، کانپور، دہلی جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ اُنہوں نے ٹریم گاڑی دیکھی ہوگی یہ گاڑی بجلی کی طاقت سے لوہے کی پٹڑی پر چلتی ہے مگر اب "نئے تجربات سے واضح ہوا ہے۔ کہ پٹڑی کے بغیر بھی ٹریم کو چلایا جاسکتا ہے اس سے خرچ میں بہت کفایت ہو جائے گی۔ ایک تو تیل کا خرچ بچے گا۔ دوسرے تیل کی بجائے سستی بجلی سے کام نکل جائے گا۔ علاوہ ازیں لوہے کی پٹریاں گھس جانے سے جو نقصان ہو جایا کرتا تھا وہ بھی نہ ہوگا۔

نوٹوں اور سکوں میں بیماریوں کے جراثیم

شاید یہ دریافت ہمارے ناظرین کی حیرت کا موجب ہو۔ کہ نوٹوں اور سکوں میں بھی بیماریوں کے جراثیم اپنا گھر بنا لیتے ہیں اور ایک جیب سے دوسری جیب میں منتقل ہو کر امراض کو بڑی سرعت سے پھیلاتے رہتے ہیں۔ نوٹ اور سکے جس قدر پُرانے ہونگے اُسی قدر تباہی آور ہو جائینگے۔ اس لئے جو شخص گندے سکے اور پھٹے پرانے نوٹ قبول کرنے میں حیل و حجت کرتا ہے۔ وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر اپنی صحت کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔

امریکہ کا محکمۂ حفظانِ صحت پرانے نوٹوں کو دھو کر استری کر دیتا ہے۔ اور سکوں کو کھولتے ہوئے پانی میں ڈالکر جراثیم کو ہلاک کر دیتا ہے۔

سب سے چھوٹی ریلوے - دُنیا بھر میں سب سے چھوٹی ریلوے انگلستان کی THE SKADAL RAILWAY ہے۔ جو تقریباً سات میل لمبی ہے۔ اس کی پٹریوں کا درمیانی فاصلہ صرف ۱۵ انچ ہے۔ یہ ابتدا میں کان سے خام لوہا نکالنے کی غرض سے بنائی گئی تھی۔ لیکن کام ہو جانے پر بیکار ہو گئی۔ اور بعد میں ایک کمپنی کے ہاتھ فروخت کر دی گئی۔ آج کل اس ریلوے پر سلسلۂ آمد و رفت جاری ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جہاں کوئی مسافر اشارہ کرے۔ وہیں گاڑی ٹھیر کر اُسے اُتار دیتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مسافر دو سٹیشنوں کے مابین گاڑی پر چڑھنا چاہے۔ تو بھی ڈرائیور گاڑی روک لیتا ہے۔

چاول سے دُودھ - امریکہ کا رائس جرنل RICE JOURNAL لکھتا ہے۔ کہ چاول سے دودھ بنایا جا سکتا ہے۔ اور اُس سے وہی غذائیت اور طاقت حاصل کی جا سکتی ہے۔ جو دودھ میں پائی جاتی ہے۔ سائنس بتلاتی ہے کہ جس طرح گائے کے تھنوں میں دودھ آجاتا ہے۔ بالکل اُسی طرح چاول کا پودا زمین سے رس کھینچتا ہے۔ اور وہ رس جم کر چاول کا دانہ بن جاتا ہے اب اگر اُس دانے کو ازسرِ نو رس میں تبدیل کیا جاسکے تو وہ دودھ بن جائیگا۔ اس کے تجربے ہو چکے ہیں اور ثابت کیا جا چکا ہے کہ اِس قسم کے مصنوعی دودھ سے گھی بھی نکالا جا سکتا ہے۔

عنقریب سان فرانسسکو میں اس کے لئے ایک عظیم الشان کارخانہ جاری ہونے والا ہے ؛

کشش ثقل کم ہو سکتی ہے - لمبے سانس لیکر پانچ آدمیوں کا چھٹے آدمی کو اُٹھانا مغرب میں ایک عام کھیل ہے۔ اس کا طریق عمل یہ ہے۔ کہ پانچ آدمی اپنی ایک ایک اُنگلی چھٹے آدمی کے پاؤں کے تلوؤں بازوؤں کی کہنیوں اور ٹھوڑی کے نیچے رکھدیتے ہیں۔ اور پھر ایک ہی وقت میں سانس روک کر اُسے اُٹھا لیتے ہیں۔ اُسوقت اُن کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اُس آدمی کا وزن کم ہو گیا ہے لیکن کیا اُس کا وزن درحقیقت کم ہو جاتا ہے؟ یا اُن کو مغالطہ ہوتا ہے۔ اس کا فیصلہ کُن تصفیہ کرنیکے لئے امریکہ میں پانچ آدمیوں نے چھٹے آدمی کو ترازو پر کھڑے ہو کر اُٹھایا۔ اُن سب کا وزن ۷۱۲ پونڈ تھا۔ مگر جب آدمی کو اُٹھایا جا چکا تو یہ وزن ۶۵۲ پونڈ رہ گیا۔

برفانی طوفان کا امکان - بہت سے سائنسدانوں کی رائے ہے کہ سمندر سابق کی نسبت بہت چھوٹا رہ گیا ہے امریکہ میں اس قسم کے مقامات موجود ہیں۔ جو سطح سمندر سے کئی ہزار فٹ بلند ہیں۔ اور کئی وجوہ سے ثابت ہو چکا ہے۔ کہ کبھی وہ قطعات زمین زیر آب تھے۔ لیکن سمندر کا وہ پانی کہاں ہے؟ سائنسدانوں کا متفقہ فیصلہ ہے۔ کہ وہ پانی برف کی شکل میں قطب جنوبی میں مقید ہے۔ اور جب وہ پگھلے گا۔ تو سمندر میں اس قسم کا مہیب طوفان آئیگا۔ کہ بندرگاہیں غرق ہو جائیں گی۔ اور پانی اپنی مملوکہ زمین پر پھر سے لہریں مارنے لگے گا۔

بعض سائنسدان کہہ رہے ہیں۔ کہ وہ وقت اب قریب ہے ؛

عجیب باتیں - شتر مرغ دنیا بھر میں سب سے بڑا پرندہ ہے، لیکن اُسکا دماغ نسبتاً سب سے چھوٹا ہے۔

دنیا میں اسوقت تک تین پہاڑ مل چکے ہیں۔ جنکی برف کی رنگت سبز ہے۔

فلیٹ ہانٹس کے ایک کسان کے پاس اِس قسم کی سدھائی ہوئی مکھیاں ہیں۔ جو گھنٹی کی آواز پر کام شروع اور بند کر دیتی ہیں؛

نسوانی دُنیا

دُنیا میں سب سے بڑی عمر کی عورت آسٹریلیا میں ہے۔ جس نے حال میں اپنی ۱۰۵ ویں سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی ہے اُس کی قوتِ سامعہ جواب دے چکی ہے لیکن اُسکی بینائی تاحال درست ہے۔ وہ اپنی طویل العمری کا باعث یہ بیان کرتی ہے۔ کہ میں نے کبھی منشی اشیاء کا استعمال نہیں کیا۔ اور کھانے پینے میں ہمیشہ باقاعدہ رہی ہوں +

بلجیئم کے دارالعوام میں پہلی دفعہ ایک خاتون کو بطور رکن منتخب کیا گیا ہے۔ اور چیمبر میں اعلان کیا گیا ہے۔ کہ خواتین کو وکالت کرنیکی بندش اُڑا دی گئی ہے

دُنیا کے تختہ پر مراکو ہی شاید ایک ایسا ملک ہے جہاں کے لوگ اخبار کے نام سے بھی نا آشنا ہیں۔ اب وہاں سے پہلا ماہوار رسالہ شائع ہونے والا ہے۔ اسکی اڈیٹری کا ذمہ ایک خاتون نے لیا ہے۔

جناب فیروز الدین خانصاحب بی۔ اے۔ انسپکٹر مدارس بنوں کی گرامی قدر دختر خدیجہ بیگم صاحبہ نے امسال پنجاب یونیورسٹی سے تاریخ کا امتحان ایم اے شاندار کامیابی سے پاس کیا ہے یعنی وہ صوبہ بھر میں دوسرے درجہ پر کامیاب ہوئیں۔ صاحبہ موصوفہ نے بی اے آنرز اور ایف۔ اے کے امتحانوں میں بھی امتیازی کامیابی حاصل کی تھی۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ آپ اپنی زندگی ملک و قوم اور صنف نازک کی خدمت کے لئے وقف کر چکی ہیں۔ اور قومی تحریکات میں عزم صمیم کے ساتھ حصّہ لے رہی ہیں۔ سودیشی لباس اور سودیشی اشیاء سے بہت دل بستگی رکھتی ہیں +

شکر اللہ سعیہا و بارک فی عزمہا

امسال مشہور ایرانی ادیب اڈیٹر صاحب "حبل المتین" کی صاحبزادی نے کلکتہ یونیورسٹی سے وکالت کا امتحان قابل رشک کامیابی سے پاس کیا ہے یعنی یونیورسٹی بھر میں وکالت کے امتحان میں اول نمبر حاصل کیا +

پٹسبرگ میں ایک لڑکی جیسی این وائی چیٹین واعظ کا کام کر رہی ہے ——— اُس کی عمر صرف گیارہ سال ہے +

ہمایوں

جلد ۲ جولائی ۱۹۲۲ء نمبر ۱

طُورِ ایفل

کبھی طُورِ سینا کا نام سُنتے تھے، اب طُور ایفل کا ذکر اذکار ہوتا ہے! یعنی کبھی دُنیا بھر میں تہذیبِ مشرق کا ڈنکا بجتا تھا، اب ہر سُو تمدنِ مغرب کا سکّہ رواں ہے! اور یہ اِس لئے کہ کبھی دُنیا رُوحانیت کے بحرِ ناپید کنار میں مستغرق رہتی تھی۔ اور اب وہ مادّیت کی فضائے وسیع میں محوِ پرواز ہے! طُورِ سینا اور اُس کے پرستار صحرائے گمنامی میں مستور ہیں، طُورِ ایفل اور اُس کے پجاری عشرت کدۂ پیرس میں جلوہ گر! طُورِ سینا پر جا کر ایشیا خدا سے ہم کلام ہونے کا تمنائی ہُوا، طُورِ ایفل پر چڑھ کر یورپ خدائی قوتوں سے ربط پیدا کرنے کا دعوے دار ہے!

اوّل اوّل جب طُورِ ایفل بنا تو وہ سیر و تفریح کے لئے بنایا گیا تھا۔ کچھ اِنسان کی اِس "قدرتی" خواہش کو پُورا کرنے کی غرض سے کہ وہ آسمان کے قریب تر پہنچ سکے اور کچھ اُس کی اِس "فطرتی" آرزو کے دل بہلاوے کے لئے کہ میں اپنے ہمجنسوں کو نیچا دیکھوں اور دُنیا کو اپنے قدموں میں سرنگوں پڑا ہُوا نظارہ کروں!

یہ سربفلک تعمیر دنیا کا سب سے اُونچا مینار[1] ہے جسے مسیو ایفل نامی ایک انجنیئر نے پیرس کی

[1] طُور کے معنے فرانسیسی زبان میں مینار یا بُرج کے ہیں۔

نمائش کے لئے (۱۸۸۹ء) میں تیار کیا یہ عجیب وغریب آہنی عمارت پیرس کے ہر حصے سے نظر آتی ہے اور اُس کے مقابل میں وہاں کی عالیشان عمارات کھلونے سی معلوم ہوتی ہیں + دُنیا میں اس کے بعد سب سے اونچی تعمیر واشنگٹن مونیومنٹ ہے جس کی بلندی ۵۵۵ فٹ ہے۔ تیسرے درجے پر کولون (جرمنی) کا مشہور کلیسا ہے جو ۵۲۱ فٹ بلند ہے +

ایفل مینار کی تین منزلیں ہیں۔ پہلی منزل جو گرجا نوتردام کے میناروں کے برابر بلند ہے بہت وسیع ہے اور اُس پر صد ہا تماشائیوں کی گنجایش ہے۔ یہاں بہت سے قہوہ خانے اور طعام گاہیں ہیں۔ اور گرمیوں کے موسم میں تھیٹر کا تماشا بھی دکھایا جاتا ہے + دوسری منزل زمین سے ۳۷۶ فٹ بلند ہے اور تیسری ۹۰۵ فٹ۔ مینار کی کل بلندی ۹۸۴ فٹ ہے + اس کے اوپر سے پیرس کا نظارہ کریں تو ایک خوشنما نقشہ آنکھوں کے سامنے بچھا ہُوا معلوم ہوتا ہے اور نواح پیرس میں فرانس کا نظارہ فی الحقیقت بے مثال ہے۔ نگاہ چاروں طرف پچاس پچاس میل تک کام کرتی ہے اور دریائے سین دُور افق پر ایک باریک ریشمی تاگے کی طرح دکھائی دیتا ہے + سب سے اوپر کی منزل میں چوٹی پر ایک کمرہ بنا ہُوا ہے۔ جہاں سے بے تار کے پیغامات امریکہ تک پہنچائے جاتے ہیں + اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ سیر کو جاتے ہیں تو بے تار کی ٹِک ٹِک سُن کر اوپر کو دیکھتے ہیں کہ فرشتوں کے پروں کی آواز ہے یا کوئی الہامی پیغام نازل ہو رہا ہے ؟

وہاں اک ڈاک خانہ بھی ہے۔ سیر کرنے والے اکثر اپنے دوستوں کو تصویری کارڈ لکھ کر بھیجتے ہیں کہ دیکھئے یہاں بھی ہم آپ کو یاد کرتے ہیں + مُدعا صرف یہ ہوتا ہے کہ تمہارا دوست اتنی بلندی پر پہنچ کر تمہاری مُبارکباد کا مستحق ہے + تہذیب مغرب کے تصنّع کی فی الحقیقت کوئی حد نہیں !!

بشیر احمد

روس کی تاریخ پر ایک اجمالی نظر

(گذشتہ سے پیوستہ)

یاد ہوگا کہ روسی نصرانیت نے گیارھویں صدی کے وسط میں آرتھوڈکس (Orthodox) عقائد قبول کر لئے تھے، لیکن اس رد و قبول کے کیا وجوہ تھے؟ اور روسی مسیحیت کی یونانی کلیسا سے مل کر کیا حالت رہی؟ سطور ہذا میں اس پر بھی ایک نظر ڈالی جاتی ہے، تاکہ قارئین کرام اس گوشۂ بحث سے بھی ناواقف نہ رہیں:-

روس میں یونانی کلیسا کی مذہبی تبلیغ و اشاعت زیادہ تر سیاسی وجوہ پر مبنی تھی۔

چونکہ روس تمام یورپ میں بلحاظِ وسعتِ ارضی سب سے بڑی سلطنت تھی، جو متعدد فرمانرواؤں کے قبضہ میں تھی، اس لئے بائز نطینی (Byzantineam) کلیسا نے ضروری سمجھا کہ اس وسیع رقبۂ زمین کے تمام باشندوں کو اپنے مسلک و مشرب میں داخل کرکے، اپنا ایک زبردست حامی پیدا کرلے، اسی غرض سے آرتھوڈکس مشنری نے سب سے پہلے روسی امراء کو اپنے طریق کی دعوت دی، اور پھر تمام اقطاع و اضلاع میں مبلغین بھیجدیئے، اور تمام روسی قوم کو آرتھوڈکس بپتسمہ دیدیا،

روسی کلیسا کے اعیان و اکابر اپنی خدمات و فرائض کے لحاظ سے دو قسموں پر منقسم تھے، ایک رہبان، دوسرے قسیس۔ قسیسین کا کام نکاح پڑھانا، اور عبادت کرانا تھا، اور رہبان کی خدمت، اس کا انتظام، اور ہمہ وقت پاسبانی۔ رہبان ہمیشہ کلیساؤں میں رہتے اور تجرد کی بے روح زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے، ان لوگوں کی علمی حالت بھی عام طور پر نہایت پست اور مذہبی واقفیت بہت محدود ہوتی تھی، مذہبی مجالس و محافل کے مراسم، اتوار کی دعاؤں کے الفاظ، اور نکاح و اصطباغ کے طریقے زبانی یاد تھے، جو زیادہ تر زبانی رٹاؤ پر مبنی ہوتے تھے، عامۂ امت اور ان کے درمیان صرف یہ فرق تھا کہ وہ دنیوی کاموں میں مشغول رہتے، اور ہفتہ میں صرف ایک روز گرجا میں جاتے تھے اور یہ رات دن وہیں رہتے، اور نذرانوں سے پیٹ پالتے تھے،

لیکن یاد رہے کہ روسی کلیسا اور بائز نطینی کلیسا بالکل ایک نہ تھے، بلکہ دونوں میں کچھ کچھ اختلافات تھے، اور اس حیثیت سے روسی کلیسا بائز نطینی کلیسا کے تمام اثرات سے آزاد، اور خود ایک مستقل حیثیت رکھتا تھا، اس کے اوقاتِ عبادت، طریقِ دعا، الفاظ و مصطلحات، وظائف و معتقدات بالکل مختلف تھے، دعائیں قدیم سلافی زبان میں پڑھی جاتی تھیں،

سولھویں صدی میں حالت بدلی، طبیعتوں کے بے چین انقلابوں نے مذہب میں بھی انقلاب پیدا کرنا چاہا، اس انقلاب کی پہلی قسط اصلاح تھی، جسے خواب ربودہ روسیوں کی بیدردی کی پہلی کروٹ سمجھنا چاہیئے، سولھویں صدی کے وسط میں دربار شاہی سے ایک فرمان نافذ ہوا، یہ فرمان روسی گرجوں کے اِنتظام و نگرانی کے لئے ایک اسقفِ اعظم کے تقرر کا اعلان تھا، اس کے ضمن میں چند ضروری اصلاحات کا تذکرہ بھی تھا، جن میں سب سے زیادہ اہم جاہل راہبوں کی برطرفی اور مذہبی کتابوں کی تحریفات سے حفاظت تھی، اسقفِ اعظم نے تمام گرجوں کے راہبوں کو بُلا کر باقاعدہ ان کا امتحان لیا، جو راہب امتحان میں ساقط ہوئے، ان کے لئے نصاب تعلیم ترتیب دیا، اور سب کو تمام و کمال پڑھ کر امتحان دینے پر مجبور کیا، بعض نے اس کے حُکم کی تعمیل کی کہ حکومت کی قوت اس کے ساتھ تھی، اور بعض اپنی سیادت دینی کے گھمنڈ میں آکر سرکش ہو گئے، اِس سرکشی پر نیکیوں نے انہیں سزا دی، اور ان کی جائدادوں کی ضبطی کا حُکم دیدیا، اس سے مُلک کی عام حالت بہت پُر آشوب ہوگئی، مذہب کے دیوانے پروانہ وار ان کے گرد جمع ہو گئے، اور ان باتوں کو بدعت سمجھ کر بگڑ بیٹھے، ہرطرف افراتفری پھیل گئی، ظاہر ہے، جو قوم مدتوں سے جہالت کی زندگی بسر کر رہی ہو، جس نے صدیاں ضعیف الاعتقادی کے قعرِ جمود میں گذاردی ہوں، وہ اِس صدائے اصلاح پر کیسے لبیک کہہ سکتی تھی، اس کے لئے تو ایسی ہوا کا ہر جھونکا، اور ایسی آواز کی ہر گونج اشد شدید معصیت تھی، جس کی مدافعت اس کا مذہبی فرض تھا، وہ اپنے موجودہ حال پر قانع تھی، اور اس کا قدامت پرست جذبہ اس کو ہر ایسی بات سے روکتا تھا جو طریق سلف کے خلاف، اور کسی جدید اسلوب و آیین کا داعی و ناشر ہو، چنانچہ انہوں نے وہی کیا جو فطرت جمود ایسے مواقع پر کرتی ہے اس لئے ضرورت تھی کہ اصلاح کا صور یکایک اس قدر بلند آہنگی سے نہ پھُونکا جاتا، اور راہِ تجدید میں جو قدم اُٹھایا جاتا، نہایت آہستگی اور دانشمندی سے اُٹھایا جاتا، تاکہ سونے والوں کو کام کی

خاموش چیخ پکار گراں بھی نہ گذرتی اور ناقہ بھی منزل تک پہنچ جاتا،

بہرحال اس وقت جو کچھ ہونا تھا وہ ہُوا، نئی مچھلی کو دیکھ کر تالاب کی ساری مچھلیوں نے طوفان اُٹھا دیا۔ لیکن بعد کو سب اسی رنگ میں رنگ گئیں، اور سب نے وہی طور طریق سیکھ لئے

تحریک اصلاح کے آغاز ہوتے ہی تو ہر طرف ہنگامے ہُوئے، اور مذہبی غلو و اطراد نے اصلاح کو مثلِ مجنوں سنگِ طفلاں کا ہدف بنایا، لیکن آخر سب کو اسی کا حلقہ بگوش ہونا پڑا۔ اور ایک ایک نے شدید مذہبیت کا جامۂ احرام اتار کر اعتدال و توسط کا پہناوا پہن لیا،

نیکیون (Naikum) جانتا تھا کہ آج جو لوگ چالیس چالیس روز روزے رکھتے، دو دو تین تین مہینہ گوشت نہیں کھاتے، ہر بات میں ایمان کو ٹھونستے اور جائز عیش و آرام سے بھی احتراز کرتے ہیں، کل اس سے بیزار ہو جائیں گے، اور مجبوراً اصلاح کی طرف مائل ہونگے۔ اس لئے وہ نہایت استقلال کے ساتھ اپنے لائحۂ اصلاح کی ترقی میں کوشاں رہا، زار کی اجازت سے نئے گرجے بنوائے، ان میں تعلیم یافتہ راہبوں کو مقرر کیا، اور ملک کو بڑی حد تک ناجائز مذہبی زیادتیوں سے سبکدوش کر دیا

قدامت پسندوں نے اس جماعت کو "منافق" کا لقب دیا، کیونکہ ان کے ہاں نہ ڈاڑھی منڈانے سے مذہب میں کوئی رخنہ پڑتا تھا، نہ حُقّہ پینے سے کسی تزلزل کا خوف تھا، نہ عمدہ لباس پہننے اور عیش کرنے میں کوئی قباحت تھی، یعنی ان کا مذہب تو اِسی طرح کی اور بہت سی باتوں کی اجازت دیتا تھا، اور اُن کا مذہب ہر بات سے ٹوٹ جاتا تھا۔ یہ صلیب کی طرف تین اُنگلیوں سے اشارہ کرتے تھے کہ عیسائیوں کے ہر قول و فعل سے تثلیث کا اظہار ہونا چاہیئے۔ اور وہ صرف دو انگلیوں سے۔ غرض اسی قسم کی بہت سی باتیں تھیں جو دونوں گروہوں میں مابہ النزاع تھیں، اور ان میں سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اصلاح پسندوں کا گروہ دن بدن ترقی کر رہا تھا، ان کی جماعت میں روزافزوں اضافہ ہو رہا تھا، اور مذہبی دیوانے کم ہو رہے تھے۔ راہبوں کے لئے یہ حسد کچھ کم نہ تھا، اس سے ان کے پرستاروں کی تعداد دن بدن گھٹ رہی تھی، اور آمدنی کے منافذ بھی بند ہو رہے تھے، وہ مدام اسی آگ میں جلتے اور ہر وقت مصروفِ قتل و پیکار رہتے تھے۔ تقریباً دو صدیاں اسی کشمکش میں گذر گئیں، آخر امتدادِ زمانہ سے جمود و نکبت کی یہ بندشیں ڈھیلی پڑیں، عقلیت کی روشنی چمکی

اور تمام نظریں خیرہ ہوگئیں۔ اب سب کو یہی سُوجھا کہ اس دیوانگی کا خرقۂ وحشت اتارنا چاہیئے، کہ مذہب آسانیاں چاہتا ہے، اور کسی پر اس کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا پھر اس کے احکام کو مُصیبت بنانے سے کیا فائدہ؟ دوسرے چونکہ اس تحریک کی خود حکومت بھی حامی تھی، اس لئے قدامت پرستی کا وجود قریب قریب مٹ گیا، "مومنین" جاہلین اپنے توغل کا آپ شکار ہُوئے مصلح جماعت کامیاب ہُوئی، اور اس کی کامیابی نے یورپ سے متعارف ہونے کا راستہ کھول دیا، کیونکہ اُن کے مذہب میں اغیار سے ملنا بھی گناہ کبیرہ تھا

روس میں مغربی تمدن کا داخلہ اطالیوں (Italians) کی وساطت سے ہُوا ہے، ۱۵۵۲ء میں اطالوی (Italian) امارتِ بحری نے ایک تجارتی بیڑا چین کی طرف بھیجا، مگر وہ جبرالٹر (Gibraltar) سے نکل کر جنوب کی طرف جانے کے بجائے شمال کی طرف ہولیا، اور بھٹکتا ہُوا بحیرۂ ابیض (White Sea) میں پہنچ گیا، اور مشہور روسی بندرگاہ آرکینجل (Archangel) میں لنگرانداز ہُوا۔ اس وقت روسیوں کے قبضہ میں صرف یہی ایک بحری راستہ تھا، بالٹک (Baltic) پر سوئیڈش (Swedish) اور بحرِ اسود (Black Sea) پر تُرک قابض تھے، لیکن یہ بندرگاہ بالکل غیر آباد تھا، اطالیوں کے داخلہ سے ۱۵۸۳ء میں زار نے اس کو آباد کرنے کا حکم دیا، اور ان تاجروں کو جو یہاں متوطن ہوں خاص حقوق و رعایات عطا کیں۔ ان میں پہلا نمبر اطالیہ کا تھا، اور دوسرا انگلستان و ہالینڈ کا، شاہ ایوان کے عہد میں اطالیوں پر زیادہ عنایت رہی، اس نے صناعوں اور انجینیروں کو نہایت اعزاز و احترام سے بُلایا، ان کے ساتھ اور لوگ بھی آئے، جن میں فنِ طباعت کے ماہر بھی تھے، انہوں نے یہاں پریس قائم کرنے کا ارادہ کیا، اور حضورِ شاہی سے اس کا سر و سامان کیا گیا،

لیکن حضارت کی یہ نسیم بہار صرف مغربی روس میں چل رہی تھی، اور مغربی روس کے بھی صرف اُن حصّوں میں جہاں مُستعمرین آباد تھے، ورنہ تمام روس خصوصاً مشرقی روس نہایت گہری وحشت و بربریت میں مبتلا تھا، راعی و رعایا دونوں یکرنگ اور اپنی جہالتوں میں یکتائی کے مدعی تھے، ایوان شاہی جن لوگوں سے لبریز تھا، ان کا ہر فرد سلطان وحشت تھا، مسٹر مارس نے لکھا ہے کہ ۱۶۰۶ء میں روس کی طرف سے دو سفیر اٹلی بھیجے

گئے، یہ دونوں عادات وخصائل میں ایشیا کے جاہل ترین گنواروں کی طرح اکھڑ، مزاج وطبیعت میں عرب کے بدوؤں کی طرح خشن و درشت، اور علم وتدبر میں افریقہ کے زولو تھے، اس پر طرہ یہ کہ ان کی وضع وہیئت بھی نہایت ابتر تھی، صفائی کے نام سے وہ قطعاً نا آشنا تھے، غسل سے انہیں نفرت تھی، منہ دھونا ایک فعل عبث تھا، اور ڈاڑھی کا تا بحدِ ناف بڑھا لینا حسنِ مذہب وآیۂ تکمیل انسانیت، ان کے سر کے بال وحشیوں کی طرح بکھرے اور الجھے رہتے تھے، کپڑے بہت بدقطع پہنتے اور میل کے تودے چڑھا کر اتارتے تھے۔ شب وروز، خلوت وجلوت، صبح وشام کا ایک ہی لباس تھا، اسی کو پہنے دربار میں جاتے، جلسوں میں شریک ہوتے، دعوتوں میں جاتے، اور رات کو بے تکلف زمین پر سو جاتے تھے، وہ تقسیم عمل کی طرح تقسیمِ محل ومقام کے اصول سے بھی نابلد تھے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، ملنے جلنے کی ایک ہی جگہ تھی، کھانا نہایت بدتمیزی اور بدتہذیبی سے کھاتے تھے، جیبوں کے رومال ان کے دستر خوان تھے، وہ گوشت کے بڑے بڑے بچے ہاتھوں میں اٹھا لیتے اور دانتوں سے نوچ نوچ کر کھاتے تھے، ہر روز رات کے کھانے کے بعد شراب پینا، اور بدمستیاں کرنا ان کا معمول تھا، اور یہ ان کی تہذیب ومعاشرت میں اس قدر ضروری چیز تھی کہ اسے وہ بڑے بڑے پیپوں میں بھر کر اپنے ساتھ لائے تھے، کچھ تو اس وجہ سے کہ دیکھنے والے کثرتِ سامان سے مرعوب ہوں، اور کچھ اس وجہ سے کہ شراب پی کر گالیاں دینا، نوکروں کو مارنا، واہی تواہی بکنا، اور عیاشی کرنا ان کے فلسفۂ اخلاق وعواطف میں ایک عظیم الشان فضیلت تھی

شامتِ اعمال سے ایک اطالوی شاعر سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ اس نے ان میں سے بڑے سفیر کی مداحی میں قصیدہ لکھا، چھوٹے سفیر کو یہ قصیدہ خوانی خوش نہ آئی، اور وہ بہت برہم ہوا کہ اس فعل سے اس کے جذبۂ خود پرستی کو بہت صدمہ پہنچا تھا، شاعر تھا مصاحب پیشہ اس نے ایک دوسرا قصیدہ لکھ ان کو بھی خوش کر دیا، اس سے دوسرے ممدوح ناراض ہوگئے، کہ اس قصیدہ میں کاغذ سفید اور دبیز لگایا گیا تھا، خط خوشنما اور روشنائی روشن تھی، اور یہ قصہ یونہی چلتا رہا

یہ تو تھی ان سفراء کی اخلاقی حالت۔ اب ایک نظر ان کی وسعت معلومات اور علم وتدبر

پر بھی ڈال لیجئے، اور اندازہ کیجئے کہ جس قوم کے منتخب شدہ سفیروں کا یہ رنگ ہو، اِس قوم کی عام حالت کیا ہو گی،

یہ لوگ صرف یہ کہ مغربی زبانوں سے کوئی زبان نہیں جانتے تھے، بلکہ خود اپنی مادری زبان میں بھی مہارتِ تامہ نہیں رکھتے تھے، اِن کا اندازِ گفتگو، طرزِ بیان، طریقِ تخاطب تو وحشیانہ تھا ہی مگر اس پر یہ اور طرّہ تھا کہ تقریروں میں الفاظ و محاورات نہایت سوقیانہ، تشبیہیں سخیف، سلسلۂ گفتگو طویل اور غیر متعلق قصص و حکایات سے لبریز ہوتا تھا، کسی بات میں فکر و تدبر نہیں کرتے تھے، عام اس سے کہ وہ کیسی ہی اہم ہو، نہ اپنے ملک کی سیاست پر عبور تھا، نہ اس مُلک کی عام سیاست سے واقفیت جہاں سفیر بن کے جاتے تھے، انتہا یہ تھی کہ اپنی سلطنت کی وسعت۔ اس کے شہروں کے نام، جغرافی حدود اور عام طبیعی باتیں بھی پوری طرح معلوم نہ تھیں، تاہم اصرار یہ تھا کہ ان کے فانوسِ عزت و حرمت میں ساری دنیا نیائش و گرائش کی شمعیں روشن کرے

۱۶۸۱ء میں ایک تجارتی معاہدہ کے لئے روسی سفارت بوتماکین (Butmakin) کے زیرِ قیادت فرانس آئی اور نابلدِ انسانیت لوگوں کا یہ وفد حضور شاہی میں پیش ہُوا، صدر وفد نے تقریر کی، تقریر کیا تھی اور کیسی، اس سے تو یہاں بحث نہیں قابلِ بیان جو واقعہ ہے وہ یہ ہے کہ صدرِ وفد کئی بار تقریر کرتے کرتے رک گئے اور شاہ فرانس کو نہایت حقارت سے دیکھا، کیونکہ وہ زار کا نام سُن کر تعظیماً کھڑا نہیں ہو جاتا تھا، یہ بات رفت گذشت ہُوئی اور تحریرِ معاہدہ کا وقت آیا تو بوتماکین (Butmakin) نے کہا کہ زار کا نام جس جگہ لکھا جائے ان کے القاب و آداب کے ساتھ لکھا جائے۔ فرانسیسی مدبروں نے اس گتھی کو بھی سُلجھایا، اور معاہدہ تکمیل پا گیا، اس کے اظہارِ مسرت میں لوئی نے زار کو ایک خط لکھا، جو تہہ ہو کر زار کے خط سے چھوٹا معلوم ہوتا تھا، بوتماکین کے تیور پھر بدل گئے، بولا:۔ یہ خط ہمارے بادشاہ کے خط سے حجم میں چھوٹا ہے، اور اس سے ہمارے بادشاہ کی تخفیف و اہانت ہوتی ہے، اس کا جواب دیا گیا کہ اس خط کا کاغذ باریک، چکنا اور قیمتی ہے، اس لئے حجم میں چھوٹا معلوم ہوتا ہے، ورنہ اصل میں اس کے برابر ہے، مگر صدر صاحب نہ مانے اور دوسرا خط اسی قسم کے کاغذ پر لکھوایا،

قریب قریب یہی کیفیت ۱۶۸۹ء تک قائم رہی، اس عرصہ میں کئی دفعہ اصلاح و ترقی کے غلغلے بلند ہوئے اور یورپ کی طرف سے آنے والی ہواؤں نے روس کی ساکن و جامد فضا میں ہنگامۂ حیات پیدا کرنا چاہا، اور بالآخر نیند کے ماتے روسیوں کو سوتے سے جگا کر ترقی کی راہ پر لگا دیا،

سویڈن، اٹلی، انگلستان اور فرانس سے تعلقات قائم ہوئے، آمد و رفت، رسل و رسائل کا سلسلہ جاری ہوا، تاجر، صناع، مہندس، ڈاکٹر وغیرہ آتے اور وطن بنا کے رہ پڑتے تھے، یہ ایک ترقی یافتہ ملک اور عمران و حضارت کی طرف بڑھنے والی قوم کے سپوت تھے، اس لئے جدھر نکل جاتے اپنی راجدھانی قائم کر دیتے تھے، روس میں بھی انہوں نے اپنی راجدھانی قائم کی، اپنے طریق و عادات، تمدن و معاشرت، علم و ادب اور اخلاق و عواطف کے جوہر دکھائے، اور روسیوں کو اپنا گرویدہ بنالیا، تھوڑے ہی دن کے اتحاد و یکجائی سے تمام سنجیدہ دماغ انکی ہر بات للچائی نظروں سے دیکھنے لگے، انہوں نے اپنے اندر بھی وہی باتیں پیدا کرلینی چاہیں اور ترقی کی جو راہ مل چکی تھی، آہستہ آہستہ اسی کی طرف ہو لئے

مگر جذبۂ اصلاح و ترقی کی یہ خواہشیں ابھی بہت محدود تھیں، صرف وہی قبائل اس طرف آئے تھے جو یورپ سے روشناس ہو چکے تھے، اس روشناسی کا پہلا اثر یہ ہوا کہ روسیوں میں اتحاد اور شہریت کی روح پیدا ہوگئی، شمالی روس کے قبائل وسطِ روس میں آ کر آباد ہوئے، اور آناً فاناً میں جنگل کو منگل بنا دیا

روسی بادشاہوں کا عام قاعدہ تھا کہ وہ اُن قبائل کو اپنے ساتھ رکھتے تھے جو شہروں میں غارت گری کرتے، یا اپنے ساتھ کوئی ایسی قوت رکھتے جو کسی وقت حکومت کے لئے مضر ہو سکتی تھی، یہ قبائل دارالسلطنت میں رہتے تھے، اور ان کے سرگروہ ایوان شاہی میں ۱۵۶۵ء میں زار (ایوان) تین ہزار جرمن ولایات بالٹک سے اپنے ساتھ لایا، اور ماسکو (Moscow) کے جنوبی حصہ میں ان کی نوآبادی قائم کر کے انہیں عام اجازت دیدی کہ وہ اس نوآبادی میں جو چاہیں کریں، ان کے لئے کوئی روک ٹوک نہیں، یہ اہلِ حرفہ کی جماعت تھی،

یہ دیکھ کر یورپ کی اور قوموں کو بھی اس طرف توجہ ہوئی، اور ایک قرن پورا نہ ہوا

تھا کہ ان کے توطن و استعمار کا سلسلہ ڈیڑھ لاکھ نفوس سے متجاوز ہو گیا، یہ مستعمرین یورپ کے مختلف شہروں سے یہاں آئے تھے۔ ان میں ہالینڈ، جرمنی، انگلستان کے باشندے زیادہ ممتاز تھے، اور اپنی معاشرت میں روسیوں کو جذب کر رہے تھے۔ لیکن یہ امیر مستعمرین کا ذکر تھا، حالانکہ ان میں ایک بڑی تعداد غرباء کی بھی تھی، جو افلاس سے تنگ آ کر محنت مزدوری کی غرض سے یہاں آئے تھے، ان لوگوں کی وہاں بھی کوئی خاص تہذیب و معاشرت نہ تھی، اس لئے یہاں آکر بھی ان میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی، بلکہ روسیوں میں مخلوط ہو گئے، اور انہی کے رسم و رواج سیکھ لئے، روسیوں کو غیر ملکی مزدوروں کا یہ اختلاط ناگوار ہوا، اور انہوں نے حکومت کو اس طرف توجہ دلائی، اس پر ۱۶۵۲ء میں دربار شاہی سے ایک قانون نافذ ہوا، اور نو آباد مہاجرین کو حکم دیا گیا کہ وہ ماسکو کے محلہ سلوبوا میں آباد ہوں، یہ محلہ محض انہی لوگوں کے لئے بنایا گیا تھا، ۱۶۷۸ء کی مردم شماری میں ان کی تعداد (۱۸۰۰۰) تھی،

اس تقریب سے روس میں مغربی تمدن پھیلا، اور وحشت و بربریت کا دور ختم ہو کر تہذیب و عمران کا آغاز ہوا، اتفاق سے اسی زمانہ میں روس کا تخت حکومت ایک ایسے شخص کے ہاتھ آیا جو مغربی تہذیب کی گود میں پل کر جوان ہوا تھا، یہ مغرب کی ہر ادا پر فریفتہ تھا، اس نے روس میں اصلاح و ترقی کی عام حرکت پیدا کی، ملک کو اندھی مذہبیت اور جھوٹے ایمان کی لعنت سے پاک کیا، قدیم تہذیب و معاشرت کی بوسیدہ دیواریں گرا کر جدید عمران و حضارت کی عمارتیں کھڑی کیں، مدارس و مکاتب قائم کئے، صنعت و حرفت کے کارخانے کھولے، سیر و تفریح کے تماشا گھر بنائے، اور روسیوں کو جہد للحیات و بقاء اصلح کی جنگ میں کامیاب ہونے کے لئے تیار کر دیا،

یہ پیٹر اعظم تھا،

پیٹر اعظم ۱۶۸۹ء میں سریر آرائے سلطنت ہوا، اس کا عہد مختلف حیثیات سے بہت نمایاں ہے، ازاں جملہ عیسائیت کی ترقی، نظم و قانون کا قیام، تہذیب و تمدن کا نشر، اور علوم و فنون کا فروغ ہے، چونکہ اس کی تربیت ابتدا سے مغربی اصولوں پر ہوئی تھی، اس نے آنکھیں کھول کر جو چیزیں دیکھی تھیں، جن رسوم و آداب کے ہنگاموں میں عہد طفلی و مراہقت بسر کیا تھا،

وہ سب مغربی تہذیب و تمدن سے متاثر تھیں، اور چونکہ مغرب کا تمدن فاتح تمدن تھا اور اس کی فتوحات کا سلسلہ برابر جاری تھا، اس لئے قدرتی طور پر سر و دل و دماغ اسی کا ہو رہتا تھا، جو آنکھ ایکبار اس کو دیکھ لیتی تھی اسی کی پرستار بن جاتی تھی، اور ہر شخص ترک و اختیار پر مجبور تھا،

پیٹر اس سے پہلے بھی ایک دفعہ تخت حکومت پر بیٹھ چکا تھا، لیکن اس وقت اس کی عمر فرمانفرمائی کے قابل نہ تھی، عنانِ حکومت اس کی بہن صوفیا (Sofia) نے اپنے ہاتھ میں لے لی، اور اس کو آرکینجل (Archangel) کے قریب ایک گاؤں میں بھیجدیا، یہاں اس نے اپنی تعلیم مکمل کی، قوائے دماغی کو تربیت دی، مغربی زبانیں سیکھیں، علوم و فنون میں درخور حاصل کیا، یورپین قوموں کے ساتھ میل جول بڑھایا، مختلف صنعتوں سے واقفیت پیدا کی، فنونِ سپہ گری میں دستگاہ کامل حاصل کی، جہازرانی کے اصول سیکھے، فرانس و انگلستان کے فلاسفہ سے تعلقات پیدا کئے، اقتصادئین سے خط و کتابت کی، اور اپنا زیادہ وقت انہی کاموں کے لئے وقف کر دیا۔ وہ غور و خوض کا عادی تھا، اس کی صحبتوں کا دلچسپ ترین موضوع ملکی ترقی کے مسائل ہوتے تھے، اور اسی پر وہ یورپ کے اہل الرائے حضرات سے بحث کیا کرتا تھا، فولیٹر (Foltaire) نے لکھا ہے کہ وہ بچپن سے نہایت فہیم و فطین اور اسی کے ساتھ نہایت محنتی و جفاکش تھا، اس کی قوتِ اخذ و انتخاب قوی تھی، وہ جس سے ملتا تھا اس کی تمام خوبیوں کو اپنے اندر جذب کر لیتا تھا، اور جہاں جاتا وہاں کے صنعت پیشہ لوگوں میں مل بیٹھ کر ان کے اصولِ صنعت سیکھ لیتا تھا۔ وہ ہر کام کو اس کی ضرورت و اہمیت کے نقطۂ نظر سے دیکھتا اور اسی دلچسپی کے ساتھ اس کے سر انجام میں منہمک ہو جاتا تھا

یہ ایک واقعہ ہے کہ نیپر (Dnieper) کی آبنائے میں اس نے ایک جہاز پر ملاح کا کام کیا، اور آرکینجل جاکر ملاحوں اور تاجروں میں اس طرح رہا کہ وہ پہچان بھی نہ سکے کہ یہ کوئی مصیبت زدہ مزدور ہے، یا صوفیا کا بھائی پیٹر اعظم!

پیٹر اعظم کی سیرت کی یہ وہ خوبیاں تھیں جو بچپن سے فطرت نے اس کے اندر ودیعت کی تھیں، اور جن کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ بچہ گھر کا چراغ ہوگا، اور اس کا وجود سارے خاندان کے لئے مایۂ فخر و ناز!

۱۶۹۷ء میں اس نے یورپ کا سفر کیا، اس سفر میں (۲۵۰) روسی اس کے ساتھ تھے، جو سب کے سب نوجوان تھے، اور ابتداء سے اس کی نگرانی میں رہے تھے، پیٹر اعظم نے ان کو مختلف شہروں کی یونیورسٹیوں (Universities) دار التجربوں (Laboratories) اور کارخانوں میں داخل کیا، اور خود بھی مشہور مشہور صنعت گاہوں اور یونیورسٹیوں میں شریک ہوتا رہا، موسیو شارل نے لکھا ہے کہ وہ ہالینڈ (Holland) کے شہر زانڈم (Zandam) میں صرف آٹھ روز ٹھیرا تھا، یہ آٹھ روز اس نے فضول سیر و تماشے کے بجائے وہاں کے جہاز سازی و جہازرانی کے کارخانوں میں گذارے، اور معمولی مزدوروں کی طرح کام کیا،

اس پُرجوش کسب و اکتساب کے بعد جب وہ روس واپس آیا تو یگانۂ ہر علم و فن تھا، یورپ کی سیاحت نے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں، یورپ کی ہمرنگی و ہم نوائی کی لگن دل میں سما گئی تھی، اور وہ صمیم قلب سے چاہتا تھا کہ کسی طرح روس، یورپ بن جائے، چنانچہ جب وہ مسند آرائے حکومت ہوا تو اسی قسم کے احکام و فرامین نافذ کئے، رعایا ان کی تعمیل کی طرف بڑھی، اور مغربی باشندوں نے اس کے ہر حکم کے آگے اپنا سرِ اطاعت جھکا دیا، لیکن مشرقی روس جو وسعتِ ارضی اور کثرتِ آبادی میں مغربی روس سے بہت بڑا تھا، ابھی بہت پیچھے تھا، اس کے باشندے قدامت پرستی میں مبتلا تھے، آبا و اجداد کی تقلید کو فرض سمجھتے تھے، اور مغربی تہذیب و تمدن کو بہت ہی بری نظروں سے دیکھتے تھے، پیٹر اس قدامت پرستی کا جانی دشمن تھا، اور اپنے ہاتھ میں قلم کے ساتھ تلوار بھی رکھتا تھا، اس نے عام حکم دیدیا کہ جو لوگ بے معنی مذہبیت نہ چھوڑیں، قدیم اخلاق و عادات ترک نہ کریں اور آبائی رسم و رواج سے باز نہ آئیں، انہیں جرمانہ اور تازیانہ کی سزائیں دی جائیں

پیٹر نے اور باتوں کے ساتھ ڈاڑھیوں پر بھی رحم کیا تھا، اور اعلان کر دیا تھا کہ تمام درباری اپنے چہروں کو "خسِ سیاہ" کی پیداوار سے پاک رکھیں، اور اس حکم کے اعلانِ قطعیت کے لئے خود اپنے ہاتھ سے ارکین و اساطینِ حکومت کی لانبی لانبی ڈاڑھیاں کاٹ دیں، اور تمام ملازمینِ سرکاری کو لانبی لانبی اور بدوضع ڈاڑھیاں رکھنے سے منع کر دیا،

روس میں اب تک تقسیمِ لباس کا رواج بہت محدود تھا، تمام سرکاری ملازم گھر کے کپڑوں سے دفتر میں آتے، اور انہی سے جلسوں میں شریک ہوتے تھے، پیٹر نے اس بدتہذیبی کو بھی روکا، اور

چپراسیوں سے لے کر اعلیٰ افسروں تک سب کی یونیفارم (Uniform) مقرر کی، وکلا اور اہلِ علم کے لئے گون اور روب متعین کی، اور حکم دیا کہ سرکاری ملازم، کالجوں کے طلباء اور اہلِ دربار وہی لباس پہن کر دفتروں اور کالجوں وغیرہ میں جایا کریں جو اِن کے لئے تجویز کیا گیا ہے

اسی سلسلۂ اصلاح و انقلاب میں پیٹر نے عورتوں کی طرف بھی توجہ کی، اب تک یہ نازک کرشمۂ فطرت ظلم وستم کا شکار تھا، اس کی حکومت نے ان کو بھی اپنی آغوشِ شفقت میں لیا، اور پردہ کی مصیبت سے نکال کر اوجِ بامِ حریت و ترقی کی راہ کھولدی، ان کی تعلیم کا انتظام کیا، معاشرت میں اِنہیں بلند کیا، انسانیت وشہریت کے حقوق دے کر ان کو عزت بخشی، اوران کے لئے وہی لباس متعین کیا جو یورپ میں عورتیں پہنتی ہیں،

اِس فرمانِ اصلاح کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ سگرٹ پینا ممنوع نہیں ہے، اور ہر شخص کو مذہبی قانونی حیثیت سے اختیار ہے کہ وہ جس جگہ چاہے سگرٹ پیئے، کوئی دوسرا شخص مزاحمت کا مجاز نہیں، جو لوگ ایسا کریں اور جائز چیزوں کے استعمال سے روکیں، وہ حریتِ انفرادی اور حقوقِ شخصی میں دست اندازی کے مجرم ہوں گے،

اس دفعہ کی شانِ نزول یہ تھی کہ روسی کلیسا نے تمباکو نوشی کو مذہباً ممنوع قرار دیا تھا، اور جو شخص سگرٹ وغیرہ پی لیتا تھا سزا پاتا تھا، پیٹر نے اس بیہودہ مذہبی امتناع کی مخالفت کی، اور اس کو قانوناً ناجائز قرار دیا، پادری لوگ اس پر بہت چراغ پا ہوئے، لیکن اس نے ان کی مطلق پروانہ کی، اور جو کچھ کرنا تھا وہی کیا،

لیکن لائحہ اصلاح کی یہ تمام دفعات محض فروعات تھیں، پیٹر کو مغربی تمدن میں جو چیز سب سے زیادہ محبوب تھی وہ مادی اختراعات تھیں، جنہیں وہ اپنے ملک میں رائج کرنا چاہتا تھا، وہ خود بھی اکثر فنون میں خاص مہارت رکھتا تھا، یورپ سے جن لوگوں کو اپنے ساتھ لایا تھا۔ ان میں کثیر تعداد انجینیروں اور صناعوں کی تھی، اور روس سے جو طالب علم ساتھ لے گیا تھا ان کو بھی اس نے صنعت وحرفت کے کارخانوں اور سپہ گری کے مدرسوں میں داخل کیا تھا، اپنی مملکت میں جو مدرسے اور یونیورسٹیاں قائم کیں، اِن میں زیادہ ترفنی اور حرفتی یونیورسٹیاں تھیں تاکہ روس کو یورپ کی مادی غلامی نہ کرنی پڑے، ان یونیورسٹیوں کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ

ان میں مادری زبان میں تعلیم دی جاتی تھی، اسی غرض سے سینٹ پیٹرسبرگ (St. Petersburg) میں ایک دار التصنیف کا افتتاح کیا، جس کا مقصد وحید مغربی زبانوں سے فنی کتابوں کا ترجمہ تھا، اس تخصیص کا یہ نتیجہ ہوا کہ روسی زبان چند ہی سال میں نہایت گرانقدر فنی اور کلاسیکل کتابوں سے مالامال ہوگئی، اور اس عملی ٹکسال نے مغربی روس سے علم وفن کی کساد بازاری کو بالکل عنقا کردیا،

پیٹر کے اخلاق کا یہ ایک نمایاں حصہ ہے کہ وہ کسی کام کو ذلیل، یا اپنے درجہ ومنصب سے فروتر نہیں سمجھتا تھا، اس نے اپنی عمر کے مختلف حصوں میں جس دلچسپی کے ساتھ نجاری ملاحی، اور صناعی کے کام کئے، اسی دلچسپی کے ساتھ مہمات سلطنت کے انجام دینے میں بھی منہمک رہا سینٹ پیٹرسبرگ میں جب وہ سر پر تاج شاہی رکھتا تھا، جب وہ ایک نہایت وسیع رقبۂ زمین کا حاکم مطلق تھا، اور جب وہ تخت حکومت پر بیٹھ کر احکام وفرامین نافذ کرتا تھا، عین اسی وقت اس کا دماغ صنعت وحرفت کے مسائل پر بھی غور وفکر کرتا تھا، حرفتی اختراعات کی طرف توجہ کرتا تھا، ترقی تجارت کی تدابیر سوچتا تھا، اور چاہتا تھا کہ کوئی ایسی تدبیر ہو جائے کہ روسی چشم زدن میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے ہمسر وہم پایہ ہو جائیں، اس مقصد کے لئے اس نے اپنی تمام امکانی کوششیں صرف کیں، قوم کی امانت میں پہلے لوگوں کیطرح خیانت نہ کی، بلکہ اپنے عیش وآرام کو تج دیا،

روسیوں نے اول اول تو اس کی ان تدابیر سے اتفاق نہ کیا، اور جاہل پادریوں کے کہنے میں آکر اکڑے رہے، لیکن جب ذرا ذرا ہوش آیا، اور پادریوں کی دوزخ وجنت کا جادو اترا تو جوق جوق اس کی طرف مائل ہونے لگے، اور کلیسائی اقتدار پر موت کی بیکسی چھاگئی، پیٹر کہتا تھا کہ یہ روسی عمران وتمدن کی دنیا میں ابھی نادان بچے ہیں مدرسے جانا اور استاد کے آگے مودب بیٹھنا ان کے لئے تکلیف مالایطاق ہے، کھیل کود کی زندگی آہستہ آہستہ چھوٹتی ہے، لیکن جب یہ بچے سن شعور کو پہنچیں گے، جب یہ جوان ہونگے تو مدرسہ سے محبت ہو جائے گی، استاد کو دوست سمجھیں گے، اور جس سے نفرت کرتے ہیں اسی کو سب سے زیادہ عزیز رکھنے لگینگے،

ناظر

جرمنی میں تعلیمی اصلاحات

انقلابِ حکومت کے بعد جرمنی کی تعلیمی دُنیا میں کئی تغیرات واقع ہُوئے ہیں۔ یہ تغیرات حامیانِ مساوات کے نقطۂ خیال سے گو کیسے ہی ناکافی ہوں۔ تاہم یہ امر واقعہ ہے کہ ان کو بھی اِتنی جلدی اور ایسی اچھی طرح عملی صورت میں لانا ناممکن ہوتا۔ اگر ان کے لئے جنگ شروع ہونے سے پیشتر زمین تیار نہ ہو چکی ہوتی۔ تعلیمی پیاس جتنی سخت اور جیسی عالمگیر جرمنی میں ہے اس سے زیادہ اور کسی ملک میں نہیں۔ لیکن اب سے کچھ عرصہ قبل اس پیاس کو بجھانے کے لئے ہر شخص کو مساوی امکانات حاصل نہ تھے۔ اس کا نتیجہ قدرتی طور پر یہی ہو سکتا تھا کہ طبقۂ عوام میں بے چینی اور بے اطمینانی پھیل جائے۔ یہ بے چینی رفتہ رفتہ اس حد تک ترقی کر گئی کہ کٹّر سے کٹّر قدامت پسندوں کو بھی اصلاحات کی ضرورت تسلیم کرنی پڑی۔ آخر کار ایسٹر ۱۹۲۰ء میں تعلیمی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے اشخاص کی ایک کانفرنس بڑے وسیع پیمانہ پر منعقد ہوئی۔ جس میں بہت سی اصلاحات زیرِ بحث آئیں۔ ان اصلاحات میں سے نفاذ پذیر اگرچہ بہت کم ہوئی ہیں۔ تاہم اس بارے میں ابتدا ہو گئی ہے۔

اشتراکی جمہوریت پسندوں کے گرم طبقہ کا تعلیمی نقطۂ خیال معلوم کرنے کے لئے ایک اشتراک پسند ماہرِ تعلیم ڈاکٹر اون ٹین کی پیش کردہ اسکیم کا کچھ حال جاننا ضروری ہے۔ اس اسکیم کا مقصد یہ تھا کہ ہر ایک بچّے کو بلا امتیاز درجہ وحیثیت روزِ پیدائش سے لے کر بلکہ اس سے بھی قبل تعلیم حاصل کرنے کا ہر ایک امکان مہیا کیا جائے۔ ڈاکٹر موصوف کی تجاویز کا لبِ لباب حسبِ ذیل تھا:۔

حاملہ عورتوں کی بود و باش اور نشست و برخاست کا انتظام پُر فضا اور فرحت بخش مقامات میں کیا جائے۔ بچّے کو پیدا ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد کسی ایسے مکان میں پہنچا دیا جائے۔ جہاں کھلونوں کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہو۔ آٹھ سال کی عمر تک اس کو اسی طریق پر

تعلیم دی جائے۔ اس کے بعد ابتدائی مدرسہ میں داخل کر دیا جائے۔ جہاں وہ چودہ سال کی عمر تک تعلیم پائے۔ ابتدائی مدارس میں لکھائی۔ پڑھائی اور حساب کو عملی تربیت پر ترجیح نہ دی جائے۔ بچوں کو چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں منقسم کر دیا جائے اور تعلیم تا بہ حدِ امکان بے ضابطہ ہو۔ ابتدائی مدرسہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ اعلیٰ مدارس میں جا کر اصولی تعلیم حاصل کریں۔ زاں بعد کسی خاص پیشہ کے متعلق خاص تعلیم پائیں اور پھر یونیورسٹی میں داخل ہو جائیں +

ظاہر ہے کہ اس قسم کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اصولی اور مالی مشکلات کو حل کرنے کے علاوہ دنیائے عمل میں بھی نمایاں تبدیلیاں کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن جرمنی میں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ کم از کم اس کی ابتدا ہو چکی ہے۔ چنانچہ وہاں نئی قسم کے ابتدائی مدارس جاری ہو گئے ہیں۔ جن میں ہر ایک بچے کو خواہ اس کے والدین کی مجلسی حیثیت کچھ ہی ہو۔ کم از کم چار سال تک تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے۔ ان مدارس میں اشتراکیوں کے نصب العین کا اثر صاف طور سے نظر آتا ہے۔ چنانچہ ان میں عملی تربیت پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ ذریعۂ تعلیم اس علاقہ کی تکلمی زبان ہے۔ جس میں مدرسہ واقع ہو۔ شمالی جرمنی میں اس اصول کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ وہاں دیہات کے تقریباً سب بچوں کے لئے فصیح جرمن زبان ایک غیر ملکی زبان ہے۔ بچے تعلیم کھلی ہوا میں پاتے ہیں اور سیر و تفریح میں قدرت کا مشاہدہ و مطالعہ کرنا سیکھتے ہیں۔ جسمانی تربیت کو پہلے کی نسبت بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ چنانچہ وزیرِ تعلیمات نے حکم دیا ہے کہ ہر مہینے میں ایک دن طویل تفریح کے لئے مقرر کیا جائے اور اس روز تمام استاد اپنی اپنی جماعت کے ہمراہ باہر جایا کریں +

ان مدارس میں چار سال تک تعلیم پانے کے بعد طالب علم کو اختیار ہے کہ خواہ ابتدائی تعلیم کو مکمل کرنے کے لئے چودہ سال کی عمر تک وہیں رہ جائے۔ خواہ وہاں سے نکل کر کسی ثانوی مدرسہ میں داخل ہو جائے۔ اگرچہ کوشش یہ کی جا رہی ہے کہ غریب بچوں کے لئے ثانوی مدارس میں داخل ہونے کا امکان رفتہ رفتہ زیادہ کیا جائے۔ تاہم بحالاتِ موجودہ اس سوال کے فیصلہ کا انحصار والدین کی مجلسی حیثیت پر ہی ہے +

ثانوی مدارس میں جہاں تک بیرونی پہلوؤں کا تعلق ہے۔ کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

لیکن اندرونی طور پر کچھ اصلاحات عمل میں آئی ہیں۔ چنانچہ اب جسمانی تربیت کو نظرانداز نہیں کیا جاتا متذکرۂ بالا ماہانہ تفریح کے علاوہ ہفتہ میں ایک دن دوپہر کے بعد کا وقت کھیلوں کے لئے وقف کیا جاتا ہے۔ ان کھیلوں میں شریک ہونا تمام طلباء کے لئے لازمی قرار دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ زنانہ مدارس میں بھی اس قاعدہ کی پابندی کرائی جاتی ہے +

ثانوی مدارس میں زیادہ قابلِ ذکر تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ پُرانی تاریخی کُتب منسوخ کردی گئی ہیں۔ جرمنی کے دشمنوں کے لئے یہ امر موجب اطمینان ہو سکتا ہے کہ نئے دَور میں تاریخ کی تعلیم ایک بالکل نئے نقطۂ خیال سے دی جائیگی۔ اس میں جنگی فتوحات اور خاندانوں کے عروج و زوال کو دلچسپی کا مرکز نہیں بنایا جائیگا۔ بلکہ یہ دکھایا جائیگا کہ تہذیب نے مختلف زبانوں میں کون کون سے مدارجِ ارتقا طے کئے۔ رائج الوقت زبانوں میں سے انگریزی روزافزوں مقبولیت حاصل کر رہی ہے اور اغلب ہے کہ بہت جلد فرانسیسی کی جگہ پر قابض ہو جائے +

مذہبی تعلیم بھی انقلاب کے اثرات سے نہیں بچی۔ پہلے یہ تعلیم تمام بچّوں کے لئے لازمی تھی لیکن اب والدین کی خواہش پر ان کو اس سے مستثنیٰ بھی کر دیا جاتا ہے۔ بعض بڑے بڑے شہروں میں طلباء کو مذہبی تعلیم کا نعم البدل اخلاقی تعلیم کی صورت میں مُہیا کیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ والدین اس کی خواہش کریں۔ ڈسلڈورف۔ البرفیلڈ اور مغربی جرمنی کے دیگر بہت سے شہروں میں ایسے اسکول جاری ہو گئے ہیں۔ جن میں مذہبی تعلیم بالکل نہیں دی جاتی +

زنانہ مدارس کے لئے بہُت ہی دوررس اصلاحات زیرِ غور ہیں۔ ان میں سے بعض کو عملی صورت بھی دیدی گئی ہے۔ لڑکیوں کو تعلیم دینے کا مقصد بھی وہی رکھا گیا ہے۔ جو لڑکوں کو تعلیم دینے کا ہے۔ لڑکیوں کا معیارِ تعلیم بلند کرنے کی غرض سے زیادہ قابل اُستانیوں کا انتظام کیا جارہا ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو یکجا تعلیم دینے کا اصول رواج پذیر نہیں ہوا۔ لیکن اکثر اوقات حالات سے مجبور ہو کر لڑکیوں کو لڑکوں کے ثانوی مدارس میں بھی داخل کرلیا جاتا ہے +

یونیورسٹیوں میں کوئی اہم تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ ان کی تعداد میں اضافہ کرنیکا سوال مرکزِ توجہ بن گیا ہے۔ چنانچہ تجویز کی جارہی ہے کہ ہر ایک بڑے شہر اور بہُت سے چھوٹے شہروں میں یونیورسٹیاں جاری کر دی جائیں +

اس امر پر بھی کچھ روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معلّموں اور متعلّموں نیز معلموں اور والدین کے باہمی تعلقات کس قسم کے ہیں۔ اس امر کی کوشش کی جارہی ہے کہ ثانوی مدارس کے طالب علموں میں حکومتِ خود اختیاری کا اصول رائج کیا جائے۔ یا کم از کم معلموں اور متعلموں کے باہمی رشتۂ اعتماد کو مضبوط بنایا جائے۔ بعض مدارس میں باقاعدہ طور پر ایک "اسکول جمہنڈی" قائم کردی گئی ہے۔ یعنی مدرسہ کے طلباء کا ایک جلسہ ہوتا ہے۔ جس میں وسطیٰ اور اعلےٰ جماعتوں کے طلباء التزام کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور مدرسہ کے مختلف معاملات پر بحث کرتے ہیں۔ بعض مدارس میں ہر ایک جماعت کی طرف سے ایک ایک۔ دو دو قائمقام منتخب ہوجاتے ہیں اور معلموں اور متعلموں کے باہمی معاملات کی سرانجام دہی کا بار انہی پر ڈال دیا جاتا ہے +

اسکے علاوہ والدین کی انجمنیں بھی قائم ہوگئی ہیں۔ ان انجمنوں سے لوگوں کو بہت اُمیدیں ہیں پہلے جرمنی میں معلموں کو سول سروس کے افسروں کی طرح نہایت وسیع حقوق و اختیارات حاصل تھے لیکن اب یہ حالت نہیں رہی۔ مثال کے طور پر اب اِبتدائی مدارس میں والدین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس وقت چاہیں۔ جماعت میں بیٹھ کر معلموں کے طریقۂ تعلیم کے متعلق اپنا اطمینان کرلیں۔ لیکن ثانوی مدارس میں ابھی یہ قاعدہ رائج نہیں ہُوا۔ والدین کی انجمن والدین اور معلموں کے باہمی معاملات کو سرانجام دیتی ہے۔ ان انجمنوں کی حیثیت اگرچہ مشیرانہ ہے۔ تاہم اگر وہ چاہیں تو ارا کینِ مدرسہ پر ناقابلِ مزاحمت دباؤ ڈال سکتی ہیں۔ اِس لئے اگر والدین کو اپنے حقوق وفرائض کا احساس صحیح طور پر ہوجائے تو یہ انجمنیں آگے چل کر بہت نتیجہ خیز ثابت ہوسکتی ہے ان انجمنوں کے تمام ممبر بذریعہ انتخاب مقرر ہوتے ہیں۔ انتخاب میں رائے دینے کا حق صرف ان لوگوں کو ہے۔ جن کے بچے مدرسہ میں تعلیم پاتے ہوں۔ کسی شخص کو ایک سے زیادہ رائے حاصل نہیں۔ خواہ اس کے کتنے ہی بچے مدرسہ میں زیرِ تعلیم ہوں۔ بروئے قانون ہر ایک مدرسہ میں اس قسم کی ایک انجمن ہے۔ معلم بھی انجمن کے اجلاسوں میں بطور مشیر شریک ہوسکتے ہیں لیکن ممبروں کو اختیار ہے کہ وہ معلموں کو مدعو کئے یا اطلاع دئے بغیر بھی انجمن کا اجلاس کرلیں +

(ماخوذ)　　میلا رام وفا

ہندی نقاشی

شاید کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ہندوؤں کے ہاں علوم و فنونِ لطیفہ و نفیسہ کسی انسان کے لئے استعمال نہیں ہوتے تھے۔ شاعر کسی راجہ مہاراجہ کی شان میں قصیدہ گو نہ تھا۔ یہ کام بھاٹوں سے لیا جاتا تھا۔ کوئی نقاش کسی انسان کی تصویر نہیں بناتا تھا۔ کوئی بُت تراش انسان کا بُت نہ بناتا تھا۔ موسیقی کسی انسان کی دنیوی اغراض میں استعمال نہ ہوتی تھی۔ ہندوؤں کے ہاں نیچر یا اُس کے آفرینندہ جسے ایشر کہتے ہیں یا اُس کے خواص کی مورتیں یا بعض جذبات کے اظہار کے لئے فنونِ نفیسہ استعمال ہُوا کرتے تھے۔ عمارات میں نقاشی و سنگتراشی دیوی دیوتاؤں کی مدح یا اُن کے متعلقہ مظہرات کے لئے کی جاتی تھیں۔ عیسائیوں کے ابتدائی زمانہ میں بھی فنونِ لطیفہ مذہب کے تحت رہے مگر وہاں رفتہ رفتہ اب دنیوی اغراض میں استعمال ہوتے ہیں مہاتما بُدھ کے بُت اُس وقت بننے شروع ہُوئے جب اُن کو انسان سے بالاتر سمجھا گیا۔ بودھوں کے زمانہ میں تصویر کشی اور نقاشی کا بہت رواج ہو گیا تھا۔ عوام الناس کے لئے گوتم بدھ کا ذریعۂ تعلیم نقاشی تھی۔ بُت تراشی بعد میں شروع ہُوئی۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بُدھ بھکشو جب ہندوستان سے باہر گئے تو اپنے ہمراہ تصویریں اور مختلف قسم کے نقاشی کے نمونے بھی لے گئے جن کے ذریعہ سے وہ بُدھ مت کی تعلیم دیتے رہے (Percy Brown) پرسی براؤن علم (Painting) نقاشی کے مسلم ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب انڈین پینٹنگ (Indian painting) میں رقمطراز ہیں کہ چینیوں نے نقاشی بُدھ بھکشوؤں سے سیکھی وہاں سے جاپان میں پہنچی۔ چین اور جاپان کے مندروں میں جس قسم کی نقاشی موجود ہے وہ غار اجنتا (Caves Ajanta) کے دیواری نقوش سے نقل کی ہُوئی معلوم ہوتی ہے۔ دراصل بُدھ کے زمانہ کی مصوری و نقاشی مذہبی رنگ میں تھی۔ بُدھ دھرم کے اصول۔ اُس کے بانی کے سوانح دکھلائے جاتے تھے۔ جس کے ذریعہ سے

اس دہرم کی اشاعت کیجاتی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ ۶۷ء میں ایک بُدھ بھکشو جس کا نام کشپ مدنگا تھا چین پہنچا۔ شاہنشاہ منگ ٹی نے اسے بُلوایا تھا۔ اس کے بعد متواتر بہُت سے مصور اور نقاش ہندوستان سے چین جاتے رہے اور وہاں دیواروں پر نقاشی کرتے رہے۔ مندروں میں اُنہوں نے نقاشی شروع کردی جس سے مقصود بدھ مت کا پھیلانا تھا۔ حتیٰ کہ بہُت سے چینی ہندوستان میں آکر یہ فن سیکھتے رہے۔ سترھویں صدی تک یہ سلسلۂ آمد و رفت جاری رہا۔ ہندوستان کے مصوّر بہت سے چین میں سکونت پذیر ہوگئے اور وہیں مرے۔

محققانِ علم مصوری و ماہرانِ علم نقاشی نے جاپان اور چین کی مصوری اور نقاشی کو نہایت غور سے مطالعہ کیا ہے اور بُدھ مت کے زمانہ کے ہندی نقوش کے ساتھ مقابلہ کیا ہے مثلاً ڈلن صاحب۔ بن ین صاحب۔ رکٹ صاحب وغیرہ وغیرہ اس رائے پر پہُنچے ہیں۔ کہ چین اور جاپان کی مصوری اور نقاشی میں ہندی مذہبی رنگ ہویدا ہے جس میں شک کی گنجایش نہیں افسوس ہے کہ (غار ایجنٹا) کی دیواروں کے نقوش حوادثِ زمانہ سے زیادہ تر خراب ہوگئے ہیں۔ کسی صاحب نے عرصہ ہُوا اُن کے عکس لئے تھے۔ افسوس کہ اتفاق سے وہ بھی جل گئے۔ تاہم کہیں کہیں اب بھی نقوش اور تصاویر موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فنِ نقاشی درجۂ کمال تک پہنچا تھا۔ انگریز ماہر حیرت میں ہیں کہ اس ابتدائی زمانے میں ہندوستان میں مصوری کس درجۂ کمال پر پہنچی ہُوئی تھی۔ حیدر آباد دکن میں چند سال ہوئے انجمن آثارِ قدیمہ قائم ہوئی ہے اور اعلےٰ حضرت نظام کو اور اُن کے اہلکاروں کو قدیم صنادید کے محفوظ کرنے اور مرمت کرنے میں نہایت دلچسپی ہے۔ یہ سوسائٹی ایک رسالہ بھی شائع کرتی ہے ناظرین کو معلوم ہے کہ علاقہ بمبئی میں ایک مصوّر راوی ورما گذرا ہے اکثر تصاویر جو بازاروں میں فروخت ہوتی ہیں اسی کے مطبع کی ہیں۔ اِس شخص نے ہندوؤں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ ہندو دہرم کے دیوی دیوتاؤں اور ہندو پورانوں کے فسانے اُس نے تصاویر میں دکھلا دیئے اور طباعت جدید کی رنگ آمیزی سے کام لے کر لاکھوں کی تعداد میں سارے مُلک میں پھیلا دیں بنگال میں بھی ایشیائی مصوری کی ترقی ہو رہی ہے اس مصّوری کی

طرز و وضع اپنی خاص ہے۔ ضلع کانگڑہ میں بھی ہندو راجاؤں کے عہد میں ایک خاص طرز رائج تھی۔ وہ کانگڑہ اسکول کہلاتا ہے۔ جو مغلیہ طرز کی نقل تھی۔ فارسی خوانوں نے فارسی کتابوں میں مانی و بہزاد کے نام سُنے ہونگے۔ یہ دونوں مصور اسمٰعیل صفوی شاہِ ایران کے زمانہ میں گذرے ہیں۔ یہ دونوں مصور ایرانی مصوری کے موجد اور اُستاد تھے۔ ایرانی نقاشی مشہور ہے۔ ایران سے نقاشی کشمیر پہنچی ۔ جہاں آپ کشمیری کتابوں میں نقاشی دیکھیں تو سمجھئے کہ یہ ایران کی نقاشی کی نقل ہے +

زمانۂ حال میں مصوری اور نقاشی کا مقصد دُنیوی ہو گیا ہے۔ عبادت کے محکمہ سے وہ علیحدہ ہو گئی ہیں۔ آیا یہ ترقی سمجھی جائیگی یا تنزل۔ ہم کوئی رائے پیش نہیں کرتے۔ کن جذبات کو حال کے فنونِ لطیفہ تحریک دیتے ہیں اپنے اپنے مذاق پر منحصر ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ روحانیت اور مذہبی رنگ رخصت ہو گئے ہیں +

شمیم

"اے عورت! تو مخلوق کا سب سے بہتر نمونہ ہے۔ تو خدا کی انتہائی اور سب سے اعلےٰ مخلوق ہے تجھ میں یعنی تیری ہستی میں سب اچھی چیزیں جو خیال اور نظر میں آسکتی ہیں بدرجۂ کمال موجود ہیں۔ تو پاک ہے۔ تو شانِ عرفاں رکھتی ہے۔ تو نرم اور خلیق ہے تو بہت مرغوبِ طبع ہے۔ اور تو بہترین کائنات ہے" +

ملٹن

"اے عورت! میں تیری اس وجہ سے تعریف نہیں کرتا۔ کہ تو کائنات میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اور میں بایں سبب تجھ سے محبت نہیں کرتا کہ تو انسانی راحت کا اعلیٰ سرچشمہ ہے۔ بلکہ میں اس واسطے تعظیم کرتا ہوں۔ کہ انسان کی انسانیت تیرے ہی طفیل سے قائم ہے۔ اور تو تمام نیکوں کا ملجاو ماوا ہے۔ تیری ذات، تیرے دل و دماغ میں وہ خوبیاں ہیں۔ جن سے انسانِ ضعیف البنیان بھی فرشتوں کی ہمسری کر سکتا ہے"

ہورنیس ٹوسل

(ماخوذ) افتخار رسول بدر

مرّوجہ اُردُو شاعری

مروجہ اُردو شاعری دو چار کوڑی الفاظ کو لڑا لڑا کر معنی آفرینی کے اکھاڑے کی رونق دوبالا کرنے میں مشغول ہے۔ ان الفاظ کی فہرست کچھ طویل نہیں۔ آئینہ۔ حیرت۔ خموشی۔ غم۔ سکوت۔ ذرہ۔ قمر۔ حُسن۔ جلوہ تپش۔ شعلہ۔ شمع۔ محفل۔ شوق۔ خواب اور ہمچوں قسم تیس چالیس۔ کبھی حیرت خم ٹھونک کر آئینہ کے بالمقابل ہوتی ہے کبھی اس سے گتھم گتھا۔ کبھی بالکل اپنے آپے سے باہر۔ کبھی خموشی میں کبھی خواب میں غرض سو سو طرح ذلیل ہوتی ہے۔ یہی حال دوسرے الفاظ کا ہے۔ شوق بیچارہ تو بالخصوص اس قدر ہرجائی ہُوا ہے کہ کہیں کا نہیں رہا۔ کبھی آغوشِ حیرت میں کبھی شعلہ سے ہم پیالہ و ہم نوالہ۔ کہیں غم کا میاں۔ کہیں چمن کا خانہ زاد غلام۔ دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوستا ہے اور بعض دفعہ بیتاب ہو کر خواہش کرتا ہے کہ کاش میں بھٹیارا ہوتا۔ مگر شوق نہ ہوتا۔ اردو شعر گویوں کے ظلم سے تو بچتا۔ باقی رہا چاند سو کچھ تعجب نہیں کہ وہ قطعی طور پر ہجرت کر جائے۔ اسے زمینِ شعر راس نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر ان الفاظ کی دُہائی سُنی گئی تو اُردو شعر سازی کے کارخانہ کے کاریگر آئندہ کن الفاظ کو اپنے دماغی ہتھوڑے اور دل کی بھٹی سے نرم گرم کر کے توسنِ کلام کی نعلبندی کیا کرینگے؟

اول اول جب زلف و گیسو کے محلہ سے فریاد اُٹھی تو اتفاقیہ طور پر قومی تابوت کی تیاری تھی اس وقت کے شعر بافوں نے میلوں لمبا کفن پیش کر دیا مگر اب تو وہ موقع بھی نہیں۔ اس مُردے کی ہڈیاں تک گل چکیں۔ اصلی نہ نقلی کسی قسم کے آنسوؤں کی گنجایش نہیں +

چند دن شاعروں نے مناظرِ قدرت پر سواری گانٹھنے کی ٹھہرائی تھی۔ بیچارے دشت و کوہسار زخمی ہوئے۔ بادلوں کے پرخچے اُڑے۔ چاندنی بلبلا اُٹھی +

تصوف و عرفان بھی شعر کی چکی میں پس کر سُرمہ ہو چکے۔ اس خاک اُڑانے سے بھی کچھ نہیں بنے گا۔

تو آخر پھر اب کیا ہوگا؟ سٹرائک یا ہڑتال!

عبد العزیز

روزنامچہ

شمس العلماء مولانا مولوی محمد حسین آزاد مرحوم

(گذشتہ سے پیوستہ)

تمام دن ہمارے دائیں ہاتھ پر گادُر۔ جاسک وغیرہ کی پہاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ اگرچہ بات اعتبار کے قابل نہیں۔ مگر کہتے ہیں۔ اس میں فرقہ بام (جنگلی آدمی۔ بن مانس) رہتے ہیں۔ مرد اکثر غاروں میں رہتے ہیں۔ ان کی عورتیں انسان پر عاشق ہوتی ہیں۔ جہاں کسی مسافر یا اکیلے دوکیلے آدمی کو پاتی ہیں لے جاتی ہیں۔ اُس سے ہوس رانی کرتی ہیں۔ جنگل کے میوے لاکر کھلاتی ہیں۔ تلوے چاٹتی ہیں۔ کہ چل نہیں سکتا۔ خود حیوان مطلق ہیں۔ مگر انسانِ نرینہ سے ہوس رانی کا مرض ہے۔ اِن کے نر ہوتے ہیں۔ مگر وہ نہایت ضعیف اور یہ ایسی قوی ہوتی ہیں کہ وہ کچھ نہیں کرسکتے۔ وہ انسان سے صاحب اولاد بھی ہو جاتی ہیں، آدمی اگر بھاگ کر نکل جائے تو پیچھا کرکے دوڑتی ہیں اور پکڑ لے جاتی ہیں۔ اور نسل بڑھاتی ہیں، ایک دفعہ ایک شخص بھاگا۔ مادہ نے تعاقب کیا۔ ایک ندی بیچ میں حایل تھی۔ خوش قسمتی سے وہ قوم پانی سے ڈرتی ہے۔ خوبیٔ قسمت سے یہ پار ہوچکا تھا۔ مادّہ کنارے پر آکر رُک گئی غائیں بائیں کرکے غُل مچاتی تھی۔ روتی تھی۔ غصّہ ہوتی تھی اور بچّوں کو اُٹھا اُٹھاکر دے دے مارتی تھی۔ کہ شاید ان کی محبت کے سبب سے چلا آئے۔ مگر وہ بلا سے نکلا، اب کب جاتا تھا کھڑا دیکھتا رہا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد بھاگ آیا۔

جہاز ہمارا چلا جاتا ہے۔ میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ خلاصی اور لوکران جہاز تاش کھیل رہے ہیں کبھی دو کبھی تین بادبان چڑھا دیتے ہیں رات کو چار بادبان ہو گئے ہوا کم تھی اُتار چڑھاؤ ہوتا رہا۔ دن کو گرمی بشدت رہی رات کو کچھ امن رہا۔

۵ر اکتوبر ۱۸۸۵ء یوم دوشنبہ ۲۵ ذالحجہ سنہ ۱۳۰۲ھ صبح مبارک صُبح ہوئی۔ سُنا کہ دس

بارہ بجے بندر عباس پہنچ جائیں گے۔ میں نے ½ ۷ بجے تک عرشہ پر جاکر ہوا کھائی بہت خوش آئند تھی۔ پھر آکر لکھنے میں مصروف ہوا۔ دن کو گرمی ایسی شدت کی رہی کہ چاروں طرف پھرتا تھا۔ اور کہیں امان نہ پاتا تھا، خدا کی قدرت یاد آتی تھی۔ کہ کجا وہ لاہور کی سیر اور سوا سیر برف کوٹ کر پھا کنی اور دن رات میں تین تین دفعہ تربوز کھانے خوراک میں فقط دہی دودھ۔ اور کجا یہ عالم۔ اس پر غذا کی بے سامانی الگ ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ مظہر العجائب کی شان اس سے بہت عالی ہے۔

ہمراہی ہمارے جو پہلے اوپر آچکے ہیں کبھی کہتے ہیں کہ بہ دستِ راست کوہ مبارک ہے یہاں عرب اور کوہستانیوں سے کسی زمانے میں جنگ ہوئی تھی۔ اور عرب کی فتح ہوئی تھی اس لئے اس کا نام جبلِ مبارک رکھا۔ کبھی کہتے ہیں۔ کہ سامنے کوہ سلامہ نظر آتا ہے۔

رات کو گرمی نے سخت تکلیف دی تھی میں گھبرا کر اُٹھتا اور بیٹھ جاتا۔ صبح تک یہی حال رہا۔ رات کو میں نے دریا میں دیکھا۔ کف جو موج میں یا جہاز سے ٹکرا کر پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے جاتے ہیں۔ جیسے فاس فورس کے بادل بہہ رہے ہیں اور اِکادُکا بُلبلے جگنو نظر آتے ہیں۔

مسقط کنارے پر تھا۔ مگر چھوڑ دیا۔

۶ر اکتوبر ۸۵ء سہ شنبہ ۲۶ ذلحجہ۔ صبح کو دونوں طرف پہاڑیاں نظر آنے لگیں۔ کہتے ہیں کہ ٹھیک دستِ راست پر کوہ ہرمز ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی سمندر کے بیچ میں ہے اس پر آبادی ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ کوہ لاک سے جہاز دُور نکل آیا۔ بائیں ہاتھ پر ہانقہ کو چکر دے کر کہتے ہیں کہ تمام کشم کا علاقہ ہے۔ سمندر کے کنارے مرزا نظرالبہ شاہِ ایران کی طرف سے حاکم ہے۔

½ ۸ بجے بندر عباس پر پہنچے۔ یعنی آبادی ہمارے داہنے ہاتھ تھی ہمارے جہاز نے کنارے سے اس قدر دُور لنگر کیا۔ کہ میں بلکہ کوئی بھی شہر میں نہ جا سکا۔ دفعۃً ایک چھوٹا جہاز بادی آیا۔ کہ یہاں کے لوگ اسے غراب کہتے ہیں۔ وہ انگریزی کمپنی ہے۔ ڈاک دینے اور لینے کے لئے۔ اور ہمیں وہ مال لینے آیا تھا۔ جو بندر عباس کے لئے ہمارے

جہاز میں تھا۔

بندر کے ملاح چھوٹی چھوٹی کشتیاں لے کر آئے۔ اور یہاں کے اُترنے والے مُسافروں کو اُتار لے گئے۔ چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر چند نوجوان لڑکے آئے۔ اور خربوزے۔ خشک انجیر۔ انار۔ ناشپاتی۔ انڈے۔ لائے۔ پھر چند اور سودے والے آئے۔ مگر سب کی زبان خالص فارسی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہاں سے خاکِ ایران شروع ہوتی ہے باوجود اس کے سب کی رنگت کالی یا سانولی۔ اس کا تعجب نہیں۔ جس ملک میں اس غضب کی گرمی پڑے وہاں تو حبشی پیدا ہونے چاہیئے ہیں۔ خیر جو جہاز آیا تھا۔ اس میں حبشی اور اکثر دوغلے حبشی بھی تھے۔ انار بالکل کھٹے تھے۔ خربوزے بھی مزے میں قابلِ تعریف نہ تھے۔ البتہ بڑے بڑے تھے۔

۱۲ بجے تک مال جہاز سے اُترتا رہا۔ بہت سے تھیلے شکر کے تھے کالی مرچ۔ کھوپرہ اور کئی بوجھ تانبے کی چادروں کے تھے۔ یہاں سے ہندوستان کو جانے کے قابل کوئی چیز نہیں۔ مہندی اور "لوکے" لیمو بغداد کو جاتے ہیں اور کپڑا ان تمام بندروں میں بمبئی سے آتا ہے۔ دو بجے جہاز چلا اور ٹھنڈی ہوا کھلی۔ مگر اس طرح کھلی۔ گویا اسی کی منتظر تھی ہماری جان میں جان آتی تھی لیکن مشکل یہ کہ عین مقابل سے آتی تھی اگر بادی جہاز ہوتا تو قدم بھر آگے نہ بڑھ سکتا۔ دخان کی برکت تھی کہ رات کے چار بجے تک جہاز تیر کی طرح ہوا کی چھاتی پر چڑھتا چلا گیا۔ اب شام ہو گئی۔ میں عرشہ پر ٹہلتا پھرتا ہوں۔ بندر عباس سے ایک مرد عرب شیخ محمد حسین سوار ہوئے۔ بحرین جاتے ہیں کہ روضہ خوانی کریں۔ سلسلۂ گفتگو میں میں نے سید نعمت اللہ جزائری علیہ الرحمۃ کا ذکر کیا۔ کہا کہ میں اُن کی اولاد میں ہوں ◆

باقی آئندہ

افسانہائے عشق

بخت نصر کا قیدی

بابل کے باغچہ ہائے آویزاں میرے ہی لئے بنائے گئے تھے۔ میں بخت نصر کی محبوبہ اشتارت تھی۔ جس دیوی کے نام پر میرا نام تھا، میں اسی کی طرح حسین تھی۔ اسی کی طرح میں ایک ریشمی لباس پہنے رہتی تھی جو مردوں کی روحوں کو قید کرنے کے لئے اک جال تھا۔ میرے دامن سے کسی کا سر چھو جائے، وہ بےچارہ، اُس دامن کے نرم تاروں میں پھنس کے رہ جاتا تھا۔ جتنا اُس سے نکلنے کی کوشش کرتا تھا اُتنا ہی اور پھنستا تھا، اُتنا ہی اور اُس کے گلے میں پھندا پڑتا، میرے ذرا سے حکم، میرے خفیف سے اشارے پر خون کے آبشار گرتے تھے، دریا بہتے تھے، انسان بھیڑوں کی طرح ذبح کئے جاتے تھے؛ دُنیا کی بڑی سے بڑی سلطنت، وہ شکل، وہ رنگ اختیار کرتی تھی جو میں اُسے دینا چاہتی تھی، اور وہ تاجدارِ معظم جو تمام دُنیا پر حکمرانی کر رہا تھا، میرے گورے پاؤں کے نیچے، اک زبوں و عاجز قیدی کی طرح پڑا رہتا تھا، مگر میں خوش نہ تھی۔ ہاں، اگر ستارے میرے کمرے میں جمع ہو کر، چراغ کا کام دیتے اور آفتاب میرے محل کو گرم کرنے کے لئے انگیٹھی بنتا، اور دُنیا میرے پسندیدہ پھولوں سے لد کر میرا پائیں باغ بن جاتی، تو بھی میرے لئے یہ سب کچھ ہیچ تھا،

اِس لئے کہ میری رُوح میں اک نقطہ، ایک عمیق و حاکم نقطہ خالی تھا،

اس نقطہ کو نہ دولت کی شان، نہ انسانوں کی بندگی، نہ اُن کے خون، اور نہ اجرامِ فلکی بھر سکتے تھے، وہ نقطہ ایک ایسے وجود، ایک ایسے رفیق کو ڈھونڈھتا تھا جو میری زندگی کے باریک ترین عنصر میں سکون و حظ پیدا کرے۔ اک دن میں اپنے باغچہ کے سب سے زیادہ رنگین سب سے زیادہ چمکیلے پھولوں کے دستے میں لیٹی ہوئی تھی۔ کہ میرے کانوں کو سپاہیوں کی ہائے ہُو، اور ہتیاروں کی جھنکار سُنائی دی، یہ سپاہی ارضِ فلسطین سے فاتحانہ واپس ہو رہے تھے، اور

اُن کے نعرے بابل میں گونج رہے تھے۔

اب میرے حضور میں کتنے قیدی آگ میں جلائے جائیں گے، کتنوں کی آنکھیں نکالی جائیں گی کتنوں کی کھال کھینچی جائیگی۔ کیا کیا شکنجے، کیا کیا تکلیفیں، کیا کیا اذیتیں دی جائینگی اور فریادوں کے ساتھ خون کی نہریں ہم آہنگ ہوکر بہینگی۔ زمین میرے باغ کے محبوب ترین لالہ زار سے زیادہ سُرخ، زیادہ آتشیں رنگ میں رنگی جائیگی، خود بخت نصر آکر مجھ سے نئی اذیتوں نئے شکنجوں کی ترکیبیں پوچھے گا۔ یہ ظالم و خونخوار قوم، جو اپنے معبدوں، اپنے دیوتاؤں اور اپنی زندگی میں ظلم و اذیت اور اُس کے مظاہر کی پرستش کرتی ہے، شاید اسی وجہ سے مجھے پیار کرتی ہے کہ میں نے ظلم اور اذیتوں کے نئے نئے طریقے اِنہیں سکھائے ہیں۔

بخت نصر، وہ آلۂ ظلم جو دنیا میں موت اور خون تقسیم کیا کرتا تھا، مجھ سے آکر رائے لیا کرتا تھا یہ حاکم قہار جو دنیا کے اوپر، اِنسانوں کے اوپر ایک حکمرانِ مطلق کی حیثیت سے، اپنی رعایا کا گلا گھونٹتا تھا، ایسے لمحے بھی ہوتے تھے کہ میں، اس کی رعایا کی طرح اُس کا گلا گھونٹتی تھی میں نے گھنٹوں اس منظر سے لُطف اُٹھایا ہے کہ اپنے مرمر کے دروازے کی چوکھٹ پر اُس کے تاجدار سر کو میں نے ٹھکرایا ہے، اور وہ اک زخمی شیر کی طرح غرّایا ہے اور پھر خاموش ہو کر رہ گیا ہے۔ اس رات میں اپنے محل کی سیاہ چھت کو دیکھ رہی تھی، جس میں آسمان کی تقلید میں چاندی کے چمکدار ستارے جڑے گئے تھے کہ مجھے معلوم ہوا کہ بختِ نصر آرہا ہے۔ اُس نے سب ہتیار میرے کمرے کے دروازے پر اُتار کر رکھدیئے اور ایک سانپ کی طرح سرکتا ہُوا میرے حضور میں آیا اور کہنے لگا،

"اشتارت! میں نے فلسطین میں ہر چیز پر قبضہ کر لیا، اور اک سرے سے دوسرے سرے تک اُسے ویران کر دیا اور جلا کر خاک کر ڈالا، مگر وہاں اک شخص ہے جس کی روح پر میں تسلط حاصل نہیں کر سکا، وہ اک سپاہی منشی آدمی ہے۔ موت کی ہر شکل پر اُس کی آنکھیں ہنستی ہیں وہ اک بہادر رُوح رکھتا ہے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا کہ میں اُسے مرعوب نہ کر سکوں یہ شخص جو میرے سامنے بالکل بے ہراس رہتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اُن کی آنکھوں میں خوف دیکھوں، بتا کہ میں اُسے کس اذیت میں مبتلا کروں کہ وہ میرے سامنے کانپے،،

میں نے کہا: "کل اُسے میرے سامنے لایا جائے۔ میں جانتی ہوں کہ اُس کے ساتھ کیا کرنا چاہیئے۔ دوسرے دن، میں محل "طلائی آفتاب" میں گئی، اس کی چھت میں اک مرصع طلائی آفتاب بنایا گیا تھا، کمرے کا فرش اور دیوار و در اُس کے طلائی نور سے دمک رہے تھے، میں اپنے زرتار بالوں میں اک طلائی موباف لگائے ہوئی تھی، میرے حسین جسم پر اک طلائی ملبوس تھا، میں اس طلائی کمرے میں اس دبدبہ و احتشام کے ساتھ داخل ہوئی کہ دُنیا پھر اُسکی مثال نہ دیکھے گی۔ اک طلائی تخت پر جو نہایت سبکدست، نہایت ماہر صناعوں کی صنعت گری کا نمونہ تھا، میں متمکن ہوئی، اور وہاں میں نے اُس کا انتظار کیا۔ تھوڑی دیر میں میں نے دیکھا کہ دروازے کے مرصع طلائی پردوں کو اک غلام کے سیاہ ہاتھ نے ہٹایا، اور بنی اسرائیل کا وہ نوجوان جو بخت نصر کے سامنے بے خوف رہتا تھا داخل ہوا،

مجھے اپنی طاقتِ حسن پر اتنا بھروسہ تھا کہ میں جانتی تھی کہ وہ سرکش طبیعتیں جو آفتابوں معبدوں، معبودوں کے سامنے سجدہ نہ کرتی تھیں، میرے حسن کے سامنے سربسجود ہو کر میری پرستش کرتی تھیں،

یہ نوجوان کمرے میں داخل ہوا، ایک کھال اوڑھے ہوئے، بازو اور کندھے کھُلے ہوئے،

بابل کے سورماؤں کے سانولے ہاتھوں پر، اور بازوؤں اور چہروں پر رگیں اس طرح اُبھری ہوئی ہوتی ہیں جیسے بٹی ہوئی رسّی، مگر اس نوجوان کی گوری اور ہموار جلد پر ایک ساکت اور مطمئن قوت کا احساس ہوتا تھا۔ اس کا اصلاً صبیح مگر تمازتِ آفتاب سے سُرخ چہرہ کتابی تھا جس میں ایک ایسی روحانیت جھلکتی تھی جس کا میں اب تک تصوّر بھی نہ کر سکی تھی۔ اس کے شانوں پر گھنے سنہرے بال لہرا رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں۔ سمندر کی اور آسمان کی نیلاہٹ، اُس کی رُوح سے مل کر ایک ضیائے رنگیں پیدا کر رہی تھی اور یہ ضیائے رنگیں میری رُوح کے خالی نقطے میں، جسے اس قدر برسوں سے، اِس قدر طویل مُدت میں کسی چیز نے نہ بھرا تھا، نفوذ کر رہی تھی، میری رُوح اب تک تشنہ تھی، دولت کی شان، اِنسانوں کی عبودیت، انسانوں کے خون، اور اجرام فلکی جس روح کی تاریکی دور نہ کر سکے تھے،

اس وقت اُس کی آنکھوں کی روشنی اُس رُوح کو منور کر رہی تھی۔ اب میرے لئے، نہ دولت کی شان، نہ انسانوں کے خون، نہ اُن کی بندگی، نہ زمین نہ آسمان، نہ اجرام فلکی، کچھ نہ تھے، میری روح، میری حسیات میں سے کائناتِ محو ہو چکی تھی۔ میرے لئے صرف وہ سیلِ نور تھا جو اُس کی آنکھوں سے نکل رہا تھا، یہ نور تھا اور میری روح کی وہ مسرت تھی جو چشمے کی طرح اُبل رہی تھی،

میں اپنے تخت سے اُتری، اُسکی ثابت اور ضیا بار آنکھوں کی طرف سیدھی کھنچی چلی گئی میں نے اپنے بالوں میں سے طلائی موباف نکال پھینکا، اور اُن قدموں کو جو فلسطین سے یہاں تک آنے میں پتھروں پر چلنے سے چھل گئے تھے، اپنے لمبے کھُلے ہُوئے پریشاں بالوں سے ڈھک لیا، اور کہا:۔

"تو بھی اسی طرح عشق کے سنہری تاروں سے میری تشنہ روح کو جو سالہا سال سے تیرا ہی انتظار کر رہی تھی ڈھک لے"

اُس نے چند لمحے جواب نہ دیا جب اُس نے بات کرنی شروع کی تو مجھے ایسا معلوم ہُوا کہ ایک معبودِ اپنی معظم و نجات بخش رحمت تقسیم کر رہا ہے۔ اس نے کہا:۔

"اے عورت!" یاخودا" نے تیری روح کی طرف التفات کیا، جو تو چاہتی تھی وہ تجھے دیا تو بھی اس کرم خاص کے عوض میں بنی اسرائیل کی جانوں کو بچا،" میں نے اپنا سر اُٹھایا، اور اُس انقیادِ مطلق سے جو میری طبیعت میں ابھی پیدا ہُوا تھا میں نے کہا:۔

بہت اچھا، مگر مجھ پر اک نظر تو ڈال، مجھے اک چھوٹی سی نوازش سے محروم نہ رکھ آہ! میں کتنے برسوں سے تیرا انتظار کر رہی تھی، اُسنے اپنے لمبے اور نرم ہاتھ میرے سر کی طرف بڑھائے، مگر عین اس وقت بخت نصر آنکھوں سے شُعلے برساتا ہُوا کمرے میں داخل ہُوا اور پُرغضب آواز سے کہنے لگا:۔

"اس خانہ بدوش کو اپنا عاشق کرنیکے لئے تو نے یہاں بُلایا تھا، لیجاؤ اسے" اس وقت میں نے معلوم کیا کہ میرا تمام افسوں، میرا تمام طلسم جو انسانوں پر تھا ختم ہوگیا، اور اُس جانور کے سامنے جسے میں نے اپنا مطیع و منقاد کر رکھا تھا میں عاجز کھڑی تھی، بخت نصر کا آخری حکم اسوقت تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے:۔

"اشتارت کو باغ آویزاں میں، اسکے بالوں سے لٹکا دو۔ اور بنی اسرائیل کو ایک ایک کر کے اُس کی آنکھوں کے سامنے ذبح کرو،،

(خالدہ خانم ادیب)

سید سجاد حیدر

نُدرتِ ذوق و نظر

ان ہی کچی پکی مٹی کی چار دیواریوں میں اب بھی بعض لوگ ایسے رہتے ہیں کہ اگر دُنیا کو اُن کے متعلق صحیح معلومات نصیب ہو جائے، تو اُس کی مسرت، عہدِ عتیق کے کسی پُرانے دفینہ کی دریافت سے کچھ کم نہ ہو۔

آبادی کے اسی ہنگامے میں مِلے جُلے، کچھ افراد ایسے بھی ہیں کہ اگر زمانہ اُن کو، اُن کی حقیقی قابلیت کے علم کے ساتھ حاصل کرلے، تو آج بھی فنونِ لطیفہ کی بعض شاخوں میں جدید اکتشافات کا اضافہ ممکن ہے۔

رشید، کیا ہے اک چھریرا سا، خوب صورت بائیس تیئیس سالہ نوجوان، عام ہیئتِ جسمی سے متین، مگر جس وقت کسی طرف دیکھے تو اُس کی گردن میں وہ ذرا خم کا پیدا ہو جانا، اُس کی شوخیٔ فطرت کی دلیل، قیافہ مضمحل طبیعت کھوئی ہُوئی، دل گرفتہ دلگیر، آشفتہ حال، علی گیرین، گریجوئیٹ مگر قدرت کی بلیغ ترین تصنیف۔ اگر خاموش ہو جائے تو مصحفی مرحوم کا جمودِ شعری، مسکرائے تو آسکر وائلڈ کا استہزائے فصیح، اور جب سرگرمِ سخن ہو تو ملک محمد جائسی کی پدماوت، اپنی مکمل رعنائیوں کے ساتھ اُس کے بیان کا اک جزو محسوس ہو +

کبھی ادب و شعر کی رنگینیوں میں گم۔ کبھی ترکِ لذات کا مدح خواں۔ کبھی تہذیب و مدنیت کا عَلم بردار۔ کبھی فلسفۂ رہبانیت کا مبلغ، غرض آدمی کیا ہے اک چیستاں ہے۔ پہلے پہلے جب میں اُس سے ملا میں نے اُس کو دیوانہ سمجھا، مگر جب اُس سے باتیں ہُوئیں تو کھو گیا۔ اور اب جبکہ اُس سے کچھ محبت سی ہو گئی ہے تو اپنے آپ کو اُس کے لئے بیتاب سا پاتا ہوں +

اگرچہ اُس کے ادبی افکار و آراء انگریزی ادب و لٹریچر سے بہت کچھ متعلق ہیں مگر پھر بھی اُس کے محسوساتِ شعری یورپ ہی کی فضاء کے لئے مخصوص نہیں۔ مجھے معلوم ہے کاشی و ہردوار کی زمین بھی اُس کے سجدۂ ادبیت کی اک خاص سمت ہے۔

یوں تو اس کی طبیعت کا کیف خود اپنے لئے، اور احباب کے واسطے ہر وقت اک مستقل دعوتِ لطف ہے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ جس طرح کششِ مقناطیس کے لئے مادۂ آہن ناگزیر ہے بالکل اسی طرح بعض لطیف عنوانات ہیں، جن پر رشید کے ذوقِ تکلم کا پیمانہ بے اختیار چھلکنے لگتا ہے

میں کسی طرح بھی وہ زمانہ نہیں بھول سکتا، جبکہ مسلسل چھ سات روز میں نے رشید کو دیکھا کہ اس نے شاید اپنی زندگی کے لئے فیصلہ کر لیا ہے کہ یوں ہی بلا کچھ کھائے، پئے، بلا کچھ بولے چالے، خاموش۔ اُداس۔ بقیہ حیات بسر کر دے گا

صبح ہو یا شام، دن ہو یا رات، اک کیفیت ہے کہ اُس پر مستولی ہے، چُپ ہے، مسرور ہے، مست ہے، آخر چھٹے یا ساتویں روز بے حد منتوں سے میں نے اُس کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ بڑے اصرار سے اس حالت کے اسباب کو دریافت کرنا چاہا مگر جس اجمال سے اُس نے کام لیا ہے اُس کے بلاغتِ ذوق کا اُس سے پتہ چلتا ہے، اُس نے کہا "فتح النساء کے کوچے سے نکل رہا تھا کہ مرے کانوں میں اک آواز آئی اور پھر مرے ہوش بجا نہ رہے دیکھو کیا ماجرا طراز جملہ ہے۔

"اِدھر تو آ۔ ارے او پھول والے!!"

اُس نے کہا "مظہر تم ہی کہو اس طلبِ نکہت، اس تفصیلِ ذوق، اس ترنمِ صوت کا صحیح جواب مرد کی مبتلا طبیعت، خرابیٔ مذاق اور کرختگیٔ فطرت کبھی دے سکتی ہے، میرے احساس کی نزاکت کا تقاضا یہی تھا کہ میں اپنی روح کے فشار کو یوں نذرِ نکہت بنا دیتا ——"

رشید کے وظائفِ ادبی کی تفصیل تو بہت دشوار ہے مگر غالباً اس قدر اجمال بھی لطف سے خالی نہ ہوگا جو عرض کرتا ہوں۔ اک مرتبہ بمبئی مالا بار ہل کی زیرین سڑک کے موڑ پر، جبکہ مظہر و رشید ساتھ ساتھ جا رہے تھے اک زرد رنگ کی نہایت خوب صورت سی موٹر برابر سے گذری صرف اک نرم و نازک آواز قہقہہ ہمارے کانوں میں گونجتی ہوئی گذر گئی۔ مگر رشید حواس باختہ ہو گیا ٹھیک گیارہ بجے رات تک وہیں بے حس و حرکت اک جانب بیٹھا رہا۔ موسیقی جب نغمہ کے کیف میں ڈوب کر اپنا آخری بول، طربوں پر اثر بنا کر پھیلا دے اور کائنات کو تڑپا کر رکھ دے، مصوّر، جب اپنے نقوشِ مصوّرہ میں آخری رنگ بھرے اور دیکھتا رہ جائے، شاعر

تخیل کی کیفیت کو جب ادا کرنے بیٹھے اور دو لفظ خوبی سے کوئی نادر ترکیب اختیار کرلیں، جس پر وہ اُچھل پڑے۔ بس ایسا ہی اثر اِس شیریں و نازک سے قہقہے نے رشید پر کیا!

قیامِ بمبئی کے زمانہ میں اک مرتبہ رشید دو روز ہوٹل سے غائب رہا، نہایت تلاش کی نہ ملا۔ آخر تیسرے روز چرچ گیٹ کی جنوبی کوٹھیوں کے طویل و حسین سلسلۂ تعمیر کے آخرین حصہ پر جہاں اک مکان کے سامنے مختصر سا پارک ہے اُس کے سبزہ پر آپ خموش و غمگین پائے گئے۔

یہ مشاغل اُس کے روزانہ وظائف میں داخل ہیں اور احباب اسکے عادی۔ تاہم اُس کے دوستوں میں یہ خلش بھی ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا!؟

۲

رشید کے بعض دوستوں نے مشورہ کیا، کہ چونکہ جوانی صحتِ اخلاط کے نتائج سے عبارت ہے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ رشید کے والدین کو یا خود رشید کو شادی پر آمادہ کرنا چاہیئے، اور بات یہ بھی تھی کہ اول اول رشید کو جو لوگ دیکھتے اور اُس سے باتیں کرتے یا اُس کا حال اُس کے خاص دوستوں سے سنتے تھے تو وہ یکایک صحیح رائے قائم کرنے پر قادر نہ ہو سکتے تھے، چونکہ اُس کے خیال کی پرواز بہت بلند و آزاد تھی بعض لوگ تو اُس کا ساتھ ہی نہ دے سکتے تھے مگر اُس پر بھی جو لوگ کچھ ہم آہنگ و ہم نوا ہو جاتے تھے اُن میں بھی بہت دیر تک ساتھ دینے کی سکت نہ رہتی تھی، شدتِ تخیل، غلوئے افکار ہر شخص کا حصہ نہیں۔ تاہم اس شادی کی تحریک نے اُس کی زندگی کے اک بڑے اغلاق کو واضح کر دیا اور سب لوگ جاننے لگے کہ یہ کس طرح کا معصوم مجنون اور پاکباز دیوانہ ہے۔

سب سے پہلے میں نے ہمت کر کے اُس سے کہا "رشید! ماشاء اللہ تم جوان ہو، فارغ ہو، مناسب ہے شادی کرلو۔ شادی شرکت ہے عیش کی، جس سے جانبین کی مسرتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ شادی تدریجی ارتقا ہے تہذیب و تمدن کا اور اخلاق کا تصفیہ بھی اس سے ممکن ہے۔ شادی مردانہ زندگی کا حسن ہے۔ شادی مردانہ جبودیت کا وقار ہے اور سچ تو یہ ہے کہ شادی ہی مرد کی مصرفیت کی راہ ہے، تمہارا یہ التہاب و اضطراب اور یہ بیکار شباب اک تسلی چاہتا ہے اور یہ چیز صرف اک عورت کی محبت ہی پیش کر سکتی ہے اِدھر اُدھر تلاش عبث ہے!"

آپ باور کیجئے گا رشید، اک معصومانہ جوش کے ساتھ میری جانب متوجہ ہوا اور کہنے لگا

بس محمود بس خدا کے واسطے حقایق کو اپنے جہل سے مجروح نہ کرو، تم نے اپنی دانست میں بڑی قابلیت سے مسئلۂ مناکحت پر روشنی ڈالی ہے۔ مگر یقین کیجئے آپ نے اپنے ان چھ سات جملوں میں اس درجہ جہل و نادانی سے کام لیا ہے کہ اگر میں چھ سات مہینے تک سرگرم گفتگو رہوں تب بھی شاید تمہارے اغلاقِ منطق کے سلجھاؤ سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ حضرات کی دُنیا اور ہے اور مجھ بیکس کی دُنیا اور ہے۔ کاش کوئی بات تو آپ نے سوچ سمجھ کر کہی ہوتی۔ یہ انتیازی شبہات، یہ یک طرفہ تصدیقِ ظنیات۔ یہ خود ساختہ ابہام۔ یہ اغلاط کے خوشنما عنوانات، کیا آپکی دُنیا کی تعمیر ان ہی خرابیوں پر منحصر ہے ۔ ؟!

"تم نے یہی کہا ہے نا کہ تم جوان ہو۔ فارغ ہو۔ شادی کر لو۔

"محمود! جوانی یہ تعینِ زمانی واللہ اُس دُنیا کے جذباتِ کثیف کی اصطلاحات ہیں جن کے ہاں طفلی۔ جوانی۔ ضعیفی کے کچھ مدارج و مشاغل الگ الگ مختص و قائم ہیں۔ اور حیات کی یہ تقسیم سہ گانہ اپنے اندر کچھ بیکاری۔ کچھ لہو و لعب۔ اور کچھ بندگی و بے چارگی کی تفصیل پوشیدہ رکھتی ہے۔ ورنہ مجھ سے اگر پوچھئے تو انسان کی یہ ہوشمندئِ حس، اک حیات ہے غیر فانی اور اس کی نہ طفلی ہے۔ نہ شباب اور نہ بڑھاپا۔ جب تک حسّی استدراکات زندہ ہیں۔ انسان زندہ ہے ورنہ یوں آدمی جیا کرے۔ مگر اس شے سے محروم، تو اُس کی زندگی حقیقت میں وہی زندگی ہے جہاں بچپن بھی ہے۔ جوانی بھی ہے اور ضعیفی بھی۔ جس کے ساتھ ساتھ زوال ہے اور جس کے آگے پیچھے اجل!

"پس میری جوانی اُس نوع کی جوانی نہیں جیسا تم نے فرض کیا ہے، اور اس طرح تم نے مجھ پر میری معصومیت پر اپنی جوانی سے ظلم توڑے ہیں، ہاں اُس جوانی سے جو سراسر غلاظت کا اک ڈھیر ہے!!"

"تم نے کہا ہے کہ تم فارغ ہو!؟

"ہاں تمہاری دُنیا میں اگر متفکر و متلاشی، فارغ کہلائے جاتے ہیں تو مجھے بھی تم فارغ کہہ لو ورنہ میں تو محمود! اس درجہ مصروف ہوں جس کے مقابلہ میں تمہاری مصروفتیں میری فراغت کا اک داغ ہیں!

تم یہی فرماتے ہو کہ شادی کر لو، اس سے جانبین کی مسرتوں میں اضافہ ہوتا ہے "شادی شرکت ہے عیش کی"۔ شاید محمود! تم نے اپنی عمر کے کسی حصے میں بھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ شادی کیوں کرتے ہیں؟ شادی کی کیوں ضرورت ہے؟ ورنہ تمہاری زبان سے کبھی تحریص و تشویق کے لئے

ایسے جُملے نہ نکلتے۔ دیکھو آسکر وائلڈ، کہتا ہے "مرد اس لئے شادی کرتے ہیں کہ وہ تنگ آجاتے ہیں۔ عورتیں اس لئے شادی کرتی ہیں کہ وہ نئی زندگی کا اشتیاق رکھتی ہیں۔" پس تو بحمداللہ اُس صحتِ اخلاط کے ہنگامی نتائج و اثر سے، جس کو تم جوانی کہتے ہو، میں اُس کی ولولہ خیز تحریکات سے ابھی مغلوب و متاثر نہیں ہُوا ہوں۔ میں آپ لوگوں کی سی جوانی کا مالک نہیں، اور نہ اس جوانی کے التہاب و اضطراب سے میں تنگ آ گیا۔ نہ ابھی میری مصروفیتوں سے مجھے رستگاری نصیب پھر مجھے شرکتِ عیش کی کیا حاجت، میرے مطمئن و سادہ سکونِ خلوت کو ہنگامہ آرائیوں کی کیا جستجو؟"

"مجھے تو اک مرتبہ جب اک فردِ صنفِ نازک نے دعوتِ ازدواج دی تھی تو میں نے یہ کہا تھا کہ جو لوگ اسیرِ ازدواج ہیں انہوں نے اپنی نادانی سے آپکی نئی زندگی کی آرزوئے خام کی قربانگاہ پر اپنے آپ کو بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ میں اس طلسمی کھیل کے کھیلنے سے معذور ہوں ——

"اس کے بعد تمہارا یہ ارشاد کہ "شادی تدریجی ارتقا ہے تمدن و تہذیب کا" یہ بھی تم ہی کو مُبارک اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تم نے اپنے اس خیال کو سوسائٹی کی اجتماعی عزتوں کے سائے میں سرسبز ہونے کی توقع پر کہا ہے۔ ورنہ یہ خیال انسانی ظلم و استبداد کی اک قدیمی روداد ہے، جس کی تم نے نہایت خوبصورت و خوشنما لفظوں میں نمائش کی ہے، شادی، اِنسانی غلامی کے احیاء کی تاریخ ہے، کہ کس کس انداز و طریق سے کن کن حیلوں اور فریبوں سے عورت کو اسیر و پابند کیا ہے، وہ جب آزاد تھی تب بھی مرد کی حرص و آز کا شکار رہی۔ وہ جب سے تمہاری اسیر و پابند ہُوئی، تمہاری خوئے ہوس رانی کا لقمہ ہے، میں تم سے پوچھتا ہوں تمدن کے نظام نے عورت کو چند قواعدِ رسمیہ کے ماتحت تمہارا بنا دیا مگر عملی صورت سے کیا تم خود بھی اُسی شدتِ قید کے ساتھ اُس کے ہو جاتے ہو، اور ایماناً اگر ایسا نہیں ہے تو بتاؤ تم کو کیا حق حاصل ہے کہ تم دوسروں کو غلام بنائے رکھنے کی آرزو کرو۔ ہاں شادی اس معنیٰ کر ضرور ارتقاء ہے تمدن و تہذیب کا کہ اس سے افزائشِ نسلِ انسانی متعلق ہے۔ فنِ انساب وضع ہُوا، اسماء الرجال مُدون ہُوا۔ یا جب انسانوں کو تن ڈھانکنے کی ضرورت ہُوئی۔ اور پیر پھیلا کر سائے میں رات کاٹنے کی فکر ہُوئی۔ تو صنعتِ پارچہ بافی کو فروغ ہُوا، اور فنِ تعمیر کی ایجاد ہُوئی۔ ضرورتیں بڑھنے لگیں۔ مکر و فریب کی ترقی ہُوئی۔ دنیا نے اپنی معصومیت کا نوحہ پڑھا۔ سادگی کا ماتم برپا ہُوا، اُس کی جگہ معصیت کی مجلسیں قائم

ہوئیں اور تصنع اور بناوٹ نے دنیا میں چہل پہل کر دی۔

محمود! عورت شادی کے لئے نہیں، شاعری کے لئے ہے۔ دیکھو آسکر وائلڈ کیا خوب کہتا ہے "اُس سے محبت کرنا نہایت ہی شاعرانہ تخیل ہے مگر تحریک مناکحت میں مطلق شعریت نہیں!" لاریب کہ جس دلچسپی و تخیل میں شگفتگی۔ بلندی۔ اور شعریت نہیں ہے، میں نہیں جانتا دنیا میں اُس کی وقعت کیسے قایم ہوسکتی ہے؟ ہاں تم نے یہ بھی کہا ہے کہ شادی تصفیہ اخلاق کا بھی ذریعہ ہے تمہارے اس خیال سے شاید تمہاری دنیا کے علمائے نفسیات متفق ہو سکتے ہونگے۔ میرے احساسِ محض کی دنیا آپ کے ساتھ اس باب میں اتفاق کرلینے سے عاجز و معذور ہے۔

تمہارے نزدیک شاید اخلاق کا تصفیہ کسی شب عیش میں ہنگامی دولوں سے اپنے جوش کے بار کو سبکدوش عصمت ہو جانے سے عبارت ہے تب تو آپ نے سچ کہا ہے ورنہ میرا خیال تو یہ ہے اپنا ماحول تک اس خیال سے جب تک کوئی پاک نہ کریگا، اُس وقت تک اخلاق کا تصفیہ اُس سے کبھی ممکن نہیں!

حیف کہ آپ کے ہاں "شادی مردانہ زندگی کا حسن ہے"، مگر میرے ہاں عورت سے اس نسبت مہمل کا پیدا ہی کرنا ذمائم اخلاقی کا منبع ہے۔ تمہارے ہاں مردانہ عبودیت کا وقار، شادی ہے ہاں ان لوگوں کے ہاں جو اپنی زندگی وبہیمیت کے آگے غنچوں کی خلقت منفعل، صرف سجدہ ہو جانا پسند کریں ورنہ دنیا ابھی رشید سے خالی نہیں جس کے نزدیک حسنِ نسائیت کی پرستش ہی عروج حیاتِ صادقہ ہے۔ ہاں کس نوع کی پرستش، کہ خیال میں اُس کے لئے یکسوئی فراہم کرنا جس کے بعد شئے متصوّر کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہے ۔

شادی، مرد کے لئے معروفیت کی راہ ہے۔ آپ نے سچ کہا مگر محمود! معروفیت کی نوعیت مبہم ہے۔ غالباً تمہاری منشا اس سے یہ ہے کہ عورت کی کفالت خرچ کی ذمہ داریوں کے احساس میں مرد انسان سے چوپایہ تک ترقی کر سکتا ہے! اس حصے کو معروفیت کے الگ کر کے میرا خیال یہ ہے کہ محبت جیسی شئے کبھی روپیہ سے نہیں حاصل کیجا سکتی۔ میری سمجھ میں آجتک یہ نہیں آیا کہ اک مرد۔ اک عورت آپس میں محبت سے مل جُل کے رہتے ہیں مرد روپیہ کماتا ہے، اس پر خرچ کرتا ہے اور عورت اُس کے روپیہ کو لیتی ہے اور اپنے آپ پر بھی خرچ کرتی ہے اور اُس کے معاوضہ میں اپنا

ذخیرۂ حیات۔ اور اپنی محبت، مرد کو دیتی ہے؟ محمود! یہ کیا فلسفہ ہے اتحاد کا؟۔ اس لین دین میں کیا محبت کی خرید فروخت ہُوا کرتی ہے۔ جاؤ، لاحول ولا قوۃ! مجھ سے اگر ایسے بیوپار کی خواہش رکھتے ہو تو میری متانت آپ کے جواب میں یکسر اک قہقہہ ہو جائے تو مجھے معذور اور خیال فرمائیے!

عورت میرے واسطے وجۂ مصروفیت ہو سکتی ہے۔ وہ اپنی تحسینِ خلقت کے لحاظ سے رنگینی۔ سادگی۔ اور معصومیت کا مظہر ہے۔ اس لئے ساری دُنیا کے لئے وہ موجبِ دلچسپی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اُس کا جزوِ ادنیٰ مَصرف ہے شادی کا، اور اجمالِ اعلیٰ مبدا ہے پرستش کا۔ اوّل الذکر دنیا کی جوانیوں کا موضوعِ گفتگو ہے اور آخر الذکر صرف ادیبوں کا مشغلۂ شعری ــــ!"

سب سے آخر محمود تم نے غائتِ ہمدردی سے کہا ہے کہ تمہارا اضطراب اور یہ بیکار شباب، دونوں اک تسلی چاہتے ہیں اور وہ صرف عورت کی آغوشِ مودۃ میں نصیب ہو سکتی ہے۔ تمہارے علوئے خیال پر اس وقت تو مجھے بھی پیار آگیا۔ مگر چونکہ تمہارے ہاں عورت اور نسائیت میں کوئی فرق نہیں ہے اور میرے ہاں عورت اک اور چیز ہے اور نسائیت اک اور چیز اس لئے تمہاری ہر وہ بات جو چاہے کسی قدر مفید ہو مگر ذرا سے اس امتیازی خط کو محسوس نہ کرنے کے باعث ہر بلندی سے محروم رہ جاتی ہے۔ ہاں میرا التہاب یہ بیکار شباب اگر حضور کے نزدیک اک عورت کی تسلی کا جویا ہے تو پھٹکار اُس اضطراب پر لعنت اُس شباب پر۔ آپ کے خیال کی عورت آپکی دُنیا کی جوانی کے لئے موجبِ مسرت ہو تو ہو۔ نہ میں تمہاری دُنیا کا سا جوان اور نہ مجھے اُس عورت سے ربط، جو آپ کے بزمِ خیال کی زینت ہے ــــ!

اس قضیئے سے علیحدہ ہو کر ہاں مجھے اُلفت ہے اُس مظہرِ شعری سے جو پیکر ہے لطافت و نسائیت کا۔ جس کے تصور میں شعریت ہے جس کے نظارہ میں مُصوّری ہے۔ جس کی گفتگو میں موسیقی ہے۔ جس کی خاموشی عنوان ہے دیویت کا، جس کی تمکینِ وقار لرزہ ہو الوہیت کا . . . !"

خلیقی دہلوی

وزیرِ عدالت

یہ واقعہ آج سے اڑھائی ہزار سال پہلے کا ہے۔

ایک دن شام کے وقت جبکہ آسمان پر بادل لہرا رہے تھے۔ بُدھ گیا نامی گاؤں میں ایک اجنبی ششو پال براہمن کے دروازے پر آیا۔ اور لجاجت آمیز لہجہ میں بولا "کیا مجھے رات کاٹنے کے لئے پناہ کی جگہ مل سکے گی؟"

ششو پال اپنے گاؤں میں سب سے غریب تھے انتہائے افلاس نے بھوکے بیل کے مانند اُن کی ہڈیوں کے پنجر نکال رکھے تھے۔ اُن کی گذر اوقات اراضی کے ایک ٹکڑہ پر تھی۔ جس کی پیداوار اس قدر قلیل تھی۔ کہ اُن کے لئے بھی ناکافی تھی۔ مگر اس کے باوجود اجنبی کو دروازے پر دیکھ کر اُن کا چہرہ شگفتہ ہوگیا جس طرح سُورج مُکھی کا پھول طلوع آفتاب سے کھل اُٹھتا ہے۔ اُنہوں نے مُسکراتے ہُوئے کہا "یہ میری خوش نصیبی ہے۔ آیئے تشریف لایئے اتھتھی[1] کے چرنوں سے میرا چوکا[2] پوتر[3] ہو جائیگا۔"

اجنبی اور براہمن دونوں اندر گئے۔ ہندوستان میں اتھتھی ستکار[4] کا رواج عام تھا۔ ششو پال کے لڑکے نے اجنبی کی خاطر مدارات کی۔ اجنبی اس پر لٹو ہوگیا۔ اُس نے براہمن سے کہا "آپ کا لڑکا نہایت کام کا آدمی ہے۔ اُسکی خدمت سے میرا جی خوش ہوگیا"

ششو پال نے اس طرح سر اٹھایا جیسے کسی نے سانپ کو چھیڑ دیا ہو۔ اور حقارت آمیز لہجے میں جواب دیا "تم ہمارے اتھتھی ہو۔ ورنہ براہمن یہ الفاظ سُننے کی تاب نہیں رکھتے۔"

اجنبی نے اپنی غلطی پر نادم ہو کر کہا "معاف کیجئے۔ میرا یہ مطلب نہ تھا۔ مگر آج کل وہ براہمن کہاں ہیں؟ اب تو آنکھیں اُن کے لئے ترستی ہیں"

ششو پال نے جواب دیا "براہمن تو اب بھی ہیں۔ کمی صرف چھتریوں کی ہے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا"

ششو پال نے ایک طُول طویل تقریر شروع کردی جس کو سُن کر اجنبی حیران رہ گیا۔ اُن کی باتیں اس قدر مدلل اور جامع تھیں۔ کہ اجنبی پر رُعب طاری ہوگیا۔ اُسے یہ گمان تک نہ تھا۔ کہ اس چھوٹے سے گاؤں میں ایسا عالم متبحر بھی موجود ہو سکتا ہے۔ اُس نے ششو پال کی منطقیانہ دلائل اور مسائل حکومت سے واقفیت دیکھ کر کہا "مجھے خیال نہ تھا کہ گودڑ میں لعل چھپا ہُوا ہے مہاراج اشوک کو معلوم ہو جائے۔ تو آپ کو کسی عہدہ پر متمکن کر دے۔"

[1] مہمان [2] باورچی خانہ [3] پاکیزہ [4] مہمان نوازی

ششو پال کے خشک لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔
جس کا دل کڑھ رہا ہو جس کی آنکھیں اشکباری کر رہی ہوں جس کا دماغ پریشان ہو۔ اُس کے لبوں پر مسکراہٹ ایسی خوفناک معلوم ہوتی ہے۔ جیسی کورستان میں چاندنی بلکہ اُس سے بھی زیادہ۔ ششو پال کی آنکھیں نیچے جھک گئیں۔ انہوں نے تھوڑی دیر کے بعد سر اوپر اُٹھایا اور کہا "آجکل بڑی بے انصافی ہو رہی ہے۔ جب دیکھتا ہوں میرا خون اُبلنے لگتا ہے"

اجنبی نے پہلو بدل کر جواب دیا "شیر بکری ایک گھاٹ پانی پی رہے ہیں"

"رہنے دو۔ میں سب جانتا ہوں"

"نقص نکالنا آسان ہے۔ مگر کچھ کر کے دکھانا مشکل ہے"

ششو پال نے آگ پر پڑے ہوئے پتے کی طرح گرم ہو کر جواب دیا "موقعہ ملے تو دکھا دوں۔ کہ انصاف کسے کہتے ہیں؟"

"تو آپ موقعہ چاہتے ہیں؟"

"ہاں! موقعہ چاہتا ہوں"

"پھر کیا ہوگا۔ کیا کوئی بے انصافی نہ ہوگی؟"

"قطعاً نہ ہوگی"

"کوئی مجرم سزا سے محفوظ نہ رہیگا؟"

"نہیں رہے گا۔"

اجنبی نے تحمل سے کہا "یہ بہت مشکل ہے"

"براہمن کے لئے بات کوئی مشکل نہیں میں انصاف کا ڈنکا بجا کر دکھا دوں گا"

اجنبی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، آنکھوں میں چمک اُس نے ہنس کر جواب دیا "اگر میں اشوک ہوتا۔ تو آپ کا ارمان پورا کر دیتا"

براہمن کے دل میں ایک شبہ نے سر اُٹھایا۔ لیکن دوسرے لمحہ میں وہ رفع ہو گیا۔ جس طرح ہوا کے تیز جھونکے ابر کو اڑا کر لے جاتے ہیں۔

۲

دوسرے دن مہاراج اشوک کے دربار میں ششو پال کی طلبی ہوئی۔ اس خبر سے گاؤں بھر میں آگ لگ گئی۔ یہ وہ وقت تھا۔ جب مہاراج اشوک کی حکومت شروع ہوئی تھی اور سخت گیری کی پالیسی کا آغاز تھا۔ اُس وقت مہاراج ایسے ظالم اور خونخوار تھے۔ کہ براہمنوں اور عورتوں کو بھی پھانسی پر چڑھا دیا کرتے تھے۔ اُن کی نگاہ غضب سے بہادر دلاوروں کا پتہ بھی پانی پانی ہو جاتا تھا۔ لوگوں نے سمجھ لیا کہ ششو پال کے لئے یہ طلبی کا حکم پیام مرگ ہے اُن کو پورا پورا یقین تھا کہ اب ششو پال زندہ نہ لوٹیں گے۔ ششو پال کی بیوی اور لڑکے پر کوہ الم ٹوٹ پڑا۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے لیکن ششو پال کے چہرے پر شکن نہ پڑی۔ وہ کہتے تھے جب میں نے کوئی قصور نہیں کیا۔ حکومت کے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی۔ تو مجھے کوئی پھانسی کیوں دینے لگا؟ بلاشبہ حکومت ایسی بے انصاف اور اندھی نہیں ہو سکتی۔ کہ بے قصور براہمنوں کو اذیت دینے لگے۔
رنج والم کی لہروں کے درمیان میں وہ اس طرح خاموش

کھڑے تھے۔ جیسے سمندر میں چٹان۔

شام ہوگئی تھی۔ ششو پال پاٹلی پتر پہنچے اور شاہی محل میں لے جائے گئے۔ اس وقت تک اُن کو کسی بات کا اندیشہ نہ تھا۔ لیکن شاہی محل کی شان و شکوہ نے اُن پر ہیبت طاری کردی جس طرح انسان کم پانی میں مطمئن رہتا ہے۔ لیکن ذرا آگے بڑھ کر گھبرا جاتا ہے۔ اُن کے دل میں قسم قسم کے خیالات آنے لگے۔ کبھی سوچتے۔ کسی نے کوئی شکایت نہ کردی ہو۔ آزادی سے جو جی میں آتا ہے۔ کہدیا کرتا ہوں کہیں اس کا خمیازہ نہ اُٹھانا پڑے۔ کئی دُشمن ہیں۔ کبھی سوچتے وہ اجنبی پتہ نہیں کون تھا؟ ہو سکتا ہے۔ کوئی جاسوس ہی ہو اور یہ آگ اُسی کی لگائی ہوئی ہو۔ تب تو اُس نے سب کچھ کہدیا ہوگا۔ کیسی حماقت کی۔ جو ایک ناواقف سے گھل مل کر باتیں کرتا رہا۔ اب پچھتا رہا ہوں۔ کاش اُس وقت زبان پر قابو رکھتا۔ کبھی خیال آتا۔ شاید میرے افلاس کی کہانی یہاں تک پہنچ گئی ہو۔ اور مہاراج نے مجھے کچھ دینے کو بلا بھیجا ہو۔ یہ بھی تو ممکن ہے۔ اِس خیال سے دل کا کنول شگفتہ ہو جاتا۔ مگر پھر دُوسرے خیال سے مُرجھا جاتا۔ اتنے میں نوکر نے کہا "مہاراج آرہے ہیں"۔ ششو پال کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ اُن کو ایسا معلوم ہُوا گویا جان لبوں تک آگئی ہو۔ حکومت کا کیسا رُعب ہوتا ہے؟ اس کا پہلی بار تجربہ ہُوا۔ نگاہ دروازے کی طرف جم گئی۔ مہاراج اشوک شاہانہ انداز سے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور مسکراتے ہُوئے بولے "برہمن دیوتا! غالباً آپ نے مجھے پہچان لیا ہوگا"۔

ششو پال گھبرا کر کھڑے ہوگئے۔ اس وقت اُن کے جسم کا ایک ایک بال کانپ رہا تھا۔ وُہی چہرہ تھا۔ وہی آواز۔ ششو پال نے مہاراج کو چُبھتی ہُوئی نگاہوں سے دیکھا۔ شُبہ یقین ہوگیا۔ یہ وُہی تھے۔

۳

ہاں یہ وُہی تھے۔ ششو پال سناٹے میں آگئے کیا سردی کی رات کو ایک برہمن کے ہاں پناہ لینے والا اجنبی ہند کا باوقار تاجدار ہو سکتا ہے۔ ششو پال نے فوراً اپنے جسم پر قابو حاصل کرلیا۔ اور کہا "مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ ہی مہاراج ہیں۔ ورنہ اس قدر آزادی سے گفتگو نہ کرتا"۔

مہاراج اشوک بولے "ہوں"

"لیکن میری بات میں رتی بھر مبالغہ نہ تھا"۔

"ہو سکتا ہے"

"میں ثبوت دے سکتا ہوں"

مہاراج نے کہا "میں نہیں چاہتا"۔

"تو مجھے کیا حکم ہوتا ہے"؟

"میں آپ کی آزمائش کرنی چاہتا ہوں"۔

ششو پال کے دل میں ایک خیال نے چٹکی لی کیا وہ سچ ثابت ہوگا۔ مہاراج نے کہا "آپ نے کہا تھا کہ اگر مجھے موقعہ میسر ہو تو میں انصاف کا ڈنکا بجا دوں گا۔ میں آپ کی اس باب میں آزمائش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ تیار رہیں"۔

ششو پال نے مانسرور کے راج ہنسوں کے

مانند اپنی گردن بلند کی اور جواب دیا" ہاں۔ اگر مہاراج کی یہی خواہش ہے تو میں انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔"

"کل صبح تم وزیرِ عدالت مقرر کئے جاتے ہو۔ سارے شہر پر تمہارا اختیار ہو گا"

"مہربانی"

"ہر ایک پاٹلی پتر کا حاکم پولیس تمہارے ماتحت ہو گا۔ اور تم اُسکے ذمے دار سمجھے جاؤ گے۔"

"بہت اچھا۔"

"اگر کوئی واردات ہو گئی۔ یا کہیں قتل ہو گیا۔ یا ڈاکہ پڑ گیا۔ تو اِسکے جواب دہ تم ہو گے۔ بولو منظور ہے؟"

ششوپال نے خودداری کے انداز سے سر جھکا کر جواب دیا۔ ہاں منظور ہے"

مہاراج نے تھوڑی دیر تک سکوت کیا۔ اور پھر ہاتھ سے انگوٹھی اُتار کر بولے" یہ شاہی انگوٹھی ہے۔ تم کل صبح کی پہلی شعاع کے ساتھ وزیرِ عدالت سمجھے جاؤ گے میں دیکھوں گا۔ تم اپنے آپ کو کس طرح کامیاب ثابت کر سکتے ہو"

۴

ایک ماہ گذر گیا۔ وزیرِ عدالت کے انصاف و انتظام کی چاروں طرف دُھوم مچ گئی معلوم ہوتا تھا کہ ششوپال نے شہر پر جادو ڈال دیا ہے۔ اور چور ڈاکوؤں کو اس طرح قابو میں کر لیا ہے۔ جس طرح سانپ کو بین سے سپیرا قابو میں کر لیتا ہے

اُن ایام میں لوگ دروازے کھلے چھوڑ جاتے تھے۔ لیکن کسی کا نقصان نہ ہوتا تھا۔ ششوپال کا انصاف اندھا اور بہرا تھا۔ جو نہ شکل دیکھتا تھا۔ نہ سفارش سُنتا تھا وہ محض سزا دینا جانتا تھا اور سزا بھی عبرت انگیز۔ شہر کی حالت میں زمین آسمان کا فرق پڑ گیا۔

رات کا وقت تھا۔ آسمان پر تارے کھیلتے تھے۔

ایک امیر نے ایک عالی شان مکان پر دستک دی۔ دریچہ سے کسی عورت نے سر نکال کر پوچھا" کون ہے"

"میں ہوں۔ دروازہ کھول دو"

"مگر وہ یہاں نہیں ہے"

"پروا نہیں۔ تم دروازہ کھول دو"

عورت نے نڈر ہو کر جواب دیا" میں نہیں کھولونگی۔ تم اس وقت جاؤ"، امیر نے تلخی سے کہا" دروازہ کھولدو۔ ورنہ مَیں توڑ دوں گا"

عورت بولی" جانتے نہیں شہر میں ششوپال کی حکومت ہے۔ اب کوئی اس طرح کی سینہ زوری نہیں کر سکتا"

امیر نے تلوار نکال کر دروازے پر حملہ کیا۔ معاً ایک پہرے دار نے آکر اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور کہا "کیا کر رہے ہو" امیر نے اُس کی طرف اس طرح دیکھا جس طرح بھیڑیا بھیڑ کو دیکھتا ہے۔ اور تندی سے بولا۔ "تم کون ہو؟"

"میں پہرے دار ہوں"

"تم کو کس نے مقرر کیا ہے؟"

"وزیرِ عدالت نے"

"غلطی زکر وبس اُسے بھی خاک میں ملا سکتا ہوں۔

بہتر یہی ہے کہ تم ٹل جاؤ"۔

پہرے دار نے استقلال بھرے لہجہ میں جواب دیا۔

"لیکن اس وقت مہاراج اشوک بھی آجائیں تب بھی نہ ٹلونگا"

"کیوں موت کو بلا رہے ہو"

"مہاراج میں نے جو عہد کیا ہے اُسے پورا کرونگا"

"کس سے عہد کیا ہے؟"

"وزیرِ عدالت سے"

"کیا؟"

"یہی کہ جب تک زندہ ہوں اور جب تک خون کا آخری قطرہ میرے جسم میں باقی ہے۔ تب تک ادائگیِ فرض میں کوتاہی نہ ہونے دونگا"

امیر نے تلوار نکال لی۔ پہرے دار نے پیچھے ہٹ کر کہا" آپ غلطی کر رہے ہیں میں نوکری پر ہوں"

مگر امیر نے سُنا ان سُنا ایک کر دیا۔ اور تلوا لے کر جھپٹا۔ پہرے دار نے بھی تلوار سونت لی۔ مگر وہ ابھی نیا تھا پہلے وار میں ہی گر گیا۔ اور جان بحق ہُوا۔ امیر کا خون خشک ہوگیا۔ اُس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اُس کی خواہش نہ تھی کہ پہرے دار کو مار دیا جائے۔ وہ محض اُسے ڈرانا چاہتا تھا۔ لیکن زخم کاری لگا۔ امیر نے اُس کی لاش کو ایک طرف کر دیا۔ اور آپ بھاگ نکلا۔

۵

صبح کو اس واقع کا گھر گھر چرچا تھا۔ لوگ حیران تھے کہ ایسی جرأت کیسے ہوگئی۔ کہ پولیس کے آدمی کو قتل کر دے۔ اور پھر ششو پال کے عہدِ حکومت میں۔ دارالسلطنت میں سراسیمگی طاری تھی۔ پولیس کے آدمی چاروں طرف دوڑتے پھرتے تھے۔ گویا یہ اُن کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔

وزیرِ عدالت نے تفتیش میں دن اور رات ایک کر دیا۔ یہ واردات اُن کے عہدِ وزارت کا پہلا واقعہ تھا۔ اُن کو کھانا پینا فراموش ہوگیا۔ آنکھوں سے نیند اُڑ گئی۔ دل سے چین۔ قاتل کا سُراغ لگانے کے لئے اُنہوں نے اپنی انتہائی کوششیں صرف کر دیں۔ لیکن اُن کی تمام محنت تمام جُستجو۔ سعیِ بے سُود ثابت ہُوئی۔ جیسے کوئی پانی بلوتا رہا ہو۔

ناکامی کا ہر ایک دِن اشوک کے غُصّے کو زیادہ مشتعل کر رہا تھا۔ وہ کہتے تم نے کِس طمطراق سے اِنصاف کا دعوےٰ کیا تھا۔ بولو اب کیا ہوگیا۔ وزیرِ عدالت سرِ ندامت جُھکا لیتے۔ مہاراج کہتے قاتل کب تک گرفتار ہوگا۔ وزیرِ عدالت جواب دیتے۔ کوشش کر رہا ہوں۔ عنقریب پکڑ لوں گا۔ مہاراج ہر روز پوچھتے قاتل گرفتار ہُوا۔ وزیرِ عدالت کہتے نہیں۔ مہاراج کا غصہ بھڑک اُٹھتا۔ اُن کی آنکھوں سے آگ کی چنگاریاں نکلنے لگتیں وہ بادل کی مانند گرج کر کہتے" میں یہ متواتر نہیں نہیں سُن کر تنگ آگیا ہوں"

اِسی طرح ایک ہفتہ گذر گیا مگر قاتل کا سراغ نہ مِلا۔ مہاراج اشوک نے ششو پال کو بُلا کر کہا" تمہیں تین دن کی مُہلت دی جاتی ہے۔ اگر اس عرصہ میں بھی قاتل

گرفتار نہ ہُوا تو تمہیں پھانسی دیدی جائیگی۔"

اس خبر سے شہر میں ہلچل سی مچ گئی ایک ماہ کے قلیل عرصہ ہی میں ششو پال عوام میں ہر دلعزیز ہو چکے تھے۔ اُن کے اِنصاف کی چاروں طرف دھاک بندھ گئی تھی۔ لوگ مہاراج کو گالیاں دینے لگے۔ جہاں چار آدمی اکٹھے ہوتے اِس موضوع پر گفتگو شروع ہوجاتی۔ وہ چاہتے تھے کہ خواہ کچھ بھی ہوجائے۔ مگر ششو پال کا بال تک ٹیڑھا نہ ہو ششو پال خود سرگرمی سے تحقیقات میں مصروف تھے۔ اور اتنا ہی نہیں پولیس کا تمام عملہ دل و جان سے کوشش کر رہا تھا۔ مگر بے کار۔ یہاں تک کہ تیسرا دن آگیا۔ اب صرف چند گھنٹے باقی تھے۔ رات کا وقت تھا۔ ششو پال کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ وہ شہر کے اُس گنجان آباد حصّہ میں گھوم رہے تھے۔ جہاں یہ واردات ہُوئی تھی۔ یکایک ایک مکان کے دریچہ سے ایک عورت نے جھانک کر باہر دیکھا۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہُوا تھا۔ عورت نے آہستہ سے کہا "تم کون ہو؟ پہرے دار" تاریکی یاس میں شعاع امید دکھائی دی۔ ششو پال نے جواب دیا "نہیں میں وزیر عدالت ہوں"

"ذرا یہیں ٹھیرو۔"

عورت کھڑکی سے غائب ہوگئی۔ اور روشنی لے کر دروازے پر نمودار ہُوئی۔ وزیرِ عدالت کو ساتھ لے کر وہ اپنے کمرے میں گئی۔ اور اُن کو ایک چوکی پر بٹھا کر بولی "آج آخری رات ہے۔" وزیرِ عدالت نے پُر معنی نگاہوں سے عورت کی طرف دیکھا۔ اور جواب دیا "ہاں آخری۔" آواز میں یاس تھی، الفاظ میں حسرت۔ عورت تلملا کر کھڑی ہوگئی۔ اور بولی "میں اس واردات سے واقف ہوں۔"

ششو پال کے مُردہ قالب میں جانِ زار آگئی۔ اطمینان کی سانس لے کر بولے "کہو۔"

"رات کا وقت تھا۔ قاتل نے اس مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ یہاں اکثر آتا رہتا ہے۔"

"مگر کیوں۔"

"اُس کا چال چلن درست نہیں"

"پھر۔ آگے"

"میں نے جواب دیا۔ جس کے پاس تُم آئے ہو۔ وہ یہاں نہیں ہے۔ مگر اُس نے اسے غلط سمجھا۔ اور دروازہ توڑنے پر مُصر ہُوا۔ پہرے دار نے اُسے روکا اور اُسی کے ہاتھ سے مارا گیا۔"

وزیرِ عدالت نے پوچھا "مگر قاتل کون ہے؟"

عورت نے اُن کے کان میں کچھ کہا۔ اور سہمی ہُوئی کبوتری کی مانند چاروں طرف دیکھا۔ ششو پال جوش سے تن کر کھڑے ہو گئے۔

۶

صُبح ہُوئی۔ دربار میں تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی آج وزیرِ عدالت کی قسمت کا فیصلہ ہونے کو تھا۔ اشوک نے تخت پر پاؤں رکھتے ہی کہا "وزیر عدالت کو حاضر کرو" ششو پال سامنے آئے۔ اس وقت اُن کے

چہرے پر سکون تھا۔ مہاراج نے پوچھا" قاتل کا پتہ لگا"

وزیرِ عدالت نے حوصلہ مندی کے انداز سے جواب دیا" ہاں لگ گیا"

"حاضر کرو"

وزیرِ عدالت نے سر جھکا کر کچھ سوچا۔ بظاہر اُنکے دل میں اسوقت دو مخالف طاقتوں کی جنگ ہورہی تھی۔ چہرے کا رنگ اسکی شہادت تھا یکایک اُنہوں نے مضبوط قوتِ ارادی سے سر اٹھایا۔ اور اپنے ایک افسرِ اعلیٰ سے مخاطب ہو کر کہا" رن بیر"

"شری مان جی"

"گرفتار کرلو۔ میں حکم دیتا ہوں"

اشارہ مہاراج کی طرف تھا۔ دربار میں سناٹا چھا گیا۔ مہاراج کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوگیا۔ گویا تپا ہوا تانبا ہو۔ آنکھوں سے غصّے کے شرارے نکلنے لگے۔ وہ تلملا کر بولے۔

گستاخ! یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

وزیرِ عدالت نے ایسا ظاہر کیا۔ گویا یہ الفاظ سُنے ہی نہیں۔ اور اپنے الفاظ کا پھر اعادہ کیا" میں حکم دیتا ہوں۔ گرفتار کرلو"

رن بیر پتلی کی مانند آگے بڑھے۔ درباریوں کے سانس رُک گئے۔ مہاراج تخت سے نیچے اُتر آئے۔ وزیرِ عدالت نے کہا" یہ قاتل ہے۔ میری عدالت میں حاضر کرو"

نظارہ وزیرِ عدالت کی کچہری میں منتقل ہوا۔ وہاں سارا شہر جمع تھا۔ ششوپال نے حکم دیا۔ مجرم شاہی خاندان سے ہے اس لئے اکیلا حاضر کیا جائے۔

مہاراج اشوک نے اشارہ کیا۔ وزرا پیچھے ہٹ گئے اور اُس جنگلے میں کھڑے ہوگئے جو ملزموں کے لئے مخصوص تھا تاج شاہی کی اُسکی اپنی مملکت میں اُسکے اپنے نوکر کے ہاتھوں یہ توقیر(؟) ہو سکتی ہے۔ اسکی کسی کو اُمید نہ تھی لیکن ششوپال آہنی ارادے سے کُرسیِ عدالت پر متمکن تھے۔ اُنہوں نے آنکھ کے اشارے سے مہاراج کو پرنام کیا۔ ہاتھوں کو انصاف کی گرفت نے باندھ رکھا تھا۔ وہ آہستہ سے بولے" تم پر پہرے دار کے قتل کا الزام ہے۔ تم اس کا کیا جواب دیتے ہو"

مہاراج اشوک نے ہونٹ کاٹ کر جواب دیا" وہ گستاخ تھا"

"تو تم جرم کا اقبال کرتے ہو"

"ہاں میں نے اُسے قتل کیا ہے۔ گو میرا ارادہ نہ تھا"

"وہ گستاخ نہیں تھا میں اُسے ایک مدت سے جانتا ہوں"

"وہ گستاخ تھا"

"تم جھوٹ بولتے ہو میں تمہارے قتل کا حکم دیتا ہوں"

اشوک کی آنکھیں سُرخ ہوگئیں۔ وزیروں نے تلواریں نکال لیں بعض آدمی ششوپال کو گالیاں دینے لگے۔ بعض نے یہانتک کہہ دیا" وزیرِ عدالت پاگل ہوگیا ہے" ایک آواز آئی تم اپنا سر بچاؤ۔ اشوک نے ہاتھ اٹھا کر خاموشی کا اشارہ کیا۔ چاروں طرف پھر وہی سناٹا چھا گیا۔ وزیرِ عدالت نے کڑک کر کہا" آپکا غصّہ سراسر ناواجب ہے۔ میں اس وقت وزیرِ عدالت کی کرسی پر ہوں۔ اور انصاف کرنے بیٹھا ہوں۔ مہاراج اشوک کی دی ہوئی یہ انگوٹھی میرے ہاتھ میں ہے۔ اگر کسی نے شور و شر کیا۔ تو میں اُس کو چُن چُن کر تحقیرِ عدالت کے جرم میں سزا دونگا"

اسکے بعد اُنہوں نے پھر اشوک سے خطاب کیا" اشوک!

تم نے رعایا کے ایک فرد کو قتل کیا ہے۔ میں تمہارے قتل کا حکم دیتا ہوں۔" مہاراج نے سر جھکا دیا۔ اس وقت اُنکے دل میں روحانی سرور کا سمندر لہریں مار رہا تھا۔ یہ شخص سونا ہے جو آگ میں پڑ کر کُندن ہوگیا ہے۔ کہتا تھا میرا انصاف اپنی دھوم مچا دیگا۔ وہ قول جھوٹا نہ تھا۔ اُس نے اپنے الفاظ کی لاج رکھ لی ہے۔ ایسے ہی شخص ہوتے ہیں۔ جن پر قومیں فخر و ناز کرتی ہیں اور اپنے دل و جگر قربان کرنے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ اُنہوں نے ایک عجیب انداز سے سر بلند کیا۔ اور بے پروائی سے کہا "میں اس حکم کے خلاف کچھ نہیں بول سکتا۔"

وزیر عدالت نے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ سونے کا ایک بُت لے کر حاضر ہُوا۔ وزیر عدالت نے کھڑے ہو کر کہا "صاحبان! یہ دُرست ہے کہ مَیں وزیر عدالت ہوں۔ یہ بھی درست ہے کہ میرا کام انصاف کرنا ہے یہ بھی دُرست ہے کہ رعایا کے ایک آدمی کا قتل کیا گیا ہے۔ اُس کی سزا لازمی ہے۔ لیکن شاستروں میں راجہ کی ذات مقدس تسلیم کی گئی ہے۔ اُسے ایشور ہی سزا دے سکتا ہے۔ یہ کام وزیر عدالت کے احاطۂ طاقت سے باہر ہے۔ اس لئے میں حکم دیتا ہُوں۔ کہ مہاراج کو تنبیہ کرنے کے بعد رہا کر دیا جائے۔ اور اُن کے اِس بُت کو پھانسی پر لٹکا یا جائے۔ تا کہ لوگوں کو عبرت ہو۔"

وزیر عدالت کی جے کے نعرے بلند ہُوئے۔ لوگ اس انصاف پر فریفتہ ہو گئے۔ وہ کہتے تھے یہ آدمی نہیں دیوتا ہے۔ جو نہ شخصیت سے خائف ہوتا ہے۔ نہ طاقت کے آگے گردن خم کرتا ہے ضمیر کی آواز سُنتا ہے اور اُس پر بلا دھڑک بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اَور کوئی ہوتا تو مہاراج کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا۔ لیکن اس نے اُنہیں "تُم" کہہ کر مخاطب کیا ہے گویا کوئی معمولی مجرم ہو۔ اُن کو ذہنی کیف کا احساس ہُوا۔ ہزاروں آنکھوں نے خوشی کے آنسو بہائے۔ ہزاروں زبانوں نے پُرشور نعرے لگا کر کہا "وزیر عدالت کی جے۔"

رات ہو گئی تھی۔ وزیر عدالت شاہی محل میں پہنچے اور اشوک کے سامنے انگوٹھی اور مُہر رکھ کر بولے۔ "مہاراج! یہ اشیاء آپ سنبھالیں میں اپنے گاؤں میں واپس جاؤں گا۔"

اشوک نے احترام کی نگاہوں سے اُسے دیکھ کر کہا "آج آپ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں اب یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"مگر شریمان . . . . . ."

اشوک نے بات کاٹ کر کہا "آپ کی جرأت تاریخ ہند میں یادگار رہیگی۔ یہ بار آپ ہی اُٹھا سکتے ہیں۔ مجھے دوسرا کوئی اس عہدے کے قابل نظر نہیں آتا۔"

وزیر عدالت لاجواب ہو گئے۔

سُدرشن

خیالات

تیرے لئے وہی اچھا ہے جو تیرا خدا تجھے دے!

اُس کی بخششوں کا انحصار کچھ احسان پر نہیں بلکہ محبت پر ہے! ماں اپنے ننھّے کو وہی چیز دیتی ہے جو اُس کی سچّی خوشیوں کی کفیل ہو۔ وہ اپنی خوشی کو اپنے ننھے کی راحت کے ساتھ وابستہ کر دیتی ہے اور اُسی کی معصوم اُلفت کو اپنی بے لاگ محبت کی تنہا جزائے خیر سمجھتی ہے!

تیرے خدا نے جس روز تجھے پیدا کیا اُس کا مقصد تیری گردن کو بارِ احسان سے جھکانا نہ تھا بلکہ یہ کہ تو اُس کی دُنیا میں ایک بیکس بچے سے جو انسانوں کی بستی میں اَوروں کے لئے ایک ربانی پیغام لے کر آتا ہے ایک توانا جوان بن جائے جو اُس کی ہمہ گیر قوت کو عالمِ ہستی کی ہر شئے میں آشکار دیکھے اور اُس سے پیار کرے!

جو تیرا خدا تجھے دیتا ہے وہی تیرے لئے اچھا ہے! تو اُس کے پُرخلوص ہاتھوں سے ہر اُس چیز کو جو وہ تجھے دے شکریہ کے ساتھ لے لے اِس لئے نہیں کہ تیرا اظہارِ امتنان تیرے آقا کے لطف و کرم کو مطمئن کر دیگا یا تیری احسانمندی اُسکی قابلیتِ عمل کو کسی صورت میں تقویت دے سکتی ہے۔ اُسکی قوتِ عمل اعترافِ کار کی حاجت مند نہیں، اُس کا قدوم خیر مقدم کی آرزو نہیں رکھتا، وہ متمنی نہیں کہ اُسکی مخلوق اُس کے سامنے سرِ نیاز خم کئے رہے! وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ تیری ترستی آنکھیں اُس کے جلوے سے سیراب ہوں اور تیرا دل اُس کی رحمتوں سے تسکین پا کر دنیا کے رنج و راحت سے روز و شب مضطرب نہ رہے! اور یہ اِس لئے کہ اُس کی بخششوں کا انحصار کچھ احسان پر نہیں بلکہ بے لاگ محبت پر ہے!

تیرا خدا جب تجھے تکلیف دیتا ہے تو اِس لئے نہیں دیتا کہ اُسے اِس بات میں راحت حاصل ہوتی ہے یا اس لئے کہ اس کی خوشیوں کا ذخیرہ کچھ کم ہو جاتا ہے! — اُس نے تو طرب و انبساط کی لہریں

کو کائنات کے رگ و پے میں دوڑا دیا ہے۔ اور جب کوئی وجود متفکر نظر آتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ تیرا آقا رنج و آلام کو عمداً اُس پر نازل کرتا ہے بلکہ خود اُس وجود کے ناکردنی اعمال ہی افکارِ ہستی سے ہمکنار ہو جاتے ہیں! دُنیا کی ہر شئے وہ اچھی ہو یا بُری اُس کا سرچشمہ وہی ربِّ ذوالجلال ہے اور مصائبِ دہر بھی اُسی قسّامِ ازل کے تابعِ فرمان ہو کر تجھ تک پہنچتے ہیں لیکن اُسی وقت جب تیرے اپنے عمل ان آہنی آلات کو مقناطیسی قوت سے اپنی طرف کھینچ لیں! اور یاد رکھ کہ ان کے اِتّصال سے جو تصادم تیرے نفس کو پہنچتا ہے۔ وہ تیری رُوح کے لئے محرّکِ خیر ہے!۔ وہ تیری قوتِ اِرادی ہی تھی جو تجھے جادۂ عصیاں پر لے گئی لیکن اس کے باعث جو زحمت و ندامت تجھے اُٹھانی پڑی وہ تیرے لئے تیرے خالق کی طرف سے اک سودمند ہدیہ ہے! تُو باہیں پھیلا کر اُس کی سمت دوڑ اور اپنے بیقرار ہاتھوں سے اِس بیش بہا تحفے کو لے لے!

تیرا خدا تمام حاجات سے بالاتر اور کُل اغراض سے پاک ہے! اُس کی نیکیاں لاانتہا ہیں اور اُس کے انعامات کا خزانہ کبھی ختم نہیں ہوتا!۔ زندگی عالمِ بالا کا عطیہ اور خواہش دنیائے اسفل کا تحفہ! خواہش تیری زندگی کو اس دُنیا میں لائی تھی اور خواہش ہی کارزارِ دُنیا میں تجھے کشاں کشاں لئے پھرتی ہے لیکن تیرا مُدعائے حیات سرابِ خواہشات کے عقب میں آوارہ و سرگرداں رہنا نہیں بلکہ مٹّی میں مٹّی ہو کر اُسی وجودِ لازوال میں جذب ہو جانا ہے جس سے تو رُونما ہُوا! —— تو تیرے لئے وہ اچھّا نہیں جس کی تو خواہش کرے تیرے لئے اچھّا وہی ہے جو تیرا خدا تجھے دے!! تو خام تمنّاؤں کے پیچھے پڑ کر رنج و راحت کی کشمکش میں اپنے نازک وجود کو پُرزہ پُرزہ نہ ہو جانے دے، تو اپنے ذکی الحس دل کو مظالمِ جذبات کی برق پاشیوں سے پارہ پارہ ہونے سے بچالے اور اُسے اُس خاموش وادی میں لے چل جہاں کی لطیف ہوائے سرورِ حیاتِ جاوید کا سامانِ بقا بہم پہنچاتی ہے اور نفسِ انسان کو دُنیا کی پست ہوسوں سے بے نیاز کر دیتی ہے؟

بشیر احمد

محفلِ ادب

شعر و شاعری اور سائینس۔ لٹریچر کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ ایک شعر و شاعری دوسرے سائینس شعر و شاعری میں تخیل کی حکومت ہے۔ دُنیائے سائنس میں دلیل کا سکہ چلتا ہے۔ ناول اور ناٹک شاعری کی قلمرو میں پھلتے پھولتے ہیں۔ تاریخ اور سوانح عمری سائینس کے ذیل میں شامل ہیں۔ شاعری کا میدان اندرونی خیالات ہیں۔ سائینس کی بنیاد بیرونی صداقتوں پر رکھی جاتی ہے۔ درخت سے پھل ٹوٹ کر زمین پر گرتا ہے۔ سائینس دان اسے صاف طور پر دیکھتا ہے اور نتیجہ کتاب میں نوٹ کرتا ہے۔ مگر انسان کیسے عروج حاصل کرتا ہے۔ اور کن غلطیوں کے باعث اس کا عروج تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اسے دیکھنا سمجھنا اور پھر دوسروں پر واضح کرنا تخیل کا کام ہے۔ سائنس دان کا نظریہ دُنیا فوراً تسلیم کر لیتی ہے۔ لیکن جب کوئی باکمال شاعر جذبات اندرونی کا کوئی راز حاصل کر لیتا ہے اور اُسے دُنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ تو لوگ اُسکی صداقت میں شبہ کرنے لگتے ہیں ــــ حالانکہ تخیل کا سنگِ بنیاد ہمیشہ صداقت ہوتا ہے۔

سرسوتی الہ آباد (ہندی)

بجھا ہوا چراغ۔ آہ! میرا چراغ بجھ گیا۔ اب میں

کیا کروں؟

دُنیا بھر میں روشنی ہو رہی ہے۔ لیکن مجھ بدنصیب کے آنگن میں گہری تاریکی چھائی ہے۔ میں اپنے دل کو کس طرح تسلی دوں؟

میری سکھیاں اپنے کمروں میں آرام کی نیند سو رہی ہیں اور اُن کے سرہانے کافوری شمعیں روشن ہیں۔ کیا اُن کو یہ خیال نہیں رہا۔ کہ میں تاریکی میں بجھا ہُوا چراغ ہاتھ میں لیکر بھٹک رہی ہوں۔ اور اُن کے دروازوں پر جاتے ہُوئے ڈرتی ہوں کہ وہ مجھ پر خفا نہ ہو جائیں۔

میرا راستہ تاریک ہے، اور اُس پر کسی مسافر کے قدموں کی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ کون ہے؟ جو میرے بجھے ہُوئے چراغ کو جلانے کی پروا کرے۔

پربھا کانپور (ہندی)

نوزائیدہ بچہ۔ معصوم نوزائیدہ بچہ چارپائی پر پڑا سو رہا ہے۔ اور اُس کی ماں کی لاش گھاٹ کے کنارے آگ کے شعلوں کی نذر ہو رہی ہے۔

وہ کس قدر بے بس ہے۔ زندگی کا طوفان اُسے مٹانے کے لئے بادل کے مانند گرجتا ہُوا قریب تر آ رہا ہے یکایک بچہ کی آنکھیں کھُل جاتی ہیں۔ اور وہ بھوک سے

بیتاب ہوکر چیخنے چلانے، اور شور مچانے میں مصروف ہوجاتا ہے۔ پاس کھڑی ہوئی عورتوں کے دل پگھل جاتے ہیں اور وہ مضطربانہ انداز سے بچے کو گلے سے چمٹاکر اشکباری کرنے لگتی ہیں اُس وقت اُن پر اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ کہ بےبس بچہ نہیں جو انہیں ہونٹ بسورنے سے قابو میں کرسکتا ہے بلکہ وہ خود ہیں۔ جو دل میں محسوس تو کرتی ہیں لیکن بچے کے لئے کچھ نہیں کرسکتیں ــــــــــ

بھارت ورش (بنگالی)

عالم بےبسی۔ ایک عورت تھی، جو نہایت حسین تھی اُس کی آنکھیں سوتے وقت بھی مسکراتی رہتی تھیں۔

وہ جس محفل میں جاتی تھی، اپنے حسن کے جادو سے اُسے زیروزبر کردیتی تھی۔ جس آدمی کو چاہتی تھی تسکینِ قلب سے محروم کردیتی تھی۔

ایک دن مکڑی کا جالا ٹوٹ گیا۔ اُس نے اپنی بہترین کوششیں صرف کردیں لیکن جالے کے تار نہ جڑسکے۔

اس کے بعد اُس کا آئینہ ٹوٹا۔ اور اُس کا روپہلی سایہ فضا میں گم ہوگیا۔ اُس نے اُس کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اُٹھائے لیکن ہر دفعہ ناکام رہی۔

اُس کے قریب کوئی متنفس نہ تھا۔ لیکن اپنی بےبسی پر اُسے اس قدر رنج ہوا۔ کہ اُس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اُس نے اس رنج کو ایک پرلطف نغمہ میں غرق کرنا چاہا لیکن اُس کی اُنگلیوں اور آواز دونوں نے جواب دیا۔

مغرور حسینہ بےبس ہوکر صوفہ پر گرگئی۔ اور گرم گرم آنسو اُس کے رُخساروں پر بہنے لگے۔

پوئٹری (شکاگو)

دُنیا کی اہم ترین ضرورت۔ ہم نے اہلِ دماغ اصحاب سے سوال کیا تھا۔ کہ اُن کے خیال میں اس وقت دُنیا کو سب سے زیادہ کس شے کی ضرورت ہے اس کے جواب میں جو خطوط موصول ہوئے ہیں۔ اُن میں سے بعض یہ ہیں:۔

۱۔ دُنیا کو اسوقت جس شئے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ جوش و سرگرمی ہے اگر اسکی طرف توجہ نہ دی گئی۔ تو دُنیا بہت جلد تباہ ہوجائیگی۔

۲۔ دُنیا کو اسوقت جس شئے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ایک ایسا ہوائی جہاز ہے جو نہایت آہستہ آہستہ زمین پر اُترسکے اور جسکے ٹوٹنے کا اندیشہ نہ ہو

۳۔ دُنیا کو اسوقت روحانی ارتقا کی ضرورت ہے اور اس میں دُنیا کا آئندہ امن مضمر ہے

۴۔ دُنیا کی سب سے بڑی ضرورت امن ہے۔

۵۔ دُنیا کو امن و آزادی اور پریشانی سے نجات کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

۶۔ میرے خیال میں اسوقت دُنیا کی اہم ترین ضرورت یہ ہے۔ کہ اسکی بڑھتی ہوئی آبادی کو جنگ، قحط سالیوں اور وبائی امراض سے کم کردیا جائے۔

۷۔ ایندھن دن بدن کم ہورہا ہے اور دُنیا پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ اس کا نعم البدل پیدا کرو۔

۸۔ لوگ تقدیر کے خلاف بغاوت کررہے ہیں انکو اس امر کا یقین ہونا چاہیئے کہ ہمارے لئے کونسا پروگرام مرتب کیا گیا ہے۔

۹۔ دنیا کو اس وقت صرف ایمان کی ضرورت ہے۔

ٹٹ بٹس (لنڈن)

ش۔ د۔ رش

حصۂ نظم

بربطِ دل

اے حریمِ شہود کی زینت!
کعبۂ ہست و بود کی زینت
خانقاہِ وجود کی زینت
اہلِ معنے کی جانماز ہے تو
بربطِ دل عجیب ساز ہے تو

فلسفی تجھپہ فخر کرتے ہیں
متقی تجھپہ فخر کرتے ہیں
رند بھی تجھپہ فخر کرتے ہیں
شاعروں کی متاعِ ناز ہے تو
بربطِ دل عجیب ساز ہے تو

زمزمہ تیرا سربسر قم ہے
زیر و بم میں حیاتِ مردم ہے
تیرا نغمہ ترا تبسم ہے
طبعِ محمود ہے ایاز ہے تو
بربطِ دل عجیب ساز ہے تو

تیرے نغموں میں احترام کی روح
تیرے شیون میں ہے دوام کی روح
ہے فقط تیری روح کام کی روح
مخزنِ راز خود بھی راز ہے تو
بربطِ دل عجیب ساز ہے تو

تجھ کو مضرابِ غم سے نسبت ہے
تجھ کو محبوب سوز کی گت ہے
تیرا نالہ نہیں قیامت ہے
غم کے پردے میں پر گداز ہے تو
بربطِ دل عجیب ساز ہے تو

امین

ترانۂ حمد

اے داورِ مہر و ماہ و اختر!
اے نکہتِ حسن و مشکِ سارا!
اے تو کہ ہے عکس تیرا جاں سوز!
اے تو کہ کبھی نہ تجھ کو پائے!
تیرا ہے فلک زمیں ہے تیری
عالم کو کئے ہوئے ہے محصور

اے خالقِ جسم و جانِ مضطر!
اے قوتِ عشق و سنگِ خارا!
اے تو کہ جھلک تری دل افروز!
پائے بھی تو لوٹ کر نہ آئے
وہ شے نہیں جو نہیں ہے تیری
اور دیکھو تو خود نظر سے مستور

فطرت ہے ترے قدم کا مظہر
پانی میں تری روانیاں ہیں
گوہر کی چمک میں آب تیری
محسوس ہے سب کو تیری ہستی
لہروں میں خروش ہے کہ تو ہے

قدرت ہے ترے کرم کا منظر
مٹی میں تری نشانیاں ہیں
جوہر کی دمک میں تاب تیری
باطل بھی ہے محوِ حق پرستی
ساحل بھی خموش ہے کہ تو ہے

مالک ہے تو اور کریم بھی ہے
پہچان تھے جو اُن میں جاں ہے تجھ سے
بیباک جنہیں اماں ہے تیری
اُمڈا جو ترے کرم کا طوفاں
دی نخل کو شاخ شاخ کو گل
صحرا کو نسیم - بحر کو موج
رنگت سے کیا چمن کو معمور
خاموش تھیں پتیاں خزاں میں
رحمت کی تری گھٹا جو چھائی
لالہ بھی چمن میں رنگ لایا

قادر ہے مگر رحیم بھی ہے
پنہاں تھا جو سب عیاں ہے تجھ سے
ثنا نشاط جنہیں نواں ہے تیری
جل بھن کے باغ و راغ و میداں
گلشن کو شجر - شجر کو بلبل
دریا کو خرام - کوہ کو اوج
نکہت سے کیا فضا کو مخمور
ہو حق کا سماں تھا گلستاں میں
گلشن میں نئی بہار آئی
ظاہر ہے کہ تجھ کو دیکھ پایا

مجھ کو بھی دیا مرا مقدر
گر تو نہ جلائے اپنے دم سے
بے بس ہوں کہ تیری جستجو ہے
کس طرح بھلاؤں تجھ کو دل سے

سینے میں جو ہے یہ قلبِ مضطر
مر جاؤں میں زندگی کے غم سے
بے کس ہوں کہ تیری آرزو ہے
ہے ربط مجھے اس آب و گل سے

مدت سے یہ میری التجا ہے
دل میں مرے اپنی لو لگا دے
گر تجھ کو میں لمحہ بھر نہ دیکھوں
آنکھوں میں ہو میری نور تیرا

راتوں کو یہی مری دعا ہے
کانوں کو پیامِ حق سنا دے
دنیا کو بھی اک نظر نہ دیکھوں
باتوں سے مری ظہور تیرا

زار

جذباتِ عالیہ

مرزا یاس لکھنوی

نیشِ درد و نوشِ درماں تا بہ ہر دے
زیست مشکل مرگ آساں تا بہ ہر دے

غمزۂ ناخواندہ مہماں تا بہ ہر دے
زحمتِ ہم رنگِ احساں تا بہ ہر دے

العطش اے ساقیٔ خمخانۂ غم العطش
نشۂ عیشِ پشیماں تا بہ ہر دے

دوزخِ خود را بہشتے سازم از اعجازِ عشق
جائے گل آتش بداماں تا بہ ہر دے

از خزاں آبادِ عالم خویش را دزدیدہ ایم
رنگ و بوئے ایں گلستاں تا بہ ہر دے

در بہارِ پُر خلش آسودہ نتواں زیستن
خار در پیراہنِ جاں بر تا بہ ہر دے

تہمتِ راحت کشم در منزلِ واماندگی
پا بہ گل سر در گریباں تا بہ ہر دے

منزلِ موہوم ما را پا بجولاں می برد
خاک بر سر بے سر و ساماں تا بہ ہر دے

سجدہ تا صد سال بر خاکِ وطن نبودگراں
تکیہ بر دیوارِ زنداں تا بہ ہر دے

دست و پا گم گشتہ از اندیشۂ تعبیرِ بد
پا دے از خوابِ پریشاں تا بہ ہر دے

بہرۂ از عقل جویا فیضے از دیوانگی
پندِ پیر و سنگِ طفلاں تا بہ ہر دے

یاسؔ امیدِ وفا از لکھنو فکرِ محال
در گروہِ نا مسلماں بر تا بہ ہر دے

مرزا اعجاز دہلوی

تلافی ظلم کی اچھی ستم ایجاد کرتا ہے
زبانِ مظلوم کی کٹتی ہے جب فریاد کرتا ہے

وہ مشقِ ناز کرتا ہے وہ دادِ حسن دیتا ہے
غلط ہے کون کہتا ہے کہ وہ بیداد کرتا ہے

نہیں اُٹھتا ہے تیشہ بوالہوس کے ہاتھ سے لیکن
زباں سے آدعائے ہمتِ فرہاد کرتا ہے

عبث ہے نالہ گر طاقت نہیں منقار و بازو میں
قفس سے کب کسی کو یوں کوئی آزاد کرتا ہے

خبر گو دانہ پانی کی نہ لے پر لطف کیا کم ہے
کہ باتیں میٹھی میٹھی رات دن صیاد کرتا ہے

نہ ہو مغموم ہمدم! یہ خدا کے کارخانے ہیں
کبھی آباد کرتا ہے کبھی برباد کرتا ہے

کوئی اعجازؔ یارانِ فراموشکار سے کہہ دے
جسے تم بھول بیٹھے ہو وہ تم کو یاد کرتا ہے

کیفی دہلوی

ہم نے اس عالمِ فانی کو تماشا جانا
ایک نیرنگیٔ آشوبِ تمنا جانا

دیر میں جا کے اگر جلوۂ صنم کا دیکھا
اپنی تصویر کا ہم نے اُسے چربا جانا

کس مپرسی کا حرم میں جو ذخیرہ پایا
خانہ بربادیٔ دل کا اُسے خاکہ جانا

دل کے آئینہ میں عکسِ رُخِ زیبا اترا
جو خیال آیا اُسے خوابِ زلیخا جانا

ہمکو چھوٹا نظر آیا نہ یہاں کوئی بڑا
ذرۂ خاک کو ہمپلۂ ثریا جانا

دل کے ہوتے جسے آئینہ کی حاجت ہو اسے
محوِ دلبستگیٔ لطفِ تماشا جانا

طور پر حضرتِ موسیٰ نے جو کچھ دیکھا تھا
وہ بھی اک پُتلیوں کا ہم نے تماشا جانا

اصلِ وحدت کی بنا ہے عدمِ غیریت
اس کا جب رنگ جما غیر کو اپنا جانا

یہ جو خواہش ہے کہ خواہش سے ملے آزادی
یہ بھی اک عشوۂ افسونِ تمنا جانا

جس کو تم کہتے ہو موت اس کو میں سمجھا ہوں وصال
دمِ شمشیر کو میں نے دمِ عیسیٰ جانا

تیری جو بات ہے دنیا سے نرالی کیفیؔ
سب بُرا کہتے ہیں جس کو اُسے اچھا جانا

جملہ حقوق محفوظ

زمامِ ابلقِ ایام در دستِ ہمایوں شد
نویدِ دورِ خوش کامی انیسِ طبعِ موزوں شد

بیادگارِ علامۂ فصیح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں (مرحوم)

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایُوں

مُرتبۂ

میاں بشیر احمد بی۔ اے۔ (آکسن) بیرسٹرایٹ لا۔ ایڈیٹر

مولانا تاجور نجیب آبادی (فاضل دیوبند) جائنٹ ایڈیٹر

منشی محمد صادق مینجر رسالہ ہمایوں نے
مرکنٹایل پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

محمد انور خوشنویس چوک متی لاہور

فہرستِ مضامین بابت ماہ اگست ۱۹۲۲ء

جلد ۲ — نمبر ۲

حصۂ نثر

حصۂ نظم

جذباتِ عالیہ

جہاں نما

عورتوں پر مظالم۔ رسالہ ماڈرن ریویو اپنی تازہ اشاعت میں رقمطراز ہے کہ ہندوستان اس وقت خاص حالات سے گذر رہا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اس بیداری کے دور میں ہندوستانی سوچیں۔ کہ کیا اُن کو عورتوں کے ساتھ اپنے سلوک میں خوشگوار تبدیلی کرنیکی ضرورت نہیں؟ یہ امر واقعہ ہے۔ کہ جتنی عورتوں کی اموات ہندوستان میں ہوتی ہیں اُتنی اور کہیں نہیں ہوتیں۔ مہذب ممالک اُس پر چونک اُٹھتے ہیں۔ بنگال میں نوعمر لڑکیاں ساڑھیوں پر تیل چھڑک کر جل مرتی ہیں۔ اسکی وجہ کیا ہے ؟ مردوں کی بدسلوکی اور بے مہری !!

بہت سے مرد ایسے ظالم بھی ہیں۔ جو غریب عورتوں کی ناک کاٹ ڈالتے ہیں اور عمر بھر کیلئے اُنکی صورت بگاڑ دیتے ہیں۔ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ایسے بدکرداروں اور انسان صورت وحشیوں کو چار پانچ مہینے کی سزائے قید دیکر چھوڑ دیا جاتا ہے اسکے علاوہ عورتوں پر اور بھی قسم قسم کے ناگفتہ بہ مظالم کئے جاتے ہیں جو ہندوستان کی ترقی کے راستے میں زبردست رکاوٹ ہیں۔ ضرورت ہے۔ کہ ملک کے بہی خواہ اسکی طرف توجہ کریں۔ اور ملک کی حقیقی خدمت سرانجام دیں۔

چین کی تہذیب۔ لنڈن کے مشہور رسالہ ڈائل میں آنریبل برٹرینڈ رسل نے اس موضوع پر ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ میں اس وقت تک یہی فرض کئے ہُوئے تھا۔ کہ تہذیب کے لحاظ سے چین بہت پس اُفتادہ ملک ہے۔ لیکن تجربہ نے یہ خیال غلط ثابت کر دیا۔

جب ہم کسی چینی سے کہتے ہیں۔ کہ تم دُنیا کے تمدن کی طرف دیکھو۔ اور اُس سے اپنا مقابلہ کرو۔ تو وہ مشرقی سنجیدگی سے چند منٹ کے لئے سکوت اختیار کرتا ہے۔ اور پھر جواب دیتا ہے کہ ہم اگر اپنے آپ سے مطمئن ہیں۔ تو اسکی ضرورت ہی کیا ہے۔ اور اگر نہیں ہیں۔ تو دُنیا خواہ تہذیب کے کسی نقطہ پر ہو۔ ہمیں آگے بڑھنا چاہیئے۔

میں چین میں چینیوں کو تعلیم دینے کی غرض سے گیا تھا۔ لیکن وہاں جاکر معلوم ہُوا۔ کہ مجھے وہاں سے بہُت کچھ سیکھنا ہوگا۔ اور یہ میرا ہی نہیں ہر ایک یوروپین کا جو وہاں کچھ عرصہ رہ چکا ہے۔ خیال ہے۔ چین میں بیرونی شان و شکوہ عنقا ہے۔ لیکن معصومیت، خوبصورتی، سادگی اور اطمینان قلب گوشہ گوشہ میں ملتے ہیں

روس میں ڈراما۔ آجکل روس کو تبدیلیوں کی سرزمین کہا جاتا ہے۔ گذشتہ چند سالوں میں وہاں حیرت انگیز انقلابات رونما ہوئے ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ وہاں ڈراموں کو بہت فروغ حاصل ہوا ہے۔ چنانچہ صرف ماسکو میں آجکل تین ہزار کے قریب تھیٹر ہیں جہاں ہر رات تماشے ہوتے ہیں۔ زراعت پیشہ لوگ فارغ البال ہو گئے ہیں اور عیش و عشرت میں مشغول ہیں وہ اپنے گذشتہ زمانہ کو ڈراموں کی صورت میں دیکھنے کے بہت شائق ہیں۔ اس لئے جو ڈرامے وہاں آجکل کئے جاتے ہیں۔ اُن میں سے نوے فیصدی زراعت پیشہ لوگوں کی زمانہ گذشتہ کی پُرمصائب زندگی سے متعلق ہیں۔ اُس کے ساتھ اپنی موجودہ حالت کا موازنہ کرکے اُن کے چہروں پر مسرت کا رنگ دوڑ جاتا ہے۔ لیکن آثار نظر آرہے ہیں۔ کہ ان ڈراموں میں بہت جلد اصلاح ہو جائیگی ۔

موجودہ جیلخانے۔ برنرڈ شا انگلستان کا مشہور ڈراما نویس ہے۔ جس کے قلم نے انگلستان کی زندگی پر حیرت خیز اثر ڈالا ہے۔ جیلخانوں سے متعلق انہوں نے حال میں دو کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں:۔

"اگر سزائے قید منسوخ کر دی جائے، تو یقیناً لوگ زیادہ نیک و پاکباز بن جائیں۔ سزا دہی کا یہ طریق نہایت ظالمانہ اور مستقل طور پر نکما کر دینے والا ہے۔ میرا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے۔ کہ سزا دینے کا یہ طریق محض ایک کھیل ہے، لیکن بیحد ظالمانہ۔ جج، مجسٹریٹ اور ہوم سکرٹری اس کی نوعیت سے قطعاً نا آشنا ہیں۔ میری رائے میں ہر ایک مجسٹریٹ کو کم از کم چھ ماہ کے لئے جیلخانے میں رہنا چاہیئے، تاکہ جب وہ کسی کو سزائے قید کا حکم سنانے لگے۔ تو اُسے اس امر کا کامل طور پر احساس ہو۔ کہ وہ کیا کر رہا ہے؟"

امریکہ میں خوشحالی کا نیا دور۔ "امریکن اِشُو" لکھتا ہے۔ کہ جب سے امریکہ میں شراب نوشی کو قانوناً بند کیا گیا ہے۔ لوگ زیادہ خوشحال ہو گئے ہیں بنکوں میں جو روپیہ جمع رہتا تھا۔ اُس میں تیس فیصدی کا اضافہ ہو گیا ہے اور جرائم میں اکاسی فیصدی تخفیف واقع ہوئی ہے پاگل خانوں میں جو آدمی داخل کئے جاتے تھے۔ اُن میں بھی نمایاں کمی ہوئی ہے۔ طلاق۔ خاندانی فساد اور اسی قسم کے دیگر مقدموں کی تعداد بھی پیشتر کی نسبت بہت ہی کم رہ گئی ہے۔

حکومت امریکہ کا خیال ہے۔ کہ آئندہ نسل موجودہ امریکنوں کی نسبت بہت زیادہ خوشحال اور نیک چلن ہوگی ۔

علمی شعاعیں

ہوا سے بجلی پیدا کرنیکا آلہ۔ امریکہ کے سائنسدانوں نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جس سے بہت سی ہوا جمع کر کے بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس آلہ میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ نہ اس کے لگانے میں کوئی دقت پیش آتی ہے یہ آلہ پٹرول سے جلنے والے لمپ کے مانند بالکل سادہ اور مختصر ہے فرق صرف یہ ہے کہ جہاں مؤخر الذکر میں ایندھن یا پٹرول کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہاں اول الذکر میں ہوا سے کام چل جاتا ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے۔ کہ اُسے مکان سے ذرا فاصلے پر لگا دیا جائے۔

اس طریقہ سے بجلی کا پیدا ہونا انسانی تہذیب میں نمایاں ترقی کا ظہور ہے۔ اس سے اُن لوگوں کو بھی بجلی میسر آسکیگی۔ جو شہروں سے دور دراز فاصلے پر دیہات میں رہتے ہیں۔ اور موجودہ طریقہ سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔

ریڈیم کا نیا استعمال۔ ریڈیم کے متعلق تازہ ترین انکشاف یہ ہے۔ کہ اس کی مدد سے آواز کو ہزاروں میل کے فاصلے پر پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ آدمی جنگل میں ہو یا جہاز میں وہ خشکی کی سرگرمیوں سے واقف ہو سکتا ہے اور آوازیں سُن سکتا ہے۔ بہت سی یونیورسٹیوں نے انتظام کیا ہے۔ کہ اُنکے طلباء گھر بیٹھے ہُوئے دور دراز کے فاصلوں سے قابل اصحاب کی تقریریں سُن سکیں۔ جب وہ اپنے بند کمروں میں آرام کرسی پر لیٹے ہُوئے نہایت آرام سے بول رہے ہوں۔

لیکن ریڈیم کے کرشمے ابھی ختم نہیں ہوئے۔ امریکہ کے سائنسدان اس پر دن رات تجربے کر رہے ہیں۔ اور اس کے نئے نئے استعمال معلوم کرنے کے درپے ہیں۔ جن پر تیس لاکھ روپیہ سالانہ کے قریب خرچ ہو جاتا ہے۔

دھاتوں پر دھوئیں کا اثر۔ عام لوگ جانتے ہیں۔ کہ دھاتیں دھوئیں میں رہنے سے جلد خراب ہو جاتی ہیں۔ لیکن اُن پر کتنا اثر ہوتا ہے؟ یہ تحقیق نہ ہُوا تھا اب چند تجربے کئے گئے ہیں۔ جن سے ظاہر ہُوا ہے کہ چھتوں پر ڈالنے کی جو آہنی چادریں بالعموم تیرہ چودہ برس تک خراب نہیں ہوتیں۔ دھوئیں میں تین چار سال ہی میں بیکار ہو جاتی ہیں۔ فولاد کی چادر دس سال تک کام دے سکتی ہے۔ لیکن دھواں اُسے دو سال کے اندر اندر ہی خراب کر دیتا ہے

تانبے کی عمر سینکڑوں سال ہوتی ہے۔ لیکن دھوئیں میں رہنے سے وہ بیس پچیس سال سے زیادہ نہیں رہتی۔

کھانسی کا علاج۔ ایک نئی مشین ایجاد ہوئی ہے جسکے ذریعہ سے سمندری ہوا فاصلے پر پہنچائی جا سکتی ہے۔ اور اس سے کھانسی کے مریض بہت جلد تندرست و توانا ہو جاتے ہیں۔

اس ایجاد کا سہرا لنڈن کے مشہور ڈاکٹر ایف ڈبلیو الیگز ینڈر ہیلتھ آفیسر کے سر ہے۔ صاحب موصوف نے ایک نامہ نگار سے بیان کیا کہ "طبی دنیا تسلیم کرتی ہے کہ پرانی کھانسی کے لئے سمندری ہوا اکسیر ہے لیکن غربا کے لئے سمندر کے کنارے جانا آسان نہیں میری مشین اُن کو سمندر کے پاس تو نہیں لیجا سکتی لیکن سمندر کی ہوا کو اُن کے قریب ضرور لا سکتی ہے"

اس ہوا سے دو تین مریضوں پر تجربے کئے جا چکے ہیں اور کسی میں بھی ناکامی نہیں ہوئی۔

رنگت تبدیل ہوسکتی ہے۔ برازیل کے ڈاکٹر او۔ ایف پڈرسو نے کئی سالہ تجربات کے بعد دعوٰے کیا ہے۔ کہ وہ کالی رنگت کو تبدیل کرکے اُسے سفید بنا سکتا ہے۔

ڈاکٹر پڈرسو نے ایک لیکچر کے دوران میں کہا۔ کہ آدمی کے خون میں رنگت کے جراثیم پائے جاتے ہیں اگر اُن کو تبدیل کر دیا جائے۔ تو رنگت تبدیل ہو سکتی ہے اُس نے چوہوں پر جراحی عمل کرکے اُن کا خون نکالا اور اس میں سے کالی رنگت کے جراثیم نکال کر سفید رنگ کے جراثیم داخل کر دئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دن کے بعد چوہوں کا رنگ تبدیل ہو گیا۔

اسی طریقہ سے انسانوں کا رنگ تبدیل ہو سکتا ہے

بے تار برقی کا ایک نیا پہلو۔ بے تار برقی کے متعلق تازہ ترین دریافت یہ ہے۔ کہ اس کے ذریعہ شائع شدہ کتب، رسائل اور پمفلٹ آنِ واحد میں دوسرے مقامات پر روانہ کئے جا سکتے ہیں اس کا موجد ہنگری کا ایک غریب انجنیئر زابو نامی ہے

جہاں سے پیغام بھیجا جاتا ہے۔ وہاں پر ٹائپ شدہ یا چھپا ہوا کاغذ رکھ کر برقی لہر چھوڑ دی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ مضمون دور دراز کے فاصلے پر پہنچ جاتا ہے۔

موجد کا دعوٰے ہے کہ اس ایجاد سے مالکان اخبارات کو بیحد فائدہ پہنچیگا۔ اور وہ بغیر محصول ڈاک کے ایک ہی وقت پر دنیا بھر میں اپنے اخبارات شائع کر سکیں گے۔

نسوانی دُنیا

لاہور میں عنقریب ایک زنانہ کالج کھلنے والا ہے۔جس کی پہلی دو جماعتوں میں سائنس کا بھی انتظام ہوگا۔ نیز زنانہ مدارس کے لئے اُستانیوں کی تربیت کی جماعتیں بھی کھولی جائیں گی۔ لیکن یہ جماعتیں یونیورسٹی کے حلقۂ اثر سے بالا ہوں گی۔ اس درسگاہ کا نظم ونسق براہ راست حکومتِ پنجاب اور وزارتِ تعلیم سے متعلق ہوگا۔

ہائی کورٹ مدراس کے چیف جج جناب ڈیوڈس صاحب کی بیوی کو مدراس میونسپلٹی کا ممبر نامزد کیا گیا ہے۔ یہ پہلا موقعہ ہے۔ جب کسی ہندوستانی خاتون کو میونسپلٹی کا رُکن بننے کا موقعہ دیا گیا ہے۔

جاپان کے دارالسلطنت ٹوکیو کی ایک مشہور زنانہ یونیورسٹی کے دروازے پر مفصلہ ذیل تحریر چسپاں پائی گئی ہے۔جس میں جاپانی مستورات کی طرف سے مردوں کو اطلاع دی گئی ہے کہ

۱۔ صبح کو ہمارے ساتھ اُٹھا کرو۔

۲۔ بچوں اور مہمانوں کے روبرو ہم سے کبھی اس قسم کی گفتگو نہ کی جائے۔جس سے ہماری ذلت مقصود ہو

۳۔ جب زیادہ دیر کے لئے گھر سے باہر رہنا ہو تو ہمیں بتا کر جائیں کہ آپ کہاں جا رہے ہیں۔

۴۔ جس طرح آپ اپنی خواہشات کا خیال رکھتے ہیں۔اُس طرح ہماری خواہشات کا بھی خیال رکھیں۔

۵۔ جو کام آپ بآسانی کرسکتے ہیں۔ اُسکے لئے ہمیں خواہ مخواہ تکلیف نہ دیں۔

۶۔ ہم سے مخاطب ہوتے وقت "تو اور تم" کا استعمال بے حد قابل اعتراض ہے۔

روس کی ایک مشہور لیڈی ڈاکٹر این کرچ نے تپِ محرقہ کی ایک ایسی عجیب دوا دریافت کی ہے جس سے اس کا علاج بہت آسان ہوگیا ہے۔

وائٹ کمشن نے تحقیقات کے بعد رپورٹ کی ہے۔ کہ برما کی لیجسلیٹو کونسل میں ممبران کے انتخاب میں مستورات کو بھی رائے دہندگی کا حق ہونا چاہیئے۔

وانسنرگ میں اس وقت تک عورتیں جج نہیں بن سکتی تھیں۔ اب یہ قانون منسوخ کر دیا گیا ہے۔

ہمایوں

جلد ۲ اگست ۱۹۲۲ء نمبر ۲

چاندنی رات میں

چاندنی رات میں، دامنِ پاک کے کنارے، جب چاند بکھرے ہوئے بادلوں کی جھلملیوں سے سوتی دنیا کو اپنی صاف و سرد کرنوں کے ساتھ جھانک رہا ہو، بچپن کے گئے گذرے دنوں کی یاد تازہ ہوتی ہے:

برس گذر گئے، اسی جھیل کے کنارے، تاروں بھری رات میں، مجھے دنیا میں اُسکی موجودگی کے ساتھ زندگی کا لُطف حاصل تھا جو اب چاند کی شکل میں، میری تاریک راتوں کو، اپنے نت نئے جلووں سے منوّر کئے ہوئے ہے!

کتنے حسین و سادہ تھے طفلی کے وہ دن جب بہتی ندیوں کے کنارے تُو اور میں اے دوست! اپنے معصوم کھیل کھیلتے تھے، کاغذ کی ناویں بہاتے تھے، جب نسیمِ سحر کے مَس پر یا چڑیوں کے چہچہوں کو سُن کر ہم اک دوسرے کو دیکھتے تھے اور مُسکراتے تھے، ہم نہ جانتے تھے کیوں؟ ہم جاننا نہ چاہتے تھے کس لئے؟

ایسی تھی ہماری باہمی رفاقت، جو اب اِک خوابِ مطمئن کی طرح، صرف چاندنی راتوں ہی میں یاد آتی ہے!

آہ! وہ دن کہاں گئے؟ وہ دوستی کیا ہوئی؟

مجھے تو اس بے ہنگامہ ساحل پر گشتی ڈالے مدتیں گذر چکی ہیں، نسیمِ صبح آتی ہے اور میں عرقِ شرم میں غرق ہو جاتا ہوں کہ ایسی ہی نرم و نازک خرام تھی میری طفلانہ اُلفت جسے میں نے کھو دیا! سُورج کی شعاعیں سطحِ آب پر اپنا اضطرابی رقص کرتی ہیں اور میں اپنے دست و پا میں اک بے چین حرکت کا آغاز محسوس کرنے لگتا ہوں کہ ایسا ہی روشن و بے تکلف تھا میرا کھیل کود جسے میں نے اپنے ہاتھوں ضائع کر دیا!

اکثر جی میں آتا ہے کہ اِس ساکن کشتی کو جو ساکن پانی پر بیکار پڑی رہتی ہے توڑ پھوڑ کر دُور دُور کسی چنار کے ٹہنوں میں ایک مُعلق جھونپڑا بنا لوں اور اُسی میں مرد شب تنہا رہا کروں ~~ لیکن اُمید تیرا مُسکراتا چہرہ شبِ ماہ کے بادلوں میں مجھے دکھاتی ہے اور میرا دل لپک کر رہ جاتا ہے!

آفتاب کی رخصتی شعاعوں کے سنہری جادہ لرزاں پر اے دوست! اور شام شفق کی دھندلی روشنیوں میں میری بیکار کشتی کو اپنے ننھے چپوؤں سے، اپنے بچپن کے ننھے خوشنما چپوؤں سے چلا اور مجھے بھی کھینے کا حکم دے کہ میں پھر دُنیا کی اصلی زندگی کو اک نظر دیکھ لوں!

اُف! ظالم ہوا کوہ کے دامن سے دامن چھڑا کر پانی کی روانی کو چھُوتی ہے گویا عصمت بندشوں کی سنجیدگی سے الگ ہو کر حُسن کو پیار کرتی ہے اور چاندنی پہاڑ کی چوٹیوں پر پرتو افگن ہے یعنی انکسار رفعت سے ہم آغوش ہو کر میٹھی نیند سو رہا ہے!

پھُولوں سے بھینی بھینی خوشبوئیں نکلتی ہیں اور پہاڑوں سے ہلکی ہلکی ہوائیں چلتی ہیں!!

فضا میں چاندنی، چاندنی میں نسیم، نسیم میں نکہت اور نکہت میں تیری محبت کی ہوش ربا کیفیتیں تیرتی پھرتی ہیں!!!—— آہ! چاندنی رات میں کسی کاشمیری جھیل کے کنارے اپنے تئیں اک خوابِ سیمیں کے نذر کر دینے میں زندگی کا لُطف ہے!

غرض کی دوستی اے دل! سُورج کی عریاں روشنی میں چلتی پھرتی ہے لیکن محبت کی دوستی، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ، صرف چاندنی کے سیمیں ملبوس ہی میں نظر آ سکتی ہے، کیا میں اُس کھوئی ہُوئی دوستی کو پا سکتا ہوں؟ وہ ننھی پتیوں کی طرح لہرانے والے نازک خیالات کیا پھر میرے بے تاب سینے میں موجزن ہو سکتے ہیں؟ نہیں نہیں! جب تک اپنے گم کردہ بچپن کو پھر نہ پالوں گا اُس کھوئی ہُوئی دوستی کا خوابیدہ حُسن نہ دیکھوں گا!

وہ معصوم وقت جب ہر شے مجھے حُسن کی اک مُورتی معلوم ہوتی تھی اس مخمورِ علم زمانے میں کیونکر واپس آئے جب سُورج کی کرن کرن میرے لئے ہر وجود کے نقائص ہی پر روشنی ڈالتی ہے!

ہاں! چاندنی راتوں میں جب روشنی اک نیم وا کلی کی مانند، حقیقت کی تاریکیوں میں چھُپی چھُپی رہتی ہے باہمی رفاقت، چاند کی متین و منظوم نگاہوں سے جلوہ ریز ہو کر، دل کی سب سے پوشیدہ گہرائیوں میں اک ہلکا سا تموج پیدا کر دیتی ہے!

میں دل سے پُوچھتا ہوں کہ "کیا میں دوست رکھتا ہوں"؟ وہ جواب دیتا ہے کہ "ہاں رکھتا ہے مگر یُوں کہ کبھی وہ تجھ سے کچھ غرض رکھتے ہیں کبھی تو اُن سے کوئی مطلب"!

میں بھی اُن سے مطلب رکھتا ہوں! میں جو بے غرضانہ دوستی کا متلاشی رہتا ہوں مجھے بھی اپنی ہی غرض سے واسطہ ہے! ذلت ہو میرے لئے کہ اس روشن دُنیا کی خود کامی کا سرچشمہ میرا ہی نفس ہے!

اے یادِ طفلی کے چاند! تو سیاہ بادلوں کے پیچھے چھُپ جا! اے مہیب رات! تو اپنی تاریکی کا آنچل مجھ پر ڈال دے کہ میں خود پرستی کی نیند سو جاؤں!!

بشیر احمد

ح

تاریخ رُوس پر ایک اجمالی نظر

گذشتہ سے پیوستہ

پیٹر اعظم نے خلیج فن لینڈ کے ساحل پر ایک شہر بھی آباد کیا تھا، اس کا نام (جرمنی ناموں کی طرح) سینٹ پیٹرسبرگ تھا، یہاں کی آبادی کا غالب حصہ آرکینجل کے متعمرین تھے، ان کی آبادی کی وجہ سے یہ شہر بہت شاندار ہوگیا تھا، بازار وسیع تھے، دوکانیں خوشنما تھیں، اور سوادِ شہر کالجوں، کارخانوں، ہوٹلوں، اور امراء و رؤسا کی کوٹھیوں سے مزین تھا، اس کی رسمِ افتتاح ۱۷۱۸ئہ میں رقص و سرود کی رنگین بزموں سے ہوئی، ان بزموں میں تمام امراء و رؤسا، عمال حکومت اور معزز و سر بر آوردہ متعمرین شریک ہوتے تھے، اور سب کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ ایک ایک رات اپنے ہاں جشنِ افتتاح منائیں، رقص و نغمہ کی نشاط انگیز مجلسیں آراستہ کریں، اور مغربی تہذیب رقص کی طرح اپنے ساتھ عورتوں کو بھی شریک کریں، ان مجلسوں کے آدابِ نشست و برخاست، طریقِ رقص و نغمہ، اور تہذیب مخاطبہ و مکالمہ بالکل یورپین ہوتے تھے، یہاں ہر شخص آزادی سے سگرٹ وغیرہ پی سکتا تھا، اور کوئی مزاحمت و مخالفت کا مجاز نہ تھا،

ان مجلسوں کا نظام امور خود پیٹر نے ترتیب دیا تھا، اور وہ عام طور پر شایع کر دیا گیا تھا اس نئے شہر کی فضا جب ان لطیف ہنگاموں، اور لطف و مسرت کے رنگین قہقہوں سے لبریز ہوگئی، تو پادریوں نے بڑی لے دے کی، اور اپنے مذہبی جنون کا ایک اور آخری ثبوت دیا، انہوں نے مشرقی روس کے باشندوں کو جو اس حد تک انقلاب قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے اپنے ساتھ ملا لیا تھا، اور اسی بے سری فوج کو لیکر فاتح تمدن کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے، لیکن پہلی ہی پیشقدمی میں شکست کھائی، اور جس فوج کے گھمنڈ پر آگے بڑھے تھے وہ تتر بتر ہوگئی، جو پڑھے لکھے تھے وہ اسی میں جذب ہوگئے، اور جو جاہل تھے انہوں نے اپنے خروج کی سزا بھگتی،

لیکن موت جب آتی ہے تو کسی کے ٹالے نہیں ٹلتی، ان پے در پے شکستوں کے بعد

بھی ان کا جنون ٹھنڈا نہ پڑا، اور اب یہ خفیہ سازشیں کرنے لگے، اس سلسلہ میں سب سے بڑا کام جو انہوں نے کیا، پیٹر کے بیٹے (کسیس) اور بیوی (ایڈوکسیا) کو ورغلانا تھا، تاکہ وہ پیٹر کو ہلاک کردیں، مگر ان کی شومئی قسمت سے یہ سازش کھل گئی، اور پیٹر کے سامنے مقدس پادریوں کی فردِ جرم پیش کی گئی، اس کی پاداش میں اس نے بیوی کے لئے تازیانوں کی سزا تجویز کی، اور بیٹے کے لئے قتل کی، باقی تمام سازشیوں کو حبس دوام کا حکم سنایا، اور اسقف اعظم کا عہدہ توڑ دیا، جس کے بعد ملک میں ایک گونہ سکون و اطمینان پیدا ہو گیا۔

اس آگ کو بجھا کر وہ مستقل طور پر پیٹرسبرگ میں جا رہا، یہاں اس نے لیو و نیہ کی ایک قیدی عورت سے شادی کرلی، اس عورت کا نام کیتھرائن تھا۔ کیتھرائن سے دو لڑکیاں پیدا ہوئیں، جن کے پالنے کے لئے فرانس سے آیائیں بلائی گئیں ان دونوں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام نہایت اعلیٰ اور بالکل یورپین اصولوں پر کیا گیا تھا، یہ لڑکیاں جب جوان ہوئیں، اور پڑھ لکھ کر فراغت پائی، تو اپنے روشن خیال باپ کی امیدوں کو پورا کرنے اور اس کے نظام اصلاح کو تکمیل کے بام رفعت تک پہنچانے میں منہمک ہو گئیں،

پیٹر نے روسی نظام حکومت کو بھی بدلا تھا، لیکن اس بارے میں اس نے جو کچھ اصلاحات کیں قدیم اصول ملوکیت کو تسلیم و برقرار رکھتے ہوئے کیں، بلکہ اپنے حکم و تسلط کو علم و سیاست اور نظم و قانون کا آب و رنگ دے کر اور زیادہ مطلق العنان کر دیا۔

اصلاحات کے سلسلہ میں فوجی اصلاحات کو عدالتی و انتظامی اصلاحات پر ترجیح ہے، اس لئے اسی ترتیب سے یہاں اس کا ذکر کیا جاتا ہے،

روس میں اب تک فوجوں کا کوئی خاص نظام نہ تھا، جس قدر فوجیں تھیں بالکل بے قاعدہ تھیں، عہدوں کی تقسیم، فرائض و اختیارات کی تحدید، صبح و شام کے قواعد اور مصنوعی جنگ کا تو کیا ذکر، یہاں سرے سے سپاہیوں کے پاس اسلحہ بھی ایک وضع کے اور کافی تعداد میں نہ تھے۔ اس پر طرہ یہ تھا کہ ان کی وردیاں ان کا روزمرہ کا لباس ہوتی تھیں، اور فوج میں بلاتخصیص سن و سال ہر شخص بھرتی کر لیا جاتا تھا،

پیٹر نے اس بدنظمی کو بدلا، پرانے آدمیوں کو نکال کر نئے آدمی، اور ایک خاص عمر

کے بھرتی کئے، انہیں یورپین عسکریت کے سانچہ میں ڈھالا، خدمات کی تقسیم کی، عہدوں کے نام جرمن ناموں سے اخذ کئے، صبح و شام کی قواعد لازمی قرار دی، ہر تیسرے مہینہ مصنوعی جنگ کا طریقہ جاری کیا، فرانس سے اسلحہ منگائے اور تمام فوجوں کے لئے خاص خاص وردیاں مقرر کیں،

روس وسیع وسیع جنگلوں اور چٹیل میدانوں کا ملک تھا، اس کی کائنات ارضی میں سمندروں اور دریاؤں کا دور دور پتہ نہ تھا، لے دے کر جو چند دریا تھے وہ مغربی روس میں تھے، اور اس وقت جو سمندر ان کے قبضہ میں تھا، اس کا ساحلی مقام (آرکینجل) غیر ملکی باشندوں سے آباد تھا، لیکن یورپ میں اور باعزت رہنے کے لئے بحریت روح پیدا ہونی ضروری تھی۔ خصوصاً استقلالِ قومی کے لئے جنگی بیڑہ نہایت ضروری تھا، ورنہ روس، یورپ کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا، اس لئے پیٹر نے اور کاموں سے زیادہ اس طرف توجہ کی، اور اس ضرورت کو بدرجۂ اتم پورا کیا،

اس زمانہ میں بحریات کی سلطانی کا تاج ہالینڈ کے سر پر تھا، اور اس کا بیڑہ یورپ میں سب سے زیادہ قوی اور منتظم تھا، پیٹر نے اسی کے نظام بحریت کو اختیار کیا، روسیوں کو بحری کام سکھوائے، اور اپنا بیڑہ بالکل انہی اصولوں پر مرتب کیا، اور تکمیل نظام کے لئے ماتحت عہدوں پر اہل ہالینڈ کو مقرر کیا، لیکن تمام ذمہ دار عہدے اور اعلےٰ خدمات روسیوں کو تفویض کیں، اور اس طرح اپنی برّی و بحری فوج یورپ کے مقابلہ کے لئے تیار کر لی،

یہی دونوں قوتیں تھیں، جن کے بل پر روس، سویڈن پر غالب آیا، ترکوں کو شکست دی، بحر اسود پر قبضہ کیا، اور ساری دنیا سے اپنی قوت کا لوہا منوا لیا، اس کے بعد عدالتی اصلاحات کا نمبر آتا ہے، ہالینڈ کی بحریت کی طرح اس زمانہ میں سویڈن کی ملکیت بہت مشہور تھی، اس کے لئے پیٹر نے اسی کے نظام حکومت کا اتباع کیا، اور بالکل انہی طریقوں پر اپنے ہاں عدالتی نظم و نسق کے قواعد، فصل مقدمات کے قانون، اور مالگذاری کے آئین و ضوابط مدون کر کے نافذ کئے، ملک میں قانونی مدرسے جاری کئے، وضع آئین و قوانین کی مجلسیں بنائیں، کابینۂ وزارت مرتب کیا، خفیہ پولیس کا محکمہ قائم کیا، انتظامی پولیس کی اصلاح کی، اسکے

فرائض و اختیارات تعین کئے۔ اور تمام صیغوں میں اعلیٰ عہدوں پر روسیوں کو مقرر کر کے غیر خود مختار عہدوں پر سویڈش اہلکاروں کو مامور کیا،

عدالتی و انتظامی نظام جدید میں جن لوگوں نے حصہ لیا، اور جو مختلف مناصب و خدمات پر مامور ہوئے، ان کے لئے ٹیشین کا لقب تجویز کیا گیا، اور آبائی شان و شوکت پر مرنے والوں کی آن توڑنے کے لئے تمام عزت و حرمت اسی جماعت کے لئے مخصوص کر دی، ان لوگوں کو خزانۂ عامرہ سے بڑی بڑی تنخواہیں ملتی تھیں، دربار شاہی سے خطابات عطا ہوتے تھے، اور جب کبھی شاہی لطف و کرم اور بخشش و عنایات کی بارش ہوتی تھی، انہی لوگوں پر ہوتی تھی، موروثی امیروں اور خاندانی منصبداروں کا اس میں کوئی حصہ نہ ہوتا تھا، ویلس کا بیان ہے کہ پیٹر نے ایک ایسا قانون بھی نافذ کیا تھا جو خاندانی سیادت کے لئے ملک الموت تھا، اس میں صاف لکھا تھا کہ اگر کوئی خاندان دو پشت تک عدالتی یا فوجی خدمت یا ملازمت نہ کرے، اس کو شریف خاندانوں میں شمار نہیں کیا جائیگا، درباروں میں ان کی کوئی عزت نہیں ہوگی، خواہ ان کے اسلاف نے سلطنت کی کتنی ہی خدمات انجام دی ہوں، اور خواہ وہ کتنے ہی بڑے عہدوں پر مامور رہے ہوں، اس قانون کی رو سے انتقال عہدہ و منصب کا طریقہ بھی بند کر دیا گیا تھا، اور ہر کام کے لئے قابلیتِ ذاتی دیکھی جاتی تھی۔

جب نظامِ حکومت میں خرابیاں ہوتی ہیں تو سینکڑوں برائیاں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں، اور وہ نظامِ حکومت ملک کے لئے بجائے مفید ہونے کے مضر اور نقصان دہ ہو جاتا ہے، اِن خرابیوں میں ایک بڑی خرابی رشوت بھی ہے، جو دوسری خرابیوں کے لئے بمنزلۂ بنیاد و اساس ہوتی ہے،

روس میں رشوت خواری کا عام چرچا تھا، ادنےٰ اہل کاروں سے لیکر اعلیٰ عہدہ داروں تک ایک متنفس بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھا، پیٹر نے جدید نظام حکومت میں اسکا بہت زائد خیال رکھا تھا، اور قریب قریب ایسی تمام راہوں میں رکاوٹیں پیدا کر دی تھیں۔ جو رشوت کا منفذ ہو سکتی تھیں، تاہم رشوت خواریاں بالکل بند نہ ہوئیں، اور بدرجۂ مجبوری ایک علیحدہ قانون نافذ کرنا پڑا، جس نے صاف لفظوں میں رشوت خواری کی قطعی ممانعت کی،

اور مرتشی افسروں اور اہلکاروں کو مستوجب سزا قرار دیا،

لیکن بری عادتیں آسانی سے کہاں چھوٹتی ہیں، پھر جس عادت میں مادی فوائد بھی ہوں وہ اس طرح کیسے چھوٹ سکتی تھی، چنانچہ اس قانون کے نافذ ہونے کے بعد علانیہ رشوت خواری تو بند ہوگئی، مگر پوشیدہ کا بازار کھل گیا، اور عمال حکومت عدل و انصاف، اور نظم و قانون کو رشوت کے ہاتھ فروخت کرتے رہے، اور اس کی بھی پروا نہ کی کہ اس سے حکومت کے مالیہ پر کیا اثر پڑتا ہے، بالآخر پیٹر نے ان لوگوں پر جاسوس مقرر کئے، اور ان کی اطلاعات پر نہایت سخت سزائیں دیں، اور بقول مسٹر میکنزی جن کے جرائم رشوت زیادہ تھے انکی جائدادیں ضبط کرلیں اور انتظاماً قتل بھی کیا، ایک روز پیٹر ایک اعلیٰ افسر سے انسداد رشوت کے مسئلہ پر گفتگو کر رہا تھا، گفتگو کے دوران میں اس نے کہا:۔ اب میں ایسا قانون نافذ کرنا چاہتا ہوں جس کی رو سے مرتشی عمال سزائے موت کے مستوجب ہوں،، افسر نے جواب دیا:۔ لیکن یہاں تو سب کے سب مرتشی ہیں، اگر یہ قانون نافذ کیا گیا تو باقی کون بچیگا؟ کیا جلالت آب یہ چاہتے ہیں کہ روس کو ویران کردیں؟

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ روس میں رشوت کتنی عام تھی، جو ایسی سزاؤں کے بعد بھی بند نہ ہوئی،

جیسا کہ قاعدہ ہے کہ تمدن کی ترقی، تہذیب کا نشر اور نظام حکومت کی اصلاحات سے مالگذاری اور ٹیکس وغیرہ بڑھ جاتے ہیں، اور ضروریات زندگی وسیع ہوکر گراں ہوتی جاتی ہیں، روس میں بھی یہی ہوا، اور یورپ کی طرح یہاں بھی زندگی کی قیمت بہت بڑھ گئی، ہر شخص شریفانہ زندگی بسر کرنے کے لئے کام کاج کرنے پر مجبور تھا، جس سے مغربی تمدن کو اور ترقی ہورہی تھی،

روسیوں میں جو تمدن زیادہ رائج ہوا تھا وہ فرانسیسیوں کا تمدن تھا، تمام خوش حال روسی اپنے قدیم تمدن اور آبائی رسم و رواج سے نفرت کرنے لگے تھے، انہوں نے اپنی قومی زبان فرانسیسی زبان کو بنا لیا تھا، اور عام طور پر اسی میں گفتگو کرتے تھے، ان کے کتب خانوں کا غالب حصہ فرنچ لٹریچر ہوتا تھا، کلب میں آنے جانے، اُٹھنے بیٹھنے، ہنسنے بولنے کے طریق و آداب بالکل یورپین تھے، وہ مذاق بھی کرتے تو مغربی انداز میں، اور قہقہے بھی مارتے تو فرنچ

طریقہ پر،

پیٹر اعظم کی سیرت کے مختلف واقعات آپ کے سامنے آچکے ہیں، لیکن اب وہی پیٹر اعظم خون چکاں دامن لئے نمودار ہوتا ہے۔

یہ خون کس کا ہے؟ غریب مسلمانوں کا!

اب تک آپ نے پیٹر کو روشن خیالیوں کی تمثال، اصلاح پسندیوں کا نمونہ اور رواداری ومنصف مزاجی کا مجسم دیکھا ہے، لیکن یہ تمام باتیں اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لئے تھیں، مسلمانوں کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ غیظ وغضب اور قدیم مسیحی جنون کے جوش سے تمتما اُٹھتا ہے، وہ پہلے جس قدر نیک تھا اب اسی قدر بد ہوتا جاتا ہے، پہلے اس میں جس قدر خوبیاں تھیں اب اتنی ہی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور نظر آتا ہے کہ پیٹر صرف آئینۂ رحمت ہی نہ تھا بلکہ چنگیز اور ہلاکو بھی تھا!

اوراق گذشتہ میں جو واقعات پیش کئے گئے، ان کے مطالعہ سے آپ نے سمجھا ہوگا۔ کہ پیٹر مذہبی آدمی نہ تھا، لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے، پیٹر اپنے مذہب کا بہت پابند تھا، عیسائیت کا داعی تھا، اور اسلام کا شدید دشمن تھا، اس حصۂ مضمون میں اسی موضوع پر چند سطریں سپرد قلم کی جاتی ہیں:۔

تاتاری ممالک میں مسلمان بکثرت آباد تھے، قزان، خوارزم، فرغانہ، ردفا، بخارا وغیرہ میں انکی بڑی بڑی بستیاں تھیں، یہ مسلمان ترکی قبائل تھے، جو اپنی اخلاقی ومذہبی خوبیوں کی وجہ سے اپنے دوسرے ہمسایوں سے بہتر تھے، اور اپنے انہی ہتیاروں سے بلا جنگ وجدل سب کو مفتوح کرلیا کرتے تھے، یہ مفتوح قومیں زیادہ تر نصرانی ہوتی تھیں، جنکے بڑے بڑے قبیلے چواش، چرش، آرو غیرہ تھے، ان میں بعض قبیلے تو کلیتہً اسلام میں جذب ہوگئے تھے، بعض نے صرف اخلاقی اثرات قبول کئے تھے، اور اس جذب وقبول کو اس قدر ترقی ہوئی تھی کہ اطراف وجوانب کی تمام آبادیاں لفظاً ومعناً اسلام کی حلقہ بگوش ہوگئی تھیں،

یہ حالت تھی کہ روس نے تاتاری ممالک پر قبضہ کیا، اور یہ تمام شہر اسکے آہنی چنگل میں آگئے،

باقی آئندہ

روزنامچہ آزاد

شمس العلماء مولانا مولوی محمد حسین آزاد مرحوم

گذشتہ سے پیوستہ

۲۷ اکتوبر ۱۸۸۵ء چہار شنبہ ۲۷ ذوالحجہ میں بموجب معمول کے آخر شب سے عرشہ پر ہوا کھا رہا تھا۔ کہ سفید صبح کے ساتھ بندر لنگہ (لنجہ) کے درخت کناروں پر دکھائی دیئے۔ لنگر ڈالنے کے سامان ہوئے ۲ بجے کے بعد دو کشتیاں اسباب لینے آئیں ۸۔۱۰ اسواریاں آئیں کہ بحرین میں اتر جائینگی ۲ گھنٹہ اسباب اترتا رہا ½ ۱۰ بجے جہاز روانہ ہوا۔ لنگہ بندر عباس سے چھوٹا ہے۔ شہر کنارے پر آباد ہے، اصلی آبادی کم تھی۔ جہازوں کی آمد و رفت نے سہ چند بڑھا دیا ہے۔ اس کے بیچ میں کھجوروں کی قطار ہے۔ اس کے پیچھے پھر آبادی ہے مکانات کی ساخت سامنے سے انگریزی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ہوادار کھڑکیاں برابر برابر رکھتے ہیں میوہ یہاں کچھ نہیں۔ اصلی عرب کے لوگوں کی آبادی ہے۔ اگرچہ ایران کی عملداری ہے مگر حاکم سید ہوتا ہے چنانچہ حاکم حال کا نام سید نقیب ہے آج کل محرم کے سبب سے شہزادہ محمد حسین مرزا بندر عباس سے آیا ہوا ہے۔ اور جب کوئی صورت خاص واقع ہوتی ہے۔ تو کوئی حاکم ایرانی بھی آجاتا ہے۔

گرمی کی شدت ہے، ہوا کھل گئی ہے اگر عرشہ پر سایہ ہوتا تو عیش ہو جاتا۔ اب سخت تکلیف میں ہیں۔ میں رات بھر میں کئی بار اوپر اور کبھی نیچے گیا کہ مبادا کوئی چیز غائب ہو جائے۔ آدمیوں کی کثرت نے زیادہ تر تکلیف دی حاجی عبد الرسول نام بوشہری معلم جہاز ہو کر لنجہ سے آئے ہیں وہ میرے شریک بستر ہوئے۔ نجف نام ایک نوجوان خوش مزاج ان کے ساتھ ہے۔ ایک حبشی دراز قد بھی ساتھ ہے۔

لطیفہ۔ میں نے حبشی کا نام پوچھا۔ کہا مہندی (ماندنی) میں نے پوچھا مہندی چہ

معنی دارد۔ ہنس کر کہا۔ "غرض ہیکہ انشاء اللہ میماند"

حاجی صاحب کاروبار دریا سے خوب واقف ہیں۔ جو جہاز آتا ہے بوشہر تک ساتھ ساتھ جاتے ہیں وہاں سے ان کی بدلی ہو جاتی ہے یہ معلم۔ راہ کے نیک و بد اور خوف و خطر کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس وقت حاجی صاحب کا قہوہ پیا ہے،

لنجہ کے لوگوں کی اصل عربی ہے۔ بحرین اور بوشہر سے ان کی ایسی آمد و رفت ہے جیسے لاہور، امرتسر، جالندھر، یا دلی، میرٹھ،

۸، اکتوبر ۱۸۸۵ء ۲۸ ذلحجہ پنجشنبہ۔ رات بھی ہوا سخت چلتی رہی۔ کہ عرشہ پر چلا نہ جاتا تھا، جہاز آگے پیچھے اس طرح ہلتا تھا۔ جیسے کوئی بچہ کو گودی میں لٹا کر بیٹھا رہے اور ذرا لوؤں کو حرکت دے اوّل اوّل مجھے اس سے نیند آئی۔ مگر پچھلے پہر سے مجھے ضعف شروع ہُوا۔ اور صبح تو ایسا ضعف معلوم ہُوا کہ دل و دماغ کھلے جاتے ہیں۔ جس وقت دُودھ میں چائے ڈال کر گھولی اور روغنی روٹی بھگو کر پی۔ اس سے ذرا سہارا ہُوا مگر دل بدمزہ ہو گیا گھی میں کھوپرے کا تیل تھا۔ تھوڑی دیر میں بہت بے قراری اُٹھائی۔ عرشہ پر جا کر پڑا رہا۔ میں سر سے یا تو یک دل تھا۔ یا اب دل بیٹھا جاتا تھا۔ بارے آنکھ لگ گئی۔ تھوڑی دیر میں دھوپ آ گئی۔ اُٹھا تو طبیعت ٹھیری ہُوئی تھی۔ نیچے آ کر کئی گھونٹ پانی پیا۔ سہارا سا ہو گیا۔ اِدھر اُدھر پھرتا تھا۔ مگر حال بے حال تھا۔ لیٹے بیٹھے چین نہ تھا۔ دوپہر کو جھوکے کم ہوئے چند نوالے چاول کے دال کے ساتھ کھائے۔ یہ بھی معلوم ہُوا۔ کہ ہمارے حصہ کا عرشہ جو جہاز کی ناک سے لگا ہُوا ہے اس پر زیادہ جھوکے لگتے ہیں۔ وسط میں کم۔ میں بھی وہیں جا بیٹھا اور یہ چند سطریں لکھیں۔

باقی آئندہ

چمنستان

گُلزارِ محبّت

اگر تم جمادات ہو تو مقناطیس کی طرح کشش پیدا کرو، نباتات ہو تو سُورج کی شعاعوں سے رنگ پکڑو اور انسان ہو تو اپنے سینے کو محبّت سے معمور کر لو!

اگر محبّت کے پُجاری دُنیا میں نہ ہوتے تو شمعِ آفتاب کبھی کی سرد پڑ گئی ہوتی۔

محبّت کیا جانا جان کی راحت ہے محبّت کرنا دل کی فرحت!

جب فرشتے ستاروں کے سامنے آداب بجالاتے ہیں تو ہم لوگ اُسے محبّت پُکارتے ہیں۔

محبّت کا غم سب غموں سے بڑھ کر جاں گُسل ہے۔

خود نمائی کا انجام محبّت کا آغاز ہے اور محبت کا انجام معرفت کا آغاز!

خُدائے لایزال تکمیلِ افلاک ہے اور محبت تکمیلِ انسان!

محبّت جنت الفردوس کی ہواؤں میں ایک آسمانی تنفس ہے!

جو محبّت کی بیعت کرتا ہے وہ شجاعت کا سبق پڑھ لیتا ہے!

اے وہ ہستی کہ محبت کی وجہ سے مُصیبت میں گرفتار ہے ہاں محبت کر محبّت کر! کہ محبت کا دردِ حیاتِ مستعار کی کلفتوں کی بہترین دوا ہے ؎

چو منصور از مُراد آنانکہ بر دارند بر دار اند
کہ بایں درد اگر در بند درمانند درمانند

دل کتنا اُداس ہوتا ہے جب وہ محبّت سے اُداس نہ ہو!

آہ ایک ہی مرقد میں پہلو بہ پہلو ہاتھ میں ہاتھ دیئے لیٹے رہنا اور زندگی کی تاریکیوں کو اپنی چمکتی آنکھوں کی شمعوں سے روشن کرنا! میری ہستی کے لئے یہ بات کافی ہے!

اُس شخص کی جُدائی جس کے ساتھ دُنیا بھر کی خوشیاں وابستہ ہیں فضائے ہستی کا سب

سے زیادہ اندوہ گیں خلا ہے ۔ یہ بات کس قدر سچی اور پیاری ہے کہ محبوب معبود بن جاتا ہے اگر خدائے کون و مکاں کائنات کو رُوح کے لئے اور رُوحوں کو محبت کے لئے پیدا نہ کرتا تو (نعوذ باللہ) یہ گمان کیا جا سکتا کہ وہ محبت کی سحر کاریوں کو قدرت کی نیرنگیوں کا رقیب سمجھے ہُوئے ہے !

جو دل باہمی محبت کا راگ گاتے ہیں خدا اُن کی راحتوں میں بجز اِس کے اَور کیا اضافہ کر سکتا ہے کہ وہ اُن کی محبت کو ہمیشگی عطا فرمائے ! ایک ایسی فانی زندگی کے بعد جو محبت میں گذری ہو ایک ایسی ابدی زندگی جو محبت ہی میں گذرے بلاشبہ اک نعمتِ خداوندی ہے۔ لیکن جو دل آویز مسرتیں اس چندروزہ دُنیا میں محبت کا عطیہ ہیں اُن کے لُطف کو زیادہ کرنا خالقِ کائنات کے لئے بھی اک ناممکن سا امر ہے !

اے میرے دوست ! تُو آسمان کے تاروں کی درخشانی اور اُن کی گہرائیوں کو ٹکٹکی باندھے ہُوئے کیا دیکھتا ہے کہ اک روشن تر ہستی کی ننھی اُجلی اُجلی کرنیں خود تیرے ہی پہلو میں کھیلتی ہیں اور اُس کا عُمق تیرے دل کو زیادہ حیران کرنے والا ہے !

میں رات کی تاریکی میں ہوں ! میں کیا کہوں کوئی صورت تھی جو نظروں سے غائب ہو گئی، آہ میں کس سے کہوں کہ اب میں رات کی تاریکی میں ہوں ! وہ ساتوں آسمانوں کی حدود سے دُور دُور چلی گئی، وہ آٹھوں بہشتوں کی فضا کو اپنے ساتھ لے گئی اور اب میں وحشت خیز راتوں میں اپنے غم سے ہم آغوش ہو کر اپنی محبت کو رنج و الم کے آنسوؤں سے کوس رہا ہوں !

اُس کا غمگین چہرہ اکثر میری نیندوں کو اُچاٹ کئے دیتا ہے !

دُنیا دلِ افسردہ کے تاروں کو چھیڑتی ہے تو تار تار سے درد بھرے نغمے نکلنے لگتے ہیں !
میں اک مُدت اُن تاروں کو دیکھتا رہا ہوں جو آسمان پر میرے لئے چمکتے ہیں۔ مگر وائے ناکامی کہ میں نے ہنوز اُس شمع کو روشن نہیں کیا جو میرے ہی تاریک دل میں بیکار پڑی ہے !

اے رات

اے رات ! نقابِ تاریکی میں چھپ جانے والی ! اے رات ! کُنجِ تنہائی میں پھروں

سرنگوں رہنے والی! مجھے اپنا شاعر بنالے اور اُن لوگوں کے بے گائے ہُوئے گیت مجھے گانے دے جو تیرے سائے میں عمروں خاموشی کی داد دیتے رہے۔ آہ! مجھے اپنے اِس بے پہیہ رتھ پر جو ایک دُنیا سے دُوسری دُنیا کو بغیر کسی شورش کے جنبش کئے جاتا ہے سوار کرلے! اے توقت کے قصرِ عالیشان کی ملکہ اے تُو تاریک اداؤں کی حسین دپُرعظمت حسینہ!

آہ! کتنے ہی دردِ تمنا سے پامال ہونے والے دل تیرے وسیع صحن میں داخل ہُوئے اور تیرے بے چراغ گھر میں اپنے خواب آلودہ نصیبے کو بیدار کرنے کی آرزو میں گھنٹوں آوارہ دپریشان پھرا کئے اور کتنے ہی دل ایسے تھے جو کسی مسّرتِ نامعلوم کے تیروں سے چھدے ہُوئے نغمہائے انبساط سے لبریز ہوکر بہہ نکلے اور اُن کی موسیقی کی شیریں آوازوں نے کائنات کی دُور دراز بستیوں میں اک عظیم الشان غلغلہ ڈال دیا!

یہ سب کی سب رُوحانی ہستیاں جواب ہمیشہ کے لئے بیدار ہوچکی ہیں تاروں کی ہلکی ہلکی روشنیوں میں اک حیرت کے ساتھ اُس روزافزوں خزانے کو دیکھتی ہیں جو اُن کی متجسّس نگاہوں نے دفعتہً پالیا ہے! اے رات! شرابِ تاریکی سے مخمور ہونے والی! اے رات بحرِ تنہائی میں مستغرق رہنے والی! مجھے اُن کی بے تھاہ خاموشی کا خوش آواز شاعر بنالے!!

وائے قسمت

وائے قسمت کہ مجھے چین نہیں ہے گھر میں
ماجرا کہتی ہے غُربت کا اِدھر بادِ صبا

ہائے تقدیر مجھے گھر ہی نہیں گھر اپنا
اور اُدھر قصۂ اندوہ سمندر اپنا

نعرہ زن راہ پہ ہے راہرو روزِ ازل
چھوڑ کر زیست کے افکار وطن جاتا ہوں

ہے مرے جی میں بنالوں اُسے رہبر اپنا
موجِ آوارہ کا پیرو ہے مقدر اپنا

جادہ پیما ہے وہ اور اُس کے قدم کی آواز
نعرہ زن رہ پہ ہے میرے لئے دلگیرِ ازل

مجھے پیغامِ سفر دیتی ہے دن بھر اپنا
جی میں آتا ہے بنالوں اُسے دلبر اپنا

عالمِ شباب میں۔ میری زندگی اک پھُول کی مانند تھی، وہ پھُول جو اپنے بھرے خزانے سے ایک دو پنکھڑیاں گرادے اور پھر بھی جب نسیمِ بہار اس کے دروازے آکر دستِ گدائی دراز کرے تو

کبھی اپنے اُس خسارے کو محسوس نہ کرے! ــــــ لیکن اب جبکہ جوانی کے دن ختم ہو چکے ہیں میری زندگی ایک پھل کی طرح ہے کہ وہ کوئی زائد شے نہیں رکھتی اور اپنی پوری شیرینی کے ساتھ اپنے تئیں تیرے حضور قطعی نذر کر دینے کی منتظر ہے!

تُو نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے پہلو میں بٹھا لیا اور تمام لوگوں کے سامنے مجھے اک مرتفع مقام پر جگہ دی یہانتک کہ میں بزدل ہو گیا کہ نہ جنبش کر سکتا نہ آپ اپنا رستہ چل سکتا۔ میں ہر قدم پر شکوک و بحث کرتا مبادا میری کوئی سی حرکت بھی اُن کی ناراضگی کا موجب ٹھیرے۔

بالآخر میں آزاد ہو گیا ہوں مُصیبت میرے سر پر ٹوٹ پڑی طبلِ ہتک بج چکا، میرا مرتبہ خاک میں مل گیا۔ اب میرے رستے میرے سامنے کھُلے ہیں، میرے پر پروازِ آسمان کی تمنا سے پھڑپھڑا رہے ہیں۔ میں نیم شب کے ٹوٹنے والے تاروں کے ساتھ سایۂ عمیق میں غوطہ زن ہونے کو جا رہا ہوں، میں موسمِ گرما کے اُس طوفان زدہ بادل کی مانند ہوں جو اپنا زرّیں تاج پھینک کر ایک زنجیرِ برق پر بجلی کی تلوار آویزاں کئے ہُوئے ہو!

اک پُر وحشت مسرت میں میں حقیر لوگوں کی گرد آلود راہ پر دوڑتا ہوں اور تیرے آخریں خیر مقدم کے قریب تر ہُوا جاتا ہوں۔ بچہ اپنی ماں کو پا لیتا ہے جب وہ اُس کے رحم کو چھوڑ دے، جب میں تجھ سے جُدا ہوتا ہوں جب میں تیرے گھر سے باہر نکال دیا جاتا ہوں تو آزاد ہو کر میں تیرا پیارا چہرہ دیکھ سکتا ہوں!

نامۂ محبت

جب شرابِ نُور سے لبریز تھا جامِ سحر
اَور دیتی تھی صبا پھُولوں کو پیغامِ سحر
جاگ اُٹھی اور محبّت سے ہُوئی سرشار میں
دیکھ کر پہلو میں اپنے نامۂ دلدار میں
میں اسے سمجھوں یہ قدرت میری فطرت میں نہیں
پڑھ سکوں لکھا ہُوا یہ میری قسمت میں نہیں
میں نہ رکھّوں گی کسی عالم کی خلوت میں قدم
فلسفی کے فکر کو دوں گی نہ میں بارِ الم
جی میں آتا ہے رہا دُنیا میں جو محرمِ عشق
پڑھ سکے وہ کِس طرح سے نامۂ منظومِ عشق
دل مرا مضطر ہے سینے سے لگاؤنگی اِسے
طفلِ الفت ہے یہ گودی میں کھلاؤنگی اسے
رات جب خاموش ہو اور آسماں غرقِ نشاط
انجمن میں چھیڑ دیں تارے بھی سازِ انبساط
ہو کے میں مستِ طرب اُس ساعتِ مدہوش میں
اِس کو پھیلاؤں گی اپنی وسعتِ آغوش میں
پتّیاں گُل کی پڑھیں گی نامۂ اُلفت مرا
ندّیاں گائیں گی مل کر نغمۂ راحت مرا
اپنا جھُومر مجھ کو پہنائے گی پرویںِ فلک
پھُول لائے گا مری محفل میں گلچینِ فلک
گرچہ پا سکتی نہیں میں مُدعائے جستجو
گو سمجھ سکتی نہیں ہوں علم کی میں گفتگو
جی مرا ٹھنڈا ہُوا پیغامِ اُلفت دیکھ کر
دل تو اچھا ہُوا لُطفِ محبّت دیکھ کر

زندگی

زندگی کیا ہے؟ بقائے دوام کا بچپن!
اُس کی زندگی دراز ہوجاتی ہے جس کی زندگی نیک ہو۔
علم محبت قوت! یہ ہے مکمل زندگی۔
زندگی فانی ہے اور فن باقی۔
وہ جو ہمیشہ زندہ رہنے کے لئے زندگی بسر کرتا ہے
موت سے ہرگز نہیں ڈرتا۔
زندگی چند روزہ ہے، فن بے پایاں، مواقع گریزاں،
تجربہ مشکوک اور فیصلہ مشکل۔
زندگی اک پُرلطف داستان ہے اُسکے لئے جو غور کرے
اور اک پُرغم کہانی اُس کے واسطے جو محسوس کرے۔
زندگی پر بھی اک حکم لگایا جاسکتا ہے کہ نوجوانی ایک غلطی
ہے شباب ایک جدوجہد اور بڑھاپا ایک پچھتاوا۔
ہماری زندگی عملوں میں ہے سالوں میں نہیں، خیالوں میں نہ
کہ سانسوں میں، احساسات میں نہ کہ دقیانوسی ڈھکوسلوں میں
ہمیں اپنے وقت کو دل کی دھڑکن کے ساتھ شمار کرنا چاہئیے
زندہ زیادہ وہ رہتا ہے جس کے خیال زیادہ اچھے جسکے
احساس زیادہ پاکیزہ اور جس کے عمل زیادہ نیک ہوں!
اگر تم زندگی سے مستفید ہونا چاہتے ہو تو شباب میں پیری
کا تجربہ اور پیری میں شباب کی قوت کو اپنے اندر محسوس کرو!

موت

موت تو محض پھول کا جھڑ جانا ہے تاکہ زندگی کی شاخ میں پھل آئے۔
خدا انسان سے موت کی خوشیاں چھپائے رکھتا ہے تاکہ وہ
زندگی کی صعوبتوں کو آسانی کے ساتھ برداشت کرسکے۔
موت سب کو برابر آتی ہے اور جب آتی ہے تو سب کو برابر کردیتی ہے
یہ دن جس سے تُو اس قدر خائف ہے اور جسے تُو اپنا آخری
دن پکارتا ہے ہمیشگی کی پیدایش کا روز ہے۔
زندگی میں بے دھڑک قدم رکھنا یہ موت ہے اور
مرجانا تو اپنے ہتھیار ڈال دینا ہے۔
موت صرف ایک بار آتی ہے اور ہم عمر بھر اُسکا احساس کرتے ہیں
اگر خدا موجود ہے تو موت دلکش ہے اور اگر وہ موجود نہیں تو
زندگی بے سُود ہے۔
اِس زندگی کی بیداری کے کھیل تو میں دیکھ چکا۔ اب آرزو
ہے کہ موت کی نیند کے نت نئے خواب دیکھوں۔
ہم نہیں جانتے ہم کیا ہوجائیں گے ہم کہاں جائینگے؟؟
ڈر ہمیں ان باتوں کا ہے موت کا نہیں!
موت کے تیروں سے بچنے کی ایک ہی زرہ ہے نیک عمل!
"موت"؟ آسمانی زبان میں اُسے "زندگی" کہتے ہیں!
موت زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ ہم مرتے ہیں تاکہ پھر کبھی فنا نہ ہوسکیں!
خودداری کی موت بے حرمتی کی زندگی سے بدرجہا بہتر ہے۔

گلچیں

ابلیس اور عورت

ایک شخص کو کسی پرانی کتاب سے شیطان کی طلبی کا وظیفہ مل گیا۔ آدمی تھا ارادے کا پکا۔ لگا پوری تن دہی سے وظیفہ رٹنے۔ کسی عابد و زاہد نے اس قدر یک دلی سے خدا کی پرستش نہ کی ہوگی جتنی ان حضرت نے ابلیس بازی میں زحمت اٹھائی فاقوں سے دن کو رات۔ رات کو دن کر دیا۔ ترکیب کا لازمی جزو یہ تھا کہ تیرہ دن کا ایک ہی روزہ اور پھر چودھویں دن شراب سے افطار وہ بھی اس طرح کہ بلا کسی چیز کے کھائے لگاتار چودہ گلاس شراب کے چڑھائے جائیں تب شیطان صاحب نمودار ہونگے چنانچہ اس عامل نے ایسا ہی کیا۔ جونہی اس شخص کی گلاس بازی ختم ہوئی تو اس نے سب سے پہلے اپنے جسم میں ایک غیر معمولی تبدیلی محسوس کی یعنے بجائے اس کے کہ تیرہ دن کے روزے کی کمزوری یا چودہ گلاسوں کے نشے کا کچھ اثر ہوتا اس کا جسم اعلیٰ سے اعلیٰ صحت کی حالت سے بھی ہزار گنا زیادہ چست۔ اس کی آنکھیں بجائے خمار آلود ہونے کے صاف۔ دماغ تر و تازہ اور دل مطمئن تھا۔ اور خود بخود ہی یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ اگر اس قسم کی صحت و طمانیت شیطان صاحب کی ملاقات کا پیش خیمہ ہے تو ملاقات کے پر لطف ہونے میں کچھ شک نہیں۔ اس عمل کے شروع کرنے سے پہلے اسکی نیت تھی کہ شیطان سے دولت۔ حسن۔ حکومت۔ دیرپا جوانی کے حصول میں امداد لی جائے لیکن اب جب کہ وہ وقت اسے قریب معلوم ہوتا تھا تو اس کے دل میں ان خیالات میں سے ایک بھی جاگزیں نہ تھا بلکہ وہ محسوس کرتا تھا کہ شیطان کے سامنے ان خواہشوں سے بھی بڑھ کر کوئی خاص آرزو پیش کرے۔ تاکہ شیطان بھی قائل ہو جائے کہ انسانی نسل نے دنیا میں لاکھوں سال گنوا کر کم از کم ایک فرد ایسا پیدا کیا ہے جس کے خیالات میں جدت ہے۔

یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر انگریزی طریقے سے کسی نے انگلی سے کھٹ کھٹ کی عامل نے حسب معمول بے تکلفی سے Come on (آجاؤ) کہا۔ دروازہ کھلا۔ ایک صاحب بہادر نہایت خوش قطع لباس میں ٹوپی اتارتے ہوئے بصد آن بان وارد ہوئے اور فرمانے لگے" آپ کی محنت کی داد دیتا ہوں۔ اس زمانے میں واقعی بہت کم لوگ اس قدر ثابت قدمی سے اپنے عزم پر قائم رہتے ہیں"

مسٹر شرید۔ عامل کا نام شرید تھا۔ ان کے

وطن یا دیگر تعلقات کا پتہ نہ چل سکا۔ نووارد تھے۔ کرائے کی کوٹھی میں رہتے تھے۔ چند ملاقاتوں میں ان سے یہ تمام واردات معلوم ہوئی۔ اب پھر مفقود الخبر ہیں) یہ آپ کی قدردانی ہے۔ تشریف رکھئے۔ کہیئے کچھ نوش کیجیئے گا؟

شیطان:۔ (اطمینان سے آرام کرسی پر متمکن ہوتے ہوئے) تھینکیو۔ مجھے واقعی پیاس محسوس ہو رہی ہے۔ میں آپ کے پاس سیدھا پریذیڈنٹ ولسن کے ہاں سے آ رہا ہوں۔ اور یہ تو آپ خود ہی قیاس کر سکتے ہیں کہ امریکا سے سیدھا ہندوستان آنا اور رستے میں صرف چند منٹ کے لئے بیت المقدس ٹھہرنا کم از کم پیاس کا موجب تو ضرور ہو گا۔

شریر۔ واللہ آپ نے کافی سفر کیا۔ مگر آپ کے بشرے سے تکان معلوم نہیں ہوتی۔ کیا پیجیئے گا۔ وسکی۔ سوڈا یا کچھ اور؟

شیطان۔ جی نہیں۔ وسکی تو کبھی نہیں پیتا۔ پانی پلوا دیئے ٹھنڈا ہو اگرچہ آپ کے وطن کے پانی سے بھی ڈر لگتا ہے۔

شریر۔ کیا آپ اتنے سفر کے بعد بھی وسکی نہیں پیتے؟ تعجب ہے۔

شیطان۔ واقعی بدقسمتی یا خوش نصیبی سے اس نعمت سے محروم ہوں۔

(لوکر جس کے لئے شریر پہلے ہی بٹن دبا چکا تھا دبے پاؤں داخل ہوا۔ مہمان کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ کیا ارشاد ہو گا اس کے لئے بلا حکم لئے وسکی اور سوڈے کی بوتلوں کی طرف جھکا)

شریر۔ وسکی نہیں چاہیئے۔ اُبلا ہوا فلٹر شدہ پانی۔ ایک گلاس۔

(خادم اعلیٰ درجے کا تربیت یافتہ خادم تھا پھر بھی اس غیر معمولی فرمائش کو سن کر مہمان صاحب کی طرف بہ نظر تحسین دیکھنے سے رک نہ سکا۔ دل میں اس نووارد کی عظمت کا سکہ جمائے ہوئے گیا۔ اور فوراً پانی لا کر پیش کیا)

شریر۔ سگرٹ رکھ دو۔ بس۔

(خادم مشین کی طرح تعمیل کر کے غائب ہوا)

شیطان۔ اس پانی کا کس قدر خوش نما پاکیزہ رنگ ہے۔ آپ کی خانہ داری کا انتظام قابلِ تعریف ہے۔ مسز شریر لاثانی منتظمہ ہیں۔ مجھے لنڈن یاد آ گیا۔

شریر۔ کیوں بناتے ہیں۔ چہ نسبت والا معاملہ ہے۔ لیجئے سگرٹ کا شوق کیجئے۔

شیطان۔ چونکہ پہلی ملاقات ہے اس لئے ضرور آپ کو تعجب ہو گا مگر میں سگرٹ بھی نہیں پیتا۔

شریر۔ (قہقہہ لگا کر) یک نہ شد دو شد

اب تو ضرور میں اپنے دوستوں میں کہہ سکونگا کہ شراب اور سگرٹ نہ پینا شیطانی کام ہیں۔

شیطان۔ آپ سے تو مجھے بڑی بڑی اُمیدیں ہیں نہ یہ کہ آپ اُلٹا مجھے بدنام کرینگے۔

شرید۔ (اور زیادہ ہنس کر) آپ کی گفتگو کس قدر پُر لطف ہے مگر آمدم برسرِ مطلب۔ فرمائیے "مجھے کیا کرنا چاہیئے؟"

شیطان۔ یہ سوال ہمیشہ مجھے بڑی دقت میں ڈالتا ہے۔ اگر میں اپنے ضمیر۔ (ضمیر کا لفظ سُنتے ہی شرید صاحب نے ایک اور بے اختیار قہقہہ لگایا)۔ ہنسیئے۔ ہنسیئے مگر واقعی میرا ضمیر ہے اور وہ کچھ ایسا بُرا بھی نہیں۔ میں بدگمانیوں کا شکار ہوں اور اگر کبھی کسی سے صاف صاف دل کی بات کہتا ہوں تو وہ مجھ پر مُلّا ہونے کا شک کرتا ہے۔ یہ ایذا اور اس پر گالی بھی برداشت کرتا ہوں۔ خیر اگر میں اپنے ضمیر کے مطابق اور آپ کے فائدے کے لئے صحیح مشورہ دوں تو یہی کہوں گا کہ آپ کو مسز شرید کی اس قدر دل آزاری نہیں کرنی چاہیئے۔ مانا کہ وہ اولڈ فیشن کی خاتون ہیں مگر ان میں خوبیاں بھی ہیں اور انسانی زندگی کچھ اسی قسم کی معجون ہے

شرید۔ (The devil کہہ کر رک گیا) معاف کیجئے۔ مگر میں خودمختاری چاہتا ہوں۔ شہرت دولت حکومت اور ان سب سے بڑھ کر نیچر کی پوشیدہ طاقتوں پر کلی اختیار۔ ایسی کوئی رُوحانی کشش کہ انسانی ساختہ مشینوں سے آزاد ہوکر دم زدن میں کبھی مریخ کی سیر کروں۔ کبھی زحل کی کبھی مشتری کی اُنگلی پکڑ کر کہکشاں کے گلستان میں چکر لگاؤں۔ میرے خیال کی پرواز تو یہاں تک ہے اور آپ نے وہی دقیانوسی چھیڑ نکالی کہ بیوی سے دل بہلاؤ اور بیوی بھی ایسی جس کے بال عید شب برات کو بھی نیا فیشن اختیار نہیں کرتے۔ یہ تو میں سمجھتا تھا کہ ملٹن نے جو آپ کا قصہ لکھا ہے وہ فرضی ہے مگر کیا جرمن Goethe کے Faust میں جو آپ کے کرشمے درج ہیں۔ یا وہ جو ماری کوریلی کی کتاب میں آپ کے کارنامے ہیں وہ بھی سب غلط ہیں۔ مجھے افسوس ہوگا اگر میری محنت رائگاں گئی۔

شیطان۔ فاضل شرید۔ وہ قصص بس کسی حد تک ہی درست ہیں۔ مگر میں آپ کو مایوس کرنا نہیں چاہتا۔ جو کچھ آپ چاہتے ہیں اس کے لئے بھی تیار ہوکر آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا تھا "مجھے کیا کرنا چاہیئے؟" میرے خیال میں عورت خاوند ایک ہیں اور آپ کی "مجھے" میں دراصل مسز شرید بھی شامل ہیں۔ اس لحاظ سے میں نے عرض کیا تھا کہ آپ ان کی دل آزاری نہ کریں۔ کیونکہ انکو رنج دینا گویا اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنا ہے

انسان کے لئے دنیا میں رنج و راحت تمامتر اس کے خیالات پر مبنی ہے۔ اب آپ خود ہی . . . . . .

شرید۔ معاف کیجئے قطع کلام کرتا ہوں۔ مگر . . . . . (رُک گیا)

شیطان۔ جی ہاں۔ کہئے۔ آپ کیوں رُکتے ہیں؟

شرید۔ میرا خیال تھا کہ آپ کو میرے مافی الضمیر سے پوری آگاہی ہوگی۔ آپ نے نصیحت بازی شروع کر دی۔ ناصح تو لاکھوں ہیں۔ آپ چارہ ساز بنئے۔

شیطان۔ اچھا آنکھیں بند کیجئے۔

(اگلا حصہ مسٹر شرید کی ڈائری سے لفظ بلفظ نقل ہے)

"مجھے آج ڈاکٹر نے ٹھیک دو دن کی سخت بیماری کے بعد اجازت دی ہے کہ میں صرف ایک گھنٹہ کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کر دوں۔ ڈاکٹر سب پاگل ہیں۔ ان کی تشخیص یہ تھی کہ زیادہ شراب نوشی سے مجھے ہذیان لاحق . . . . ہوا۔ مجھے غش یا بیہوشی جو کچھ ہوئی وہ محض ایک صدمے سے۔

اس وقت تنہائی ہے۔ میرا دماغ صاف ہے اور میں اس ڈائری کو ٹھیک اسی لمحے سے شروع کرتا ہوں جب شیطان نے مجھے کہا۔ کہ "اچھا آنکھیں بند کرو" آنکھیں بند کرنے کے بعد کے واقعات مجھے پورے پورے یاد ہیں اور ایسی طرح کہ میں اُن کو کبھی ہزار کوشش سے بھی بُھلا نہیں سکتا۔ میری جسمانی صحت اِس وقت کامل بلکہ اکمل حالت میں تھی اور اب گو میں کمزور ہوں مگر کمزوری صرف جسمانی ہے۔ میں نے آنکھیں بند کیں۔ شیطان کے کُرسی سے اُٹھنے کی آہٹ مجھے سُنائی دی۔ اس نے میرے سر پر نہایت نرمی سے مگر مضبوطی سے اپنا سرد ہاتھ رکھا۔ اس ہاتھ رکھنے کی دیر تھی کہ میری آنکھیں پھر کُھلیں مگر میرا کمرہ نہ تھا۔ مجھے اچھی طرح دکھائی دیا کہ میرا لباس بھی متغیر تھا۔ پھر جو میں نے غور کیا تو معلوم ہُوا کہ کسی قسم کی سواری میں ہم نہایت سرعت سے ہوا میں سفر کر رہے ہیں۔ یہ سواری ہوائی جہاز سے مشابہ نہ تھی بلکہ الف لیلہ کی اڑنے والی قالین یا طلسم ہوش ربا کے ساحر بادشاہ افراسیاب کے تخت کے طریق کی تھی۔ شیطان کا لباس بھی متغیر تھا۔ وہ بڑی رعونت سے ایشیائی طریق پر اس تخت کی صدر کی جگہ تکیہ لگائے بیٹھا تھا۔ تخت میں خفیف حرکت معلوم ہوتی تھی مگر یہ صاف ظاہر تھا کہ سیدھا بلندی کی طرف لاکھوں میل فی سکنڈ کی رفتار سے بڑھ رہا ہے۔ مجھے کچھ اچنبھا نہ معلوم دیا۔ شیطان نے یوں گفتگو شروع کی۔

شیطان۔ کہئے کچھ اس طریق سفر سے تکلیف تو نہیں؟

میں۔ جی نہیں۔ کہاں چل رہے ہیں؟

شیطان۔ ایک ملکہ سے آپ کی ملاقات کراتا ہوں۔

شیطان کا یہ کہنا تھا کہ تخت ایک عجیب غریب باغ کے دروازے پر رُک گیا۔ ہم اُتر کر داخل ہوئے۔ باغ کی چار دیواری سے ملحق اندر کی جانب کھلے ہوئے۔ ہزاروں دلفریب دالان نما کمرے تھے۔ دائیں طرف ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں دو عورتیں تھیں۔ دونوں ہم شکل ایک قطع۔ ایک لباس۔ ایک عمر مگر اُن میں جو برائے نام بڑی معلوم ہوتی تھی وہ دوسری کو سخت بیرحمی کے ساتھ گھور رہی تھی۔ جو بیچاری اس غضب آلود نگاہ کا نشانہ بن رہی تھی وہ سخت بے بسی کی حالت میں بلا چون وچرا اس قہر کو برداشت کر رہی تھی۔ میں سخت متعجب ہوا۔ کچھ سوال کرنیکو تھا کہ شیطان نے اشارے سے کہا پہلے دیکھ لو۔

دوسرے کمرے میں داخل ہوئے وہاں بھی دو عورتیں۔ ایک قطع۔ ایک لباس ایک آن۔ جو پہلے کمرے میں ذرا بڑی تھی وہ یہاں ذرا چھوٹی تھی۔ یہاں والی بڑی ملکہ چھوٹی ملکہ پر نہایت سفاکانہ طریق سے روحانی تشدد کر رہی تھی۔

سینکڑوں بلکہ ہزاروں کمروں میں آن واحد میں ہم گزرے سب جگہ یہی دیکھا کہ دو ہم شکل ایک ظالم ایک مظلوم۔ اخیر میں ایسے بھی بہت سے کمروں میں سے گذر ہوا جہاں دو ہم شکل لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ کھیل میں مصروف ہیں میں بہت سوال کرنا چاہتا تھا مگر شیطان مجھے روک دیتا تھا سب سے اخیر میں ایک ایسے کمرے میں داخل ہوئے جہاں ایک حسن وجمال کی پری ایک کتاب پر نگاہ جمائے بیٹھی تھی۔ کتاب کے ورق بغیر اسکی کوشش کے خود بخود بڑی سرعت سے اُلٹے جا رہے تھے۔ بعض صفحوں کو وہ چاہتی تھی کہ زیادہ دیر تک دیکھے مگر کتاب کے ورق اُلٹنے والی طاقت اس خواہش سے آزاد تھی اور وہ شاہزادی بامر مجبوری اس کتاب کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے بڑھ کر اس کتاب کو دیکھا۔ فوراً سمجھ میں آگیا کہ جتنے کمروں میں سے جو حالت دیکھ کر میں گذرا ہوں یہ کتاب ان کمروں کی حالت کا مرقع ہے۔ اِتنا دیکھا اور بیتابی سے باہر نکلا۔

شیطان مسٹر شریر! یہ ملکہ نورجہاں ہیں۔ اس باغ میں اِتنے کمرے ہیں جتنے نورجہاں کی زندگی میں دن تھے۔ سوائے بچپن اور زندگی کے ابتدائی حصّے کے باقی تمام دن اس ملکہ کی یہ کیفیت تھی کہ منگل کی نورجہاں پیر کی نورجہاں کو ملامت کرتی تھی۔ اور بدھ والی نورجہاں منگل والی نورجہاں کو ایذا دیتی تھی۔ انسانی خواہشوں کا

خاصہ ہے کہ دو دن بھی ایک اصول پر قائم نہیں رہتیں۔ چنانچہ یہ لاثانی عورت بھی اس مرض میں مُبتلا تھی۔ اور اب اس کی آنکھوں کے سامنے تا قیامت اس کی زندگی کا ڈراما ہوتا رہیگا۔ کیا تم اس کی حسرت کا اندازہ کر سکتے ہو۔ ہرگز نہیں۔ یہ یاد رکھو کہ یہ ملکہ بمقابلہ دیگر فرمانرواؤں کے ہزار درجہ بہتر تھی اور یہی وجہ ہے کہ میں نے تم کو ایک اچھا نمونہ دکھلایا ہے۔

مَیں۔ کیا کوئی اِنسان ایسا بھی گذرا ہے جس کی ساری زندگی ایک اصول پر بغیر تغیر کے گذری ہو؟

شیطان۔ لاکھوں۔ سب سے بہتر مثال رسُولِ عربی کی ہے مگر وہاں نہ میں جا سکتا ہوں نہ تم۔ لیکن ہزاروں ڈاکو اور چور بھی ایسے ہُوئے ہیں جن کے عزم میں، خواہشوں میں۔ ذرائع میں تغیر نہیں ہُوا۔ جن کا ایک دن دوسرے دن کا قاتل نہیں ہُوا۔ مگر عام طور پر انسانی زندگی یہی ہے کہ . . . . نہیں تمہیں لفظوں سے نہیں بتلاتا۔ صحیح صحیح دکھلا دیتا ہوں۔

یہ کہکر شیطان نے ایک کتاب میرے سامنے رکھ دی۔ میرے کئی دوستوں کی متحرک تصویریں اس کتاب میں نظر آئیں۔ سب کو یہی کرتے دیکھا کہ جو ایک دن بوتے دوسرے دن اسی کو اکھاڑتے حیران ہو گیا کہ افسوس ہماری آنکھیں کس قدر بند ہیں۔ مثلاً میرے دوست غندل کی کئی سو تصاویر اس کتاب میں تھیں۔ ہر تصویر میں وہ بڑی تندہی سے اپنے کام میں مشغول تھے مگر کام سب جگہ یہی کہ جو ایک دن کیا اسے دُوسرے دِن مٹایا۔

شیطان۔ یہ تو انسانی زندگی کا معمولی نمونہ ہے۔ آؤ تمہیں عمر خیّام سے ملائیں۔

ایک ندی نمودار ہوئی کیا دیکھتا ہوں کہ ندی کے دونوں طرف ہزارہا انسان بیٹھے ہیں غور سے دیکھا تو معلوم ہُوا کہ گو شکلیں ہزاروں ہیں۔ مگر شخص ایک ہی۔ ہر شکل ندی سے پیالے بھرنے میں مصروف تھی۔ جام بھرے جا رہے ہیں۔ اور رکھے جا رہے ہیں۔ نہایت شد و مد سے۔ اور کوئی کام نہیں۔ شیطان نے مسکرا کر پوچھا کہئے حضرت کیا حال ہے؟ سب نے متفقہ جواب دیا "جی سخت متردد ہوں۔ یہ نایاب شراب بہہ رہی ہے۔ اسے پیالوں میں سمیٹ لوں تو پھر پیُوں"۔ یہ جواب میں نے سُنا اور پھر شیطان میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"دیکھو مسٹر شرید! یہ شخص سینکڑوں برس سے اسی کام میں لگا ہُوا ہے۔ اسی دُھن میں ہے کہ ندی کو ساغروں میں بھر کر رکھلے پھر پیئے تاکہ کچھ ضائع نہ ہو اور ندی ہے کہ بہے جا رہی ہے

بیچارہ لگا رہیگا اسی طرح۔

میں۔ افسوس ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ شخص تو سعیِ لاحاصل کی مُصیبت سے آزاد ہو گا۔

شیطان ۔ یاد رکھو کہ خیام نوعِ انسان کے برگزیدہ لوگوں میں سے تھا اور اس کا یہ حال ہے

اس واقع کو دیکھ کر میرے دل پر سخت مایوسی طاری ہُوئی کہ ایک طرف سے قہقہہ کی آواز سُنائی دی۔ دیکھا تو سینکڑوں ہمشکل لڑکے بے تحاشا ہنس رہے ہیں۔ شیطان کی طرف میں نے بنظرِ استفسار دیکھا۔

شیطان۔ کیا تم نے نہیں پہچانا ۔ یہ ظہیر الدین بابر ہیں۔ ارادے کا پکّا تھا مُصیبت میں بھی ہمت نہ ہارتا تھا۔ بڑھاپا اس کے شباب کو زوال نہ دے سکا۔ یہ ہمیشہ جوان اور خوش رہیگا یاد رکھنا کہ عالمِ ارواح میں بھی کسی کو مستقبل کی خبر نہیں۔ چنانچہ بابر کو بھی کچھ پتہ نہیں کہ اس کے بعد کیا ہُوا۔ شخصی زندگی کا پہلا اور آخری اصول یہ ہے کہ ہر شخص اپنے خیالات کا ذمہ دار ہے افعال یا ان کے نتائج کا ذمہ دار نہیں۔ افعال و نتائج انسانی ارادے سے آزاد ہیں۔

مَیں۔ یہ تو نیا قانون ہے۔

شیطان۔ نیا ہو یا پُرانا۔ ہے صحیح۔

میں۔ مگر جب نتائج کی ذمہ داری نہیں تو ذمہ داری کیا خاک ہُوئی؟

شیطان۔ واقعی باوجود کافی علمیت کے تمہاری سمجھ ابھی خام ہے۔ بیشتر حصہ انسانوں کا اسی غلطی میں ہے کہ انہیں دُنیا میں کچھ کر کے دکھلانا ہے۔ حالانکہ صحیح بات اتنی ہے کہ ہر انسان اپنی ہستی کا اڈیٹر ہے۔ اور اُسے دیکھنا یہ ہے ۔ کہ اس نے اس جزوِ عالم کو کس طرح اڈٹ کیا۔ دولت حکومت ۔ اصلاح تمہارے اختیار میں نہیں کبھی نہیں پوچھا جائیگا کہ تم نے اوروں کے لئے کیا کیا؟ بلکہ صرف یہ کہ تم خود کیا بنے؟ کیا سال۔ دس سال بھر کی متواتر کوشش سے اتنا بھی نتیجہ پیدا ہُوا؟ کہ تمہارے خیالات میں حسن و اطمینان کی جھلک پہلے سے بیشتر ہُوئی۔ نور جہاں کے پاس سب کچھ تھا۔ اس نے تمہارے معیار سے ہزاروں نیکیاں کیں مگر اس کے خیالات اکثر اسفل رہے۔ اسے حکومت ۔ دولت۔ فرمانروائی کے جال سے کبھی آزادی نہ ہُوئی۔ تم اپنی نسبت سوچو کہ آج سے دس سال پہلے کے اور آج کے تمہارے خیالات میں کچھ بیّن فرق ہے؟ کچھ عروج ہے؟ ہرگز نہیں ایک بھی سوال ان دس سالوں میں تم طے نہیں کر سکے ۔ ابھی تک تم نے اس بات کا فیصلہ بھی یقینی طور پر نہیں کیا کہ آیا زندگی اس قابل بھی ہے کہ انسان اس کا بوجھ برداشت کرے۔

کوئی اصول تمہارے نزدیک فیصلہ شدہ نہیں اور اگر ہے تو صرف چند منٹ کے لئے۔ افسوس ہے کہ تم لوگ اپنے عارضی مکانوں کی بنیاد تو مستحکم بناتے ہو مگر خیالات کی بنیاد ہمیشہ ہوائی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ متزلزل"۔

میں کچھ کہنے کو تھا کہ ایک طرف سے ایک نہایت خوشنما مسجد نظر آئی۔ شیطان نے مجھے اجازت دی کہ میں تنہا جا کر دیکھ آؤں۔ اندر داخل ہوا تو ایک متبرک صورت پیر مرد وضو میں مصروف ہیں۔ فرشتہ نما لڑکے اور لڑکیاں ایک طرف سبق کی تلاوت کر رہے ہیں۔ مجھے خیال ہوا کہ پہلے شیطان سے ان بزرگ کی ہسٹری معلوم کر دوں۔ باہر نکلا۔ شیطان سے پوچھا یہ کون ہیں؟

شیطان۔ یہ ایک گمنام شخص تھا "الصلوٰۃ خیر من النوم" کا سچا عاشق۔ اس راگ کو دوسروں سے سنتا۔ آپ سناتا۔ اور اس پر عمل کر کے دکھلاتا ہر وقت کام میں لگا رہتا تھا۔ چنانچہ ساری عمر اسے کبھی فرصت ہی نہ ملی کہ اپنے لئے متاع دنیا میں سے کچھ جمع کرنے کا خیال بھی کرے۔ شیطان کے ان الفاظ سے خود بخود میری زبان پر لفظ "ابا" آنے کو تھا کہ یکایک مجھے سخت حیرانی ہوئی کیونکہ میں پھر اپنے کمرے میں تھا۔ شیطان اسی طرح میرے سامنے آرام کرسی پر تھا۔ پانی کا گلاس جو ابھی میرے نوکر نے اسے دیا تھا نیم پر تھا۔

شیطان۔ میں نے آپ کو آنکھیں بند کرنے کے لئے کہا تھا آپ تو سو ہی گئے۔

میں سمجھ گیا کہ یہ ان حضرت کی شعبدہ بازی ہے۔ مجھے سب کچھ دکھلا بھی دیا اور پھر اپنے آپ کو الگ بھی ظاہر کر دیا۔ گویا کہ نورجہاں وغیرہ کی ملاقات خواب میں میرے ہی خیالات کے تلاطم کا نتیجہ تھی یہ جونہی میرے چہرہ سے ظاہر ہوا تو شیطان بولا۔

شیطان۔ جی نہیں۔ واقعی آپکا قیاس غلط ہے۔ مجھے شعبدہ بازی نہیں آتی۔ مجھے بھی کیا آپ نے پیر یا جوگی مقرر کیا ہے۔

میں۔ اس وقت تو آپ نے میرے دل کی بات معلوم کر لی۔ پھر اور جو کچھ میرے دل میں ہے اسے آپ کیوں پورا نہیں کرتے میں فلسفہ بازی سے سخت گھبراتا ہوں۔ آپ چاہے مجھے ہزار یقین دلائیں کہ آپکی شعبدہ بازی نہیں اور نورجہاں وغیرہ کے متعلق جو کچھ میں دیکھ چکا ہوں وہ میرے پریشان خیالات کا عکس ہے مگر میں خوب جانتا ہوں کہ آپ ہی کی کارستانی ہے۔

شیطان۔ اچھا یونہی سہی۔ میں تو بھی چاہتا ہوں کہ ہر شخص اپنی ہٹ پر قائم رہے مجھے اس سے زیادہ کیا کامیابی ہو گی کہ جس

بُرائی دہٹ! کے عوض "معلم الملکوت" کے درجہ سے میری معزولی ہُوئی وہ بُرائی سب انسانوں میں پیدا ہو۔

مَیں۔ حضرت۔ یہ چُہل کسی اور کو دیجیئے۔ آپ کیوں خیال کرتے ہیں کہ میں اُن گنوار گھامڑوں میں سے ہوں جن کے ارادہ میں آپ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے تغیر پیدا کر سکتے ہیں۔ میں طاقت چاہتا ہوں۔ وہ طاقت جو مجھے نیچر پر غالب کر دے۔ تمام جہانوں میں ایک خدا کی طرح پھروں۔ چاہوں تو زمین کو سورج کی غلامی سے۔ چاند کو زمین کی قید سے آزاد کر دوں۔ قطبی تارے کو جنوب بھیج دوں کہکشاں سمیٹ لوں۔ مریخ کو زحل۔ زحل کو آفتاب۔ آفتاب کو پاکٹ لمپ بنا دوں۔ آپ کیا باتیں کرتے ہیں مجھے اخلاق سے نیکی سے۔ خیالات کی پاکیزگی سے کیا تعلق؟ میں ان چیزوں سے بالاتر ہونا چاہتا ہوں۔ وہ طاقت چاہتا ہوں جو اپنے لئے خود قانون ہو۔ آپ اپنے پُرانے دقیانوسی وتیرے کو چھوڑیئے۔ انسانی دماغ اب وہ نہیں کہ دُنیاوی جاہ و حشم کے واسطے شیطان کی مدد کا محتاج ہو مجھے افسوس ہوگا اگر یہ نتیجہ نکلا کہ اتنے لکھوکھا سال میں انسان نے تو آخر کچھ نہ کچھ ترقی کی مگر شیطان صاحب بقول آپ کے وہی مکتب کے مُلا رہے۔

شیطان۔ اب مجھے تسلیم کرنا پڑیگا۔ کہ آپ کی گفتگو بڑی پُرلطف ہے۔ جو باتیں ہزاروں سال ہُوئے مصر میں سُنی تھیں وہ آج پھر ہندوستان میں ایک نئی شان سے پیدا ہیں۔

میں۔ ہیں! کیا یہ خیالات کبھی پہلے بھی کسی نے ظاہر کئے ہیں؟

شیطان۔ کئی دفعہ۔ اگر بالکل یہ نہیں تو ان کے قریب قریب لیکن آپ کو یہ خیال کرکے اگر خوشی ہوتی ہے کہ یہ خاص آپ کی جدت طبع کا نتیجہ ہیں تو آپ میری بات باور نہ کیجئے۔ اپنے خیال پر قائم رہیئے۔

میں۔ جدّت ہو یا نہ ہو۔ یہی خیال ہیں جو ایک بلند حوصلہ انسان کو باقی لکیر کے فقیروں سے تمیز کرتے ہیں۔ میں طاقت چاہتا ہوں۔ ایسی جو تمام کائنات کی کایا پلٹ دینے کے لئے کافی ہو۔

شیطان۔ میں آپ کی مدد کے لئے تیار ہوں۔ وہ طاقت حاصل ہو سکتی ہے۔ صرف محنت اور وقت درکار ہے۔

مَیں۔ (بڑے زور سے) محنت کے لئے تیار ہوں۔ کیسی ہی مشقت کیوں نہ ہو۔ مگر یہ بتلاؤ کہ وقت کتنا لگیگا؟

شیطان۔ جی زیادہ نہیں۔

میں۔ (بڑی بے تابی سے) پھر بھی کتنا؟

شیطان۔ بس یہی دس بیس لاکھ سال۔ جونہی یہ لفظ مجھے سُنائی دیئے میرا کلیجہ

پاش پاش ہوگیا مگر پھر بھی میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بڑے جوش سے کہا۔

"اچھا کیا ہوا۔ میں مر کر پھر پیدا ہوں گا۔ اور ضرور اس طاقت کو حاصل کرونگا میں انسانی نسل کی صدا ہوں۔ ضرور بالضرور آخرالامر انسان کو وہ خدا بنتا ہے جس کی تعریف میں متبرک کتابیں پُر ہیں۔"

اسی جوش اور مایوسی کے صدمے سے میں بیہوش ہوا تھا نہ کہ شراب سے۔ اب میں تھک گیا ہوں اور سوتا ہوں۔

شریدکی ڈائری کا دوسرا حصہ

میری بیوی میری بیماری میں اور کل جب مجھے ڈاکٹر نے لکھنے پڑھنے کی اجازت دی پروانہ وار مجھ پر نثار ہوتی رہی۔ باوجود اس کے کہ میں موقع بے موقع اسے جتلاتا رہتا ہوں کہ وہ سخت پھوڑ ہے۔ نااہل ہے۔ شکل کی سیدھی ہے اسکی اطاعت و فرمانبرداری اور خدمت میں سرِمو فرق نہیں آتا اس پر میرے جور و جفا کا کچھ اثر ہی نہیں۔ اگر میں دُنیا بھر میں بہترین خاوند ہوتا تو بھی کوئی بیوی میری اس سے زیادہ خدمت نہ کرتی جو بانو کرتی ہے۔ آج صبح میری طبیعت پھر اصلی رنگ پر تھی۔ عارضی بیماری کی کمزوری قریباً دور ہو چکی تھی۔ واقعی بانو کو محض خفیف کرنے کے لئے اسے میں نے کل کی ڈائری سُنائی اور اس سے ماقبل کے واقعات کا ذکر کیا۔ ڈائری اور سرگذشت سن کر کچھ گفتگو ہم دونوں کے درمیان ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ اس گفتگو سے میری زندگی آئندہ کے لئے بالکل بدل جائیگی۔ بانو نے مجھے وہ دیدیا ہے جو کوئی بادشاہ۔ کوئی ولی۔ کوئی مذہب کا بانی نہیں دے سکتا۔ بانو۔ بانو کس قدر میری عقل پر پردہ تھا۔ اور کس آسانی سے بانو تو نے وہ پردہ دُور کردیا ہے۔ آئندہ میں تجھے پیار نہیں کرونگا۔ بلکہ تیری پرستش کرونگا۔ تیری گفتگو صرف اس لئے قلمبند کرتا ہوں کہ مجھے اس کا کوئی جملہ بھول نہ جائے۔ اور مجھے یہ بھی یاد رہے کہ میں تو تجھے خفیف کرنا چاہتا تھا مگر تو نے مجھے اسفل السافلین سے اُٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا۔ نہ تیرے دل میں انتقام کا خیال آیا نہ تیور پر بل نہ آنکھ میں آنسو۔ بانو بانو تو عورت نہیں فرشتہ ہے۔

بانو۔ (ڈائری سُن کر) شیطان نے ناحق آپ کے دل میں وسوسہ ڈالدیا ہے کہ آپ میری دل آزاری کرتے ہیں۔ (میرے پاؤں پر سر رکھ کر) اگر کبھی اپنی کسی حرکت سے مجھ بیوقوف نے آپ پر یہ ظاہر کیا ہے کہ آپ میری دل آزاری

کر رہے ہیں تو ﷲ آپ معاف کریں۔ میں آپ کی
کنیز ہوں۔

(میں نے جلدی سے بانو کا سر پاؤں سے
ہٹا لیا۔ وہ اپنی دھیمی صادق آواز سے پھر بولی۔)

میں آپ کی ایک محبت کی نگاہ کی قیمت
ساری عمر کی خدمت سے ادا نہیں کر سکتی۔ اور
ایک کیا ایسی سینکڑوں پیار کی نگاہوں کی یاد
میرے دل میں ہے۔ میری جان کے مالک! کیا
آپ کے خیال میں بنت رسولؐ کی نام لیوا
مسلمان خاتونیں ایسی گئی گذری ہوگئیں؟ ہرگز
آپ یہ خیال نہ کریں۔ ہر سمجھدار مسلمان خاتون
کا فرض ہے کہ وہ اپنے شوہر کی خاطر اپنے آپ کو
بالکل محو کر دے۔ مجھ میں تو ہزاروں کمزوریاں
ہیں سخت نا مسلم ہونگی اگر جیسے آپ ہیں اس پر
فخر نہ کروں بلکہ اُلٹا گلہ کروں۔ پیار کے جواب
میں، یا پیار کی اُمید میں یا راحت و آرام کے عوض
میں خدمت کی تو کیا کی؟ رنج میں راحت میں۔ بھوک
میں پیاس میں۔ تشدد میں۔ تکلیف میں۔ شوہر کی
سچے دل سے عزت کرنا۔ اس کی غمگسار بن کر اس کی
ہمہ تن خدمت کرنا مسلمان خاتونوں کا خاصہ ہے۔
میں اس نصب العین سے بہت دُور ہوں۔ مگر
یہ میرا مذہب ہے۔ اللہ میری کوتاہیوں کو معاف
کرے آپ کبھی بھول کر بھی خیال نہ کریں کہ میں
ناخوش ہوں۔ یا کبھی ہوئی۔ صرف مجھے اپنی خدمت
کی عزت کا موقع دیتے رہیئے۔ اور میں کچھ نہیں
چاہتی۔ ہاں چاہتی ہوں اپنی گذشتہ غلطیوں کی
معافی۔ آپ کی صحت۔ آپ کی خوشی۔ آپ کی
عزت۔ آپ کے لئے سب کچھ چاہتی ہوں۔
بہت زیادہ چاہتی ہوں۔ اپنے لئے صرف آپ کی
خدمت۔ اگر مجھ سے خدمت میں کوتاہی ہوئی تو
قیامت میں آپ کے والد کو کیا مُنہ دکھاؤں گی؟

میں۔ بانو بانو۔ خدا کے لئے ایسی باتیں
نہ کرو۔ میں تمہارا سخت قصوروار ہوں۔ تم مجھے
معاف کرو۔

بانو نے میرے مُنہ پر اپنا ملائم ہاتھ رکھدیا
اور کہا توبہ توبہ۔ لونڈی سے بھی کوئی معافی مانگتا
ہے" یہ لفظ اس نے بالکل بلا تصنع کہے اسکے
دل سے نکلے۔ آخر میں نے اسکا ہاتھ پرے
کیا اور کہا " بانو! لونڈی نہیں ملکہ بلکہ ہادی۔ اب
زیادہ میں کچھ نہیں کہتا مگر کوشش کرونگا کہ اس
قابل بنوں کہ تمہاری جیسی فرشتہ خصلت بیوی
کے قدم بقدم چلوں۔ اگر اسلام تمہاری جیسی خاتونیں
پیدا کر سکتا ہے تو مسلمان ہونے سے بڑھ کر دُنیا
میں کوئی عزت نہیں۔ آج سے الحاد کو رخصت
بانو بانو۔ تیرا دل خدا نے اپنے ہاتھ سے بنایا
ہے۔

شرید کی ڈائری کا تیسرا حصہ

میری زندگی میں کس قسم کے عجائبات کا ظہور ہو رہا ہے؟۔ آج صبح میں اُٹھا تو میرے میز پر ایک خط پڑا تھا حالانکہ میرے کمرے میں کوئی شخص داخل نہیں ہوا تھا۔ اس خط کو تین چار دفعہ میں نے شروع سے آخر تک بڑے غور سے پڑھا اور پھر رکھ کر بانو کو بلانے گیا۔ ابھی کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا کہ مُڑتے مُڑتے اسی جگہ پر نظر کی جہاں خط رکھا تھا۔ دیکھا تو خط غائب۔ اب اس کا مطلب قلمبند کرتا ہوں۔ خط میرے نام شیطان کی طرف سے تھا۔

خط

ڈیر مسٹر شرید!۔ میری خود پسندی۔ میری غیر معمولی کامیابی سے اور بھی چمک اُٹھی ہے اور مَیں خلافِ عادت آج ایک انسان کو اپنا محرمِ راز بناتا ہوں۔

سُنئے۔ لاکھوں برس میں اسی دھوکے میں رہا کہ بہشت والے معاملے میں مَیں مظلوم تھا اور خدا ظالم۔ بزعمِ خود مجھے یہ سچی شکایت تھی کہ حوا نے مجھے ورغلایا اور اُلٹا مشہور کر دیا کہ میں نے اسے بہکایا۔ میں دانت پیستا تھا۔ کہ کس قدر بہتان ہے کہ آدم بہشت سے نکالا گیا۔ آدم اور آدم کی اولاد نے میرے ذریعہ سے دُنیا میں آکر ہزاروں خود ساختہ باغِ ارم بنائے۔ جس گھر میں شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے سچے عاشق وہیں بہشت۔ ایک بہشت چھوڑی اور لاکھوں پائیں۔ بنی نوع انسان کو میرا ممنون ہونا چاہئیے تھا نہ یہ کہ اپنا مطلب تو نکال لیا اور مجھے بدنام کر دیا۔

یہ میرا وہم میری سزا تھی۔ میرا دوزخ تھا اور اس میرے وہم نے واقعی مجھے شیطان (جیسا کہ میں مشہور ہوں) بنا دیا تھا۔ خدا کو میں ہمیشہ "بڈھے دشمن" کے جملے سے یاد کرتا اور اس کی ہر بات کو ایک چکمہ سمجھتا۔ لاکھوں برس انسانی رُوح کا شکار میرا کھیل رہا مگر وہ زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ اور اس کے خاتمے کی داستان بھی عجیب ہے۔

غور سے سُنئے۔ ایک دن محض اتفاقیہ طور پر میں اپنی گذشتہ زندگی پر نظر ڈال رہا تھا۔ اور خیال کر رہا تھا کہ گو خدا سے جنگ کر کے میں نے پے در پے زک اُٹھائی مگر لاکھوں کروڑوں انسانی روحیں تو مجروح کیں اس خیال سے میں خوش رہا تھا کہ الٰہی قہقہہ نے مجھے بدمزہ کر دیا۔ مجھ پر صاف واضح ہو گیا کہ دراصل ایک روح کا بھی ان لاکھوں سالوں میں کچھ نہ بگاڑ سکا۔ جو گیا سوا اپنے ہاتھوں۔ میری شیطنت کا کسی کے

زوال پر کسی کے گناہ پر سرِ مو بھی اثر نہ تھا۔ لاکھوں سال میں محض اپنے آپ کو دھوکا دیتا رہا۔ اس دن مجھے پتہ لگا کہ میری ہستی ایک قلمزن شدہ حرفِ غلط سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ ایک آخری کوشش میں نے کی اور وہ یہ کہ ایک واقعی سچی مسلمان دل عورت کے ایمان میں خلل ڈالوں۔ تمہیں پتہ ہے کہ کیا نتیجہ ہوا؟ ہرگز نہیں وہ نیک نہاد ویسی ہی پاک صاف رہی اور بجائے اس کے کہ وہ مایوس ہوتی اس نے اپنے دشمنوں کے حق میں یہ دعا کی کہ "یا الٰہی میرے دشمن بے سمجھ ہیں انہیں نیک توفیق دے۔ اور شیطان جو انہیں درغلاتا ہے اسے بھی راستی کی ہدایت کر"

یہ دعا اس نے ایسے وقت کی جب کہ میں اپنے دل میں پیچ و تاب کھا کر یہ کہہ رہا تھا کہ "کمبخت مسلمان قوم مٹتے مٹتے بھی کس قدر دیر لگا رہی ہے۔ نہیں مٹے گی جب تک کہ ایک بھی ایماندار عورت اس قوم میں باقی ہے"

میرا یہ خیال اور ایک نیک عورت کی یہ دعا۔ میں جو کبھی اپنے کئے پر منفعل نہ ہوا تھا جسکی لغت میں ندامت کا لفظ معدوم تھا اس دن مرگیا۔ اس دن سے میرا عہد ہے کہ جہاں کہیں نیک عورت کو پاؤں اسکی خدمت کروں۔ "حوّا" پر بدگمانی کرنے کا کفارہ یہی ہے کہ اس کی نیک اولاد کی خدمت کروں۔

یہ وجہ تھی کہ مسز شرید کے اور آپکے درمیان مصالحت کرانیکی آرزو میرے دل میں تھی۔ میں نازاں ہوں کہ مجھے آپ کے معاملے میں کامیابی ہوئی اور پوری"

یہ تھا شیطان کا خط۔ جب ابلیس بھی نیک خاتون کا ممد ہو تو لعنت ہے ان پر جو ایسا خیال کریں جن سے شیطان توبہ کر چکا ہو۔

عبدالعزیز

تبدیلِ قسمت

۱

سُلطان سنگھ نے استقلال بھرے لہجہ میں کہا۔ "میں ایک سال کے اندر اندر اپنی قسمت تبدیل کرلونگا۔"

ساگرچند جوش کی حالت میں تیر کی مانند تن کر کھڑا ہوگیا اور تھرتھرائی ہوئی آواز میں بولا "تم مذاق تو نہیں کر رہے۔"

"یہ مذاق کا موقعہ نہیں۔"

"تو تم سنجیدگی سے کہہ رہے ہو۔؟"

"واقعی۔"

"تمہیں اُمید ہے کہ ایک سال کے عرصۂ قلیل میں کامیاب ہو جاؤگے؟"

"سولھوں آنے۔"

"آج کیا تاریخ ہے؟"

سلطان سنگھ نے دیوار کے ساتھ لٹکے ہوئے ایک میلے سے کیلنڈر کی طرف دیکھ کر کہا "۳۰ اکتوبر ۱۹۱۲ء"

"تو یکم نومبر ۱۹۱۳ء کا سورج تمہیں غریب نہ دیکھیگا۔"

"بالکل نہیں۔"

سُلطان سنگھ ان اشخاص میں سے تھا جنہیں لوگ شریف بدمعاش کہتے ہیں۔ کبھی اس نے بہت اچھے دن دیکھے تھے۔ اس کا باپ دولت رام شہر کے ممتاز رُؤساء میں سے تھا۔ اِس کے پاس روپے کی کمی نہ تھی۔ صدر بازار میں تین دکانیں تھیں۔ دو مکان۔ بنکوں میں روپیہ اس کے علاوہ تھا۔ مگر اتنا ہی نہیں۔ اس کا دل متاعِ دیانت و حسنِ شرافت سے بھی مالا مال تھا۔ جب تک زندہ رہا۔ اس کے نام کی سارے شہر میں پُوجا ہوتی رہی۔ لیکن اُدھر اس نے آنکھیں بند کیں۔ اِدھر سُلطان سنگھ نے اس کا روپیہ اُڑانے پر کمر باندھ لی۔ دولت رام کی پیش بندیوں نے سُلطان سنگھ کو کبھی حد اعتدال سے متجاوز نہیں ہونے دیا تھا اُس وقت وہ ایک طائرِ بے بال و پر تھا۔ جس کی بے بسی سے زیادہ دردناک اس کی حسرتِ پرواز تھی دولت رام کی وفات نے اس کو پر لگا دیئے۔ دو سال تک کھُل کر عیش کیئے۔ اور اپنے دِل کے ارمان نکالتا رہا۔ یہ عرصہ اس کی زندگی کا نغمۂ خواب تھا جس کو پامال کرنے کے لئے کوئی بیداری نہ تھی۔ ہفتہ کے ساتوں دن جلسے ہوتے رہتے تھے۔

اور یہ جلسے کوئی معمولی جلسے نہ ہوتے تھے۔ ایک ایک دن میں سینکڑوں پر پانی پھر جاتا تھا۔ اس کی ان خوش فعلیوں نے اس کے باپ کی جائداد کو برباد کر ڈالا۔ جس طرح برساتی نالے کی پُرآشوب روانی کناروں کے ٹوٹ جانے سے سرسبز کھیتوں کو نگل جاتی ہے۔

لیکن اس کے باوجود اس کی شکل وصورت سے یہ گمان نہ ہوتا تھا۔ کہ اس میں یہ گُن بھی ہونگے ناواقف آدمی اکثر دھوکا کھا جاتے تھے۔ اور سمجھ بیٹھتے تھے۔ کہ اس کے مُنہ میں تو زبان بھی نہیں۔ اس کی متین نگاہیں جُھکی ہُوئی آنکھیں اور مہذبانہ اطوار دیکھ کر کسی کو خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ یہ شخص ادباش بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے نقد روپیہ اُڑا دیا۔ مکانوں کو رہن بھی رکھ دیا۔ لیکن اُنہیں فروخت نہیں کیا۔ عمارت گر گئی تھی۔ لیکن چار دیواری قائم تھی۔ یہ چار دیواری اس کی گذشتہ عظمت کی آخری یادگار تھی۔ جسے قائم رکھنے کے لئے وہ پُورے دل وجان سے کوشش کر رہا تھا۔ انسان اتنا ذلت سے نہیں ڈرتا۔ جتنا اسکی تشہیر سے ڈرتا ہے۔ سُلطان سنگھ نے جو کچھ کیا پردے کی اوٹ میں کیا۔ گو کسی قدر بدنام ہو گیا تھا مگر نہ اس قدر کہ لوگ نفرت کرنے لگیں۔ اس کے باپ کا دبدبہ ابھی تک باقی تھا۔ آدمی مرجاتا ہے اُس کی شہرت زندہ رہتی ہے۔

اسی طرح کچھ سال گذر گئے۔ تب سُلطان سنگھ کی آنکھیں وا ہُوئیں۔ جبتک روپیہ عام تھا۔ تب تک کوئی خیال نہ تھا۔ روپیہ آتا تھا۔ خرچ ہو جاتا تھا بنک سے منگوانے میں کوئی محنت صرف نہ ہوتی تھی۔ ایک پُرزہ کاغذ بھیجنے ہی سے کام چل جاتا تھا۔ لیکن جب وہ خرچ ہو گیا۔ تو بہارِ بے خزاں میں غم کے پہلو نمودار ہُوئے۔ سُلطان سنگھ تذبذب میں پڑ گیا۔ جس طرح ناٹک دیکھنے کے بعد آدمی منڈوے کے باہر کی تاریکی دیکھ کر گھبرا جاتا ہے اسی طرح سلطان سنگھ کے سامنے عسرت نے اندھیرا پھیلا دیا۔ اس عُسرت میں کتنی رقت تھی، کتنی حسرت۔ سُلطان سنگھ کے دل پر جیسے کسی نے گرم لوہا رکھ دیا۔ ایک دن دیر تک اپنی حالت پر غور کرتا رہا۔ آخر تلملا کر کھڑا ہو گیا۔ اور استقلال بھرے لہجہ میں بولا "میں ایک سال کے اندر اندر اپنی قسمت تبدیل کر لُونگا"

۲

ساگر چند سُلطان سنگھ کا دوست تھا۔ سُلطان سنگھ کو اس پر پُورا پُورا بھروسہ تھا۔ وہ اپنے پوشیدہ سے پوشیدہ امور میں بھی اسے شریک کرنے سے نہیں ہچکچاتا تھا۔ ساگر چند محض سُلطان سنگھ کے روپیہ کا خواہاں ہو۔ یہ بات

نہ تھی۔ اسے سلطان سنگھ سے عشق تھا۔ عموماً دیکھا گیا ہے۔ کہ بدمعاش لوگوں میں بھی کوئی نہ کوئی صفت نیک ضرور پائی جاتی ہے۔ جس طرح تاریک گھٹا کے گرد سفید دھاری ہوتی ہے۔ ساگر چند چھٹا ہوا غنڈہ تھا۔ لیکن اس میں بھی ایک خوبی تھی، دوست پروری کا جذبہ اس میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔ جب سلطان سنگھ نے خرچ سے ہاتھ کھینچنا شروع کیا۔ تو اسکے احباب غیر حاضر رہنے لگے۔ وہ شریف گھرانوں کے تھے۔ مگر ساگر چند کی سرگرمیوں میں فرق نہ آیا وہ ذلیل کمینہ تھا۔ پلیگ کے دنوں میں جب شہر خالی ہوجاتے ہیں اور لوگ لاشوں کو لاوارث چھوڑ کر جان بچانے کی خاطر بھاگ جاتے ہیں۔ تو خدمت کو وہی لوگ آگے بڑھتے ہیں جو بدمعاش ہوتے ہیں۔

ساگر چند جب سلطان سنگھ کے ارادے سے آگاہ ہوا کہ وہ ایک سال میں اپنی اصلاح کر لیگا۔ تو اُس کا دِل خوشی کے ہچکورے لینے لگا۔ جیسے کنول پانی میں تیرتا ہے اس وقت اسکی آنکھوں میں چمک تھی۔ لبوں پر مُسکراہٹ ہمدردی کے انداز سے آگے بڑھا۔ اور بولا" کیا کروگے"؟

سُلطان سنگھ نے زاہدانہ طریق سے جواب دیا" کوشش کرنا فرض ہے۔ وہ کردوں گا۔ دیکھا چاہیئے۔ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔"

ساگر چند کو ایسا معلوم ہُوا۔ جیسے سُلطان سنگھ اس سے بات چھپا رہا ہے۔ اُس کے دِل میں تیر سا لگا۔ افسردہ خاطر ہو کر بولا" مجھ سے نہیں کہو گے۔؟"

سُلطان سنگھ پر اصل حقیقت واضح ہوگئی۔ اُس نے گھبرا کر کہا" میرا یہ مدعا نہ تھا"

"تو بات کھول کیوں نہیں دیتے؟"

"ابھی سُننا چاہتے ہو یا ٹھیر کر"؟

"میرا دل تو ابھی چاہتا ہے۔ جب تک سُن نہ لوں گا۔ چین نہ آئیگا"

سُلطان سنگھ نے احتیاطاً کمرے سے باہر نگاہ دوڑائی۔ اور آہستہ سے کہا" میں بیاہ کروں گا"

"اس کے بعد؟"

"بیوی کی زندگی کا بیمہ کراؤں گا"

"پھر"

"بیوی مرجائے گی"

"اور اگر نہ مرے تو۔"

"نہ مرنے کی وجہ کیا ہے۔ ضرور مریگی۔"

ساگر چند بالکل بُدھو نہ تھا۔ اس نے

مڈل تک تعلیم پائی تھی۔ سُلطان سنگھ کی مُسکراہٹ دیکھ کر صورت حال سمجھ گیا۔ اور بولا "خوب۔ گویا اسکی زندگی تمہارے ہاتھ میں ہوگی"

"پورے طور پر۔"

"اس سے آگے کہو۔"

"وہ مر جائیگی۔ میری قسمت تبدیل ہو جائیگی"

ساگرچند نے چند منٹ تک توقف کیا۔ اس نے یہ نہیں سوچا کہ یہ گناہ کبیرہ ہے۔ وہ اس سے زیادہ آگے جانے کو بھی تیار تھا لیکن اسے اندیشہ یہ تھا کہ کہیں سُلطان سنگھ اس ارادہ سے متزلزل تو نہ ہو جائیگا۔ یا اُسے اس سے کوئی نقصان تو نہ پہنچ جائیگا۔ اُس نے اس سوال کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا۔ اور کہا "اسکیم تو بڑے غضب کی ہے۔ اگر کامیاب ہو جائے۔ تو واقعی تمہاری قسمت تبدیل ہو سکتی ہے۔ لیکن اس میں خطرات کی بھی کمی نہیں۔"

سُلطان سنگھ نے جواب دیا "بھئی موتی سمندر کی تہ سے ہی نکلتا ہے۔ اس کے لئے موت کے مُنہ میں جانا ہوتا ہے"

اس وقت سُلطان سنگھ ایسا خوش تھا جیسے کوئی سلطنت مل گئی ہے۔

اس کے دو مہینے بعد سُلطان سنگھ کی شادی ہو گئی۔

۳

شام کا وقت تھا۔ سلطان سنگھ اپنے صحن میں آرام کرسی پر بیٹھا ایک ناول دیکھ رہا تھا اتنے میں ملازم نے آکر کہا "سرکار منروا انشورنس کمپنی کا ایجنٹ آیا ہے"

سُلطان سنگھ نے ناول ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس وقت اس کے دِل میں خیالات کا ہجوم برپا تھا۔ سوچنے لگا۔ کیا کرنے لگا ہوں۔ میرے باپ نے رفاہ عام کے لئے پکی سرائے بنوائی تھی۔ میں اپنے لئے ایک معصوم لڑکی کو قتل کرنا چاہتا ہوں۔ باپ بیٹے میں کس قدر فرق ہے۔ اگر یہ بات کسی طرح کُھل گئی تو۔ . . . .

سُلطان سنگھ کا دل و دماغ کھونے لگا۔ اس پر از خود رفتگی کا عالم طاری ہو گیا۔ گناہ سے زیادہ خوفناک گناہ کا خیال ہے۔ سُلطان سنگھ کے پائے استقلال متزلزل ہو گئے۔ فیصلہ کیا کہ یہ پاپ نہ کروں۔ مگر اتنے میں ہوس نے سر اُٹھایا ہوا کا رُخ تبدیل ہو گیا۔ سُلطان سنگھ نے جواب دیا "بُلاؤ"

گناہ کا راستہ کتنا صاف ہے۔

ایجنٹ نے آکر سلام کیا۔ اور بیٹھ کر کمپنی کے پراسپکٹس سلطان سنگھ کے ہاتھ میں رکھ دیئے سلطان سنگھ نے چند ورق اُلٹ پُلٹ کر دیکھے اور پُوچھا "آپکی کمپنی مستورات کا بھی بیمہ کرتی ہے؟"

ایجنٹ نے قدرے متعجب ہو کر جواب دیا۔ "جی ہاں کرتی ہے"۔

"اُس کے Rate (نرخ) دکھائیے۔"

"کتنے سال کے لئے"؟

"بیس سال کے لئے"۔

ایجنٹ نے ایک صفحہ نکال کر کہا۔ "یہ ہے"

سُلطان سنگھ نے دیکھ کر جواب دیا۔

"بہت زیادہ ہیں۔"

"عورتوں کے زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ کمپنی کو بڑا Risk (خطرہ) ہوتا ہے۔"

"ہوں"

"آپ کتنے روپوں کی پالیسی لینا چاہتے ہیں۔"؟

"ایک لاکھ کی"۔

ایجنٹ نے اُچھل کر کہا۔ "ایک لاکھ کی؟"

"ہاں ایک لاکھ کی۔ کتنے روپے ماہوار دینے ہونگے"

ایجنٹ نے پہلے یہ تخمینہ لگایا کہ مجھے ماہوار کمیشن کیا ملیگا۔ امید نے چہرہ گلرنگ کر دیا پھر اُس نے حوصلہ مندی کے انداز سے کہا۔ "پانسو بارہ روپے ماہوار"۔

"بہت زیادہ رقم ہے۔ گویا سوا لاکھ کے قریب تو ہم ادا کر دیں گے۔ ادھر ہم کو ملیگا صرف ایک لاکھ۔ سراسر نقصان کا سودا ہے۔"

ایجنٹ کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ اندیشہ ہُوا کہ کہیں ارادہ رہ ہی نہ جائے۔ پُرجوش طریقہ سے بولا۔ "جناب عالی! کمپنی جو (Risk) سر پر لے رہی ہے۔ وہ بھی تو تھوڑا نہیں۔ ایک لاکھ کی رقم بھی آخر کوئی چیز ہے۔ ہندوستان میں اس کا رواج نہیں یورپ میں تو ہر ایک شخص بیمہ کرانا فرض سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ وہاں ایک آدمی کی مَوت پر سارا خاندان بھوکوں نہیں مرتا۔"

سلطان سنگھ اپنے خیال میں مگن تھا۔

ایجنٹ نے سمجھا۔ میری تقریر کام کر گئی۔ سنبھل کر بولا۔ "تو فارم پُر کر دیجئے گا۔ کل معائینہ ہو جائیگا"۔

کانپتے ہُوئے ہاتھوں نے فارم پُر کی۔ دوسرے دن معائینہ ہو گیا۔ سُلطان سنگھ نے اطمینان کا سانس لیا۔ کامیابی کے دو مرحلے طے ہو گئے۔ کیا تیسرا بھی ہو گا۔

۴

چھ مہینے گذر گئے۔ سُلطان سنگھ نے اپنی بیوی ست ونتی کی طرف توجہ نہ کی۔ وہ عموماً مردانے ہی میں رہتا تھا۔ زنانے میں جاتے ہُوئے اُس کی رُوح کانپتی تھی۔ وہ اکثر راتوں کو بھی مردانے میں پڑا رہتا تھا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ ست ونتی سے جتنی کم ہو سکے ملاقات کروں۔ اس کے مُنہ کی

طرف دیکھ کر اس کے ارادے پست ہو جاتے تھے وہ جب کبھی اسکی نشۂ محبت سے سرشار آنکھوں کی طرف دیکھ لیتا تھا تو ہفتوں تک اس کے دل میں ہلچل مچی رہتی تھی۔ اُس کی یہ خواہش کہ بیوی بدصورت ہو۔ پوری نہ ہوئی۔ وہ نہایت حسین تھی جیسے سنگِ مرمر کی مورت۔ اُسے دیکھ کر سلطان سنگھ حیرت میں آجاتا تھا۔ اس نے خوبصورت سے خوبصورت عورتیں دیکھی تھیں لیکن ایسی خوبصورت عورت آجتک نہ دیکھی تھی۔ اسے شبہ ہونے لگا کہ میں اپنا کام نہ کر سکونگا۔ خوبصورتی نے اپنا کرشمہ دکھایا۔ کہتے ہیں حسن سے درندے بھی رام ہو جاتے ہیں۔ کیا سلطان سنگھ ان سے بھی گیا گذرا ہے۔

برسات کے دن تھے۔ آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے۔ سلطان سنگھ شراب کے نشہ میں مخمور ایک شیشی لئے زنانے میں گیا۔ اور ست ونتی سے بولا "اسے سنبھال کر رکھنا۔ روز آج صبح اٹھ کر پیا کرو۔ تمہاری صحت گر رہی ہے ٹھیک ہو جائیگی"

یہ دوا ایک دیسی حکیم نے تیار کی تھی جس کا مہلک اثر آہستہ آہستہ ہڈیوں میں سرایت کر جاتا ہے۔ اور معائنہ سے معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ مقتول کو زہر دیا گیا ہے۔ ست ونتی نے خاوند کے مُنہ سے یہ کلمات محبت کے سُنے تو سور گ میں پہنچ گئی۔ اور مسکراتے ہوئے بولی "یہ کیا ہے شراب تو نہیں؟"

"نہیں طاقت کی دوا ہے"

"آپ بھی پیا کریں۔ فکروں نے چہرے کا کیا حال کر دیا ہے؟"

کیسا فقرہ تھا۔ محبت کے رس میں ڈوبی ہوئی تاثیر۔ سلطان سنگھ کے ضمیر نے ملامت کرنا شروع کیا۔ لیکن اس نے اپنے جاگتے ہوئے جذبہ کو اندر ہی اندر دبا دیا اور کہا "میرے لئے دوسری چیز تیار ہو رہی ہے"

اس وقت اس کے سینے میں دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

۵

دن چڑھا۔ مگر سلطان سنگھ کو ہوش نہ تھا۔ ست ونتی کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اس نے گھبرا کر ڈاکٹر کو بلوایا۔ اس وقت سلطان سنگھ بے ہوش پڑا تھا۔ ڈاکٹر نے آکر دیکھا ۱۰۶ درجہ کا بخار۔ ست ونتی سُن کر سہم گئی۔ اُسکی آنکھوں میں پانی آگیا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "کوئی خطرہ تو نہیں"

"ابھی تک تو نہیں۔ لیکن اندیشہ ہے کہ بہت جلد نمونیہ ہو جائیگا۔"

ست ونتی کی رو کی ہوئی چیخیں نکل گئیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ڈاکٹر نے کہا "اس سے کیا ہوگا۔ احتیاط کرو۔"

بہتا ہوا پانی تھم گیا۔ ست ونتی احتیاط اور خدمت کرنے پر کمر بستہ ہوگئی۔ اس نے سمجھ لیا۔ کہ اس وقت رونے سے کام نہ چلیگا۔ لٹتی ہوئی زندگی بچ سکتی ہے تو صرف خدمت سے وہ خاوند کے سرہانے بیٹھ گئی۔ اور وقت پر دوائی پلائی گئی۔ دن گذر گیا۔ مگر بخار میں افاقہ نہ ہوا۔ رات گذر گئی۔ مگر فرق نہ پڑا۔ ڈاکٹر نے آکر دیکھا۔ اور کہا "جس بات کا اندیشہ تھا۔ وہ ہوگئی۔ نمونیہ ہو گیا ہے۔"

ست ونتی کے کلیجے میں بھالا سا چبھ گیا۔ لیکن اس نے آنکھوں کو بے قابو نہیں ہونے دیا۔ تیمارداری میں مشغول ہوگئی سلطان سنگھ متواتر ایک ماہ بیمار رہا۔ ست ونتی نے دن رات ایک کر دیا۔ جب کبھی سلطان سنگھ کو ہوش آتا۔ ست ونتی عقیدت مندانہ انداز سے تیمارداری میں مصروف نظر آتی۔ یہ دیکھ کر اس کو خیال آتا۔ کہ یہ کس قدر نیک ہے محبت کا سوتا۔ اور میں کتنا نیچ ہوں۔ روپے کا غلام۔ اس خیال سے اس کے دل میں خیالات کا ہجوم برپا ہو جاتا تھا۔ جو کام خوبصورتی نہ کر سکتی تھی۔ اسے محبت اور خدمت نے کر دیا۔

آخر سلطان سنگھ چارپائی سے اٹھا۔ اس دن ست ونتی کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ اس کا چہرہ اس طرح چمکتا تھا۔ جیسے چودھویں کا چاند۔ ڈاکٹر نے سلطان سنگھ سے کہا۔ میں مبالغہ نہیں کرتا۔ کہ اگر یہ دیوی اس تندہی سے آپ کی سیوا نہ کرتی۔ تو آپ کا جانبر ہونا ناممکن کے قریب قریب تھا۔"

ڈاکٹر چلا گیا۔ تو ست ونتی نے گھونگھٹ اٹھایا۔ سلطان سنگھ پر جذبے کا عالم طاری تھا۔ وہ جوشِ محبت سے بیتاب ہو کر بولا "ست ونتی"

ست ونتی نے جواب دیا "آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ وہ میری دوا آپ ہی پی لیا کریں۔ کمزوری رفع ہو جائیگی"

سلطان سنگھ کو جیسے کسی نے گولی ماردی گھبرا کر بولا۔

"وہ تم نے پی تو نہیں لی۔"

"نہیں"

"ذرا لے آؤ"

ست ونتی دوڑ کر الماری سے بوتل اٹھا لائی۔ اور خطاوارانہ نگاہوں سے خاوند کی طرف دیکھ کر بولی "آپ کی بیماری کے باعث مجھے

اس کے پینے کا خیال نہیں رہا۔ اب پی لیا کرونگی "

سُلطان سنگھ نے اُسے زور سے دیوار پر پھینک مارا۔ اور اطمینان کا سانس لیا ست ونتی سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ اور بولی " یہ آپ نے کیا کر دیا۔ بڑی قیمتی چیز تھی "

سُلطان سنگھ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ صرف ست ونتی کی طرف دیکھ کر بازو پھیلا دئے۔

یکایک اس کی نظر کیلنڈر کی طرف گئی۔ اس دن یکم نومبر کا دن تھا۔ اسے ایک سال پہلے کا فقرہ یاد آگیا۔ کہ میں ایک سال کے اندر اندر اپنی قسمت تبدیل کرلونگا۔ اور یکم نومبر کا سُورج مجھے غریب نہ دیکھے گا۔

اور کیا وہ غریب تھا؟ اس کے پاس دولت نہیں۔ لیکن دولت سے بڑھ کر ایسی چیز موجود تھی۔ جس کے حصول کے لئے دُنیا کے شہنشاہ بھی ترستے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد ساگر چند آیا۔ لیکن اس طرح سہما ہُوا۔ گویا کوئی سزا ملنے والی ہو۔ اُسے خیال نہیں بلکہ یقین تھا کہ جا کر ست ونتی کی موت کی خبر سُنوں گا۔ اس لئے اُس نے دوست کی طرف عجیب انداز سے دیکھا۔ نگاہ نے نگاہ سے سوال کیا۔

سُلطان سنگھ نے مُسکرا کر کہا " کیا پوچھتے ہو "

" ست ونتی کا کیا ہُوا "

" خیریت سے ہے۔ "

ساگر چند کے سینہ سے جیسے کوئی بوجھ اُتر گیا ہو۔ اطمینان کا سانس لے کر بولا " شکر ہے تم نے اپنا عہد پُورا نہیں کیا۔ جب میں اُس غریب لڑکی کو شب و روز گھونگھٹ نکالے ہُوئے عقیدتمندانہ انداز سے تمہاری خدمت کرتے دیکھتا تھا اور اس کے ساتھ ہی تمہارے عہد کا خیال کرتا تھا۔ تو میرا کلیجہ کانپ جاتا تھا "

" مگر میں نے اپنا عہد پُورا کر دیا "

ساگر چند گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے ایسا معلوم ہُوا۔ جیسے کسی نے اُس کا گلا دبا دیا ہو۔ رُک رُک کر بولا " کیا کہتے ہو۔ "

" میری قسمت تبدیل ہو گئی ہے۔ میں اب غریب نہیں ہُوں۔ مگر اس تبدیل قسمت کا باعث میری بیوی کی موت نہیں بلکہ زندگی ہے "

یہ کہتے کہتے سُلطان سنگھ نے فرطِ مسرّت سے آنکھیں بند کر لیں۔ اور آرام کُرسی کے ساتھ پیٹھ لگا کر لیٹ گیا۔

سُدرشن

ندرتِ ذوق ونظر

۳

بنارس کی اک شرمیلی و مسکراتی ہوئی صبح، رشید کے ہذیانِ ادبی کو شاید کبھی فراموش نہ کریگی، جبکہ اک مختصر سے قیامِ سحری کے لئے رودِ گنگا نے اپنے منظر کی تمام دلاویزیوں کو اُس کے واسطے ہدیۂ لطف و مسرت بنا دیا تھا!

فضائے بنارس کی عام دل کشی، صبح اور پھر آبِ گنگا کی وہ شوخیوں سے معمور، تبسم ریز، روانی رشید کے لئے یوں ہی کیا کچھ کم جاذبِ ذوق ونظر تھی کہ منظر کی اور بعض معصوم حیثیتیں، اُس کی فطرت کی بے چینی، اُس کے جذبات کے ہیجان اور اُس کی روح کے فشار کے لئے اک نئی قیامت ثابت ہوئیں!!

بارہا دیکھا گیا ہے کہ وہ اک معمولی سی بات سے متاثر ہو گیا اور پھر پہروں اُسے اپنی خبر نہ رہی دیکھنے والے اندیشہ کرتے کہ یہ صورت تو اختلالِ حواس کی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدرت نے اُس کو اک عجیب دل ودماغ عطا کیا ہے۔ جس میں، ودیعتِ عام سے علیحدہ کچھ گداز و فکر کا جزوِ غالب ہے کہ مظہرِ مرحمت ہے!!

دُنیا کی ہر چیز، کائنات کا ذرہ ذرہ اور ان سب کا علم و عرفان رشید کی قوتِ تخیل کا موضوعِ تجسس ہے وہ جس شے کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے اس قدر قریب سے، اس درجہ عمیق نظر سے کہ جہاں عام نظر و فکر پہنچ ہی نہیں سکتی۔ کوئی چیز سامنے آگئی اُس نے دیکھا۔ دیکھتا رہا، بس دیکھتا رہ گیا، اب ایسا معلوم ہونے لگا کہ شاید یہ صرف دیکھنے ہی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ کسی نے کوئی بات کہی، اس نے سُنا، سُنا اور سوچ میں پڑ گیا اب معلوم ہوگا کہ دُنیا میں یہ فقط سوچنے ہی کے واسطے آیا ہے۔ پھر ان ہی عنوانات پر اگر کبھی اُس کی زبان کھُل گئی تو اپنے وظائفِ روحی کو کچھ اس انداز سے حوالۂ تکلم کرتا ہے کہ جذبات کا کیف، اور اظہار کا تاثر، یہ معلوم ہوتا ہے کہ رُوح کی انتہائی گہرائیوں میں ہی ڈوب کر رہیگا +

مظہر شاہد ہے کہ رشید ساحلِ گنگا کے نوادرِ منظر کو اپنی روح کے انہماکِ کامل کے ساتھ دیکھ رہا اور لطف اُٹھا رہا تھا کہ دفعتہً اُس کی نظر کسی اک طرف گئی، گئی اور جم کر رہ گئی اور مُنہ سے صرف یہ نکلا "مظہر دیکھتے ہو قدرت کی نازک ترین

شاعری کے ساتھ کس نوع کا تمسخر و اعراض"؟

میں نے دیکھا چند عورتیں ہیں کہ جنکی ساڑہی سادی ہے اور سیاہ اور کسی قدر گاڑھی، جنکی ادائیں غم میں ڈوبی ہوئی ہیں اور مضمحل، اور جن کے سر پر بال تو شاید قطعاً نہ تھے اپنے فریضۂ پرستش و اشنان ادا کرنے کے لئے گنگا جی کے کسی گھاٹ پر جارہی تھیں، ایسی عورتوں کی ایسی نوعمر لڑکیوں کی ایسے مقامات پر کثرت ہے، جو اپنے سہاگ کو لٹا چکی ہیں اور اب اپنی زندگی کے باقی حصے کو ان تیرتھ گاہوں کے کسی اک مقدس معبد کے اک سادے سے گوشے میں گذار رہی ہیں، چونکہ ہندوں میں عقد بیوگان کا رواج نہیں ہے اس لئے ان کی زندگیاں اب سوائے اس نوع کے مصرف عبادت و رہبانیت کے اور کوئی پہلو اپنی موجودہ حیات میں ایسا خوشگوار نہیں رکھتیں جس کو کسی دوسرے طریق پر گذارا جاسکے!!

رشید کی طبیعت، رشید کے لطیف ذوق سے یہی متوقع تھا، جیسا اثر اُس پر اس منظر سے ہُوا، وہ یک لخت بیتاب جذبات ہوگیا۔ اُس کی بیتابی و بے اختیاری بھی اپنی نوعیت میں اک خاص معصومیت کو لئے ہُوئے ہوتی تھی۔ چہرہ پر اک اضمحلال طاری ہوا۔ آنکھوں میں غم کی اک لہر دوڑی۔ ہونٹ ذرا ملے۔ عام حالت میں اک ذرا کھویا کھویا پن پیدا ہُوا اور اُس نے دل پر ہاتھ رکھا اور اک طرف بیٹھ گیا۔ یہ تھا اُس کا بیتاب جذبات ہو جانا!!

اس کو عزیز رکھنے والے احباب اُسکی حالت کے ان آثار و علامات سے اس درجہ واقف ہو گئے تھے کہ تغیر کیفیات کو اُس کے چہرہ کے خاص لون، اُس کی اداؤں کی خاص تہذیب سے معلوم کر لیتے تھے۔ بسا اوقات چہرے کی خفیف سی زردی سے مظہر نے اُسکے مُبتلائے غم ہونے کا حُکم لگادیا ہے ہرچند کہ خارج میں کوئی کاوش کی صورت بھی نہ تھی۔ بارہا اُسی قسم کی شکل سے نتائج مسرت مستنبط کئے ہیں اگرچہ حالات اُس سے مختلف ہوتے تھے اُس کا ملال اُس کی مسرت، اصل یہ ہے کہ کیف کم سے تو سروکار رکھتے نہ تھے اُس کی زندگی تو یکسر تخیل تھی، کبھی شدتِ افکار سے تھک گیا، مضمحل ہوگیا، کبھی خیال آرائیوں نے وسعت عطا کردی بشاش ہوگیا۔ آہ، بوئے گل کی اور شبنم کی زندگی ہی کیا!!

مظہر بنارس کی سیر و سیاحت میں رشید کا رفیقِ سفر تھا وہ بیان کرتا ہے کہ میں نے بہت کم رشید میں اُس نوع کا گداز و کیف دیکھا ہے جو بنارس کے قیام میں میں نے اُس میں دیکھا۔

اُس نے کہا مظہر، بتاؤ کونسا ظلم ہے جو تمہاری صنف نے اس نازک جنس پر روا نہ رکھا ہو۔

"ابھی یہ سات آٹھ ہی برس کی تھی کہ مرد کی جنس نے اس کو اسیرِ ازدواج کر دیا اور عمر کا یہ وہ حصہ ہے جس میں اس صنف کا کوئی فرد بھی اس بات سے واقف نہیں ہوتا کہ ازدواج کی رسم میں لطف ہے کس نوع کا، شادی بیاہ اک ہنگامے سے عبارت ہے بچوں نے دیکھا اور ہنس دیئے؟

اتفاقات نے جب یہ روح فرسا صورت پیدا کی کہ فردِ اعلیٰ اس دُنیا سے کُوچ کر گیا تو اب لڑکی کی عمر تیرہ چودہ سال کی ہے بتاؤ وہ ہنسے کہ روئے وہ ماتم کرے کہ آزادی پر مسرور ہو۔ لاریب کہ وہ اک قیامت ہے کہ دو زمانوں کو محیط ہے۔

"آہ! اب لڑکی حقیقتِ ازدواجی سے واقف ہے۔ اُس کی زندگی کی شعریت اب عنفوانِ شباب پر ہے اور اُس کے شبابِ فتنۂ آرزو کی تمام تحریکیں اب جوان ہیں۔

"عورت اپنا بہترین ذخیرۂ حیات مرد
کو دیتی ہے لیکن اُس کے بدلے میں
ویسی ہی جنس گرانمایہ اُس سے چاہتی
ہے (آسکر وائلڈ)

"جانتے ہو وہ کیا چیز ہے۔ وہ دل ہے۔ وہ وفائے جنسی ہے وہ شرافتِ عہد ہے وہ حُسن مبادلہ ہے۔!"

مگر آہ! یہ جوان بیوہ یہ معصوم دوشیزہ۔ اسکو جنسِ کرخت کے اولینِ عہدِ الفت میں مجروح ہو جانا نصیب ہُوا۔ اس نے اسی جنسِ بے وفا کو اپنا ذخیرۂ حیات دیدیا تھا اس نے اپنی زندگی کا حُسن اس صنف کے ظالم چہرہ کا وقار بنایا تھا لیکن افسوس لڑکی کی عمر کا پہلا دور بھی کامل نہ گذرا تھا کہ وہ اپنے لطفِ طفلی کے لئے سوگوار ہے اور اپنے شباب کی ماتم داری کے لئے وقف ہے وہ صنفِ قوی کے دوسرے افراد کی نگاہوں میں اب اک بے آب موتی ہے اک محرّف حرفِ وفا ہے اور اک منسوخ عنوان ہے!!

"مظہر بتا تو خدارا مجھے سمجھا تو اس جوان بیوہ، اس مرقدِ شعر کی حیاتِ دوشیزگی کی توہین کیوں روا رکھی جاتی ہے؟ اس کی کیا چیز گم ہوگئی، اُس میں سے کونسی شئے بدل گئی۔ آہ خود پرستو! جب تک مرد زندہ ہے عورت کا فطری لوچ، سمٹاؤ حیاداری سے عبارت ہے؟ جبتک عورت خاوندوالی ہے اُس کے حُسن کی کرشمہ آفرینیاں زندہ ہیں؟ جبتک عورت کو اقتدارِ شوہری نصیب ہے، اُس کا وقارِ نسوانی تسلیم کیا جاتا ہے؟ مگر جب اُس کا سُہاگ لٹ گیا تو تمام نازک اور حسین ادائیں اک مذموم پختگی سے بدل جاتی ہیں؟

وہی حیا وہی شوخ باحجابی جس سے اسی جنس قوی کے اک فرد کو معراج نتادگی نصیب تھی اب دُنیا کے لئے وہ اک مایوسی ہے کہ مکمل۔ اک احتراز ہے کہ منکسر۔ وہ اپنی آنکھوں کے خوبصورت جھکاؤ میں اپنے تمام فتنہ ہائے حسین دفن کئے رہے تو عافیت!؟

"جبتک خاوند موجود تھا عورت کا سر گھمنڈ سے بلند تھا اور اُس کا تاجِ حُسن زرانگیز مگر حیف وہ نہ رہا تو سر خاک آلودہ ہوگیا اور جمالِ صورت کی کوئی آن اب دُنیا کے لئے موثر نہ رہی جبتک شوہر زندہ تھا۔ گھر کی چار دیواری میں نسوانی وقار کی ملکہ کی حکمرانی تھی مگر حیف اُسکے نہ ہوتے اب اس شکست خوردہ رانی کے حال کا کوئی پرسان نہیں۔ بلکہ ہم سن بچکر چلتے ہیں کہیں اسکا منحوس سایہ ہم پر نہ پڑ جائے۔ اقتدار سرنگوں ہے، وقار برباد ہے۔ نسائیت اور حُسنِ نسوانی پامال ہے، جوان بیوہ کی غریب جوانی کیا ہے لٹے ہُوئے قافلہ کا نشانِ بربادی ہے۔ مظہر! پوچھو اپنے ہمجنسوں سے پوچھو یہ کیا چھوت چھات ہے اور تمہاری اس رسمِ احتراز میں اک خوئے خراب کی پرورش نہیں تو پھر آخر اس سے مقصود کیا ہے؟

"ہائے صنفِ نازک کا شباب بھی تمہارے اقتدار کا شکار ہوا اور اُس کی رہی سہی حیات کے باقی ایام اور اُن کی لذتیں بھی تم ہی نے برباد کیں "عورت نے اولین طلب پر تم کو اپنا سب کچھ دیدیا اور پھر تم نے بدعہدی کی اور رواج میں اک مکروہ شکل کو داخل کیا،" زن بیوہ مکن اگرچہ حور است،" کہکر ادبیات میں اپنے خیال کو یادگار بنادیا۔ کس لئے؟ اس لئے کہ بیوہ اک افسانہ کی مدح خوان ہوچکی۔ بیوہ نے اپنی زندگی کی کچھ راتیں راحت سے گذار لی ہیں۔ اس لئے کہ بیوہ اپنے شباب کے لطفِ اول کو مرد کے عہدِ وفا پر تصدق کرچکی ہے۔؟!

"ہاں اب وہ اس قابل کہاں کہ کوئی مرد اُس کو اپنے اضافۂ محبت کا امانتدار قرار دے کسی مرد کی جوانی اور اُس کی راتیں اس بات کو کیونکر جائز رکھیں کہ وہ کسی ایسی غم نصیب کو شریکِ لطف کرلیں، جس کی راتیں آج سے قبل مصروفِ شباب گذرچکی ہیں ہاں مرد کی عصبیت کو ٹھیس لگتی ہے، مردانہ رحم وگداز کی یہ خو کیوں ہوجائے کہ کسی ایسی عورت کو اپنی زیست کی معیت کے لئے منتخب کرلے جس کی شعریت، نظم کی اک فردِ موضوعی سے جُدا اک دوسری بیت کی طرح ڈالنے پر آمادہ ہو!!

"بتاؤ غارت گر کون ہے؟ کس کے گریبان تک معصومیت ہاتھ دراز کرے، لڑکی اور

اُس کی متاعِ عزت کس درجہ بدعہدی کے ساتھ خریدی گئی، حسنِ سلوک کا یقین دلا کر اُس سے کس قدر سنگین فریب کیا گیا، اُس کو کیسا بے وقعت سمجھا گیا اُس کا سودا کیسی کم قیمت پر لے لیا گیا۔ پھر معمولی سی ادائے قیمت عہد پر اُس سے کیسی بدعہدی کی گئی کس طرح یکسر تمام صنف نے اُسکی دادخواہانہ التجاؤں پر اپنے کانوں پر ہاتھ دھر لئے۔ مردوں میں سے کسی نے اپنی زندگی، اپنی زندگی کی خوشنمائیوں، اپنی زندگی کی لطف فرمائیوں کو اپنے بھائی کے ناموسِ شرافت کے حضور پیش نہ کیا۔ ؟!

لڑکی کا حسنِ زندگی اُس کا ذخیرۂ حیات جب لُٹ چکا تو مردوں نے مل کر اُس کو دیوالیہ قرار دیدیا، اُسکو بے مایہ رسوا کر دیا۔ آہ خسران نصیب لڑکی! ذی اقتدارِ شباب ہونے کے باوصف سائلانہ اندازِ استرحام کی مظہرِ جمیل ہے، اُس کی معصومیت سے، اُس کی سادی سی جوانی سے، اُس کے بھولے بھالے شباب سے ساری دُنیا نے مل کر تمسخر و استہزا کیا ہے اور اب تمہاری بھری بزم میں وہ اک ایسی خوئے مضحک کی حریف ہے، جس کو ساری محفل سمجھ رہی ہے مگر وہ غریب نہیں جانتی کہ مجھ سے یہ کس نوع کا مذاق کیا جا رہا ہے لڑکی کی سادگی سے جس قسم کا فریب چلا گیا اُسکو نہیں معلوم یہ اُس کے حق میں کس قدر نقصان رسان ہے۔ اور طویل مصیبتوں کا پیش خیمہ ہے۔

رشید نے کہا میرا خیال ہے شاید دُنیا میں اک دن یہ انقلاب ہو کر رہیگا کہ عورت سے جب مرد لطف۔ مسرت، امن اور طمانیت و آسودگی کی بھیک مانگے گا۔ اور آج کی طرح ردئے گا۔ بسورے گا۔ اور فریاد والحاح کی اک قیامتِ صغریٰ برپا کریگا تو اُس زمانہ میں آج کی طرح عورت، ایسی بیوقوف ایسی نادان۔ نرم دل اور زود عنایت نہ ہوگی، بلکہ وہ ذی فہم۔ ہوشیار، ضابط اور معاملہ دان ہوگی وہ مرد کی صداقت کو پرکھے گی۔ اس کے دل کا گداز ٹٹولے گی، اُس کے آنکھوں کے پانی کا کھاری پن چکھے گی، اور اُس کے اضطرابِ محبت کی سچائیوں کا جائزہ لیگی، جب کہیں بعد آزمائش و امتحان وہ اپنی محبت مرحمت کریگی، اپنا دل عطا فرمائیگی۔

اور ہدیۂ الفت کی عطا کے ساتھ اک شرط یہ بھی ہوگی کہ مرد کی جنس یہ بھی عہد کرے کہ وہ عورت سے پہلے اس عالم سے رخصت نہ ہوگا۔ یا یہ کہ مرنے سے پہلے اپنی جنس کے تمام افراد میں اک سمجھوتہ کرائے کہ آج سے یہ رواج منسوخ ہے کہ کوئی عورت بیوہ کہی جائے۔ جس طرح نسائیت ہمیشہ زندہ ہے، اور جب تک وہ

جزو ہے کسی حیاتِ لطیف کا اُس وقت تک اُسکی پرستش اور اُس کے حُسنِ لطف کا احیاء بھی ضروری ہوگا! وہ کبھی حسین اور جمیل ہونے کے ساتھ، معابد کے تاریک وتنہا گوشوں میں تمثیلِ تلخئ رہبانیت نہ بنیگی۔ اُس کے خصوصیاتِ جمال سے کبھی تمسخر نہ کیا جائے گا اُس کے سر کے سیاہ عنبریں بال اُسترے سے اس طرح نہ مونڈے جائیں گے جو عمامہ نمایش مقدس سر کا نشانِ امتیازی ہے۔ اُس پر رنگ کو اور ریشم کو حرام نہ کیا جائیگا۔ وہ باغوں اور تماشا گاہوں سے خارج نہ کی جائیگی۔ وہ تہواروں اور شادی بیاہ کی عام رسومات میں بدشگونی کا عنوان نہ سمجھی جائیگی۔ وہ جوان لڑکیوں میں سہاگ محروم نہ کہی جائیگی۔ اور گھروں کی چار دیواریوں میں اُس سے ایسا ہی برتاؤ ہوگا جو اور جوان لڑکیوں سے ہوتا ہے، اسکو بھی صبح و شام سنگھار کی اجازت ہوگی۔ اسکو بھی پاکیزہ لباس اور خوشبو کے استعمال کا حق حاصل ہوگا تیل پھلیل سے اُس کو ممانعت نہ ہوگی، ہنسنے بولنے پر اُسکو مطعون نہ کیا جائیگا۔ برسات میں جھولا وہ بھی جھولے گی، ہمجولیوں میں سہاگ کے ترانے اور پی کے راگ وہ بھی گا سکیگی کبھی کوئی مرد اُس کے حضور کوئی ایسا جملہ نہ کہہ سکیگا جس سے اُس کی شعریت متالم ہو، اُسکی موسیقیت زخمی ہو جائے، اور اُس کے وقارِ صنمیت کو صدمہ پہنچے!!"

"اے ارضِ فارس! کاش آج وہ وقت آجائے اور میں باوصف اس کے کہ رسم ازدواجی سے متنفر ہوں مگر پھر میں اس بیوہ دوشیزگی کے اضمحلال روحی کو اک مرتبہ مسرت و فراغت سے بدل دینے کی کوشش کروں، دنیامیں، خوبرو۔ نرم دل۔ وفا شعار مرد تلاش کروں اور اُنکی آغوش اس بیوگی کی نعمت سے بھر دوں، اس لئے کہ زمین کا سنگھار غارت ہو رہا ہے۔ انسانی حیات کی راحت، برباد ہو رہی ہے نظامِ تمدن کی تمام برکتیں اور حسنِ مدنیت کی تمام عزتیں پامال ہو رہی ہیں نہ آئے وہ وقت کہ شیرازۂ امنِ عالم بکھر جائے!!"

کون رد کرسکتا ہے کہ اک حسین لڑکی، اک جمیل ترین اقتدارِ نسوانی کسی مرد کو منتخب کرلے اور زمین کا گوشہ گوشہ اپنے اندر کوئی زینت محسوس نہ کرے! کون ہے جو اس کے خلاف کچھ کہہ سکتا ہے کہ مرد اپنی مطمئن راحتوں کو عمر بھر ڈھونڈا کرے مگر اُس کی تلاش بے سود و بیکار ہے اگر اُس نے کسی عورت کی محبت پاش نگاہ حاصل نہ کی۔ کس میں بوتا ہے جو اس کی مخالفت میں آواز اُٹھائے کہ اک طرف مرد عالمِ انسانیت

کے ممتاز ترین افراد کو یونہی داغ بیوگی دیتے رہیں اور الگ کرتے رہیں اور دوسری طرف بیوگی اور بیوگی سے احتراز کی رسم یوں پھیلتی رہی، تو ایک دن اچھوتے خیال و مناظر کا پھر کال نہ ہوجائیگا اور نسائیت مع اپنے گداز و تاثر کے غارت نہ ہو رہیگی۔ پھر کیا ہوگا یا صنفِ کرخت کو حقیقی نسائیت سے محروم جینا پڑیگا اور دنیا میں بیوگی کے سوا کچھ ڈھونڈھے نہ ملیگا، یا بیوگی مستقل نمائش بے چارگی میں اک علو، اختیار کریگی، اور اس کی جانب سے صنفِ کرخت کی سرزنش یہ ہوگی کہ وہ اپنی دوشیزگی کو بھی بیوگی میں مدغم کریگی اور پھر دنیا کے حُسنِ فطرت اور اُس کی محرومی کا دیکھنے والا بھی نہ ملیگا!!"

حالت کے یہ انقلاب اور اُس کے اثرات ابھی سے رونما ہیں، دنیا آہستہ آہستہ رنج بیوگی ظاہر کر رہی ہے۔ اور عورت کی دنیا کے احساسات تو ہمارے اس دعوے کے بدرجہ اتم دلیل ہیں عورتوں میں اب مرد بدنام ہے اور اُس کی محبت کی تذلیل و تحقیر شروع ہو چکی ہے مَرد کی مخالفت کا یہ جذبہ بتدریج ترقی و تقویت پا رہا ہے صنفِ نازک کی دنیا میں اس کا عام چرچا ہے کہ مرد اب دن بدن بدعہد۔ غاصب اور بے وفا ہوتے جا رہے ہیں، لہٰذا کوئی عورت، اب اپنے دل کے راز۔ اپنی آنکھ کے آنسو۔ اپنی دل کی دھڑک کا حال کسی مرد کو نہ سُنائے، نہ دکھائے۔ عورت کا اشتراک، اس جنس سے قدرت نے لازمی قرار دیدیا ہے تاہم تجویز ہے کہ قدرت کے حضور اک زبردست احتجاج پیش کیا جائے اور اُس کی عملی صورت یہ ہے کہ عورت ناکتخدائی کا عہد کریگی اور اس خیال کو نہایت اہتمام سے عورت کی دنیا میں مقبول بنایا جائیگا! اور اس تحریکِ احترازِ مناکحت کو بے حد کامیابی ہو رہی ہے کہا جاتا ہے جوں جوں تعلیم عام ہوگی۔ اس خیال کو قوت ہوتی جائیگی۔

مشورہ کیا جا رہا ہے کہ عورت اپنے اعمال ازدواجی سے صداقتِ قلب کو علیحدہ کر دے اور اک نئی سیاست عمل کی اس لطیف فردِ نازک کے ذوق میں شامل کیجا رہی ہے، اب راتوں کا جاگنا اور کسی کے لئے بے قرار رہنا موقوف؛ شوہر اگر سفر میں ہے تو اپنی ضروریاتِ عیش ترک کر دینے کی ضرورت نہیں، اپنے لباس کی زینت اور تزئین کو موقوف کر دینا فضول۔ پتی اگر بیمار ہے تو اُس کو اپنی روح کے مضمحل کر لینے کی حاجت نہیں، اور اس کے وظائفِ تعشق کا عنوانِ ازدواج ترمیم کیا جا رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے عورت کی جانب سے اس درجہ فدویتِ عشق کے اظہار و عمل کی ضرورت نہیں ہے۔ ہرچند کہ

ستی ہو جانے کا ولولہ بھی اک مجبورِ عشق زندگی کی ماجرا طراز روش ہے، اُسکے سامنے بیوگی کا سوز، بیوگی کی مصیبت تھی۔ وہ جوانی کی نامرادیاں برداشت نہ کرسکی اور سہاگ کے ساتھ، بیوگی کے سوگ کو لیکر پتی کی چتا پر اپنے آپکو قربان کر دیتی تھی، اور اگرچہ اس تحریک کو اب کوئی ترقی نہیں مگر پھر بھی کہیں کبھی سُننے میں آجاتا ہے اسلئے اب اس سے قطعاً محترز رہنا چاہیئے ذی احساس عورتوں کا خیال ہے کہ مرد شادی کو اک بیوپار سمجھنے لگے ہیں۔ نان ونفقہ کی ذمہ داریاں قبول کیں اور شادی کرلی پاکیٔ نفس کا وہ عہد نہیں کرتے ورنہ فحش مقامات شہروں کے اُجاڑ نظر آتے، انکی دل لگی و دلچسپی کے سامان سب موجود و مرتب ہیں پھر کوئی وجہ نہیں اک عملی ایثار و درد کی عالمگیر تحریک نہ کی جائے اور مردوں سے اُنکی آمدنی کے اک حصّہ کا ہی مطالبہ نہ کیا جائے بلکہ اُن سے دل مانگا جائے اور جبتک وہ عزت ازدواج کی رونمائی دل نہ قرار دینگے اُسوقت تک ہمارا فیصلہ یہی رہیگا کہ ہم کبھی نرمی۔ ملاطفت اور محبت نہ برتینگے!

ہم اپنی نسائیت کے حقوق کی خاطر نہ صرف اپنی شعریت کو، اپنی شگفتگی کو برباد کر دینگے بلکہ اپنے سوز دلی کی لپٹ میں دنیائے رجالیت کے بے مہر استبدادی بتوں کو بھی خاکستر کر دینگے"۔ رشید نے کہا "ذرا احساس کی ضرورت ہے خوب سمجھ رکھو۔

مظہر! اس کشمکشِ احتراز و محبت کا انجام بُرا ہے، دُنیا اپنے تمام روپ کو جب کھو دیگی تو بتاؤ کائنات میں پھر کونسی رنگینی لاؤ گے؟ جس سے الفت و اتحاد کے چہرے منور و روشن ہونگے۔ ورنہ میں تو یہی کہوں گا توازنِ عمل دنیا کبھی پیش نہیں کرسکتی تم بھی مظہر! خلاصتہً یہی کہدو کہ اب سے کوئی بیوہ ہی نہ ہو، رشید کے عقاید ادبی کی پیروی ہونا چاہیئے، جہاں رسمِ مناکحت وازدواج کی پابندیاں نہیں ہیں ہاں ذرا نفس کے علو اور خیال کے ارتقاء کی ضرورت ہے۔

اُس مسرتِ دو روزہ سے جسکو لطفِ ازدواج کہتے ہیں بہتر تو یہی ہے کہ انسان اپنے نفس کے کام و دہن کو اس لذت سے آگاہ ہی نہ کرے۔ ورنہ پھر یہ تو غیر ممکن ہے کہ کوئی کبھی اس دُنیا سے نہ سدھاریگا۔ جنسِ قوی اگر طمانیت سے محروم ہوئی تو اور صنفِ نازک اگر توثیقِ ودیعت سے محروم ہوئی تو بہر نوع دونوں کے لئے یہ اک داغ ہے مفارقت کا۔ جس کا اثر رقیق القلب اور ذکی الحس انسان پر مدۃ العمر رہتا ہے!!

"خلیقی"

محفل ادب

جاپان کا رہبرِ اولیں۔ تاریخ نے ہمیشہ اس حقیقت کو دُہرایا ہے کہ جب فطرت کسی قوم میں کوئی خوشگوار انقلاب پیدا کرنا چاہتی ہے تو وہ اس میں سے ایک مخصوص ہستی کا انتخاب کرلیتی ہے اور پھر اسی کو اپنا مظہر قرار دیکر ساری قوم کا فیصلہ اس کے ہاتھ میں دیدیتی ہے، چنانچہ اسی اصول کے ماتحت جاپان نے بھی جو عظمت حاصل کی ہے، وہ صرف مکاڈو مُٹسوہیٹو کی صحتِ فکر کا نتیجہ ہے جس نے صرف ۴۵ سال کے اندر (۱۸۶۷ - ۱۹۱۲ء) ملک میں ان اصلاحات کو مقبول بنا دیا کہ جاپان دفعتہً جاہلیت کا لباس اُتار کر دُنیا کی قابل ترین قوموں کی صف میں جگہ پانے کا مستحق ہو گیا۔

مکاڈو بے انتہا ذہین اور علم دوست بادشاہ تھا اور مضطرب رہتا تھا کہ کیونکر جلد سے جلد اپنی قوم کو قدیم بندشوں سے نکال کر تہذیب و تمدن کی جدید شاہراہ پر لگا دے، چنانچہ جب وہ تخت نشین ہُوا تھا تو اسی وقت اُس نے ایک ایسا زبردست تاریخی خطبہ پڑھا تھا کہ جب اُس کی خبر مغربی ممالک میں پہنچی تو یورپ کے ایوانِ سیاست میں زلزلہ پڑ گیا اور وہاں کی سفید آبادی ایشیا کے اس "زرد خطرہ" سے رعشہ براندام ہو گئی۔

اس خطبہ کی حقیقی رُوح یہ تھی کہ اس میں شخصی اقتدار کے خلاف نہایت پرزور دلائل پیش کئے گئے تھے اور قوم کو اتفاق و اتحاد اور اشتراکِ عمل کی دعوت دیکر نہ صرف دستوری حکومت کی طرف مائل کر دیا گیا۔ بلکہ اصلاح اعمال اور اشاعتِ علوم وفنون کو بھی قوم کا اولیں فرض قرار دیا گیا تھا۔ پھر یہ سب کچھ زبانی پند و نصیحت نہ تھی بلکہ صدائے عمل تھی جو اُس کے سینہ سے بلند ہو رہی تھی اور بتا رہی تھی کہ آج یہ کہنے والا کل کچھ کرکے دکھا دینے والا ہے اور آخر کار یہی ہُوا کہ ۱۸۸۹ء میں خود اُس نے اپنے ہاتھوں سے استبداد کا ملعون تاج سر سے اُٹھا کر پھینک دیا اور ایک عام دستوری حکومت کا اعلان کر دیا۔ کیا دنیا کے بادشاہوں میں کوئی مثال ایسی مل سکتی ہے کہ کسی حکمران نے خود شخصی اقتدار کو پامال کیا ہو؟؟

نگار (آگرہ)

مساوات پسندی

حضرتِ عائشہ وہ شمعِ حریمِ نبوی
جن سے روشن ہے نہانخانۂ اخبارِ رسُول
مدح میں جن کی ہیں انگشت بلب اہلِ کمال
وصف میں جنکے ہیں حیرت زدہ اربابِ عقول
علم کا جن کے یہ عالم تھا کہ اصحابِؓ کبار
بیشتر قول سے انکے نہیں کرتے تھے عدول
جن کو خالق نے عطا کی تھی طلاقت بیمثل
جنکی باتیں تھیں کہ تھے باغِ فصاحت کے وہ پھول
جن کی پاکیزگیٔ نفس کا قرآں ہے گواہ
سورۂ نور کا دیکھو تو یہی شانِ نزول
جن کا دربارِ نبوت سے تھا صدیقہ لقب
جن کو کہتے تھے حمیرا محبت سے رسُولؐ
جن کا آغوش تھا بالینِ پیمبر دمِ نزع
جن کے حجرہ میں ہوئے دفن رسُولِ مقبول
جو تھیں دنیا میں بھی اور جنتِ فردوس میں بھی
حرمِ فخرِ رسل ہوں گی علیٰ رغمِ جہول
ان کو ملتا تھا وظیفہ جو گذارے کے لئے
جسپہ تھا اہلِ رسالت سے برابر معمول
خرچ کو ان کے وہ کافی نہیں ہوتا تھا مگر
فقر سے تھیں نہ وہ دلگیر نہ فاقہ سے ملول
عہد میں اپنے جو فاروقؓ نے دیکھا یہ حال
کر دیا ان کے وظیفہ میں اضافہ معقول
لے کے جب اسکو گئے حضرتِ صدیقہ کے پاس
بولیں یہ کہ نہیں سکتی ہوں اضافہ کو قبول
جملہ ازواج کو حضرت نے مساوی رکھا
اب یہ تفریق مدارج ہے بہم ان میں فضول
اپنی ہمچشموں سے کچھ بڑھ کے نہ لونگی ہرگز
میں نہ توڑوں گی مساوات کا پاکیزہ اصول
اہلِ بیتِ نبویؐ پر ہو خدا کی رحمت
جن سے اُمت میں ہوئے ایسے فضائل منقول

(رشیدہ) (عصمت دہلی)

کُتّے ۔ علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا ۔ سلوتریوں سے دریافت کیا ۔ خود سر کھپاتے رہے ۔ لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا ۔ کہ آخر کُتّوں کا فائدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجئے ۔ دودھ دیتی ہے ۔ بکری کو لیجئے ۔ دُودھ دیتی ہے ۔ مینگنیاں بھی ۔ یہ کُتّے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے ۔ کہ کُتّا وفادار جانور ہے ۔ اب جناب وفاداری اگر اسی کا نام ہے ۔ کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا ۔ تو لگاتار بغیر دم لئے باری باری صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے ۔ تو ہم لنڈورے ہی بھلے ۔ کل ہی کی بات ہے کہ رات کے گیارہ بجے ایک کُتّے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو اُنہوں نے باہر سڑک پر آکر طرح کا ایک مصرعہ دیدیا ۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتّے

نے مطلع عرض کر دیا۔ پھر تو جناب ایک کہنہ مشق اُستاد کو جو غصّہ آیا۔ ایک حلوائی کے چُولھے میں سے باہر نکلے اور بھنّا کے پُوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمالِ مشرق کی طرف سے ایک قدر شناس کُتّے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہُوا کہ کچھ نہ پُوچھئے۔ کمبخت بعض تو دو غزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔ وہ ہنگامہ سرگرم ہُوا۔ کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ آرڈر۔ آرڈر پکارا۔ لیکن ایسے موقعوں پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سُنتا۔ اب ان سے کوئی پوچھے۔ کہ میاں تمہیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھُلی ہوا میں جاکر طبع آزمائی کرتے یہ گھروں کے درمیان آکر سوتوں کو ستانا کونسی شرافت ہے ؎

ہزار داستان

خدا کی تلاش۔ میں تجھے پُر فضا گوشوں میں پھُولوں کے پیڑوں تلے تلاش کر رہا تھا، لیکن تو مصیبت زدہ غریبوں کے جھونپڑوں میں میرا منتظر تھا۔

میں تجھے دلکش نغموں میں ڈھونڈھ رہا تھا۔ لیکن تو کسی کی آہ بن کر مجھے بلاتا تھا۔

کاش مجھے یہ معلوم ہو جاتا۔ تو میری مراد آنِ واحد میں پوری ہو جاتی۔

۲۔ میری آنکھیں تیری تلاش میں عالیشان مندروں میں بھٹک رہی تھیں، لیکن تو جاں بلب مریض کے سرہانے بیٹھا میرا ہی رستہ تک رہا تھا۔

تو میری ہی خاطر کسی کی آنکھ سے آنسو بن کر اُس کے رخسار پر بہہ رہا تھا۔ لیکن میں تجھے اپنی محبوبہ کے گورے اور نکھرے ہُوئے رنگ میں تلاش کر رہا تھا۔

کاش میری آنکھیں کھُل جاتیں۔ تو میری مراد آنِ واحد میں پوری ہو جاتی۔

۳۔ میں تجھے بہشت میں ڈھونڈتا تھا۔ لیکن تو غریب محنتی مزدوروں کے درمیان کھڑا تھا۔

تو نے مجھے اپنے تک پہنچنے کے ہزاروں موقعے دئے۔ لیکن میں نے ان سب کو کھو دیا۔

کاش میں یہ جان سکتا۔ کہ میں تجھے قول میں تلاش کر رہا ہوں، حالانکہ تو فعل میں ہے۔ تو میری تلاش کتنی جلدی ختم ہو جاتی۔ اور میں کس آسانی سے اپنے مقصود کو پا لیتا۔　　یگانتر (ہندی)

ایڈیٹر۔ ایڈیٹر دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو گمنام رہتے ہیں اور "ہم" کے پُرسحر پردے کے پیچھے سے تار ہلاتے رہتے ہیں۔ اُن کو لوگ نہیں جانتے۔ مگر وہ اُن کے دماغ پر حکومت کرتے ہیں۔ "ہم" چھوٹا ہے یا بڑا، کمزور ہے یا تندرست۔ ان امور سے عوام قطعاً ناواقف

ہوتے ہیں۔ وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ "ہم" ہے۔ جو ہفتہ وار یا روزانہ اُن کے پاس آتا ہے اور دنیا بھر کے واقعات پر رائے زنی کرجاتا ہے۔ اراکینِ حکومت کے خلاف بول جاتا ہے اور مستقبل کے لئے عجیب عجیب پیشگوئیاں کرجاتا ہے۔ عوام کے دلوں پر پھر اس "ہم" کا اتنا گہرا اثر ہوتا ہے۔ کہ وہ اُس کی آرا کو بلا تامل قبول کرلیتے ہیں۔ اور اپنے دل میں اُس کی فرضی تصویر بنا لیتے ہیں۔

دوسری قسم کے ایڈیٹر وہ ہیں۔ جو اپنے آپ کو فوراً ظاہر کردیتے ہیں۔ دُنیا کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں اور جس پر حملہ کرتے ہیں، کھُلے طور پر کرتے ہیں۔ انگلستان میں مسٹر ڈبلیو ٹی سٹید اسی قسم کے ایڈیٹر تھے۔ ہندوستان میں اس وقت مہاتما گاندھی، بابو موتی لال گھوش۔ مولانا محمد علی اور لالہ لاجپت رائے اسی جماعت سے متعلق ہیں۔

اوّل الذکر جماعت کے ایڈیٹر اپنی ہستی کو فنا کردیتے ہیں اور اُس کی قبر پر اخبار کی شاندار عمارت تعمیر کرتے ہیں۔ ان کی ذات کے باعث اخبار کی توقیر ہوتی ہے۔ لیکن اُن کی ذات سے عوام ہمیشہ ناآشنا رہتے ہیں۔ ایڈیٹر کوئی ہو۔ اُس کی پالیسی لفظ "ہم" میں پوشیدہ رہتی ہے اور اسکے ناظرین صرف "ہم" کو جانتے ہیں۔ اس لئے ایسے اخباروں کی شہرت اُس وقت تک قائم رہتی ہے۔ جب تک اُس کی ادارت "ہم" کے ہاتھ میں ہے۔ انگلستان کے مقتدر اور ذی اثر اخبارات کے ایڈیٹر عموماً "ہم" ہی ہیں۔

دوسری جماعت کے ایڈیٹر اپنے وقت میں کام بہت کرجاتے ہیں۔ لیکن اُن کے اخبار کی ہستی نہیں بنتی۔ اُن کی علٰحدگی کے ساتھ ہی اخبار کی موت ہوجاتی ہے۔ لوگ اخبار کو اس وجہ سے نہیں خریدتے کہ اخبار عمدہ ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ اخبار کا ایڈیٹر ایک خاص وجاہت کا مالک ہے اپنے وقت میں اس جماعت کے ایڈیٹر کام بلاشبہ بہت کرجاتے ہیں۔ اور ان کے اخبارات کی اشاعت بھی نسبتاً زیادہ ہوجاتی ہے۔ لیکن اُن سے ایڈیٹر کا تعلق منقطع ہونے کے ساتھ ہی اخبار خشک رہ جاتا ہے۔ اور لوگ اُس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے

گمنام ایڈیٹر خود ذریعہ بنتا ہے اخبار کو مقصود بناتا ہے حالانکہ دوسری قسم کا ایڈیٹر اخبار کو ذریعہ بناتا ہے اور خود کو مقصود۔ مریادا بنارس (ہندی)

تنقید کی اہمیت۔ کسی زبان کا لٹریچر ترقی نہیں کرسکتا۔ تاوقتیکہ اُس میں زبردست اور نڈر نقاد نہ ہوں۔ اُن کی عدم موجودگی میں نالائق مصنفوں کو میدان میں اُترنے کی جرأت ہوجاتی ہے۔ اور ناقابلِ مطالعہ کتب لٹریچر کا حصہ بن جاتی ہیں۔ جہاں عمدہ کتب تیار کرنا علم ادب کی بہترین خدمت

سرانجام دینا ہے۔ وہاں لغو اور بے پردہ کتب کے خلاف رائے عامہ پیدا کرنا بھی کم ضروری امر نہیں۔ نقاد کو ایسی کتب پر اس زور سے نکتہ چینی کرنا چاہیئے کہ اُن مصنفوں کو دوبارہ کتاب لکھنے کا حوصلہ نہ ہو سکے سپارٹا میں لائی کرگس نے قانون بنا دیا تھا۔ کہ جو بچے کمزور ہوں۔ اُن کو پیدا ہوتے ہی ہلاک کر دیا جائے۔ تاکہ ملک میں صرف مضبوط اور تنومند آدمی ہوں۔ ہمارے خیال میں دُنیائے کتب میں یہ اصول بہترین اصول ثابت ہوگا۔ تاکہ لٹریچر میں صرف وہی کتابیں دکھائی دیں۔ جو اپنی خوبی کے لحاظ سے زندہ رہنے کے قابل ہوں۔ بقیہ کتب کو فوراً تلف کر دینا ملک و قوم کی بہترین خدمت ہے۔ اور اس کے لئے بلا رو رعایت تنقید ہی ایک ایسا حربہ ہے۔ جو حالات موجودہ میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بنگ سمپت (بنگالی)

میرا پھول۔ میرے باغیچہ میں بہت سے پھول تھے۔ لیکن اُن میں سے ایک خاص طور پر ایسا دلکش اور حسین تھا۔ کہ میری نگاہیں اُس کی طرف خود بخود اُٹھ جاتی تھیں ــــــ میں کہتا تھا یہ میرا پھول ہے اُسے دیکھ کر میرا دل رقص کرنے لگتا تھا۔

ایک دن میں باغیچہ میں گیا۔ مجھ پر بجلی سی گر پڑی۔ وہ پھول وہاں نہیں تھا۔ باقی باغ اُسی طرح حسن آباد بنا ہوا تھا۔ لیکن میرا پھول کہاں تھا؟

میں نے آہ سرد بھری اور آنسو پونچھتے ہوئے باغ سے باہر نکل آیا۔ حالانکہ وہاں پھولوں کی کمی نہ تھی۔ مگر وہ میرا پھول تھا۔ جو کسی کے ظالم ہاتھوں نے ٹہنی سے توڑ لیا تھا۔

(پال مال میگزین (لنڈن)

ناکام عشق۔ اے حسینہ! کیا تجھے وہ دن یاد ہے۔ جب میں ہچکچاتے ہوئے قدموں سے تیرے نیم وا دروازے پر پہنچا۔ اور رعب حسن سے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے تیرے حضور میں شرف باریابی کا طلبگار ہوا۔

تو اس وقت مسکرا رہی تھی۔

میں تیرے سامنے گیا اور اپنی زندگی کے بیش بہا تحفے تیرے قدموں پر ڈال دئے۔ اُن میں معصومیت تھی، ایمان تھا، محبت تھی، صداقت تھی اور ان سب پر ہوا کی مانند چھائی ہوئی محبت تھی۔

تو نے ان سب چیزوں کو دیکھا۔ اور بچوں کے سے اضطراب سے پوچھا "کچھ اور؟"

مَیں نے تیرے برف سے سفید چہرے کی طرف نگاہ کی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میری زندگی کے دیرینہ خواب مایوسی میں تبدیل ہوگئے، تو نے جواب دیا "یہ اشیاء میرے کس

مصرف کی ہیں ؟"

میں نے اپنے نامنظور شدہ تحفوں کو اُٹھایا اور روتا ہُوا جنگل کو چلا گیا۔ وہاں میں نے ایک درخت کے نیچے ان سب کو دفن کر دیا اور اپنی زندگی کے خوابوں کو اُس کے ساتھ بہنے والی تیز رفتار ندی کے پانی میں بہا دیا۔

اب تو مجھے دیکھتی ہے تو تیرا چہرہ خوف سے زرد ہو جاتا ہے۔ مگر کیا تجھے وہ دن یاد نہیں۔ جب میں اپنی زندگی کے بہترین تحفے لیکر تیرے پاس گیا تھا۔ اور تو نے اُن سب کو نامنظور کر دیا تھا۔

لوگ میرے افعال دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں۔ یہ شیطان ہے۔ لیکن اے حسینہ! کیا تجھے معلوم ہے۔ کہ اس کا موجب تو اور صرف تو ہے۔

ہارپر (امریکہ)

لطائف ۔ ایک انگریز ایک امریکن کو اسٹیشن سے اپنے گھر کو لے جا رہا تھا۔ راستہ میں ایک عالیشان عمارت دکھائی دی۔ امریکن نے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

انگریز نے جواب دیا "یہ عدالت عالیہ کی عمارت ہے۔ تین سال میں تعمیر ہُوئی ہے"

"مگر ہمارے ہاں تو ایسی عمارات دو دو دن میں تیار ہو جاتی ہیں"

انگریز اس تعلّی پر جھنجھلا گیا۔ مگر موقعہ کا منتظر رہا۔ اتنے میں ایک اور عمارت نظر آئی۔ یہ نسبتاً چھوٹی تھی۔ امریکن نے پھر پوچھا "کیوں صاحب! یہ کونسی جگہ ہے؟"

انگریز نے حیرت ظاہر کی اور جواب دیا "میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ یہ کونسی عمارت ہے۔ کیونکہ جب آپ کو لینے کے لئے اسٹیشن کو گیا تھا۔ اُس وقت یہ تعمیر نہیں ہُوئی تھی۔ اس دوران میں تیار ہُوئی ہے"۔

امریکن کو جواب مل گیا۔

۲۔ **بیوی**۔ آدمی بعض وقت کیسی کیسی غلطی کر بیٹھتا ہے

شوہر۔ یعنی شادی کر لیتا ہے۔

۳۔ ایک پادری نے ایک لڑکے کو اتوار کے روز پتنگ اُڑاتے دیکھ کر پوچھا "صاحبزادے! تم اتوار کے روز پتنگ اڑاتے ہو۔ تمہیں اپنے مذہب کا کیا بالکل خیال نہیں؟"

لڑکے نے سادگی سے جواب دیا۔ "مگر یہ پتنگ اتوار ہی کے اخبار سے تو بنایا گیا ہے۔"

۴۔ **پادری**۔ (ایک لڑکے سے) گناہ بخشوانے کے لئے سب سے پہلے کس چیز کی ضرورت ہے؟

لڑکا۔ گناہ کرنے کی۔

۵۔ **انسپکٹر**۔ اخبار پڑھنے کا کیا فائدہ ہے؟

طالب علم۔ گھر میں ردّی جمع ہو جاتی ہے۔

انسپکٹر۔ نہایت نامعقول ہو (دوسرے طالب علم سے) سگرٹ پینے کا کیا نقصان ہے؟

دوسرا طالب علم۔ دیا سلائیاں بہت خرچ ہوتی ہیں۔ نیوویجلاٹ (آسٹریلیا)

حصۂ نظم

گرمی

پھر زمانہ جون کا آیا درِ دوزخ کھلا — آگ برسی غیض سے پھر تمتما اٹھی فضا
خون کھولا، ہر بنِ مو سے پسینہ پھر چلا — پھر بخاراتِ زمیں اُکھڑے تلاطم آگیا

خیر ہو یارب کہ پھر برہم مزاجِ نار ہے
جو کرن ہے، خون میں ڈوبی ہوئی تلوار ہے

دہکے انگارے سے آنکھوں میں رگوں میں گرم خوں — چل گیا پھر اک زمانہ پر تمازت کا فسوں
شیرنی کی طرح پھر چنگھاڑتی پھرتی ہے لوں — آگ برسانے لگا گرمی کی دیوی کا جنوں

دھوپ نے کھولا کے موجوں کو جہنم کر دیا
آتشِ سیّال سے دریا کا سینہ بھر دیا

پھر زمیں سے آنچ سی اُٹھنے لگی بھڑکے تنور — لُو کے جھونکے دوپہر تک بن گئے طوفانِ صور
پھر گھنے پیڑوں کے پتوں میں چھپے جا کر طیور — انتہا پر آگیا پھر تیز سورج کا غرور

کوہ کی چوٹی پہ جتنا برف تھا سب گھل گیا
بادشاہِ شرق کا پھر سُرخ پرچم کھل گیا

فصلِ گل کا خشک پتوں سے کفن سلنے لگا — جل گئے سینے کے ٹانکے زخمِ دل کھلنے لگا
پھر زمیں کو زلزلہ آیا، فلک ہلنے لگا — مہرِ عالمتاب پھر جھک کر گلے ملنے لگا

لڑکیاں پھولوں سے پھر کورے گھڑے سجنے لگیں
پھر ہوا سے روزنوں میں سیٹیاں بجنے لگیں

خشک کلیاں ہو گئیں مُرجھا گئے سب برگ و بار — پھر چڑھا ہے دھوپ کی تیزی سے دنیا کو بخار
چرخ پر چھایا ہوا ہے صبح سے گرد و غبار — کتنا آتش ریز ہے اے جون تیرا ابرِ نار

ابرِ مصنوعی نے گُم کی آب و تابِ آسماں
یہ غبارِ زرد ہے گویا سرابِ آسماں

حلق میں کانٹے پڑے، ہونے لگا پھر رنگ زرد — لب پہ خشکی، طبع میں آشفتگی، آنکھوں میں گرد
کنپٹی کی رگ چلی پیہم، اٹھا پھر سر میں درد — حد سے گرمی بڑھ گئی، پھر ہو گئے جذبات سرد

کس سے وحشت کیجئے، کس کی تمنّا کیجئے
کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ اب کیا کیجئے

اُس جگہ بالو ہے بہتے تھے کبھی دریا جہاں — اوڑھ کر ذرّوں کی چادر سو گئی ہیں ندیاں
دوپہر کا اژدہا ہے غیض میں کف در دہاں — یہ زمیں جھلسی ہوئی تپتا ہوا یہ آسماں

پتیوں کے سائے میں بھونرے یہ تھرّاتے ہوئے
یہ بگولے خشک میدانوں میں بل کھاتے ہوئے

ایک ہنگامہ سا برپا ہے زمیں سے تا فلک — رنگ سبزے سے اُڑا ہے سینۂ گل سے مہک
سُرخ ذرّوں کی حرارت، گرم سورج کی پلک — چارپائے جھیل میں ڈوبے ہوئے گردن تلک

خوابگاہیں نوجوانی کی بھی اب بھاتی نہیں
کُنج میں ہے اور چرواہے کو نیند آتی نہیں

گرم پنکھے کی ہوا ہے خشک ہیں ہوش و حواس — ہر بنِ مو ایک چنگاری ہے تپنے میں لباس
ہو گئے ہیں پھول سے چہرے حسینوں کے اداس — ٹٹیاں چھڑکی گئیں بستر ہیں دروازوں کے پاس

نازنیں تلخیٔ موسم کے مزے چکھے ہوئے
سو رہے ہیں ٹٹیوں کے پاس مُنہ رکھے ہوئے

جوشؔ ملیح آبادی

لہ لوں؟

دولت کا خطاب

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے "دولت" کے سات خطاب سات مختلف شخصوں کی طرف سات بندوں میں نظم کئے ہیں ہر بند سبق آموز ہے ذیل کا خطاب ایسے شخص کی جانب ہے۔ جو زندگی کے شروع ہی میں بہت بڑا مالدار بننے کا آرزومند ہے دولت کا دوسرا روئے سخن اُس کاہل الوجود انسان کی طرف ہے جو ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر ہی متمول بننا چاہتا ہے۔ آئندہ اشاعتوں میں باقی بند بھی شائع کئے جائینگے۔ اڈیٹر

تو مرے واسطے اسدرجہ پریشاں کیوں ہے ۔۔۔ دور سے دیکھ کے صورت مری حیراں کیوں ہے

تو اگر یاد ہے کے آدمی کے ہیں رشدی ۔۔۔ میرے ملنے کا ابھی سے تجھے ارماں کیوں ہے

دن کے کاموں میں لگا دل کہ سویرا ہے ابھی ۔۔۔ استراحت کا یہ پوچھے سے ہی ساماں کیوں ہے

مجھکو سمجھا ہے مگر منہ کا نوالا کوئی ۔۔۔ اتنا بیتاب تو اے بندۂ آساں کیوں ہے

جب ہاتھ آؤنگی تو جھٹ سے نکل جاؤنگی ۔۔۔ رنج و محنت سے تجسس سے گریزاں کیوں ہے

ٹھنڈے دل سے تو ذرا جھیل تو بے سوز فراق ۔۔۔ برق بیتاب صفت شعلہ بداماں کیوں ہے

پہلے دامن تو وہ پیدا ہو سماؤں جس میں ۔۔۔ جوشِ وحشت میں عبث چاک گریباں کیوں ہے

کام ہے ٹھیک ہی وقت پہ جو ہوتا ہے ۔۔۔ اپنی عجلت مزاجی سے پریشاں کیوں ہے

امتحاں میں نہیں منظور کہ ڈالوں تجھ کو ۔۔۔ صبر کر دم لے ذرا اتنا ہراساں کیوں ہے

دلنوازی ہے مری درخور ظرف طالب ۔۔۔ تو سوا اس سے مرے لطف کا خواہاں کیوں ہے

قابل اور اہل جب اے دوست تجھے پاؤنگی
بن بلائے میں ترے پاس چلی آؤنگی

کیفی دہلوی

تو نے میرے لئے گر رنج اٹھایا ہوتا ۔۔۔ میرے الطاف کا سر پر ترے سایہ ہوتا

سر جھکائے رہا پیشانی کی تحریر پہ تو ۔۔۔ کبھی دریائے عرق اس پہ بہایا ہوتا

تجھکو تدبیر سے پرہیز ہے کوشش سے گریز ۔۔۔ دل کبھی رنج و مشقت سے لگایا ہوتا

نیک تدبیر سے تقدیر بدل جاتی ہے ۔۔۔ لوحِ دل پر کبھی نقش اسکا بٹھایا ہوتا

بیگماں گوہرِ مقصود تجھے مل جاتا ۔۔۔ غوطہ محنت کے سمندر میں لگایا ہوتا

سبز البتہ تری کشتِ تمنا ہوتی ۔۔۔ خون گرم اپنا اگر اسکو پلایا ہوتا

بنکے اکسیر ترے ہاتھ میں خود آجاتی ۔۔۔ خاک میں آپکو گر تو نے ملایا ہوتا

تگ و دو سے ہے گریز اور مشقت سے حذر ۔۔۔ کیونکر اونچا تری تقدیر کا پایا ہوتا

رہا آساں طلبی صفت بری کا پتلا ۔۔۔ ہاتھ سے کام کبھی کر کے دکھایا ہوتا

جستجو میری زخود رفتہ تجھے کر دیتی ۔۔۔ شوق میرا جو ترے دل میں سمایا ہوتا

پاس پیاسے کے کبھی ناداں کنواں آتا ہے
گرتا پڑتا وہاں وہ آپ پہنچ جاتا ہے

کیفی دہلوی

اسیرِ قفس

اے قیدِ قفس چشمِ بصیرت سے ذرا دیکھ!
تو دام سمجھتا ہے جسے دام نہیں ہے

لائیگا کبھی رنگ ترا رنجِ اسیری
اک رنگ پہ یہ ابلقِ ایام نہیں ہے

"الیسر مع العسر" اگر سچ ہے تو پھر کیا
اس صبحِ مصیبت کی تری شام نہیں ہے؟

آزادیٔ کامل تجھے ہوگی کبھی حاصل
یہ تیری تمنا ہوسِ خام نہیں ہے

صیاد نے گر قید میں رکھا تو ہوا کیا
پابندِ قفس گردشِ ایام نہیں ہے

تاجور

جذباتِ عالیہ

ذیل کی غزل مجددِ عصر ڈاکٹر اقبال کی فرمائش سے لکھی گئی۔

غالب

آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است
بر دار تواں گفت بمنبر نتواں گفت

گرامی

عشق آمد و از عقل فسونگر نتواں گفت
پیداست کہ از پنبہ و اخگر نتواں گفت

ما خم کشِ دیرینۂ سرجوشِ الستیم
با ما سخن از شیشہ و ساغر نتواں گفت

با دل شدگاں قصۂ محشر نتواں کرد
با سوختگاں حرف ز کوثر نتواں گفت

آں طفل رہِ دل زدہ رہزن نتواں خواند
در کعبہ زند آتش و کافر نتواں گفت

منصور کہ مستانہ برآمد بسرِ دار
خوش گفت ولے نکتہ بمنبر نتواں گفت

آں راز چہ راز است کہ در پردۂ میم است
آں راز الٰہی ست کہ برتر نتواں گفت

آں رمزِ جلیل است ابوجہل چہ فہمد
آں رمزِ جلیل است بآذر نتواں گفت

آنرا کہ در ایں دشت نہ صید است نہ صیاد
شاہیں نتواں گفت کبوتر نتواں گفت

در سینہ بمیرد دل بیدرد کہ آنرا
ماہی نتواں گفت سمندر نتواں گفت

بسم اللہ ترا ایں مژہ آں ابروئے خونریز
برخیز کہ از دشنہ و خنجر نتواں گفت

با دوست حدیثِ دلِ غمدیدہ چہ گویم
دلدادگیِ ذرہ با خاور نتواں گفت

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

اینست سخنہائے گرامی اگر اینست
شاعر نتواں خواند سخنور نتواں گفت

تپش

عالمِ دل ہے نورِ دیدۂ شوق
میری ہستی ہے آفریدۂ شوق

مدعائے نظر ہے حسنِ نظر
ہمہ تن بن گیا ہوں دیدۂ شوق

تارِ دامن ہوئے گریباں گیر
مرحلے دستِ نارسیدۂ شوق

دیدہ بر راہِ خارِ حسرت ہے
پائے وحشت زدہ خلیدۂ شوق

ہے تمنائی نیازِ جبیں
سرِ راہِ وفا خمیدۂ شوق

ہائے کیونکر ہو اعتبارِ خیال
مدعا در برگزیدۂ شوق !

چشمِ اشک آفریں کو کیا کہیے
جامِ لبریز ہے دمیدۂ شوق

ہو گیا آخرش نصیبِ خزاں
اے گلِ مدعا نچیدۂ شوق!

آہوئے دشتِ قیس کی ہے تلاش
دیدۂ شوق ہیں رمیدۂ شوق

غنچۂ دل سے باز پرس نہ کر
اے نسیمِ وفا وزیدۂ شوق

ہو گئیں کل امیدیں جذبِ فنا
مٹ گیا دل سے سب عقیدۂ شوق

کھل گئی چشمِ منتظر نہ کھلی
مرحبا جاں بلب رسیدۂ شوق

خوف کیا اب شکستہ رنگی کا
صورتِ حال ہے کشیدۂ شوق

چشم پوشی کی ہے طلب یعنی
پیرہن ہوں مگر دریدۂ شوق

ہے غزل میں تپش شباب کا جوش
لکھ رہا ہوں ابھی قصیدۂ شوق

وقارالاعظم شرف

دل سے کہ ہیں دل کے ارمان سے کیا مطلب؟
تم جان سے پیارے ہو تو جان سے کیا مطلب؟
اِس عشق کی مشکل سے آسان سے کیا مطلب؟
ہم درد کے طالب ہیں درماں سے کیا مطلب؟
توحید کا دریا بھی سرچشمۂ رحمت ہے
سرچشمۂ رحمت کو طوفان سے کیا مطلب؟
اک میں کہ مجھے حسرت۔ حسرت ترے ملنے کی
اک تو کہ تجھے میرے ارمان سے کیا مطلب؟
دُنیا مجھے کہتی ہے دیوانہ ہے دیوانہ
لیلیٰ ترے مجنوں کو اوسان سے کیا مطلب
بت خانہ میں کافر ہوں کعبہ میں مسلماں ہوں
تم سے مجھے مطلب ہے ایمان سے کیا مطلب
کچھ دل میں مرے یارب کانٹا سا کھٹکتا ہے
کیا چیز بنائی ہے ارمان سے کیا مطلب
آپ اور خطا زاہد توبہ ہے مری توبہ
حضرت تو فرشتہ ہیں انسان سے کیا مطلب؟
سب چلدیئے مرقد سے مٹی مجھے دے دے کر
اب جان نہیں باقی پہچان سے کیا مطلب؟
فریاد جو کی میں نے تو درد نے لی چٹکی
یہ رازِ محبت ہے اعلان سے کیا مطلب؟
پردے کی ترے بولی بندوق کی ہے گولی
اب جان کہاں مجھ میں؟ اب جان سے کیا مطلب؟
میں نے جو کہا کافر کہتا ہے کہ تم کافر
کافر کی محبت سے ایمان سے کیا مطلب؟
اُن کا ہے شرف اُن کا پوچھیں کہ نہ پوچھیں وہ
اللہ کے بندہ کو اس دھیان سے کیا مطلب؟

خورشید

ہُوئی جوں جوں ترقی عرصۂ چاک گریباں میں
جنوں کے راستے کھُلتے گئے خود ہی بیاباں میں
نوا سنجِ فغاں رہنا مرا ہر وقت زنداں میں
جگا دیگا کبھی تو ہم صفیر دل کو گلستاں میں
قیامِ موجِ غم کب تک؟ اگر راحت کو گردش ہے
ہُوا کرتے ہیں ایسے جزر و مد ہستی کے طوفاں میں
مرا حالِ زبوں آنکھوں سے اب دیکھا نہیں جاتا
نگاہیں آپ پردہ بن گئی ہیں چشمِ گریاں میں
سکونِ دل ہُوا حاصل طفیلِ دشت پیمائی
علاجِ آبلہ پائی ملا خارِ مغیلاں میں
جنونِ عشق نے کی رہبری کتنوں کی منزل تک
تلاشِ خضر میں کی راہ گم میں نے بیاباں میں
ترے دیوانے کے گرد ایک خلقت جمع رہتی ہے
یہ جمعیت مُبارک ہو اسے حالِ پریشاں میں
اثر ہے وحشت انگیز اس قدر بادِ بہاری کا
کہ پیدا ہو گئی جنبش سی ہر تارِ گریباں میں
دلِ خورشید کو اللہ نے کیا داغ بخشا ہے
نہ شوکت ایسی لالہ میں نہ یہ ضو ماہِ تاباں میں

تقریظات

ہیر رانجھا جدید مصنفہ منشی مولا بخش صاحب کشتہ امرتسری ہیر رانجھا کے موضوع پر اگرچہ آجتک بیشمار قصے مختلف اوقات اور مختلف زبانوں میں لکھے گئے ہیں اور اُن میں سید وارث شاہ کی ہیر کو بہت شہرت حاصل ہُوئی ہے لیکن زیر تقریظ کتاب اپنے طرز بیان اور اعلیٰ تخیلات کی بنا پر پسندیدہ اور قابل قدر ہے کشتہ صاحب نے اگرچہ پنجابی نظم میں بطرز وارث شاہ اس قصہ کو لکھا ہے مگر اسمیں طبی اخلاقی اور علمی نکتے بھی خوب بیان کئے ہیں زبان ٹھیٹھ پنجابی ہے انداز بیان پُر لطف اور دلچسپ لکھائی چھپائی نفیس۔ اور کاغذ چکنا دیسی حجم قریباً دو سو صفحہ۔ قیمت .. .. عہ ر

ملنے کا پتہ:۔ منشی مولا بخش کشتہ اینڈ سنسز تاجران کتب امرتسر

آنریری مجسٹریٹ۔ ایک مختصر نداقیہ ڈرامہ مصنفہ فطرت نگار سدرشن مصنوعی طرز تکلم سے پاک مقفّے نثر سے مبرّی افراد ڈرامہ کی باہمی گفتگو بالکل بے تکلفانہ اور مطابق فطرت ہے کاش دوسرے ڈرامہ نویس بھی فطرت نگاری میں سدرشن کی تقلید کریں۔ قیمت ۴ ر

رام کٹیا لاہور سے طلب کریں۔

نگار۔ ماہوار علمی و ادبی رسالہ زیر ادارت حضرت نیاز فتحپوری و جناب مخمور اکبر آبادی آگرہ سے شائع ہو رہا ہے متعدد نمبر دیکھنے کے بعد تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اردو ادبی رسائل میں نگار سب سے زیادہ ممتاز ہے اسکے ادبی مضامین خاص پایہ کے ہوتے ہیں علمی و تاریخی مضامین کا ذخیرہ بھی امتیازی شان رکھتا ہے۔ ل احمد کا ترجمہ مضمون "لالہ رخ" جو متعدد نمبروں میں مسلسل شائع ہو رہا ہے اردو ادب کا بہترین سرمایہ کہا جا سکتا ہے۔ نگار کو دیکھ کر حضرت نیاز کے ہر فنی ہونیکا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ مختصر یہ کہ حضرت نیاز نے اپنے بہار آفریں قلم سے نگار کو اسم بامسمّٰی بنا دیا ہے۔

ہماری آرزو ہے۔ کہ اُردو کے ہر شہر سے ایک ایک نگار شائع ہو۔ قیمت سالانہ پانچروپیہ .. صہ ر

حُریت۔ یہ ہفتہ وار سیاسی و ادبی اخبار زیر ادارت مولوی عنایت اللہ خانصاحب لاہور سے شائع ہو رہا ہے۔ نام کو تو یہ اخبار ہے لیکن درحقیقت ایک سیاسی و ادبی رسالہ ہے مولویصاحب موصوف مولنا ظفر علی خانصاحب کے بھائی ہیں۔ اس خاندان کے اردو اخبار نی دنیا پر گرانقدر احسانات ہیں۔ دراصل ہندوستان بھر میں اخباری مذاق زمیندار کے ذریعہ پھیلا۔ اخبار حریت کی شگفتہ زبان دلکش ادائے بیان زمیندار کے عہد شباب کی یاد تازہ کرتی ہے۔ ہر نمبر میں بڑے سائز پر کسی اسلامی رہنما کی پوری تصویر شائع ہوتی ہے ان تصاویر پر اگرچہ بیشمار روپیہ صرف ہوتا ہوگا مگر اخبار کا ہر نمبر بیحد جاذب توجہ بنجاتا ہے۔ ابتک خلیفۃ المسلمین غازی مصطفےٰ کمال پاشا غازی انور پاشا۔ غازی امیر امان اللہ خاں۔ مولانا ظفر علیخانصاحب وغیرہ کی تصاویر شائع ہو چکی ہیں۔ ہر نمبر میں لفرز ادبی و سیاسی نظمیں دلچسپ معلومات۔ سیاسی کارٹون شائع ہوتے ہیں۔ غرضیکہ صوبہ بھر کے ہفتہ وار اخباروں میں اپنا جواب نہیں رکھتا چندہ سالانہ آٹھ روپے ششماہی للعہ۔ سہ ماہی عـہ ر

دفتر اخبار حریت سے طلب کیجئے۔

ہزار داستان۔ پندرہ روزہ ادبی رسالہ زیر ادارت حکیم احمد شجاع صاحب بی اے (علیگ) مقام اشاعت لاہور قیمت سالانہ آٹھ روپے۔

اگرچہ پہلے نمبر پر اظہار رائے اسکے مستقبل پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا لیکن بفحوائے "سالے کہ نکوست از بہارش پیدا" حسن آغاز "انجام بخیر" سنا رہا ہے۔ کوئی گرانپایہ ادبی رسالہ جاری کرنیکے لئے اسکے مالک میں تین صفتوں کا ہونا ضروری ہے۔

وقارالاعظم شرف

دل سے کہ ہمیں دل کے ارمان سے کیا مطلب؟
تم جان سے پیارے ہو تو جان سے کیا مطلب؟
اِس عشق کی مشکل سے آسان سے کیا مطلب؟
ہم درد کے طالب ہیں درماں سے کیا مطلب؟
توحید کا دریا بھی سرچشمۂ رحمت سے ہے
سرچشمۂ رحمت کو طوفان سے کیا مطلب؟
اک ہیں کہ مجھے حسرت۔ حسرت ترے ملنے کی
اک تو کہ تجھے میرے ارمان سے کیا مطلب؟
دُنیا مجھے کہتی ہے دیوانہ ہے دیوانہ
لیلےٰ ترے مجنوں کو اوسان سے کیا مطلب
بت خانہ میں کافر ہوں کعبہ میں مُسلماں ہوں
تم سے مجھے مطلب ہے ایمان سے کیا مطلب
کچھ دل میں مرے یارب کانٹا سا کھٹکتا ہے
کیا چیز بنائی ہے ارمان سے کیا مطلب
آپ اور خطا زاہد توبہ ہے مری توبہ
حضرت تو فرشتہ ہیں انسان سے کیا مطلب؟
سب چلدیئے مرقد سے مٹی مجھے دے دے کر
اب جان نہیں باقی پہچان سے کیا مطلب؟
فریاد جو کی میں نے تو در دنے لی چٹکی
یہ رازِ محبت ہے اعلان سے کیا مطلب؟
پردے کی ترے بولی بندوق کی ہے گولی
اب جان کہاں مجھ میں؟ اب جان سے کیا مطلب؟
میں نے جو کہا کافر کہتا ہے کہ تم کافر
کافر کی محبت سے ایمان سے کیا مطلب؟
اُن کا ہے شرف اُن کا پوچھیں کہ نہ پوچھیں وہ
اللہ کے بندہ کو اس دھیان سے کیا مطلب؟

خورشید

ہُوئی جوں جوں ترقی عرصۂ چاک گریباں میں
جنوں کے راستے کُھلتے گئے خود ہی بیاباں میں
نواسنج فغاں رہنا مرا ہر وقت زنداں میں
جگا دیگا کبھی تو ہم صفیروں کو گلستاں میں
قیام موجِ غم کب تک؟ اگر راحت کو گردش ہے
ہُوا کرتے ہیں ایسے جزر و مد ہستی کے طوفاں میں
مرا حال زبوں آنکھوں سے اب دیکھا نہیں جاتا
نگاہیں آپ پردہ بن گئی ہیں چشم گریاں میں
سکونِ دل ہُوا حاصل طفیلِ دشت پیمائی
علاج آبلہ پائی ملا خارِ مغیلاں میں
جنونِ عشق نے کی رہبری کتنوں کی منزل تک
تلاشِ خضر میں کی راہ گم میں نے بیاباں میں
ترے دیوانے کے گرد ایک خلقت جمع رہتی ہے
یہ جمعیت مُبارک ہو اسے حالِ پریشاں میں
اثر ہے وحشت انگیز اس قدر بادِ بہاری کا
کہ پیدا ہو گئی جُنبش سی ہر تار گریباں میں
دلِ خورشید کو اللہ نے کیا داغ بخشا ہے
نہ شوکت ایسی لالہ میں نہ یہ ضو ماہِ تاباں میں

تقریظات

ہیر رانجھا جدید مصنفہ منشی مولا بخش صاحب کشتہ امرتسری ہیر رانجھا کے موضوع پر اگرچہ آجتک بیشمار قصے مختلف اوقات اور مختلف زبانوں میں لکھے گئے ہیں اور اُن میں سید وارث شاہ کی ہیر کو بہت شہرت حاصل ہُوئی ہے لیکن زیر تقریظ کتاب اپنے طرز بیان اور اعلیٰ تخیلات کی بنا پر پسندیدہ اور قابل قدر ہے کشتہ صاحب نے اگرچہ پنجابی نظم میں بطرزِ وارث شاہ اس قصہ کو لکھا ہے مگر اسمیں طبی اخلاقی اور علمی نکتے بھی خوب بیان کئے ہیں زبان ٹھیٹھ پنجابی ہے انداز بیان پُر لطف اور دلچسپ لکھائی چھپائی نفیس۔ اور کاغذ چکنا دیسی حجم قریباً دو سو صفحہ۔ قیمت .. .. .. عہ ر

ملنے کا پتہ:۔ منشی مولا بخش کشتہ اینڈ سنسز تاجران کتب امرتسر

آنریری مجسٹریٹ۔ ایک مختصر مذاقیہ ڈرامہ مصنفہ فطرت نگار سدرشن مصنوعی طرز تکلم سے پاک مقفےٰ نثر سے مبرّیٰ افرادِ ڈرامہ کی باہمی گفتگو بالکل بے تکلفانہ اور مطابق فطرت ہے کاش دوسرے ڈرامہ نویس بھی فطرت نگاری میں سدرشن کی تقلید کریں۔ قیمت ۴ر رام کٹیا لاہور سے طلب کریں۔

نگار۔ یہ ماہوار علمی و ادبی رسالہ زیرادارت حضرت نیاز فتحپوری و جناب مخمور اکبرآبادی آگرہ سے شائع ہو رہا ہے متعدد نمبر دیکھنے کے بعد تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اردو ادبی رسائل میں نگار سب سے زیادہ ممتاز ہے اسکے ادبی مضامین خاص پایہ کے ہوتے ہیں علمی و تاریخی مضامین کا ذخیرہ بھی امتیازی شان رکھتا ہے۔ ل احمد کا ترجمہ مضمون "لالہ رخ" جو متعدد نمبروں میں مسلسل شائع ہو رہا ہے اردو ادب کا بہترین سرمایہ کہا جا سکتا ہے۔ نگار کو دیکھ کر حضرت نیاز کے ہر فنی ہونیکا اعتراف کرنا پڑتا ہے مختصر یہ کہ حضرت نیاز نے اپنے بہار آفریں قلم سے نگار کو اسم بامسمّیٰ بنا دیا ہے۔

ہماری آرزو ہے۔ کہ اُردو کے ہر شہر سے ایک ایک نگار شائع ہو۔ قیمت سالانہ پانچروپیہ .. صہ ر

حُرّیت۔ یہ ہفتہ وار سیاسی و ادبی اخبار زیرادارت مولوی عنایت اللہ خانصاحب لاہور سے شائع ہو رہا ہے۔ نام کو تو یہ اخبار ہے لیکن درحقیقت ایک سیاسی و ادبی رسالہ ہے مولویصاحب موصوف مولٰنا ظفر علی خانصاحب کے بھائی ہیں۔ اس خاندان کے اردو اخبار نی دنیا پر گرانقدر احسانات ہیں۔ دراصل ہندوستان بھر میں اخباری مذاق زمیندار کے ذریعہ پھیلا۔ اخبار حریت کی شگفتہ زبان دلکش ادائے بیان زمیندار کے عہد شباب کی یاد تازہ کرتی ہے۔ ہر نمبر میں بڑے سائز پر کسی اسلامی رہنما کی پوری تصویر شائع ہوتی ہے ان تصاویر پر اگرچہ بیشمار روپیہ صرف ہوتا ہوگا مگر اخبار کا ہر نمبر بیحد جاذب توجہ بنجاتا ہے۔ ابتک خلیفۃ المسلمین غازی مصطفےٰ کمال پاشا غازی انور پاشا۔ غازی امیر امان اللہ خاں۔ مولانا ظفر علیخانصاحب وغیرہ کی تصاویر شائع ہو چکی ہیں۔ ہر نمبر میں دلفروز ادبی و سیاسی نظمیں دلچسپ معلومات۔ سیاسی کارٹون شائع ہوتے ہیں۔ غرضیکہ صوبہ بھر کے ہفتہ وار اخباروں میں اپنا جواب نہیں رکھتا چندہ سالانہ آٹھ روپے ششماہی للعہ۔ سہ ماہی عہ ر دفتر اخبار حریت سے طلب کیجئے۔

ہزار داستان۔ پندرہ روزہ ادبی رسالہ زیر ادارت حکیم احمد شجاع صاحب بی اے (علیگ) مقام اشاعت لاہور قیمت سالانہ آٹھ روپے۔

اگرچہ پہلے نمبر پر اظہار رائے اسکے مستقبل پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا لیکن بفحوائے "سالے کہ نکوست از بہارش پیداست" حسن آغاز، انجام بخیر سنا رہا ہے۔ کوئی گرانپایہ ادبی رسالہ جاری کرنیکے لئے اسکے مالک میں تین صفتوں کا ہونا ضروری ہے۔

اولاً یہ کہ وہ بے اندازہ دولت رکھتا ہو۔ ثانیاً ضرورت سے زیادہ عاقبت اندیش ہو۔ ثالثاً ادبی ذوق سے بہرہ ور ہو۔

ہمارا ذاتی علم اور ہزار داستان کا حسن معنوی حکیم صاحب کے ادبیات لطیفہ سے والہانہ محبت پر شاہد ہیں۔ مقدم الذکر دو صفات کا ثبوت رسالہ کی نظر فریبی سے مل سکتا ہے۔ ہزار داستان باتصویر ہے۔ حسن طباعت کے ساتھ حسن کتابت سے بھی مالا مال ہے۔ ہزار داستان زیادہ تر افسانوں کا مجموعہ ہے اور اسی غرض کیلئے جاری کیا گیا ہے۔ ایک سرسری نظر میں ہم نے سے دلچسپ پایا۔ زبان و محاورات کی بعض لغزشوں اور نظم کے کچھ حصے سے قطع نظر کر لی جائے تو ہزار داستان ان رسالوں میں شمار ہونیکے قابل ہے جنکی دنیائے اردو کو ضرورت ہے۔ "کتے" کے عنوان سے جناب پطرس کا مضمون ایسا قہقہہ انگیز ہے کہ ہنستے ہنستے پیٹ کے بل خم گیسو بن جاتے ہیں۔ سید امتیاز علی صاحب تاج نے "ساون رین کا سپنا" اور "لیلے" کے نام سے لارڈ لٹن اور شکسپیر کے ناول اور ڈراما کا ترجمہ مسلسل طور پر شائع کرنا شروع کیا ہے۔ یہ دونوں ترجمے بہت دلکش ہیں۔ "کاشش" ڈرامے کا نام کچھ اور ہوتا۔ خود ایڈیٹر صاحب کے قلم سے بھی "ہیرے کی چوری" کے عنوان سے ایک مختصر سا افسانہ شائع ہوا ہے۔ "خندۂ تقدیر" والے مضمون کی عبارت پر اگر نظر ثانی کر لی جاتی تو زیادہ مناسب ہوتا۔ ایسے ہی "امینہ کا گیت" درج کر کے جسٹس محمود مرحوم کو زبردستی شاعر نہ بنایا جاتا تو بہتر تھا۔ جسٹس محمود کا تبحر علمی۔ قانونی قابلیت اور عدیم المثال ذہانت یہ اوصاف کیا کم تھے؟ کہ انہیں کشاں کشاں و محل در معقولات کی حیثیت دیگر شاعروں کی قطار میں بھی لا کھڑا کیا۔ معمولی فروگذاشتوں سے جو عام طور پر ہر رسالہ میں ناگزیر ہوتی ہیں قطع نظر کر لی جائے (اور ضرور کر لینی چاہیئے) تو ہزار داستان اس قابل ضرور ہے کہ اردو دنیا اسکی قدر کرے۔ ہم اپنے با وقار معاصر کا دلی خیر مقدم کرتے ہوئے پبلک سے استدعا کرتے قدر شناسی کرتے ہیں۔

نونہال - بچوں کا ایک ہفتہ وار باتصویر اخبار قیمت چھ روپیہ سالانہ مقام اشاعت لاہور۔ زیر ادارت ایڈیٹر صاحب ہزار داستان ہندوستان بھر میں بچوں کیلئے اردو کا ہفتہ وار باتصویر اخبار اس شان و شکوہ کا اس سے پہلے کبھی شائع نہیں ہوا۔ ہمایوں کے سائز پر حجم بیس صفحات خط جلی اور خوبصورت، کاغذ اعلیٰ چھپائی خوب، سرورق نہایت قیمتی اور باصرہ فروز جس پر پورے سائز میں ایک رنگین تصویر ہے۔

اس رسالہ میں ہر قوم کے بچوں کیلئے مذہبی۔ اخلاقی۔ تاریخی عام فہم کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔ منہ کا مزہ بدلنے کیلئے کہیں کہیں دلپسند لطیفے اور نظمیں بھی درج کیجاتی ہیں بحیثیت مجموعی یہ اخبار اس قابل ہے کہ ہر ہندوستانی بچہ کے ہاتھ میں ہو۔

نونہال کی زبان "پھول" کی طرح توتلی نہیں ہے یعنی نونہال اسکولوں کی ہائی جماعتوں میں پڑھنے والے طلبا کیلئے زیادہ مفید ہوگا پھر بھی اسکی عبارت موجودہ صورت سے زیادہ سلیس اور آسان ہونی چاہیئے۔ امید ہے آئندہ کہانیوں کے ذریعہ بچوں کو حب الوطنی کی تعلیم دینے کا زیادہ اہتمام کیا جائیگا +

اخبار تعلیم لاہور - یہ اردو زبان کا ہفتہ وار تعلیمی اخبار زیر ادارت منشی طالب علی صاحب پابند سابق ایڈیٹر رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ اخبار تعلیم اپنی نوعیت کا صوبہ بھر میں ایک اخبار ہے اور اسکے لئے منشی صاحب سے بہتر کہنہ مشق ایڈیٹر نہیں ملسکتا تھا اس اخبار کے ہر نمبر میں سررشتہ تعلیم کے معلموں کی حالت زار کا دردناک نقشہ نظر آتا ہے، صوبۂ پنجاب کے تعلیمی شعبوں کے مفصل حالات درج ہوتے ہیں طالب علموں کے لئے مفید اخلاقی معاشرتی و تعلیمی مضامین شائع ہوتے ہیں غرضیکہ منشی صاحب اخبار تعلیم کو مفید اور دلچسپ بنانے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

یہ اخبار محکمہ تعلیم پنجاب کی خاص توجہ کا مستحق ہے

قیمت سالانہ چار روپے

دفتر اخبار تعلیم - متصل پیسہ اخبار لاہور

(تاجور)

دو نہایت قیمتی اور دلچسپ سوال

جو ہر خوش نصیب آدمی کو غور اور توجہ کے ساتھ حل کرنے چاہئیں

(۱) کون شخص دنیا میں کامیاب۔ نامور اور بامراد زندگی بسر کرسکتا ہے

(۲) کیا میرا اشمار بھی ایسے خوش نصیب لوگوں میں ہے؟ یا ہو سکتا ہے؟

اگر جناب کو ان دو سوالوں سے ذرا بھی دلچسپی ہے اور نہ صرف اُن اصولوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں جو دنیا کے ناموروں اور اقبالمندوں کی کامیاب زندگی کی جڑ ہیں بلکہ ساتھ ہی اپنے اندر ایک بجلی کی سی لہر پیدا کرنی چاہتے ہیں۔ جو جناب کو کامیاب و مرادمندی کی منزلِ مقصود پر پہنچا سکے اور ہمیں یقین ہے کہ آپکی موجودہ کاوش و محنت اور سینکڑوں ہزاروں کا صرف اسی لئے ہے کہ آپ اپنے ارادہ میں کامیابی اور کمالیت حاصل کریں اگر آپ اپنی زندگی کے آنیوالے سالوں کو کامیابی عزت و ناموری اور دولت و اقبال جیسی نعمتوں سے مالامال بنانا چاہتے ہیں تو آیئے آج اپنی عمر کے چند لمحے کتاب کامیابی کے بغور مطالعہ کرنے میں ہماری سفارش پر ضائع کر ڈالئے یہ کتاب مشاہدات کی بنا پر ایک عجیب روح بخش لہجہ میں، جناب کو بتادیگی کہ دنیا میں بڑا بن جانا دولت و عزت حاصل کرلینا، کسی کی میراث یا ملکیت نہیں۔ بلکہ یہ آدمی کے اپنے ہاتھ کے کھیل ہیں، اور اگر آپ بھی چاہیں تو صرف چند اصولوں پر چل کر کچھ نہ کچھ بن سکتے ہیں۔ نہایت محنت اور ابنائے ملک کی سچی ہمدردی سے لکھی گئی ہے۔ ایک ایک لفظ قیمتی ہے۔ جناب کے صدہا ساتھی ضرور اس سے فائدہ اُٹھائینگے آپ بھی اپنی کامیابی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں۔ کتاب کے ملاحظہ سے گذرنے کے بعد آپ ہم سے کہیں زیادہ اسکی قدر کرینگے۔ نہایت مؤثر اور دلچسپ۔ سات ابواب پر مشتمل۔ لکھائی خوشخط سلیس۔ چھپائی عمدہ کاغذ نفیس۔ خوبصورت جلد بندھی ہوئی قیمت علاوہ محصولڈاک ایک روپیہ پانچ آنے ؎ عہ

اگر منگوانی ہو تو فرمائش جلدی روانہ فرمادیں۔ دوسرے ایڈیشن کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ پتہ یہ ہے۔

فرمائش کے ساتھ رسالہ ہذا کا حوالہ ضرور دیں۔

حافظ غلام رسول۔ سوداگر۔ "کامیابی ڈپو" وزیر آباد (پنجاب)

قواعد

۱- ہُمایوں بالعموم ہر ماہ کے نصفِ اول میں شائع ہُوا کریگا۔

۲- علمی و ادبی۔ تمدنی و تاریخی۔ اخلاقی و روحانی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پُورے اُتریں درجِ رسالہ کئے جائیں گے۔

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہ ہوں گے۔

۴- جواب طلب خطوط کے لئے ار کا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۵- کوئی ایسا اشتہار نہ لیا جائیگا جو خلافِ تہذیب ہو۔

۶- سالانہ قیمت پانچ روپے۔ ششماہی تین روپے نمونہ کا پرچہ ۸/ علاوہ محصولڈاک

۷- ہُمایوں کی ضخامت کم از کم چونسٹھ صفحے ماہوار اور ۷۶۸ صفحات سالانہ ہوگی۔

۸- خط و کتابت کے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھیں۔

۹- ناپسندیدہ مضمون ار کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۱۰- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۲۰ تاریخ کے بعد اور ۲۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

۱۱- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کریں۔

منیجر رسالہ ہُمایوں

۳۰- مزنگ روڈ- لاہور

باہتمام لالہ دیوان چند مالک مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوایا

جملہ حقوق محفوظ

زمامِ ابلقِ ایّام در دستِ ہمایوں شد
نویدِ دورِ خوش کامی انیسِ طبعِ موزوں شد

بیادگار علامہ فصیح آنریبل مسٹر جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں (مرحوم)

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

مُرتبۂ

میاں بشیر احمد۔ بی۔ اے۔ (آکسن) بیرسٹرایٹ لا۔ ایڈیٹر

مولانا تاجور۔ نجیب آبادی (فاضل دیوبند) جائنٹ ایڈیٹر

منشی محمد صادق مینجر رسالہ ہمایوں نے
مرکنٹایل پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

محمد انور خوشنویس چوک متی لاہور

فہرست مضامین بابت ماہ ستمبر ۱۹۲۲ء

جلد ۲ — حصۂ نثر — حصۂ نظم — نمبر ۳

جہاں نُما

ہندوستان کی مردم شماری۔ گذشتہ سال ہندوستان میں جو مردم شماری ہُوئی تھی اُس کی رُو سے ہندوستان کی کل آبادی ۳۱۸۹۴۲۴۸۰ ہے اس میں سے ۱۶۳۹۹۵۵۵۴ مرد ہیں اور ۱۵۴۹۴۶۹۲۶ عورتیں گذشتہ دس سال میں صرف ۳۷۸۶۵۸۴ نفوس کا اضافہ ہُوا ہے۔

مذہب کے لحاظ سے آبادی کی تقسیم حسب ذیل ہے

ہندو ۲۱۶۷۳۴۵۸۶

مُسلمان ۶۸۷۳۵۲۳۳

بودھ ۱۱۵۷۱۲۶۸

مسیحی ۴۷۵۴۰۷۹

یہودی ۲۱۷۷۸

ارواح کے معتقد ۹۷۷۴۶۱۱

متفرق مذاہب ۱۷۹۸۹

چینی ۱۱۷۸۵۹۶

پارسی ۱۰۷۷۸

نستان اور ہندو رعایا۔ امیر کابل نے فرمان ا ہے کہ آئندہ سے ہندو رعایا کے جذبات کی کے خیال سے اور زرعی دقتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی شخص گائے کی قربانی نہ کرے۔

ہندوؤں کو کامل مذہبی آزادی عطا کی گئی ہے اور فیصلہ کیا گیا ہے کہ اُن کے رسم ورواج میں کسی قسم کی دست اندازی نہ کیجائیگی۔ اگر خاوند یا بیوی اسلام قبول کرلے تو فریق ثانی کو کسی حالت میں بھی اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا جاسکے گا۔ اگر کوئی لڑکا برضاد رغبت اسلام قبول کرلے اور اُس کے والد کی جائداد خود پَیداکردہ ہو۔ تو اُس پر اُس کا کوئی حق نہ ہوگا۔

سرکاری ملازمت میں ہندو مُسلمان میں کوئی تمیز روا نہ رکھی جائیگی۔

انتہائے سائنس۔ ولایت میں آجکل جو ڈراما نہایت مقبول ہورہا ہے۔ اور جسے دیکھنے کے لئے لوگ دُور دُور سے اُمڈے چلے آتے ہیں "آئندہ زمانہ" ہے۔ جس میں دکھایا گیا ہے۔ کہ سائنس کی ترقی سے کیسے تباہ کن نتائج برآمد ہونیکا اندیشہ ہے اس کا پلاٹ مختصراً حسب ذیل ہے:-

ایک سائنسدان پروفیسر اپنی عمر کا بہترین سرمایہ صرف کرنے کے بعد مصنوعی انسان بنانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ جو دس سال تک دن رات

کام کرسکتا ہے۔ پروفیسر اس قسم کے لاتعداد انسان بناتا ہے۔ اور دُنیا میں چاروں طرف بھیجدیتا ہے ان کی بدولت مزدوری بہت ارزاں ہوجاتی ہے اور کارخانے قلیل عرصہ میں زیادہ اشیا پیدا کرنے لگتے ہیں آخر یہ مصنوعی انسان قدرتی آدمیوں پر حملہ آور ہوکر اُن کو ہلاک کردیتے ہیں ——— تمام دنیا برباد ہوجاتی ہے، صرف ایک بڈھا آدمی باقی رہ جاتا ہے۔

اِس وقت مصنوعی انسانوں کی آنکھیں کُھلتی ہیں، وہ نہیں جانتے۔ کہ اپنے جیسے انسان کس طرح پیدا کریں یا اپنی بٹتی ہوئی طاقت کو کیسے قائم رکھیں۔ وہ مرنے لگتے ہیں۔ اور دنیا خاتمہ کے قریب پہنچ جاتی ہے چاروں طرف حرکت بند ہے۔ کوئی آواز نہیں سُنائی دیتی کوئی کام ہوتا نہیں دکھائی دیتا۔ مصنوعی انسان طاقت کا ذخیرہ ختم ہوجانے کے باعث جگہ جگہ گرتے نظر آتے ہیں۔ آخر بڈھا ایک ترکیب نکالتا ہے۔ اور دنیا کو ازسرنو آباد کرتا ہے۔

قدیم زمانے کی طرف۔ نیو یارک ورلڈ نے ایک مبسوط مضمون کے دَوران میں لکھا ہے کہ یورپین تہذیب اس وقت انتہائی بلندی پر پہنچ چکی ہے۔ اور اب اس میں مزید ترقی کی قطعاً گنجایش نہیں قدرتاً اب یہ تہذیب قدیم زمانے کی طرف لوٹے گی اور ظاہری چمک دمک کو ترک کرکے سادگی اختیار کریگی۔ نئی تہذیب کے دور میں لوگوں کے لباس نہایت مختصر ہونگے اور ضروریات بہت کم۔ شہر اُجڑ جائیں گے۔ اور لوگ دیہاتوں میں بسنے لگیں گے۔ مشینوں کا رواج بند ہوجائیگا۔ اور لوگ ہر ایک کام اپنے ہاتھ سے کرنا پسند کرینگے۔ اس تہذیب کے دور میں مشرق مغرب کا راہنما ہوگا۔

بہترین طریقۂ تعلیم کی تلاش۔ ڈنمارک کے مشہور ماہر تعلیم مسٹر ندسن دنیا بھر کا دورہ کررہے ہیں۔ تاکہ مختلف ممالک میں تعلیم کے جو جو طریقے رائج ہیں۔ اُنکو دیکھ کر فیصلہ کرسکیں۔ کہ ڈنمارک میں کونسا طریقۂ تعلیم جاری کرنا مفید ثابت ہوگا۔

صاحب موصوف امریکہ کا دورہ ختم کرچکے ہیں اور آجکل جاپان میں ہیں۔ ایک اخبار کے نمائندہ سے ملاقات کے دَوران میں آپنے فرمایا کہ ڈنمارک غریب ملک ہے۔ اور اُسکی زمین عُمدہ پیداوار سے قطعاً محروم ہے۔ اسلئے اگر اُسے مہذب متمدن ممالک کی صفِ اول میں جگہ لینا ہے تو ضروری ہے کہ اُسکے بیٹے نہایت عمدہ قسم کی تعلیم سے آراستہ ہوں۔ میرے دَورے کا واحد مقصد یہ ہے۔ کہ دُنیا کی ترقی سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ اور ڈنمارک کی تعلیمی درسگاہوں میں وہ طریقۂ تعلیم رائج کیاجائے۔ جو کم سے کم تکلیف دہ اور زیادہ سے زیادہ سود مند ہو۔

علمی شعاعیں

چھڑکاؤ کا فلسفہ۔ موسم گرما میں اکثر لوگ شام کے وقت اُٹھنے بیٹھنے اور سونے کی جگہوں پر چھڑکاؤ کرتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پانی بہا کیوں نہیں دیتے؟ ممکن ہے اس کا یہ جواب دیا جائے کہ پانی کی کفایت کے خیال سے۔ بلاشبہ اس جواب میں وزن ہے۔ لیکن چھڑکاؤ کا فلسفہ کچھ اور ہی ہے۔ جب پانی زمین پر چھڑکا جاتا ہے تو فوراً ہی بھاپ بن کر اُڑ جاتا ہے اور زمین کی گرمی کو چوس کر اوپر لیجاتا ہے تخمینہ کیا گیا ہے کہ ایک چھٹانک پانی کو مقیاس الحرارت کے ایک درجہ تک گرم کرنے کے لئے گرمی کی جتنی مقدار چاہیئے۔ اُس سے ۵۳۶ گُنا گرمی اُسے بھاپ بنانے میں صرف ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تھوڑے سے پانی کا چھڑکاؤ کیا جائے، تو زمین جلد سرد ہو جاتی ہے۔ اور اگر پانی بہا دیا جائے، تو یہ مقصد پورا نہیں ہوتا کیونکہ اُسے بھاپ بنانے کے لئے وہاں کافی گرمی نہیں ہوتی،

کیا پِسا ہُوا کانچ مہلک ہے؟ ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ یورپ اور امریکہ میں بھی یہ خیال پھیلا ہُوا ہے کہ پِسا ہُوا کانچ کھانا مہلک ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ کچھ سال ہُوئے ایک آدمی پر اس الزام میں مقدمہ چلایا گیا تھا۔ کہ اُس نے ایک دُوسرے شخص کو پِسا ہُوا کانچ کھلا کر ہلاک کر دیا ہے۔ مگر طبی شہادت پر معلوم ہُوا۔ کہ پِسا ہُوا کانچ کھانے سے کوئی شخص ہلاک نہیں ہو سکتا۔ اس کا اثر معدے پر اُسی قدر مضر ہوتا ہے۔ جس قدر ریت پھانکنے کا۔ مگر اس سے زیادہ نہیں۔ اس کے بعد امریکہ کے کئی ڈاکٹروں نے کتوں چوہوں اور آدمیوں پر اس کے تجربے کئے اور ہر دفعہ یہی ثابت ہُوا۔ کہ اس سے کوئی مہلک نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

سینگوں والے آدمی۔ الف لیلہ کے قصّوں میں بعض مقامات پر دیوؤں کا ذکر آتا ہے۔ جن کے سروں پر سینگ دکھائے گئے ہیں، لیکن آجکل کوئی صاحب عقل یہ تسلیم نہیں کرتا۔ کہ کسی بھی آدمی کے سر پر سینگ نکل سکتے ہیں۔ تاہم یہ امر واقعہ ہے کہ کئی عورتوں کے سینگ نکل چکے ہیں۔

۱۔ ایڈنبرا کے عجائب گھر میں چار سینگ موجود ہیں۔ جو چار عورتوں کے سروں سے اُتارے گئے تھے۔ اِن میں سے ایک سات انچہ لمبا اور

انگلی کے برابر موٹا ہے۔ اس سینگ کے ساتھ یہ تحریر بھی موجود ہے۔ کہ ڈاکٹر آرتھر ٹمپل نے یہ سینگ ۱۶۷۱ء میں البربتھ لو نامی عورت کے سر سے کاٹا تھا۔ جواس کے باعث متواتر، سال تک تکلیف اُٹھاتی رہی۔

دوسرا سینگ ایک عورت میری ڈیویسن کے سر پر اُگا تھا۔ شروع شروع میں یہ بہت چھوٹا تھا لیکن ۲۸ سال کی عمر میں یہ اتنا بڑا ہو گیا کہ ٹوپی پہننا مشکل تھا۔ آخر اُس نے ہار کر آپریشن کرایا اور اس بدصورتی سے نجات حاصل کی۔

۲۔ سرایڈورڈ ہوم بارٹ ایک اخبار کے ایڈیٹر تھے آپ نے اُسکی اکیسویں اشاعت میں "سینگوں والے آدمی" پر ایک مبسوط مضمون تحریر کیا تھا اور آخر میں لکھا تھا۔ کہ اس وقت بھی (۱۷۰۱ء) انگلستان میں دو عورتیں ایسی موجود ہیں جن کے سروں پر بکریوں کے مانند لمبے لمبے سینگ ہیں۔

۱۸۰۴ء میں ایک جرمن اخبار کے کالموں میں ایک خاتون نے اسی موضوع پر لکھتے ہُوئے بیان کیا تھا۔ کہ آج پانچ سال سے میرے سر پر ایک سینگ نکل رہا ہے اور اب یہ سینگ اس قدر بڑا ہو گیا ہے کہ ٹوپی پہننا بھی دشوار ہو گیا ہے

ان مثالوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سینگ والے آدمی دنیا میں ہوتے رہے ہیں۔ ہندوؤں کے پرانوں میں بھی بعض سینگ والے آدمیوں کا بیان آیا ہے۔

رنگین ریشم۔ سائنسدان ایک مُدت سے اِس تلاش میں تھے۔ کہ اس قسم کے ریشمی کیڑے پیدا کریں، جو رنگدار ریشم کے تار نکالیں۔ تاکہ اُن سے جو رنگدار کپڑے بنائے جائیں۔ اُن کا رنگ خراب نہ ہو سکے۔ اب امریکہ کے مشہور علمی رسالہ پاپولر میکینکس میں ڈاکٹر دارشیٹن اوسیجیٹن نے اطلاع شائع کرائی ہے کہ وہ اس کوشش میں کامیاب ہو چکے ہیں اور اس وقت تک اٹھارہ رنگوں کا ریشم نکال چکے ہیں، اُنھوں نے خوراک کے ذریعہ ریشم کے کیڑوں میں اس قسم کے اجزاء داخل کر دئے ہیں جن سے اُن کے ریشمی تار قدرتی طور پر رنگے ہُوئے نکلتے ہیں اور کبھی خراب نہیں ہوتے۔ جو ریشم بعد میں رنگا جاتا ہے۔ اُس کا رنگ دھوپ سے اُڑ جاتا ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب موصوف کے ریشم پر دھوپ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

عجیب باتیں۔ آج کل سب سے زیادہ خطوط شہزادہ ویلز کو موصول ہوتے ہیں۔

۲۔ بحیرہ اسود میں ایک جزیرہ ایسا بھی ہے جہاں لوگ خط کا نام تک نہیں جانتے۔

نسوانی دُنیا

برما لیجسلیٹو کونسل کے مصدقہ قواعد میں عورتوں کو بھی رائے دہندگی کے حقوق دئے گئے ہیں

سلیم احاطہ مدراس کی عورتوں نے اپنا کوآپریٹو بنک جاری کیا ہے۔ جو آج کل بڑی کامیابی سے چل رہا ہے۔ دو سال ہوئے اِسے گیارہ الوالعزم عورتوں نے جاری کیا تھا۔ آجکل اسکے ممبران کی تعداد ۱۸۱ ہے ؛

پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے والی پہلی عورت امریکہ کی ایک جاپانی خاتون ہے۔ آپکا نام مس ٹامی واڈا ہے۔ آپ نے علم الدماغ کا خاص مطالعہ کیا ہے۔ اور اس موضوع پر ایک معرکہ کی کتاب لکھی ہے۔

اٹلی کی ایک عورت نے بلند مکانات سے کودنے میں کمال حاصل کیا ہے وہ ایک سنیما میں کام کرتی ہے۔ پچھلے دنوں وہ ایک چھ منزلہ مکان سے کودی اور زمین پر صحیح وسالم اُتر آئی ایک اخبار کے نمائندوں سے اُس نے اس فن کا راز یہ بیان کیا۔ کہ جب میں کودتی ہوں تو ہوش و حواس قائم رکھتی ہوں۔ اور ٹانگوں کو پیٹ کے ساتھ لگا لیتی ہوں۔ لیکن جب زمین کے پاس پہنچتی ہوں۔ تو یکایک ٹانگیں بڑھا کر کھڑی ہو جاتی ہوں۔ اس فن میں کمال حاصل کرنے کے لئے اُسے تین سال تک مشق کرنی پڑی ہے۔

انگلستان میں عورتوں کی ایک ایجنسی ہے۔ جن کا کام محض یہ ہے۔ کہ دنیا بھر کے اخبارات کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ کس کے متعلق کون اخبار کیا لکھتا ہے۔ اس ایجنسی میں قریباً پچاس عورتیں ملازم ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کو قریباً تین سو اخبارات و رسائل روزانہ دیکھنے پڑتے ہیں۔ اور ریکارڈ رکھنا پڑتا ہے کہ مشاہیر دنیا کے متعلق کس اخبار نے کس تاریخ کے پرچہ میں کیا رائے زنی کی ہے۔ اس ایجنسی کے تازہ ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آجکل سب سے زیادہ ذکر اخبارات میں شہزادہ ویلز کا ہوتا ہے ؛

ہمایوں

جلد ۲　　ستمبر ۱۹۲۲ء　　نمبر ۳

دوشیزۂ فرانس

ندائے غیب کا پیامِ اولیں

کسی نے سچ کہا ہے کہ سانچ کو آنچ نہیں ؟

دوشیزۂ فرانس جو پندرھویں صدی کے آغاز میں بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں میں جل کر ایک جادوگرنی کی موت مری آج پانچسو برس بعد اک ایسے زمانے میں جبکہ اعتقاد و مذہب کی بنیادیں متزلزل ہو چکی ہیں اولیا کے مرتبہ کو پہنچ گئی ہے۔ کلیسا جو اس بے رحمی کی موت میں شریکِ ستم تھا اُسے سینٹ (ولی) کا لقب دے کر مسیحی اولیاؤں کے زُمرے میں فخر کے ساتھ اُس کا شمار کرتا ہے اور فرانسیسی اور انگریز، کبھی اُس کے بے پروا دوست اور جانی دشمن، دونوں دورانِ جنگ میں اُسکی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ ایثارِ نفس کا بُت اور حبُّ الوطنی کی سچی تصویر تھی ؟

دُنیا میں جب کبھی حُسنِ ایثار کی سچی داستان لکھی جائے گی کم سِن غازیۂ فرانس کا نام اُسکے سرورق پر سُنہری حرفوں میں منقوش نظر آئیگا !!

یوں تو روئے زمین پر لاکھوں عورتیں ایسی گذری ہونگی جنہوں نے اپنی گرانقدر زندگی کو

اپنے متعلقین کی خوشیوں پر قربان کر دیا، ہزاروں ایسی ہونگی جو اوروں کے بغض وحسد کی بھڑکتی ہوئی آگ میں کود کر سونے چاندی کی طرح چمکیں، سینکڑوں ایسی بھی ہیں جن کے جوہر گھر کی مٹی میں مل کر مٹی ہو گئے جنہیں اس تاریک زندانِ ہستی میں موقع نہ ملا کہ وہ میدانِ زیست میں قدم رکھ کر مردوں کے مقابل میں اپنی صنف کی برابری کا ثبوت دے سکتیں اور بیسیوں وہ جو اس معرکے میں پوری اتریں جنہوں نے اپنی جنس کی کمتری کے سنگین بہتان کو صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا اور جنسِ غالب کے دل پر اپنی مساوی قابلیت کا پورا سکہ بٹھایا —— لیکن شاید صرف اک دوشیزۂ فرانس تھی جس نے نہ محض یہی کہ غیروں کے عیش و آرام کو اپنے سکون و اطمینان سے زیادہ عزیز جانا، اک بے فکری کی زندگی سے دامن چھڑا کر ایسی لوٹ مار کے زمانے میں جب قوی ہیکل مرد بھی گھر سے باہر قدم رکھنا موجبِ ہلاکت سمجھتے تھے ماں باپ کے گھر کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہی اور جو خانہ داری کے لطف و مسرت اور معاشرتی زندگی کے رسم و رواج سے کنارہ کش ہو کر ناشائستہ مردوں کے درمیان اپنی پاکیزگی و پاکدامنی کے ساتھ عمر بسر کرنے کو چل نکلی، بلکہ جس نے ایسے وقت میں جبکہ اندوہ و حرمان کی کالی گھٹائیں اس کے وطن پر اک نہ ٹلنے والی بلا کی مانند چھائی ہوئی تھیں دلوں کو چیر دینے والی بجلی کی طرح فضائے تاریک کو اپنی آسمانی روشنی سے زندہ و پرنور بنا دیا، ایسے زمانے میں جب مردوں کے حوصلے میدانِ جنگ کی پے در پے شکستوں سے ٹوٹ کر اُن کے دل پست ہو چکے تھے، وہ فتح کو دشمن کا مقدر اور شکست کو اپنا نصیبہ سمجھ چکے تھے، نصف سے زیادہ ملک غنیم کے حوالے کر کے باقیماندہ حصے پر قابض رہ جانا معراجِ کامیابی تصور کرتے تھے، اُس نے گھر کی دنیا سے نکل کر ایک دلوں کو دہلا دینے والا نعرہ مارا کہ نامردو! مرد بنو، فرانس تمہارا وطن ہے غنیم کا نہیں، جس سرزمین میں تم پیدا ہوئے اُس کی حرمت کو کھو کر اُس کی آغوش میں غفلت کی نیند سوئے رہنا یہ اُن کا کام ہے جو اپنے فرائض کو بھول چکے ہوں، اپنی ہستی کو بھول چکے ہوں اپنے خدا کو بھول چکے ہوں، تمہارا کام اُس کی کھوئی ہوئی آزادی کا حاصل کرنا اُس کی کھوئی ہوئی عزت کا پھر پالینا اور یہ نہ ہو سکے تو اُن کو ڈھونڈنے اور ڈھونڈ نکالنے کی سعیِ مسلسل میں لڑنا اور لڑتے لڑتے مر جانا ہے!،، اور اسی پر بس نہیں بلکہ اس جنگ ناآشنا دوشیزہ نے

اپنے ہزیمت خوردہ ہم وطنوں کو یہ کہہ کر ایک مکمل اور یقینی کامرانی کی بشارت دی کہ میں خدا کی چنی ہوئی اور خدا کی بھیجی ہوئی ہوں مجھے اُس نے اس کام کے لئے چن لیا ہے کہ اُس کی مرضی ایسی ہی ہے اور اس کام کے پورا کرنے کو اُس نے مجھے تمہارے درمیان بھیجا ہے کہ اُس کی مرضی تمہیں فتح و ظفرمندی کی بلند چوٹیوں پر لے جانا اور تمہارے دشمن کو ذلت و ناکامی کے ہولناک سمندر میں دھکیل دینا ہے، اُس کا پیغام جو میں لائی ہوں سُنو، میں جو کچھ کہوں تم کرو کہ میں تم سے وہی کہونگی" جو آسمان کی "آوازیں" مجھے کرنے کو کہتی ہیں!!

جب یہ غازیہ پیدا ہوئی، فرانس اُس کا وطن اک حالتِ زار میں مبتلا تھا۔ فرانس اور انگلستان کے مابین "جنگِ صد سالہ" کو شروع ہوئے تین چوتھائی صدی ہو چکی تھی۔ فرانس پر انگریزوں کے اس حملہ کی بنیاد دراصل انگلستان پر فرانسیسوں کا وہ حملہ تھا جو اس سے تین سو برس پیشتر واقع ہوا جب فرانسیسی صوبۂ نارمنڈی کے مشہور ڈیوک ولیم فاتح نے ۱۰۶۶ء میں انگلستان پر یورش کر کے اینگلو سیکسن قوموں کو اپنے زیرِ نگیں کیا اور لندن میں اپنی موروثی حکومت قائم کر لی (انگلستان کے موجودہ حکمران اُسی کی نسل سے ہیں) وہ فرانس میں نارمنڈی کا ڈیوک اور اس لحاظ سے شاہِ فرانس کا اطاعت گذار تھا لیکن انگلستان میں وہ ایک خود مختار تاجدار تھا جس کا حقِ حکومت دراصل زورِ شمشیر پر مبنی تھا۔ اُس کے جانشینوں نے دوسری تیسری پشت میں فرانس کے مختلف صوبہ داروں سے خاندانی تعلقات قائم کر کے اپنے فرانسیسی علاقے کو وسعت دی یہانتک کہ ہنری دوم (۱۱۵۴ء تا ۱۱۸۹ء) نے اپنے ماں باپ اور بیوی کے حقوق کے ذریعے سے قریب قریب نصف فرانس پر اپنا تسلط جما لیا لیکن شاہِ جون نے آئندہ صدی کے آغاز میں اس وسیع سلطنت کو اپنی کوتاہ اندیشی سے کھو دیا۔ ۱۳۲۸ء میں چارلس چہارم کی وفات کے ساتھ فرانس کے اصلی کاپیتی خاندان کا کوئی نرینہ رُکن باقی نہ رہا۔ سالی قانون کے مطابق کوئی عورت تخت کی دعوے دار نہ ہو سکتی تھی لیکن انگلستان کا بادشاہ ایڈورڈ سویم (۱۳۲۷ء تا ۱۳۷۷ء) جس کی ماں اسی کاپیتی خاندان سے تھی۔ اس بنا پر تختِ فرانس کا حق دار بن بیٹھا کہ اگرچہ اک عورت خود مالکۂ تاج نہیں ہو سکتی مگر وہ تاجداری کے حق کو اپنی نرینہ اولاد کی طرف منتقل کر سکتی ہے۔ اس دعوے کا نتیجہ وہ لڑائی ہوئی جسے

مورخین جنگ صد سالہ کہتے ہیں۔ یہ خون ریز اور بظاہر بے سود جنگ[1] ۱۳۳۸ء سے لے کر ۱۴۵۳ء تک جاری رہی اور دونوں مُلکوں کی خوشحالی کو اس سے غایت درجہ نقصان پہنچا۔ ایڈورڈ سوم کا یہ دعوے ہمیں کتنا ہی مضحکہ خیز معلوم کیوں نہ ہو انگریزوں کا سو برس تک یوں فتح فرانس پر تلے رہنا آج کل کیسا ہی نفرت انگیز نظر کیوں نہ آئے اس میں شک نہیں کہ اُن وقتوں کے حالات اور زمانۂ حال کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق آگیا ہے۔ انگلستان اور فرانس کا اِک جُداگانہ مرتبہ اور یہ جداگانہ حالت نہ تھی۔ صرف تین صدیاں پیشتر شمالی فرانس کے حکمران نے رودبار سے گذرکر انگلستان کو بزور شمشیر فتح کیا تھا۔ اُس کے جانشین ڈیڑھ سو برس تک اپنی فرانسیسی ریاست پر متمکن رہے اور اُسے محض اپنی کوتاہی اور جہالت سے کھودیا۔ فرانس اور انگلستان کے باشندے جُداجُدا قومیت رکھتے تھے لیکن تاجدارِ انگلستان اپنے فرانسیسی مقبوضات کو بغیر انتہائی جدوجہد کے کھودینے پر راضی نہ ہوسکتا تھا۔ اُن دونوں ملکوں کی قسمت کا صرف نسل وقومیت کی بنا پر فیصلہ نہ ہوتا تھا بلکہ بسااوقات حکمرانوں کے ذاتی حقوق اور خواہشات پر انحصار تھا۔ سلطنت بادشاہ کی ملکیت تھی نہ کہ قوم کی۔ اور اگرچہ فرانس اور انگلستان میں کچھ مدت سے جذبۂ قومیت کے آثار نمایاں طور پر ظاہر ہورہے تھے تاہم قومیت ابھی اُس درجۂ پختگی کو نہ پہنچی تھی جو اُسے صدیوں بعد میں نصیب ہُوا۔

لیکن یہی دوشیزۂ فرانس کی عظمت ہے کہ اُس نے اِک ایسے وقت میں جبکہ فرانساوی زندگی صوبوں کے تفرقوں اور طبقۂ اُمرا کے حاسدانہ کارناموں سے عبارت تھی قوم فرنساوی کے رفیع ترین جذبات کو اپنے سینے میں محسوس کیا اور اپنے قول وعمل سے اپنے ہم قوموں کے لئے حُبُّ الوطنی کی ایک ایسی زندہ مثال بن گئی کہ فرانس کے لوگ آج بھی اُسکی آتش افروزیاں

---

[1] جنگِ صد سالہ کو چار زمانوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) ۱۳۳۷ء تا ۱۳۵۴ء انگریزی ظفرمندی کا زمانہ۔ (۲) ۱۳۵۴ء تا ۱۳۸۰ء جب فرانسیسوں نے چند علاقے پھر واپس لے لئے (۳) ۱۳۸۰ء تا ۱۴۲۹ء اس دور میں انگریز پھر فتوحات حاصل کرتے رہے (۴) ۱۴۲۹ء تا ۱۴۵۳ء جب انگریزوں کو پے درپے شکستیں ہُوئیں اور وہ فرانس سے باہر نکالدیئے گئے۔

اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں! فرانس ژان دارک[1] کے آنے سے پہلے کچھ اَور تھا اُس کے آنے کے بعد اَور کا اَور ہو گیا!!

جنگِ صد سالہ کے آخری دَور کا آغاز اس طرح ہُوا کہ ہنری پنجم شاہِ انگلستان نے یہ دیکھ کر کہ شاہِ فرانس چارلس ششم مخبوط الحواس ہے اور فرنساوی حقوق کی نگہداشت کے قابل نہیں رہا اپنے جدِ امجد کے حقوق کا اعادہ کیا اور فرانسیسیوں کے باہمی عناد و مخاصمت کا فائدہ اُٹھا کر (سنہ ۱۴۲۰ء) میں ڈیوک برگنڈی کی اعانت سے بمقام تِرُوآ حکومتِ فرانس سے ایک معاہدہ کیا جس کی رُو سے شاہِ انگلستان نے فرانس کی شہزادی کو اپنے عقد میں لے لیا اور شاہِ مفقود الحواس کی وفات پر ہنری کو اُس کا جانشین تسلیم کیا گیا۔ اس معاہدہ کی تکمیل میں ملکۂ فرانس آئزبلا نے بڑے شدّ و مد سے حصّہ لیا گویا خود ہی اس امر کی تصدیق کر دی کہ اُس کا بیٹا فی الحقیقت شاہِ فرانس کا بیٹا نہیں + اس معاہدے سے فرانس فقط حکمرانِ انگلستان کا ایک ماتحت صوبہ بن گیا اور اس کی جداگانہ ہستی ملیا میٹ ہو گئی + اس اِلحاق کے کیا نتائج ہوتے اُن کا صحیح صحیح اندازہ کرنا دشوار ہے لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ شاہِ انگلستان کی طاقت کا یُوں خوفناک طور پر بڑھ جانا دونوں مُلکوں کی آزادی کے لئے ضرر رساں ثابت ہوتا، شاہِ مُشترک دونوں مُلکوں میں زیادہ مُطلق العنان ہو جاتا، اُسے کسی خاص مجلسِ شوریٰ کی رضامندیوں کے لئے آئے دن گداگری نہ کرنی پڑتی، وہ ایک مُلک کو دُوسرے مُلک کی قوت سے دبانے اور بوقتِ ضرورت نیچا دکھانے میں بآسانی کامیاب ہو سکتا، اگر ایسا ہوتا تو تاریخ یورپ اور طرح

---

[1] دوشیزۂ فرانس جسے عام طور پر جون آف آرک کہا جاتا ہے دراصل ژان دارک نام رکھتی تھی + غلط العام نام میں دو صریح نقص ہیں۔ اوّل تو یہ اصلی فرنساوی نام کا انگریزی ترجمہ ہے اور ظاہر ہے کہ نام کا ترجمہ قطعی ناجائز ہے بالخصوص جب اُس زبان میں جس میں کہ ترجمہ کیا جائے کوئی ایسا نام موجود نہ ہو۔ دوسرے ژان کو تو جون کہہ لیا کہ یہ انگریزی صورت اس لفظ کی ہے لیکن دارک کے لفظ کا طوعاً و کرہاً تجزیہ کر کے دو فرضی لفظ بنا لینا اور پھر اُن کا ترجمہ کرنا جہلِ مرکب سے کم نہیں + انگریزی مورخین بھی اب اصلی نام کو نقلی پر ترجیح دیتے ہیں۔ لہٰذا انتہا درجہ کی ستم روائی ہو گی اگر ہم اک ایسی مجسمۂ ایثار ہستی کو اُس کے مسخ شدہ نام سے پکاریں اور اتنی زحمت بھی گوارا نہ کر سکیں کہ اُس کے اصلی نام سے اُسے یاد کریں + لُطف یہ ہے کہ ہم لوگ فرنساوی تلفظ کو آسانی اور خوبصورتی کے ساتھ ادا کر سکتے ہیں!

لکھی جاتی، دُنیا میں قومیت کی تحریک یُوں ترقی نہ پاتی، تہذیب موجودہ یوں جمہوریت کی دلدادہ نظر نہ آتی --- لیکن قدرت کو کچھ اَور منظور تھا، وہ آزادی کے جذبات کو کہیں نہ کہیں ضرور زندہ رکھنا چاہتی تھی، وہ استبداد کی کہانی کو دنیا کے سامنے دوبارہ سہ بارہ دُہرانا دُنیا کے لئے ترقی معکوس سمجھتی تھی +

اہلِ فرانس کی ایک جماعت نے اِس معاہدے پر کاربند ہونے سے اِنکار کردیا اور دوفین (اپنے ولیعہدِ سلطنت کو فرانسیسی دوفین کہتے تھے) کی حمایت میں اپنی تلواریں کھینچ لیں + اُدھر انگلستان کی مجتمعہ قوت اور ڈیوک برگنڈی اور دیگر فرانسیسیوں کی حاسدانہ اِمداد تھی - اِدھر ایک بے عقل شہزادے کے کاہل وزیاں کار درباری اور پست حوصلہ ہمراہی تھے جو دریائے لُوار کے پار فرانس کے جنوبِ مغرب میں انگریزی فوجوں سے بچ کر پناہ لئے رہنا غنیمت تصوّر کرتے تھے + فرانس کے لئے زمانۂ حال تاریک تھا اور مستقبل اُس سے زیادہ یاس خیز و ہولناک! لیکن ---- غیرتِ حق کو یکایک حرکت ہُوئی ---- غیبی امداد آپہنچی اور ایسے مقام سے آئی جس کا دوست دشمن کسی کو گمان بھی نہ تھا!! ---- ژان دارک جس نے یُوں فرانس کی آزادی کا جھنڈا بلند کیا کون تھی؟

× + × × × × × + + + + + + + + + + +

فرانس کی مشرقی سرحد پر عین اُس جگہ جہاں فرنساوی علاقہ جرمنی کی سلطنت سے مِلتا ہے۔ ایک چھوٹا سا گاؤں دومرمی آباد ہے پندرھویں صدی کے رُبعِ اوّل میں یہ گاؤں جو بالعموم نہایت پُرسکون تھا لڑائی کی کشمکش کو اپنے دیہاتی گلی کوچوں میں محسوس کررہا تھا - یہ دریائے مز کے کنارے اُس شاہ راہ پر واقع تھا جو فرانس سے جرمنی کو جاتی تھی - اس لئے یہاں کے رہنے والوں کو اکثر بڑے شہروں کی نسبت ملک کے خارجی تعلقات سے زیادہ واسطہ پڑتا تھا + کبھی کوئی جاگیردار اپنے جنگجوؤں کے ساتھ قریب سے ہوکر گذرتا تو گاؤں والے اُسے ایک دلچسپ واقعہ سمجھ کر گھروں سے باہر نکل پڑتے - کبھی کوئی راہب آنکلتا تو وہ اُن کے لئے دنیا بھر کی خبریں لاتا، میدانِ کارزار کے حالات اور انگریزوں کے مظالم کی داستانیں اُنہیں سُنائی جاتیں تاکہ قومی ہمدردی کے خیالات اِن دور دراز سرحدی علاقوں میں بھی موجزن ہوتے رہیں + "صدسالہ جنگ" کے دَوران میں یہ گاؤں پہلے سے بھی زیادہ جنگ آشنا ہوگیا - پاس کے گاؤں ماکسی پر انگریزوں اور برگنڈیوں کا قبضہ تھا لیکن چھوٹا دومرمی بدستور شاہِ فرانس کا جانبدار تھا - ایک دفعہ

جب کہ ژان بچہ ہی تھی اُس کے گھر والوں کو سخت آفت کا سامنا کرنا پڑا برگنڈیئے ناگہاں گاؤں پر آ پڑے اپنا اختر بختر سمیٹ کر وہ سرحد کے پار بھاگ گئے جہاں اچھے لورینیوں نے انہیں اپنے ہاں پناہ دی یہاں تک کہ یہ طوفان فرو ہو گیا اور وہ اپنے گھروں میں پھر آ کر آباد ہوئے۔ دومرمی کے دیہاتی کسی جاگیردار کے ماتحت نہ تھے وہ بلا واسطہ بادشاہ کی رعایا تھے۔ وہ شاہ فرانس کو اپنا حقدار بادشاہ سمجھتے تھے، کسی ہمسایہ گاؤں سے بغیر لڑے بھڑے اپنی مطمئن دیہاتی زندگی میں خدا کی عبادت اور بادشاہ کی اطاعت کرتے اور کسی اور شئے کی پروا نہ رکھتے تھے۔ لیکن مُلک کی خانہ جنگیاں انہیں کب چین سے بیٹھنے دیتی تھیں اُن کی یہ سادہ زندگی اور یہ بظاہر صلح پسند خیالات ہی بالآخر ایک عظیم الشان برہمی کا باعث ہوتے۔ ژان دارک ۵ جنوری ۱۴۱۲ء کو پیدا ہوئی۔

ژان کے باپ ژاک دارک سے زیادہ متمول شخص غالباً دومرمی میں کوئی نہ تھا۔ وہ ایک شریف کسان تھا جس کے پاس تھوڑا سا روپیہ اور بکریوں بھیڑوں اور چراگاہوں کی شکل میں بہت سی دیہاتی جائداد تھی۔ اُس کے تین لڑکے تھے اور دو لڑکیاں جن میں بعض کے نزدیک ژان دارک بڑی تھی بعض کے نزدیک چھوٹی۔ لڑکیاں عام طور پر گھر ہی کے اندر خانہ داری کے کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹاتی تھیں غریب کسانوں کی لڑکیوں کی طرح کھیتوں میں کام کرنے کو نہ جاتی تھیں مصوروں نے ژان کو اس طرح دکھایا ہے کہ وہ اپنے باپ کی بھیڑیں چرا رہی ہے لیکن خود ژان نے بعد میں اس کی تردید کی البتہ یہ کہا کہ "کبھی کبھی خطرے کے وقت اپنی باری پر میں انہیں کسی جائے پناہ میں لے جایا کرتی"۔ اُس کی ماں اِزابو نے اُسے خانہ داری کے سب کام اچھی طرح سکھائے اور بالخصوص سینے پرونے میں اُسے مشاق کر دیا۔ ژان کا وقت زیادہ تر اِسی شغل میں گذرتا تھا بعد میں جب اُس سے پوچھا گیا کہ کیا تم نے کوئی ہُنر یا کسب سیکھا ہے تو اُس نے جواب دیا کہ "ہاں! میری ماں نے مجھے سینا پرونا اور کاتنا سکھایا تھا اور ایسا اچھا کہ میں نہیں جانتی رُواں بھر میں ایک عورت بھی ایسی ہوگی جو اب مجھے کچھ سکھا سکے"! قدیم گرجاؤں کی خوب صورت پُرانی زردوزیاں اکثر ایسی ہی ہُنرمند دیہاتیوں کے ہاتھوں کی ساختہ ہوتی تھیں۔ یہ مادرانہ تربیت ہی اُس کی ساری تعلیم تھی۔ جیسا کہ اُس نے بعد میں کہا وہ فرانسیسی کا الف بے تک نہ جانتی تھی نہ اُس زمانے میں اُن سے زیادہ متمول گھرانوں میں بھی تعلیم کا کچھ چرچا تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اسکی

ماں نے بچّوں کو بعض وہ مشہور دُعائیں جو خاص و عام میں مقبول تھیں اور جن کو بڑے سے بڑے حکما بھی اپنے علم وقابلیت سے زیادہ فصیح نہ بنا سکتے تھے ازبر پڑھادی تھیں "ہمارا خدا جو آسمان میں موجود ہے" "اے مریم اے لبریز رحمت" ننھی ژان بھی اَوروں کے ساتھ یہ آسمانی گیت دُہرایا کرتی تھی!

جب یہ لڑکیاں میز پر اپنا چمکتا ہوا ریشم اور سُنہری تاگا رکھے ہوئے دریچے کے قریب بیٹھی ہوتی تھیں تو اُن کی ماں یہ خاموش ساعتیں دلچسپ کہانیاں سُنا سُنا کر گزارتی۔ سب سے زیادہ مسیحی اولیاؤں کی کہانیاں اور انجیل کی حکایات اُن جنگی واقعات کے ساتھ جو کبھی کبھی دیکھے اور سُنے جاتے تھے مثلاً زخمیوں کا قریب کے گاؤں میں لے جایا جانا تاکہ اُنکی مرہم پٹی ہوسکے، فتحمندوں کا خوشی کے نعرے مارتے ہوئے گزرنا اور شکست خوردوں کا جان بچانے کے لئے اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دَوڑانا، پھر سیاہ دل برگندیوں اور خوفناک انگریزوں کے قصّے تھے جنہیں سُن کر چھوٹے بچّے کانپ جاتے۔ یعنی حملہ آوروں کی وہ ہولناک تصویر کھینچی جاتی تھی جو ہر حملہ آور کی خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا کھینچی جاتی ہے۔ یورپ نے ترکوں کو "تباہ کُن" کا لقب کیوں دیا ہے؟ محض اِس لئے کہ وہ یورپ کے ایک حصّے کو مُسخر کرنے میں کامیاب ہوئے اور پھر بدقسمتی سے اُس پر حکومت بھی کرتے رہے!

ژاک دارک فقط متمول ہی نہ تھا وہ اور اُسکی بیوی بچّے گاؤں کے مُصیبت زدہ لوگوں کے درد و رنج میں بھی شریک تھے۔ ہر غریب و نادار کی مدد پر کمر بستہ اور ہر دُکھے ہوئے دل کی ہمدردی میں جان چھڑکتے تھے۔ ایک بادیانت ایماندار مزدور نے ژان کی وفات کے مدت بعد اُسکے دوسرے مقدمے میں اُس کی پاک طینتی کی شہادت دیتے ہوئے کہا کہ "میں اُس وقت ایک بچّہ تھا اور اُس نے علالت میں میری تیمارداری کی"۔ ژان کی ایک سیرت نگار لکھتی ہے کہ وہ یوں بھی بھلے لوگوں کا زمانہ تھا جب اعتقادیں فلسفہ اور سائنس رخنہ انداز نہ تھے اور ہر شخص اپنے ایمان کے ساتھ مطمئن رہتا تھا۔ ژان اِن میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھی۔ صبح کے وقت وہ گاؤں کے چھوٹے سے گرجا میں جاکر اپنے پروردگار کے آگے جھکتی جہاں کبھی میکائیل اپنی چمکتی ہوئی زرہ پہنے اپنا برچھا افعی کے سر میں بھونکتے ہوئے نظر آتا کبھی وہ مشہور ادلیا مارگریت

دکھائی دیتی کہ فقط اپنی صلیب ہاتھ میں لئے ہُوئے اس عدوئے انسانیت پر غالب آجاتی ہے۔
ژان اپنے گھر کی دہلیز پر یا باہر درختوں کے سائے میں بیٹھ کر اکثر سینے پرونے میں مشغول رہتی تھی، یہ اک ایسا نسوانی شغل ہے کہ بالعموم نت نئے خیالات سینے میں اُبھارتا ہے۔ کام کرنے والی گئے گزرے دنوں کے خواب دیکھتی ہے۔ آنے والے زمانے کی ممکنات پر غور کرتی ہے اور بعض اوقات ایسے تصوّرات کے ساتھ بھی پرواز کرتی ہے جن کا صحیح صحیح نقشہ خود اُسکا دماغ بھی نہیں کھینچ سکتا۔ خاموشی میں یوں کام کرتے ہُوئے وہ دیہاتی گرجا کے گھنٹے کی شیریں آوازیں سنتی۔ ان سے وہ اِس قدر مانوس تھی کہ گھنٹہ بجانے والے کو گاہے گاہے چھوٹے چھوٹے تحفے تحائف بھی دے دیا کرتی تھی تاکہ وہ اپنے فرض کی ادائگی میں ضرورت سے زیادہ مستعد رہے۔ اس باغ کے قریب ہی جہاں وہ بیٹھ کر کام کیا کرتی شاہ بلوط کے درختوں کا گھنا جنگل تھا جہاں دیہاتیوں کے اعتقاد کے مطابق پریاں رہتی تھیں اور ایک جادو کا کنواں تھا۔ اُس کے دُشمنوں نے بعد میں یہ الزام تراشا کہ وہ ان گمنام جنگلی پریتوں کی معتقد تھی۔ یہ دُرست ہے کہ وہ سال میں ایک دفعہ پادری کے پیچھے اُس جلوس میں شامل ہُوا کرتی تھی جو جنگل سے گزر کر پریوں کے کوئیں کی طرف جاتا اور جہاں پادری اپنی جھاڑ پھونک سے بلاؤں کا قلع قمع کرتا تھا۔ لیکن ژان کو ایسی رسمی تحریکوں کی حاجت نہ تھی۔ اُس کے اولیا اُس کے لئے بالکل کافی تھے۔ اُس زمانے میں اِن کے قصے پریوں کی داستانوں سے کچھ کم نہ تھے۔ ژان پر محبّت و مسرّت کے افسانوں نے چنداں اثر پیدا نہ کیا۔ اُس کا دل اُن ایثار و شجاعت و دردمندی کی کہانیوں سے لبریز ہو گیا جن کا انجام قربانی ہُوا کرتا ہے۔

لہلہاتے کھیتوں اور گنجان جنگلوں کے قرب و جوار میں رہنے والی، گاؤں کے چھوٹے سے گرجا کے شیریں آواز گھنٹے کی موسیقی میں محو ہونے والی، اپنی سلیقہ شعار ماں کے قدموں میں بیٹھ کر دلفریب کہانیاں سُننے والی، اپنے خُدا کے حضور ہر صبح ایک معصوم و پاک دل کا ہدیہ لے جانے والی یہ لڑکی سوائے گھر بار کا سادہ کام کرنے کے اور کیا کر سکتی تھی؟ یہ سب کچھ کرتی ــــ لیکن گاہے گاہے دل میں ایک ننھا سا شعلہ بھڑک اُٹھتا، وہ نہ جانتی یہ کیا ہے اور کس لئے؟ دُنیا تو شہروں میں رہتی ہے اُسے اُس بڑی دُنیا سے کیا غرض؟ وہ اُس کے لئے کر بھی کیا سکتی ہے؟

ہاں یہ سُنتی تھی کہ اجنبی مُلک میں گھُس آئے ہیں، شہزادۂ فرانس دریائے لُو آر کے پار اپنی جمیعت کے ساتھ مارا مارا پھرتا ہے، جائے شرم ہے کہ ابھی اس کی تاج پوشی بھی نہیں ہُوئی۔ ہمسایہ گاؤں کے لڑکے لڑکیاں بعض دفعہ اُن سے لڑتے بھڑتے کیونکہ وہ بادشاہ کے برخلاف دُشمن کا دم بھرتے تھے، تعجب ہے کہ اپنے ہی مُلک کو پاؤں تلے روندتے ہیں اور غنیم کا ساتھ دیتے ہیں۔ اس حالت میں مُلک کو بچانے والا ایسے حال میں شہزادے کو تاج پہنانے والا کون ہو؟؟

انہیں خیالات میں ڈُوبی ہُوئی اور خدا جانے اَور کن تصوّرات کی فضاؤں میں اُڑتی ژان، کم سِن، بھولی بھالی، پاک دل، نیک خیال، ژان، بیماروں کی تیمار دار، ناداروں کی مددگار، سادگی اور سچائی کی پتلی، اپنے سینے پردنے میں مشغول تھی؛ ابھی عُمر کے تیرہ برس بھی پُورے نہ ہُوئے تھے نیکی و معصومیت کی تصویر یہ نت نئے خواب دیکھنے والی اپنے باغیچہ میں بیٹھی تھی، گرمیوں کے دن تھے اور سہ پہر کا وقت ایک ایسا وقت جب تخیّل بے پر ہلائے ہوامیں اُڑتا ہے اور پاکیزہ ہستیاں اپنے آپ میں منہمک ہوتی ہیں! ـــــ اچانک اُس کے اور گرجا کے درمیان داہنی جانب فضا میں ایک روشنی نمودار ہُوئی ایسی کہ ژان کی آنکھوں نے کبھی اِس سے قبل نہ دیکھی تھی اور اُس کے اندر سے ایک آواز ایسی ہی نامعلوم اور حیرت انگیز سُنائی دی! ـــــ آواز نے کیا کہا؟ صرف یہ سادہ سے سادہ بات، ایسے لفظ جو ایک ننھے بچّے کے لئے موزوں ہوں، نہ ایسا کوئی پیغام جو اُس کی فہم سے بالاتر ہو! کیا؟ یہی: "ژان! اچھی اور نیک بچّی بن، گرجے اکثر جایا کر، ژان! نیک بن! ہاں اس سے زیادہ کوئی آسمانی فرشتہ اس سے کم کوئی سمجھدار ماں کیا کہے گی کہ ژان! نیک بن: چھوٹی لڑکی پہلے ڈری سہمی لیکن پھر جلد ہی سنبھل گئی، آواز ضرور آسمانی ہوگی اور پاک! یہ جو اس طرح بولی ہے! اُس نے کسی سے نہ کہا کہ کیا دیکھا کیا سُنا، بات ہی ایسی تھی جسے اک بچہ اصل اور نقل میں تمیز نہ کرسکنے کے باعث شرم و حجاب کے ساتھ پوشیدہ رکھے!

اس کا ہمیں علم نہیں کہ یہ سپنا پھر کب اور کن حالات میں نظر آیا۔ لیکن بالعموم گھر سے باہر باغ کی خاموشی یا کھیتوں کی آزاد تنہائی میں وہ دکھائی دیا کرتا + کچھ زمانہ گزرنے کے بعد آسمانی روشنی صورت و شکل اختیار کرنے لگی یہاں تک کہ ایک شبیہ بالکل مردانہ لیکن پر دار اور تاج دار

ایسی جیساکہ ایک "واقعی باتمکین انسان" ہو نظر آئی۔ وہ ایک ملکوتی صورت تھی جس کے سامنے چھوٹی لڑکی لرزہ براندام ہوگئی لیکن اُس کی پاکیزہ و شاہانہ نظر سے اُس کی ڈھارس بندھ گئی۔ نورانی ہستی نے دوبارہ اُسے نیک بننے کی ہدایت کی اور کہا "خدا تیری مدد کریگا" پھر اُس نے ژان کو اُس کے دکھیا ملک کی درد بھری کہانی سُنائی کہ "مملکتِ فرانس پر کیسی حسرت برس رہی ہے"۔ ژان کا نوجوان دل پہلے ہی حسرتوں سے لبریز تھا وہ پہلے ہی سے اپنے بے یار و مددگار ملک کے لئے غمگین رہا کرتی تھی۔ اوّل اوّل اسے کچھ شک و شبہ تھا کہ یہ میکائیل فرشتہ ہے یا کون لیکن بتدریج اُس کی ہدایات و مکاشفات کو سُن دیکھ کر اُسے یقین ہوگیا کہ یہ وہی ہے۔ یہی جنگجو فرشتہ تھا جس نے انجام کار اُسے سارا ماجرا کہہ سُنایا اور اُس کے منصبی کام سے اُسے آگاہ کیا۔ وہ بولا "اے ژان! لازم ہے کہ تُو شاہِ فرانس کی اعانت کو جائے اور تُو ہی ہے جس کی مدد سے وہ اپنی مملکت کو پھر پالیگا"۔ وہ کانپنے لگی اور اپنے دل سے پوچھا کہ آخر اس بات کا کیا مطلب ہے؟ پہلے کچھ گھبرائی پھر دل کو کڑا کرکے بولی "حضور! میں تو صرف اِک مسکین لڑکی ہوں، میں گھوڑے کی سواری نہیں کرسکتی، میں جنگجوؤں کی سالار نہیں بن سکتی"!! سپنے نے اِس گزارش کی چنداں پروا نہ کی۔ فرشتہ اُسے چھوٹی چھوٹی سی ہدایات دینے لگا کہ تُو بدری کُور کے پاس جا جو وکُولر کا کپتان ہے وہ تجھے بادشاہ کے پاس لے جائیگا سینٹ کاترین اور سینٹ مارگریت تیری مدد کو آئینگی! ان مکمل ہدایتوں سے ژان قطعی مغلوب ہوگئی کیونکہ اب اُسے صاف و صریح حکم مل گیا کہ وہاں جا اور یہ کچھ کر۔ وہ بے اختیار ہوکر چلّانے اور رونے لگی، اُس کی رُوح پر خوف طاری ہوگیا، وہ بچاری کیا تھی کہ اُسے یہ کچھ کرنے کو کہا جائے؟ ایک چھوٹی سی بچی جو اپنے کمزور ہاتھوں میں اپنی سوزن یا عصا پکڑ سکتی تھی، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ کسی بیمار بچے کے سرہانے بیٹھ جائے! لیکن اُس کے اس سارے خوف اور تامل کے عقب میں اُس کا حسّاس دل اس جذبۂ بے پناہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا کہ مملکتِ فرانس پر "کیسی حسرت برس رہی ہے" وہ کتنی سچی ہمدردی کے لائق ہے، دل اس خیال کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کرسکتا تھا، بتدریج یہ حالت ہوگئی کہ اُس کے دل میں سوائے اس خیال کے اور کچھ باقی نہ رہا اور اُس کی مختصر زندگی صُورتِ آسمانی کی یاد و انتظار میں سراپا

اضطراب بن گئی جو ناگہاں کسی لمحے جب وہ اپنے معصوم کھیل کھیلتی ہو یا جب وہ باپ کے گھر کے سامنے دہلیز پر یا باغ میں بیٹھی سی پر درہی ہو اُس پر اپنے پیغام لیکر نازل ہو جاتی تھی +
کچھ مُدّت کے بعد وہ "واقعی با تمکین انسان" شاذ و نادر ہی آتا۔ اور صورتیں جو اُس کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتی تھیں عورتوں کی نرم و نازک صُورتیں، سفید و تاباں، چاندی سونے کے خوشنما زیور پہنے، دائرۂ روشنی میں نظر آتیں اور اپنا سر جُھکا کر گویا اِک ہم رُوح ہستی سے مخاطب ہوتیں، اپنا نام بتاتیں کہ ہم کاترین اور مارگریٹ ہیں! اُنکی صدائیں نرم و شیریں تھیں کہ سن کر انسان کا جی رونے کو چاہے۔ یہ دونوں شہید خاتونیں اس بھولی بھالی لڑکی کو جسے اک روز اِنہیں کے زُمرے میں جا ملنا تھا نیکی کی ترغیب دیتیں اور اُس کی ہمت بڑھاتیں اور کہتیں کہ "آسمان میں ایک خاتون ہے جو تجھ سے محبّت رکھتی ہے"! جب یہ پیاری صورتیں نظر سے اوجھل ہو جاتیں تو ننھی دوشیزہ اپنے بھولے پن کی جانکنی میں رو پڑتی کہ کاش وہ مجھے اپنے ہمراہ لیجاتیں۔ ژان ہمیشہ اُنہیں "میری آوازیں" کہہ کر پکارتی تھی جس سے ظاہر ہے کہ شکلوں کی نسبت آوازیں اُس کے لئے زیادہ صاف و صریح ہوتی تھیں" وہ حسرت جو فرانس کے لئے اُن کے دلوں میں اُٹھتی تھی دیہات کی ساری فضا میں اک اُداس خوشبو کی طرح پھیل گئی، ننھی ژان کے سازِ دل کا تار تار اُس کے اثر سے لرزتا تھا وہ ایسا محسوس کرتی گویا اُس کی پیاری ماں اُس کی آنکھوں کے سامنے جان توڑ رہی ہے!!

کتنی تعجب انگیز تھیں یہ ملاقاتیں! کسے خبر تھی کہ اِس دُور دراز دیہات میں ایک کسان لڑکی رہتی ہے نوعمر معصوم اپنے کام میں مشغول بعض اوقات جب وہ سینے پرونے میں لیکن دراصل اپنے نت نئے خیالوں میں منہمک ہوتی تو اُس کی ماں ذرا درشتی سے اُسے پکارتی! شرمیلی، نیک دل، خدا کی سچی بندی، جب کوئی اجنبی اُس سے بات کرتا تو وہ شرما کر اپنا سر جھکا لیتی! گرجا میں ہر صبح سویرے سب سے پہلے وہی نظر آتی اور جب گاؤں میں کوئی اُسکی ہنسی اُڑاتا کہ یہ پُجارن اپنے وقت سے پہلے ہی آ جاتی ہے تو شرمساری سے خون اُس کی رگوں میں دوڑتا اور اُس کا چہرہ سُرخ ہو جاتا لیکن سوائے اِس کے اور اُس کی سادہ زندگی میں کچھ نہ تھا جس سے اُسے شرمانے کی ضرورت ہوتی +

تعجب کی بات ہے کہ نہ اپنے ماں باپ سے نہ پادری ہی سے جس کے سامنے وہ رسمیٔ "اعترافِ گناہ" کیا کرتی تھی کبھی اُس نے اپنے ان عجیب مشاہدات کا تذکرہ کیا اور آخر اُس وقت جب وہ اپنے دل میں اس شعلۂ آسمانی کو سما نہ سکتی تھی اُس نے انکشافِ راز کا تہیہ کیا۔ وہ صرف تیرہ۱۳ برس کی تھی جب اُسے یہ الہامی پیغام نازل ہونے شروع ہُوئے اور سترہ برس کی عمر تک بدستور یہ اُس کے سینے میں مدفون رہے۔ اُس کی آوازوں کی طرف سے اُسے کوئی ہدایت یا تنبیہ نہ تھی کہ وہ یہ بھید چھپائے رکھے یا ظاہر کردے اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بچپن کے انتہائی شرمیلے پن نے اور اس عہدِ زندگی میں نقل و اصل میں تمیز نہ کرسکنے کے باعث اُس نے یہ باتیں اپنے دل ہی میں دبائے رکھیں۔ پھر اچنبھا ہے کہ اس ضبط کے باوجود وہ تُرش رُو نہ تھی کہ دُنیا سے الگ تھلگ ہو کر تنگ مزاج ہو جاتی اور ملنا جُلنا چھوڑ دیتی۔ اُس کی طبیعت میں نوجوانی کا جوش اور میل جول کا سچا شوق موجود تھا۔ ہمجولیاں اُس کے ہاں آتیں، رات رات بھر اُس کے گھر رہتیں اور ایک ہی کمرے میں ایک ہی بستر پر اُس کے ساتھ سوتیں، وہ ہر قسم کے سچے جذبات سے لبریز تھی، اپنی سہیلیوں کو ہر طرح خوش کرنے کی کوشش کرتی، غریب سے غریب عورت اُسے بُلا بھیجتی تو خوشی کے ساتھ جاتی۔ الغرض اپنے ہمجنسوں کی خدمت گذاری میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑتی۔

بالآخر اُس کی دوگانہ زندگی کا راز، ہم نہیں جانتے کس طرح، افشا ہوگیا؟ یہ ظاہر ہے کہ اپنی "آوازوں" پر روز بروز غور کرنے، آسمانی صورتوں کے پیغامات سننے اور اُن کے غایت درجہ اصرار سے مجبور ہو کر آخر ان سمجھنے لگی کہ یہ محض وہم و خواب نہیں بلکہ ایک ایسی بات ہے جو عمل میں آسکتی ہے، اِک ایسا حکم ہے جس سے سرتابی کرنا قطعی گناہ ہے! اب جنگ کی خبریں اُس کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ دلچسپ بلکہ دلفریب ثابت ہوتیں۔ حملہ آوروں کے ظلم و ستم، شاہِ فرانس کی حالتِ زار، وہ جسے دُنیا جہان کے بادشاہ نے فرانس کا محافظ مقرر کیا ہے، یہ سب کچھ سُنتی تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور دل پاش پاش ہو جاتا کہ اے پیارے وطن! تیرا یہ حال ہونا تھا تجھے یُوں پائمالِ ستم ہونا تھا کہ مدد کرنے والا کوئی نہ ہو دم بھرنے والا کوئی نہ ہو؟ وہ اپنی آسمانی آوازوں کے پیغاموں میں اک قابلِ عمل حقیقت دیکھنے لگی، اُس ضرورتِ سخت کا احساس کرنے

لگی جو اُسے میدانِ کارزار کی طرف کھینچتی تھی، اُس یقینی آزادی پر ایمان لے آئی جو فرانس کے لئے کردگارِ حقیقی کے عدل نے مخصوص کر رکھی تھی!!

یہ درست ہے کہ عوام میں مُدت سے یہ اعتقاد تھا کہ فرانس کو تباہی سے بچانے کے لئے صوبۂ لورین سے ایک کنواری لڑکی نمودار ہو گی لیکن ہمیں ژان کی یہ بات ماننی پڑے گی کہ اُس نے کبھی یہ پیشینگوئی نہ سُنی تھی۔ البتہ جب وہ گھر کو چھوڑ کے نکلی تو اُس نے کئی لوگوں سے کہا کہ "میں نے سُنا ہے کہ فرانس ایک عورت کے ہاتھوں برباد ہو گا اور پھر ایک کنواری کی مدد سے از سرِ نو زندہ ہو جائے گا"!

ژان اب اس کشمکش میں تھی کہ کس طرح خدا کے احکام پر عمل کرے؟ جو دل میں ہے کس سے کہے؟ اپنے ایک بے تکلف ہم عمر ژیرار سے جو بدِ مقابل کا معاون تھا اُس نے کہا "اگر تم برگزیدہ نہ ہوتے تو میں تم سے ایک بات کہتی"۔ ژیرار سمجھا کہ غالباً یہ شادی کی تجویز ہے اور یہ سمجھنا اُس غریب کے لئے قدرتی بات تھی۔ اِن دنوں جب وہ سخت کاوش کی حالت میں تھی، اُس کی آوازیں اُسے روز و شب ترغیب دیتی تھیں کہ جا اور وہ کام کر جو خدا نے تیرے لئے متعین کیا ہے اور اُس کی قوتِ ضبط زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکتی تھی تو مشیتِ ایزدی آخر اُس کی مدد کو آئی۔ اُس کا ماموں دیوراں لاکسار اُن کے گھر چند دنوں کے لئے آیا۔ ژان نے اُسے الگ ہو کے کہا کہ وہ اُس کے ماں باپ سے اجازت لے کر اُسے اپنے ہمراہ لے چلے۔ لاکسار کا گاؤں وُکُولر کے قریب تھا جہاں بدری کُور رہتا تھا۔ رستے میں ژان نے ماموں کو اپنا رازِ دل کہہ سنایا کہ میں تو فرانس جانا چاہتی ہوں دوفیں کے پاس، تاکہ وہاں اُس کی تاج پوشی کروں ماموں اُس کا مُنہ تکنے لگا کہ یہ نادان لڑکی کیا کہہ رہی ہے؟ جو کہتی ہے نہیں جانتی اس کے معنے کیا ہیں؟ لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ وہ لغوگوئی کی خوگر نہیں بلکہ فی الحقیقت ایک نیک بخت پیاری سی بچی ہے جو سوائے نکوکاری کے اَور کسی بات کی جرأت نہیں کرتی۔ ژان نے کہا کیا آپ نے کبھی نہیں سُنا کہ فرانس کو ایک عورت تباہ و برباد کر دے گی اور پھر ایک کنواری لڑکی کے ہاتھوں وہ دوبارہ زندہ ہو گا"؟ ماموں لاجواب ہو گیا؟

۱۳ مئی ۱۴۲۸ء کو لاکسار اپنی بھانجی کو لے کر وُکُولر پہنچا اور کپتان بدری کُور سے ملاقات

کی۔ کپتان نے اس "جاہلانہ" درخواست کو سُن کر قہقہہ مارا اور کہا "دو تھپڑ مارو اور اُسے ماں کے گھر بھیج دو! بیوقوف لڑکی! وہ کیا جانے انگریز کیسے خوفناک جنگجو ہیں کہ اپنی جگہ پر اَڑ کر ذرا پیچھے نہیں ہٹتے اور بجائے میدان میں مردِ میدان کی طرح قدم مارنے کے طرح طرح کے داؤ کھیلتے ہیں۔ وہ ایک لڑکی فرانس کو کیا آزاد کرائے گی؟ بیچارہ لاکسار اپنا سا مُنہ لے کر مُڑ آیا۔ ژان سے کیا کہتا۔ اُسے تھپڑ مارنے کا خیال بھی اک گستاخی تھا۔ لیکن ژان کپتان کی اِس پھبتی سے ذرا نہ جھجکی۔ جب سے وہ اپنے باپ کے گھر سے چلی تھی اُس کے رویّہ میں اک عظیم الشان انقلاب واقع ہو چکا تھا۔ سلطنت کے وہ بڑے بڑے عہدہ دار جن کے آگے کسان اور زمیندار کانپتے تھے ژان پر اپنا رُعب نہ جما سکتے تھے، اب تو وہ سمجھتی تھی کہ یہ فقط خدا کے دئے ہُوئے ذرائع ہیں جنکے وسیلے سے اُسے اپنا کارِ منصبی انجام دینا ہے۔ باپ کے گھر کا چھوڑنا اک سخت دشوار مرحلہ تھا وہ ہولیا تو پھر ان چھوٹی چھوٹی رُکاوٹوں پر جھجکنے کی کیا ضرورت تھی؟ پانچ برس کی وہ مشقت جو اُسے جھیلنی پڑی کسے علم تھا کہ اُس میں دل کے لئے کتنی کچھ جانکنی تھی؟ وہ آنسو! وہ ڈر سے کانپنا! وہ عاجزی کہ "حضور میں اک نادار لڑکی ہوں، میں تو گھوڑے پر بھی سوار نہیں ہو سکتی"! اب اک عزمِ مستقل سے تبدیل ہو چکی تھی؟ اُس کی آوازیں اب صاف و صریح تھیں اور اُن کا مفہوم روشن و واضح؛ وہ روز و شب اُس کی ہمدرد اور مشیرِ کار تھیں، اُن کے ہوتے زندگی کی مشکلیں آسان اور دُنیا کا رستہ صاف تھا!!

اس کے بعد اُس موٹے پھپس کپتان کی کیا حقیقت تھی؟ —— جب وہ اُن اکھڑ سپاہیوں کے سامنے آئی تو اُن کا تمسخر و استہزا سب بند ہوگیا۔ اپنی سنجیدگی سادگی اور خوش اخلاقی کے ساتھ وہ بولی کہ "میں کپتان کے پاس اپنے آقا کے ہاں سے آئی ہوں، میرا پیام یہ ہے کہ آپ شہزادے کو کہلا بھیجیں کہ وہ مطلق خوف نہ کھائے کیونکہ مہربان آقا اُسے ماہِ "رمضان"[1] کے وسط سے پہلے پہلے اپنی مدد بھیجیگا"۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ "فرانس شہزادے کی ملکیت نہیں ہمارے آقا کی ہے، شہزادہ صرف اُس کا امین ہے"، اور آخر میں کہا کہ "شہزادے کے دشمن سینکڑوں ہیں لیکن میں خود ہمراہ جا کر اُس کی رسمِ تقدس ادا کروں گی"! کپتان نے سوال کیا کہ "تیرا یہ آقا کون ہے"؟

---

[1] لینٹ:۔ عیسائیوں کا رمضان

ژان نے کہا، "آسمانوں کا بادشاہ"!

اس کے بعد وہ اپنے ماموں کی مصاحبت میں اپنے گاؤں کو لوٹی۔ اتنے میں یہ خبر آگ کی طرح دُور دُور پھیل چکی تھی۔ لوگ آپس میں یہی باتیں کرتے تھے، ماں باپ کو بھی اُس کے گھر آنے سے پہلے ہی خبر ہو چکی تھی۔ ژاک دارک اک سچے فرنساوی کسان کی طرح اپنی لڑکی کے ان خیالات کو آوارگی کی خواہش پر محمول کرتا تھا۔ اپنی لڑکی پر طرح طرح کے شک کرتا اور بے آبروئی کے خیال سے کانپ اُٹھتا کہ اِس جہالت کا کیا انجام ہوگا؟ جب وہ گھر پہنچی تو رات کو اُس کے باپ نے خواب میں دیکھا کہ وہ مُسلّح آدمیوں کے حلقے میں ہے۔ یہ کیسے گمان ہو سکتا تھا کہ اُسے سپاہیوں میں معمولی سپاہی نہ بننا تھا بلکہ اُن کا سرکردہ بن کر انہیں دشوار ترین مہموں میں لے جانا اور فتحمندی کا سہرا پہننا تھا۔ صُبح اُٹھ کر باپ نے اپنا خواب بیوی اور بچوں کو سُنایا اور کہا کہ "اگر مجھے پختہ یقین ہو جائے کہ یہی کچھ ہونے والا ہے جو میں نے دیکھا ہے تو میرا جی چاہے گا کہ وہ ڈوب کر مر جائے اور اگر تم اُسے نہ ڈبوؤ گے تو میں خود اپنے ہاتھوں سے اُسے دریا میں غرق کر دوں گا۔" اگر واقعی اُسکے سر میں یہ خبط سما جاتا تو فرانس اپنی دردناک بیوگی کی حالت میں کس قدر قابلِ رحم و حسرت ہوتا! ماں کی ممتا اس خیال سے کانپ اُٹھی بات ٹالنے کے لئے عورتوں کی سی چال چلی اور شوہر سے کہا کہ بہتر ہوگا کہ اسے خواب کی بجائے کوئی اور خواب سُنایا جائے۔ ازابو گاؤں کے کسی نوجوان کو جانتی تھی جو ژان کی زوجیت کو معراجِ شادمانی تصور کرتا۔ اِس سے ژان کے آوارہ گرد خیالات بھی سُدھر جائیں گے، جی میں آیا اُسے سبق پڑھائے کہ وہ طُول کے اسقف کے سامنے جا کر قسم کھائے کہ بچپن سے اُس کے ساتھ ژان کے متعلق قول و قرار ہو چکا تھا۔ خیال تھا کہ ایسی خدا ترس، اپنے مذہب کی پکی، پادریوں کا کہا ماننے والی اسقف کے سامنے ڈر جائیگی اور انکار نہ کرے گی مگر شرمیلی ژان کا سینہ اب ناامیدی کی سرگرمی کے ساتھ بے خوف ہو چکا تھا۔ اُس نے کسی بڑے چھوٹے کا رعب نہ مانا اور صاف انکار کر دیا۔ ہمیں اس زمانے کے تفصیلی حالات نہیں پہنچے لیکن یہ ظاہر ہے کہ سردیوں کے یہ مہینے غریب ژان کے لئے نہایت سخت گذرے ہونگے، گھر میں آئے دن بحثیں ہوتی ہونگی۔ اُدھر گاؤں والے یہ نیا جھگڑا سُن سُن کے حیران ہوتے ہونگے کہ اُن کے گرجا کی سب سے زیادہ پابند پجارن یہ کیا ان سُنی باتیں کہتی ہے؟ ژان اپنی جگہ

"رمضان" کی آمد آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس کی آوازیں اُسے ہر روز اُس کا مقررہ کام یاد دلاتیں اور اُس کے گھر چھوڑنے پر بار بار اصرار کرتیں۔ اُن کے اس تواتر اور تاکید نے اُس کے دل سے ماں باپ کی اطاعت کا جانگزا خیال محو کر دیا اور آخر کار وہ ترکِ وطن پر آمادہ ہو گئی!

رمضان کا شروع تھا جب اُس نے گھر کو الوداع کہی اور "فرانس جانے کا" قصد کیا۔ ماہِ جنوری میں بدری کوُر کو پھر ملنے کی غرض سے وہ اپنے ماموں کے ہمراہ گئی۔ اُس کا لباس کسان لڑکیوں کی طرح سادہ اور خود ساختہ تھا۔ غالباً کپتان سے اُس کی متعدد مُلاقاتیں ہُوئیں کیونکہ وہ وکُولرمیں تین ہفتوں تک مقیم رہی۔ اِس اثنا میں وہ سینٹ نکولس کی خانقاہ کی زیارت کو گئی اور اور ڈیوک لورین سے بھی ملی۔ کپتان حیران و سر بگریباں تھا کہ کیا کرے اور اس جوشیلی لڑکی کو کس طرح ہوش میں لائے؟ اُن وقتوں کے خیالات کے مطابق اُس کو یہی خیال ہو گیا ہو گا کہ یہ کوئی جادوگرنی ہے جس کی صحبت بھی پُر از خطرہ ہے۔ اُس نے قصبے کے پادری سے مشورہ کیا۔ پادری نے قصہ سُنا تو وہ بھی کپتان کی طرح ششدر رہ گیا۔ باہمی مشاورت سے یہی قرار داد ہُوئی کہ اس حواس باختہ لڑکی پر جھاڑ پھونک کا عمل کیا جائے اور ساتھ ہی اِسے خوب ڈرایا دھمکایا جائے تاکہ اس کی رُوح جادو کے پنجے سے چھوٹ جائے! کپتان اور پادری دونوں مل کر گاڑیبان کے گھر جا دھمکے جہاں ژان اور اُس کا ماموں رہتے تھے۔ پادری نے کلیسانہ انداز میں کچھ منتر پڑھا اور پھر چلّایا کہ کوئی بھوت پریت اس لڑکی کے اندر ہے تو وہ دُور ہو۔ ژان اطمینان کے ساتھ بیٹھی ہُوئی خاموش اور مُسکراتی ہُوئی نظروں سے دیکھتی رہی کہ یہ حضرت کیا کر رہے ہیں؟ باہر لوگوں کا اک جمگھٹا گھر کو ہر وقت گھیرے رہتا تھا۔ ژان گر جاجاتی تو وہ اُس کے پیچھے ہو لیتے، آتی تو اُس کے ساتھ آتے۔ ایک روز اک نوجوان بازار میں سے گذر رہا تھا کہ اُس نے بھیڑ دیکھ کر چاہا کہ وہ بھی لڑکی سے کچھ کہے "تم یہاں کیا کر رہی ہو میری اچھی؟" وہ بولا "کیا بادشاہ مُلک سے باہر نکال دیا جائیگا؟ اور کیا ہم سب انگریز بن جائیں گے؟" ژان نے جواب دیا "بدری کوُر کچھ سُنتا سُناتا نہیں پھر بھی بشرطِ زندگی وسطِ رمضان سے پہلے پہلے مجھے ضرور بادشاہ کے پاس پہنچنا ہے کیونکہ دُنیا میں کوئی شخص خواہ وہ بادشاہ ہو یا ڈیوک یا شاہِ سکاٹلینڈ کی بیٹی کوئی بھی میرے سوا مُملکتِ فرانس کو نہیں بچا سکتا۔ یُوں تو میرا جی یہی کہتا ہے کہ اپنے گھر چل اور

اپنی غریب ماں کے ساتھ بیٹھ کے چرخہ کات کیونکہ یہ میرا کام نہیں ہے لیکن اب کیا کروں مجھے جانا ہے اور ضرور یہ کام کرنا ہے کہ میرے آقا کی مرضی ایسی ہی ہے"! "اور تمہارا یہ آقا کون ہے؟" اُس نے پوچھا۔ "خدا" لڑکی نے کہا۔ نوجوان اک تنکے کی طرح ہوائے شوق میں اُڑ گیا۔ اُس نے انبوہ میں سے نکل کر اپنا ہاتھ بڑھایا اور لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر حلف اُٹھایا کہ "میں خود تمہیں بادشاہ کے حضور لیچلوں گا"۔ پھر پوچھا کہ "تم کب چلنا چاہتی ہو؟" "کل چھوڑ آج" ژاں نے جواب دیا؟

یہ دوشیزہ کا دُوسرا معتقد تھا۔ پہلا وہ اچھا کسان اُس کا اپنا چچا، دوسرا یہ شریف معزز شہری جو بعد میں ژاں دَمیتز کہلایا۔ وہ دوشیزہ کے جوش سے ایسا متاثر ہوا کہ اُس نے فوراً سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔ پہلے اُن میں یہ گفتگو ہوئی کہ لباس کیسا پہننا چاہیئے۔ سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ ژاں کو مردوں یا لڑکوں کا لباس زیبِ تن کرنا مناسب ہے۔ ژاں کا قد ضرور لانبا ہوگا ورنہ مردوں کا لباس پہن کر وہ پست قامت نظر آنے لگتی لیکن اس کا کہیں ذکر نہیں۔ لوگ روز بروز اِس عجیب وغریب ہستی کی باتوں میں زیادہ دلچسپی لینے لگے تھے کہ ایک تعجب انگیز واقعہ نے اس دلچسپی کو اعتقاد کی حد تک پہنچا دیا۔ عورتیں تو پہلے ہی اُسکی نام لیوا تھیں اب مرد بھی اُسکی صداقت کو ماننے لگے۔ صوبۂ لورین سے واپس آنے کے بعد دوسرے روز (۱۲ فروری ۱۴۲۹ء کو) ژاں نے خاص وعام اور بالخصوص بدری کُور کو علی الاعلان کہہ دیا کہ آج بادشاہ کو بمقام اورلیاں فاش شکست ہوئی ہے اور اب لازم ہو گیا ہے کہ اُسے جلد بادشاہ کے پاس لیجایا جائے۔ کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ یہ شکست فی الحقیقت اُسی ساعت میں واقع ہوئی تھی جب کہ ژاں نے اعلان کیا تھا۔ اس پیشینگوئی سے اُس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے!

اُوپر گذر چکا ہے کہ وہ دیوک لورین کی ملاقات کو گئی۔ دراصل دیوک نے اُس کی آمد کی خبر سُن کر اُسے طلب کیا تھا کہ شاید اُس کی علالت میں وہ کچھ مدد دے سکے۔ بجائے تعویذِ صحت دینے کے ژاں نے اُسے یہ تلخ نصیحت کی کہ اگر تم عذابِ الٰہی سے بچنا چاہتے ہو تو جلد اپنی بیوی سے صُلح کر لو۔ دیوک ژاں کی نیک نیتی اور بلند اخلاقی سے بہت متاثر ہوا اور اُسے چار فرانک ہدیتہً دیئے جن سے اُس کے ماموں نے اُس کے لئے ایک ملبوس تیار کروایا۔ دیوک کی ماں رشتے میں شہزادۂ فرانس کی ساس ہوتی تھی۔ اغلباً اُس نے اپنی

ماں کے پاس ژان کی تعریف کی کیونکہ ژان کے وُکولر پہنچنے کے چند ہی روز بعد شینوں سے جہاں شہزادے کا دربار تھا ایک قاصد شاہی طلبی کا پیغام لے کر آیا۔ دربار میں خواتین کا معتدبہ عنصر تھا۔ شہزادے کی اس نازک سیاسی حالت میں اعانت یا امیدِ اعانت کا کہیں سے بھی آجانا بسا غنیمت تھا۔

لوگوں کے جوش و خروش اور صداقت اعتقاد کی اب کوئی انتہا نہ تھی لیکن ژاک دارک اپنے خیالات و تعصبات کے ساتھ یقین کئے ہوئے تھا کہ اُس کی آوارہ گرد لڑکی نے اُس کو سخت بدنام کر دیا ہے، اُس کا دل درد و کرب سے پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ اُدھر ژان کو بدری کوُر کے استہزا یا پادری کے جھاڑ پھونک سے اتنی روحانی تکلیف نہ پہنچی تھی جتنی اپنے گھر والوں کی سرد مہری اور خفگی سے دلی رنج ہو رہا تھا۔ وہاں سے حکم آتا تھا کہ فوراً واپس چلی آؤ۔ اُس پر لعنتیں بھیجی جاتی تھیں کہ تم نے ماں باپ کے نام کو بٹہ لگایا۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اگر جلد ہمارے پاس نہ آؤ گی تو سمجھو کہ ہم سے ہمیشہ کے لئے چھٹ جاؤ گی! بیچاری ماں کا جی اپنی عزیز بیٹی کو چھوڑنے پر راضی نہ ہو سکتا تھا۔ اُسے کامل یقین تھا کہ اُس کی عصمت شعاری اور استقلال بڑے سے بُرے حالات میں بھی ایک بحری چٹان کی طرح قائم رہیگا۔ ژان کا ایک بھائی پیئر باپ کی اس دُرشتی سے برہم ہو کر گھر چھوڑ کے چل نکلا اور اپنی بہن سے جا ملا۔

آخر کار شہزادے کی اجازت مل گئی اور ژان ۲۳ فروری ۱۴۲۹ء کو وُکولر سے چلی۔ اُسکے ہمراہ اُس کا معتقد دَمیتز اور دَمیتز کا دوست دَپولینی تھے اور اُن کے دو خادم۔ دَمیتز نے ژان کو اپنے ایک مصاحب کا ملبوس اور اُس کے حسبِ حال چھوٹی سی زرہ دی۔ شہریوں نے بھی مل کر اُسے ایک اور ملبوس بطورِ ہدیہ دیا اور ایک گھوڑا بھی پیش کیا۔ بدری کوُر نے اُسے ایک تلوار تحفتہً دی اور یوں اپنی سادگی اور ان سادہ تحفے تحائف کے ساتھ ژان فرانس کو چلی۔ رخصت کرتے وقت بدری کوُر نے کہا "جا اور جو ہونا ہو ہونے دے"۔ وہ چلنے کو تھے کہ انبوہ میں سے ایک شخص شاید ایک عورت نے چلّا کر کہا کہ "ایسے خطرناک رستوں سے کیونکر گزرو گی؟" دلیر دوشیزہ نے جواب دیا "انہیں خطروں کے لئے تو میں پیدا ہوئی تھی"۔ آخری کام جو ژان نے کیا یہ تھا کہ اپنے ماں باپ کو ایک خط لکھا کہ اگر میں نے آپ کے حکم سے

سرتابی کی ہے تو معاف کیجئے کہ میں نے اک ایسے فرمان کی تعمیل کی ہے جو آپ کے حکم سے بالاتر ہے"
اور اخیر میں اُنہیں خدا حافظ کہا!!

اِس طرح یہ اعتقاد و اُمید کا کارواں اپنے سفرِ عظیم کو چلا! رستہ ہر طرف خطرناک و ہولناک تھا۔ وہ عموماً راتوں ہی کو سفر کرتے تھے تاکہ انگریزوں اور برگندیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو جانے سے محفوظ رہیں۔ ہمراہیوں کو بعض اوقات شک گذرتا کہ کہیں یہ لڑکی دراصل اک مکّارہ ہی ثابت نہ ہو کہیں وہ اُس کے ناپاک جادو سے ملیامیٹ ہو کے مردود نہ ہو جائیں۔ دمیتز کہتا ہے کہ ژان ہمیں بارہا یقین دلاتی تھی اور کہتی تھی "جی میں شک نہ لاؤ۔ میں وہی کام کرنیکی غرض سے بھیجی گئی ہوں جو کر رہی ہوں۔ میرے جنتی بھائی ہر کام میں میری رہنمائی کرینگے" پھر کہتی کہ "پچھلے چار پانچ برس سے میرے جنتی بھائی اور میرا پروردگار مجھ سے کہتے رہے ہیں کہ میدانِ جنگ کی طرف جا اور مملکتِ فرانس کو غارت ہونے سے بچالے"! یہ پہلی دفعہ تھی کہ اُس نے اپنے "جنتی بھائیوں" کا تذکرہ کیا۔ اب دُنیا میں کوئی متنفس اُسے اظہارِ صداقت سے نہ روک سکتا تھا، جو کچھ اُس کے جی میں تھا اب اُسے کہہ دینے سے وہ باز نہ رہ سکتی تھی، اُس کی رُوح میں اک سکُونِ مُطلق جاگزیں تھا!—— آخر اُس نے اپنا کارِ عظیم شروع کر دیا تھا۔ اُس نے کبھی یہ سوچا نہ کبھی اپنے جی سے پوچھا کہ اس کا انجام کیا ہوگا!! ایک بار جب وہ خلافِ معمول ایک شہر میں داخل ہُوئے اُس نے گرجا جانے پر اصرار کیا اور اپنے ہم سفروں سے کہا "ڈرتے کیوں ہو؟ میرا خُدا میرے لئے رستہ صاف کرتا ہے؟ میں اسی کے لئے تو پیدا ہُوئی تھی!"۔ اور وہ خطروں سے بے خطر ہو کر اپنا سفر کرتے رہے یہاں تک کہ گیارہ دن کے بعد وہ منزلِ مقصود پر پہنچ گئے!!

(باقی)

بشیر احمد

جانیں چھوڑنی پڑیں، انہیں حکم دیا گیا کہ یا عیسائیت قبول کریں یا موت، اور جب انہوں نے عیسائیت کی زندگی کے مقابلہ میں اسلام پر قائم رہنے کی باعزت موت قبول کی تو ان سفاکوں نے حکم دیا کہ اپنی مسجدوں کے منارے منہدم کر دیں کہ اگر یہ ناگہاں گر پڑے تو انسانی جانیں ضائع ہونے کا اندیشہ ہے، اور جب اس حکم کی تعمیل نہیں کی گئی تو خود ہی منارے منہدم کر دئے، جو لوگ اس موقعہ پر خاموش رہے انہیں عیسائی سمجھ لیا گیا، اور جنہوں نے مقاومت کی ان پر ظلم کئے گئے، تازیانوں سے مارا گیا، گرم گرم سلاخوں سے داغ دئے گئے، اندھیری کوٹھڑیوں میں بند کر کے کئی کئی دن بے آب ودانہ رکھا گیا، گھٹنوں کے بل کنکروں پر بٹھایا گیا، خاردار شکنجوں میں دبایا گیا، اور کئی کئی من وزنی زنجیریں دست و پا، دوش و گردن میں ڈال کر میلوں چلایا گیا، غرض کوئی ایسی سزا نہ تھی جو ان غریبوں کو نہ دی گئی ہو، اور اس لئے نہ دی گئی ہو کہ وہ اسلام کے سچے پرستار تھے، اور عیسائیت کو قبول کرنے سے انکار کرتے تھے،

اس حال میں پیٹر اعظم اورنگ حکومت پر جلوہ افروز ہوا، اس کی مذہبیت اگرچہ عیسائی دعات سے کمزور تھی، اور یہ صرف اصولوں کا پابند تھا، لیکن اسلام کے مقابلہ میں یہ ان سب سے زیادہ شہ زور تھا، اس نے تخت حکومت پر بیٹھتے ہی ان کی سرگرمیوں میں اور اضافہ کر دیا، اور اپنی مملکت میں ظلم و ستم کی آگ کے بڑے بڑے دوزخ دہکوا دئے، عام حکم دیدیا گیا کہ جو مسلمان عیسائیت قبول نہ کرے، وہ اس دوزخ میں ڈالدیا جائے، یا انہیں روسی حکومت سے نکال دیا جائے، اسی کے ساتھ یہ بھی اعلان کر دیا کہ کوئی عیسائی مسلمانوں سے میل جول نہ رکھے، جو عیسائی اس اعلان کے بعد بھی ایسا کرینگے، انہیں سزا دی جائیگی،

ان اعلانات کے شائع ہوتے ہی اسلامی علاقوں میں ہنگامہ و شورش کا ظہور ہوا، اور پیٹر کو مجبوراً یہ اعلان واپس لینے پڑے،

لیکن یہ ناسور بھرنے والا نہ تھا، اور عیسائیت کی قدیمی وحشتیں پھر نمودار ہونا چاہتی تھیں تاکہ مسلمانوں کی دنیا نے اس کو جس حیثیت سے جانا ہے، اس کا زندہ ثبوت دیکھ لے، اور ظلم و ستم، قتل و غارت، مسماری و تعصب جو اس کا پیدائشی شیوہ ہے مرنے نہ پائے،

اس رسم کہن کی تجدید کے لئے ایک اور انجمن قائم کی گئی، اس کا مایۂ ضمیر سیاسی طاقت

تھی، اور اس کا صدر، مشہور دشمنِ اسلام عیسائی مبلغ ماناخ تھا، یہ پہلے بھی اپنی مسیحیت کے مقدس فرائض انجام دیتا تھا، لیکن جب اس کے تمام کاموں کی پشت پناہ حکومت ہوگئی تو اس کی سرگرمیاں اور بڑھ گئیں، اور اب یہ مسلمانوں کی آبادیوں پر بجلی بنکر گرنے اور تلوار بنکر چمکنے لگا ماناخ نے غیر قوموں کی تضعیف، خصوصاً مسلمانوں کی پامالی اور عیسائیت کے استحکام کے لئے ایک لائحۂ عمل بھی بنایا تھا، اور حکومت کی طرف سے اس کی منظوری بھی ہو چکی تھی، لیکن حسنِ اتفاق سے اسی زمانہ میں ایلاریون کی مخالفت سے اس کو مستعفی ہونا پڑا، اور یہ انجمن ٹوٹ کر ایک دوسری انجمن قائم ہوئی، اس انجمن کا نام انجمن اہتدائے جدیدہ تھا، اس کی توثیق کے لئے سرکاری فرمان ۲۳ دفعات پر مشتمل تھا، جن کا لب لباب حسب ذیل ہے:۔

۱۔ تمام رعایا کو عیسائی مذہب میں داخل کرنے کی کوشش کی جائے، اور تمام عیسائیوں کے درمیان رشتۂ محبت و مودت پیدا کیا جائے،

۲۔ جو لوگ عیسائیت قبول کریں انہیں کپڑا، تمغے، خطابات اور مالی اعانت دی جائے اور فوجی خدمات و محاصل سے مستثنیٰ کر دیا جائے،

۳۔ جو لوگ عیسائیت قبول کریں انہیں قدیم عیسائیوں کے ساتھ آباد کیا جائے، تاکہ ان میں عیسائیت کے رسوم و عوائد راسخ ہو جائیں، اور وہ دوبارہ اپنے مذہب کی طرف عود نہ کر سکیں، اور

۴۔ جو لوگ ایسا کریں (یعنی اسلام کی طرف لوٹ جائیں) انہیں تازیانوں کی سزا دی جائے، ان کا مال و متاع ضبط کر لیا جائے،

۵۔ ایسے تمام لوگوں کو بھی سزائیں دی جائیں جو باوجود عیسائیت کی تبلیغ کے اسکے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں، ان کا مال و اسباب چھین کر جلاوطن کر دیا جائے،

۶۔ تمام ملک میں ایسے مذہبی مدرسے قائم کئے جائیں جو عیسائیوں کے لئے مذہبی پیشوا تیار کریں،

۷۔ صلیب عیسائیوں کا مقدس مذہبی نشان ہے، اسے تمام نمایاں مقامات پر لٹکایا جائے اور ہر شخص کو مجبور کیا جائے کہ وہ اس کی تعظیم کرے،

۸۔ مسجدوں میں بلند آواز سے اذان دینے کا طریقہ بند کیا جائے، اس سے عیسائیوں کے

مذہبی جذبات کو ٹھیس لگتی ہے، اور اشتعال پیدا ہو کر نقضِ امن کا اندیشہ ہوتا ہے،

۹۔ تمام ایسی مساجد جو زاید از ضرورت ہوں، یا عیسائی محلوں میں واقع ہوں، یا محکمۂ احتساب کے قریب ہوں، یا ایسے مقامات پر ہوں جہاں مسلمانوں کی آبادی ۲۰۰ نفوس سے کم ہو منہدم کر دی جائیں،

۱۰۔ دوسری قوموں کو ان کی مذہبی کتابیں چھاپنے کی اجازت نہ دی جائے،

اس فرمان کے بعد سے مسلمان اور زیادہ مبتلائے مصیبت ہو گئے، ہر شخص ظلم و ستم پر تل گیا، بچوں سے لے کر عورتوں تک نے جو چاہا بے روک ٹوک کہا اور کیا، مسجدیں منہدم ہونے لگیں، مسلمانوں کے شعائرِ مذہبی اور معتقداتِ دینی کی تذلیل کی جانے لگی، جس نے چاہا ان کو بلا تامل زدوکوب کیا، ان کے لئے دادرسی کا دروازہ بند تھا، تعلیم و تعلم کی ممانعت تھی، مدرسے کھولنا جرم تھا، اور جو کوئی اس کا اقدام کرتا، وہ قید کر دیا جاتا، اور پھر مدتوں اس کی خبر نہ لی جاتی،

غرض روس میں مسلمانوں کے لئے اپنے مذہب پر قائم رہنا سخت دشوار ہو گیا تھا، وہ طرح طرح کے ظلم و ستم کا شکار رہتے، نہ کوئی خبر گیر تھا نہ دادرس، کیونکہ یہ جو کچھ ہو رہا تھا حکومت کی طرف سے ہو رہا تھا، اور حکومت بھی وہ جو امن و سلامتی کی مدعی، روشن خیالی کی داعی اور تمدنِ جدید کی حامی تھی، اور جس کی عنانِ نظم و ادارت اس کے ہاتھ میں تھی جو روسی وحشیوں میں پہلا انسان تھا، یعنی پیٹر اعظم!

ناظر دہلوی

قدرت کا طریقۂ گفتگو:۔ قدرت تین طریقوں سے گفتگو کرتی ہے۔ وہ ہم سے ہاتھ ملاتی ہے اور کہتی ہے: "ہمت کرو کوشش کرو"۔ پھر اتنی نزدیک آتی ہے کہ ہم اسکے دل کی حرکت سن سکیں۔ اور کہتی ہے: "تعجب کرو۔ محظوظ ہو۔ تعظیم کرو"۔ پھر سرگوشی کرتی ہے اور اپنا راز بتلاتی ہے اور کہتی ہے: "تلاش کرو۔ دریافت کرو"۔ اس کی پہلی اپیل ہمارے ہاتھوں سے ہے دوسری دل سے اور تیسری دماغ سے

(جے۔ آرتھر۔ ٹامسن)　　(ریاض احمد بی اے انبالوی)

"گُم کردہ"

افتخار میرا دوست تھا۔ میں اُسکو دس سال سے جانتا تھا۔ اُس کے نہاں در نہاں راز جنکو وہ اپنے قلب کی عمیق گہرائیوں میں پوشیدہ رکھتا تھا صرف مجھی پر منکشف تھے۔ میرے حیات وجذبات کو سمجھنے والا بھی آہ افتخار ہی تھا۔ میرے بے ربط ومجنونانہ خیالات جو بعض اوقات میرے سینے کی محدود وسعت سے بہت بڑھ جاتے تھے۔ جنکو میری قوتِ تحمل زیادہ دیر تک نہ اُٹھا سکتی تھی اور جو تحت الارض موادِ آتشیں کی طرح خود بخود بلا اختیاری طور پر میری زبان کے راستے خارج ہو جاتے تھے اُنکے مفہوم اصلی پر بھی سوائے افتخار کے اور کون قادر تھا؟ وہ وقت جو میں اور افتخار اکٹھے رہ کر گذارتے ہمارے ایام حیات کا بہترین وقت ہوتا تھا۔ افتخار کی صحبت مجھے تمام اشیاء دنیوی سے زیادہ عزیز تھی۔ مفارقتِ صوری کے عالم میں ہماری انتہائی خواہش یہی ہوتی تھی کہ باہم افسانۂ حیات سُنا کر بارِ زیست کو ذرا ہلکا کریں۔

احباب سے دور۔ اُنکی رُوح پرور مجلس سے دور۔ اُنکی مسرت افزا گفتگو سے (جو میرے اسبابِ حیات کا ایک لابدی جزو ہے) محروم۔ جب کبھی میں کسی ناآشنا گروہ ہوائی میں زندگی کے چند ایام گذارنے پر مجبور ہوتا تو اُس وقت میرے پُرملال سکوتِ حیات میں افتخار ہی تھا جو آکر ہیجان پیدا کرتا۔ اُس کی صحبت دنیا کا ناپسندیدہ پہلو نہ دکھا سکتی تھی وہ دوستوں کے لئے مائۂ زلیست اور ہماری مجلس کی رُوح تھا جس کے نکلجانے سے اب وہ لذتِ حیات بھی مفقود ہے افتخار نہ صرف دوست نواز بلکہ دوست پرست تھا۔ اُس کا سینہ پاک جذبات اور حقیقی محبت سے منور تھا۔ جس کی نورانی لمعات نے اُسکے دوستوں کے قلوب کو بھی صاف کر دیا تھا۔ اُسکی محبت بے لوث اور اُس کی دوستی خود غرضی سے قطعاً مُبرا تھی۔ اس لئے وہ سمجھتا کہ ہر شخص جو اُس سے متبسم چہرہ کے ساتھ ملتا ہے وہ اپنے تبسم میں صفائی قلب لئے ہُوئے ہوتا ہے۔ یہ اُس کی کمزوری کہیئے یا تجربہ کی خامی یا حُسنِ ظن بہرحال وہ اسی عقیدہ کا آدمی تھا۔ اور ہر ایک کو اپنے ہی رنگ میں رنگا ہُوا دیکھنے کا خواہشمند۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر آرزو جو اُس کے دل میں پیدا ہو بہت جلد اپنے مقصود کو پالے حصولِ مُدعا میں سعیِ پیہم اور مسلسل کوشش کو بارگراں تصور کرتا تھا۔ کہا کرتا تھا کہ آرزوں اور خواہشات کی فراوانی نقدانِ اطمینان کا باعث ہوتی ہے۔

اس لئے چاہیئے کہ جو آرزو پیدا ہو بہت جلد پوری ہو کر
اطمینان کی صورت اختیار کرلے یا ناکام رہ کر مایوسی میں
تبدیل ہو جائے۔ کانٹے کی طرح کھٹکتے رہنا مجھے پسند
نہیں' وہ دوستوں کے لئے موجب راحت تھا ہم چاہتے
تھے کہ افتخار اپنے غیر محدود احسانات کے عوض ہم سے
اپنی کسی خواہش کا اظہار کرے لیکن وہ ہر ایسی کوشش کو
بار سمجھ کر (باوجودیکہ ہماری انتہائی خواہش یہی ہوتی تھی
کہ وہ ہماری خدمات کو قبول کرے) اُس سے گریز کرتا
کہا کرتا تھا کہ "جبتک اس عوض معاوضہ کا خیال یکسر
نہیں اُٹھ جاتا دوستی حقیقی معنوں میں ظاہر نہیں ہو سکتی"
اس کے علاوہ افتخار بے حد ذکی الحس تھا۔ وہ ایک
غیر معمولی حساس طبیعت لیکر پیدا ہُوا تھا اور شاید
اسی لئے اپنے دوستوں سے کسی کام کے کرنے کو
نہ کہتا تھا کہ اگر انہوں نے انکار کر دیا تو وہ "نہیں" کی تاب
نہ لاسکیگا۔ کسی ناواقف کے لئے اُس کی زندگی سراسر
ہموار اور یکرنگ تھی جس میں نہ نوحۂ غم اور نہ نغمۂ شادی
کی آواز سُنائی دیتی تھی لیکن میں جانتا ہوں کہ اُس متین
چہرے اور خاموش سینے کے اندر جذبات کا ایک
تلاطم برپا تھا اور وہ غالباً عوام کو اُن کے سمجھنے کا اہل نہ
خیال کر کے زیادہ تر خاموش رہتا تھا۔ لیکن جب کبھی
وہ مجھ سے ملتا تو اُس کے خیالات ایک رُکے ہُوئے
دریا کی طرح اُمڈے چلے آتے تھے۔ اور اپنی طویل گفتگو
کے دَوران میں وہ شاید بھول جاتا تھا کہ اُسکا مخاطب
بھی اپنے مُنہ میں زبان رکھتا ہے۔ وہ مجھے بولنے
کا موقع ہی نہ دیتا تھا۔

افتخار شاعر تھا۔ اگرچہ لساناً شاعر ہونے کا
تو اسکو دعوےٰ نہ تھا مگر حساً و فکراً تو یقیناً وہ شاعر
تھا۔ وہ موسیقی کا دِلدادہ تھا۔ کہا کرتا تھا "جو شخص گانے
کی دِلکشا آواز سے متاثر نہیں ہوتا وہ خطرناک ہے اور
اُس سے ڈرنا چاہیئے کیونکہ اُسکے پہلو میں دل کی جگہ
پتھر ہے" صبح اور شام کی ہوا خوری میں ناغہ نہ ہونے
دیتا تھا۔ صبح کی سیر کے وقت میں اور وہ اکثر اکٹھے
ہُوا کرتے تھے۔ بعض اوقات چلتے ہُوئے جب
ہم آبادی سے بہت دُور نکل جاتے تو نہر کا آہستہ بہنے
والا پانی جس کے دونوں کناروں پر اونچے اونچے
درخت زمردی لباس میں آراستہ شبنم کے قطروں سے
لدے ہُوئے دیکھ کر میں کہہ اُٹھتا "افتخار دیکھو
کیسا خوش نما منظر ہے" تو وہ مختصر مگر اپنے واردات
قلبی کی حقیقی مظہر تقریر کو شروع کر دیتا "واقعی خوشنما
منظر ہے لیکن قدرت کا بہترین لباس۔ فطرت کا
انتہائی حُسن درختوں کے اِس جھنڈ اور نہر کے آہستہ
بہنے والے پانی میں ظاہر نہیں ہُوا۔ دُنیا کی ان بے مثل
خوبصورت جگہوں کو دیکھو جہاں دماغ کو سکون
حاصل ہوتا ہے اور طبیعت کی پریشانی کو اطمینان
بہم پہنچتا ہے۔ جہاں شاعرانہ جذبات کو حرکت
ملتی ہے اور دل میں ایک سرور سی کیفیت پیدا

ہوتی ہے۔ مگر جب تمہارا کثرتِ اشغال سے تھکا ہُوا دماغ اپنی اصلی سطح پر آجائیگا۔ جب تمہاری طبیعت کی بے چینی رفع ہوجائیگی اور جب تمہارا دل سرور سے پُر ہوجائیگا تو پھر بھی تم اُس اطمینان کو نامکمل پاؤ گے اور دیکھو گے کہ تمہارے سرور میں ایک رخنہ ابھی باقی ہے جس کو وہ منظر باوجود اپنی انتہائی خوش نمائی کے بھی پُورا نہیں کرسکا۔ تمہارا قلب مکمل راحت حاصل کرنے کے لئے محتاج ہے ابھی اُس چیز کا جو اس قدرتی منظر سے بھی زیادہ دلفریب ہو۔ جسکا خوشگوار نظارہ تمہاری آنکھوں اور دل کو مسحور کردے اور جس کا حُسن تمہاری طبیعت کی بے چینی کو اس رنگ میں ڈھال دے کہ تم ہزار اطمینان کو اُس بے چینی پر قربان کردو اور ہاں یاد رکھو وہ "عورت" ہے "عورت" ہی حقایق کبریائی کی مظہر ہے "عورت" ہی میں قدرت اپنی پوری دلربائی کے ساتھ ظاہر ہُوئی ہے۔ اور عورت یقیناً عورت ہی فطرت کی اختراعِ فائقہ ہے" اب اُسکی آواز زیادہ پُرزور ہوجاتی مگر وہ کوشش کرتا تھا۔ کہ آواز میں زور کے ساتھ سختی نہ عود کر آئے کیونکہ قدرت کی حسین ترین اور نازک چیز کا ذکر کرتے ہُوئے وہ نرم الفاظ اور نرم ہی لہجہ استعمال کرتا تھا۔ بہار کے موسم میں جب ہر جاندار اور بے جان چیز مخمور ہوتی ہے۔ جب اُس کا حُسن ابتدائی منازل طے کرکے آخری مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ تم باغ میں جاؤ اور دیکھو کہ شگوفے کھل رہے ہیں۔ کلیاں کھل کر پھول بن چکی ہیں مگر اُن پھولوں کے چہروں پر شباب کے ساتھ اُداسی چھائی ہُوئی ہے۔ وہ متبسّم بھی ہیں اور پریشان بھی۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اُنکی حقیقی زندگی مَوت میں پنہاں ہے۔ وہ اسی لئے پیدا ہُوئے ہیں کہ اپنے وجود کو اپنے سے اعلےٰ ہستی پر قربان کرکے اصلی لذتِ حیات حاصل کرلیں۔ پھُولوں کے اُس ہار کو دیکھو جو کسی دوشیزہ کے گلے میں رہ کر مُرجھا گیا ہو سطحی نظر رکھنے والا آدمی کہے گا کہ باغ میں کھِلے ہُوئے پھُول زندہ ہیں اور یہ مرگئے مگر فلسفۂ حیات کا مفسّر انسان جھٹ بول اُٹھیگا در مبارک ہیں یہ پھُول جنہوں نے ایک حسینہ کے گلے میں زندگی کا دَور ختم کیا اور یوں مقصودِ زیست حاصل کرلیا۔ اب یہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہیں"۔ میں تو جب کبھی پھُول دیکھتا ہوں۔ خوشبو سونگھتا ہوں یا موسیقی سُنتا ہوں تو میرا خیال اُس اعلیٰ وارفع ہستی کی طرف صعود کرجاتا ہے جس کے لئے یہ تمام اشیاء پیدا کی گئی ہیں اور جو اِن کا مجموعہ ہے یعنی "عورت"

مجھے افتخار کی گفتگو سننے میں بے انتہا لُطف ملتا تھا۔ اب میں اُس کی اُس رگ سے واقف ہوچکا تھا جس کے چھیڑنے سے وہ ایک طویل تقریر کرنے پر مجبور ہوجاتا۔ وہ اس قدر خوش مزاج تھا۔ کہ باوجود جاننے کے کہ ہمارا مقصد اُسکے خطبۂ بلیغ سے

چنداں فایدہ اُٹھانے کا نہیں تجاہلِ عارفانہ کئے اپنے لکچر کو جاری رکھتا۔ ہر حسین چیز کو دیکھ کر وہ پھڑک اُٹھتا تھا۔ لیکن اُس کے حاصل کرنے کے لئے وہ بہت کم کوشش کرتا۔ کہا کرتا تھا حُسن جہاں بھی ہو دلکش ہے مگر اُس کی تکمیل صرف عورت ہی میں ہُوئی ہے ۔

. . . .

افتخار یوں تو ہم سب کا ہی دوست تھا مگر مجھ سے اس قدر موانست ہو چکی تھی کہ غیریت کا کبھی خیال تک نہ آیا تھا۔ بعض اوقات جب وہ میری کسی بات سے یا کسی فعل سے بُہت خوش ہو جاتا تو کہہ اُٹھتا مُراد! اگر تم دنیا میں پیدا نہ ہوتے یا میں عدم سے ہستی میں نہ آتا یا اگر پیدا ہُوئے تھے اور ایک دوسرے سے نہ مل سکتے تو نہیں معلوم زندگی کا یہ بار کس قدر بوجھل اور نا قابلِ برداشت ہو جاتا۔ قدرت کو ہماری زندگی خوشگوار بنانا منظور تھی۔ اُس نے ایک کو بٹالے کی خاک پاک سے اور دوسرے کو اجمیر کی ارضِ مقدس سے اُٹھا کر کس طرح یکجا کر دیا زندگی میں ایک دوست کی ضرورت ہوتی ہے وہ دوست جو دوسرے میں جذب ہو جائے یا دوسرے کو اپنے میں جذب کر لے۔ جو نوحۂ غم سُن کر اپنی آنکھوں سے محبت کے دو قیمتی آنسو بہائے۔ وہ آنسو جو پریشان قلب کے لئے باعثِ نجات ہوں۔ جو زندگی کی کٹھن منزل میں اپنے تھکے ہُوئے ساتھی کی طرف تبسم آمیز نگاہوں سے دیکھے وہ نگاہیں جو اُس کے کرب و اضطراب کے بادلوں کو پاش پاش کر دیں اور جو ظلمتِ حیات میں اُس کی مشعلِ راہ ہوں۔ آہ یہی مشکل ہے۔ زندگی اپنے تمام لذائذِ دنیوی کے ساتھ ہمارے پیشِ نظر ہے۔ لیکن وہ ایسا رفیق مہیا کرنے سے عاجز نظر آتی ہے جو اپنی مصیبت سے ہمارے اس شیریں خواب کو جہاں ہم حیاتِ مصنوعی کا مزا لے رہے ہیں حقیقت سے تعبیر کر دے اور جو ہمارے خیالات کے سلسلہ کو اِس خواب سے جاگ اُٹھنے سے پہلے منتشر نہ کر دے مجھے افتخار کی یہ باتیں سُن کر خیال گذرتا تھا کہ شاید

وہ ابھی تک حقیقی اطمینانِ قلب سے بہت دُور ہے دُنیا کی خیرہ کُن روشنیوں میں وہ کسی اصلی اور پائدار روشنی کو تلاش کرنے میں مصروف تھا۔ وہ دوست جس کی تعریف وہ اِن الفاظ میں کرتا تھا "جو نوحۂ غم سن کر اپنی آنکھوں سے محبت کے دو قیمتی آنسو بہائے وہ آنسو جو پریشان قلب کے لئے باعثِ نجات ہوں" ابھی اک اُمیدِ موہوم اور خیالِ مبہم سے زیادہ حقیقت نہ رکھتا تھا۔ یہ باتیں کرتے ہُوئے اُس کے چہرے سے حسرت نمایاں ہُوا کرتی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ افتخار کے تمام رازوں میں جو مجھ پر افشاء تھے ابھی کچھ حِصّہ باقی ہے جس کو ظاہر کرتے ہُوئے وہ رکتا تھا۔ مُلاقات کے بیشتر حِصّہ میں وہ اکثر مجھ سے فلسفۂ محبت پر بحث کیا کرتا۔ ایک روز جب اُس کے خیالات غیر معمولی طور پر رقیق ہو رہے تھے میں نے اُس سے ہمدردانہ لہجے میں کہا اور "افتخار تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" وہ آہ! مراد! شادی؟ کس سے ہو۔ کون ہو سکتا ہے میرے خیالات کو سمجھنے والا؟ کون ہے میرے جذباتِ اُلفت کا حقیقی آشنا؟ ہندوستانی تمدن میں جہاں بقول "میر افضل علی" بیویاں لاٹری میں مِلتی ہیں میرا انتخاب کیونکر کچھ وزن رکھ سکتا ہے؟"۔ میں نے کئی دفعہ دیکھا کہ افتخار تنہائی کے اوقات میں نہایت اطمینان سے بیٹھ کر کاغذ پر کچھ لکھتا ہے اور پھر پھاڑ دیتا ہے۔ اُس کے چہرے سے اشتیاق اور حسرت کی علامتیں نظر آتی ہیں مگر میں نے اس کے متعلق پوچھنے کی کبھی جرأت نہیں کی۔

افتخار اُن دوستوں میں سے نہ تھا جو جدا ہو جانے پر خطوں کا تانتا باندھ دیتے ہیں اور اشتیاقِ ملاقات اور دردِ فرقت کے رونے روتے ہیں۔ وہ اگر دوستوں کے ساتھ زیادہ خط وکتابت کا مخالف نہ تھا تو اُسکو چنداں پسند بھی نہ کرتا تھا۔ میں نے جب اُس سے اس امر کی شکایت کی تو اُس نے مجھ سے کہا "زیادہ خطوط لکھنا تو میں عامیانہ مذاق سمجھتا ہوں اور نہ اسمیں دوستی اور محبت کی پائداری کا ثبوت ملتا ہے۔ قلب اور روح میں اس قدر صفائی ہونی چاہیئے کہ آنے والے واقعات کا عکس ایک دوسرے کے قلب پر پڑ جائے"۔

کالج کی تعلیم میں اُسکا آخری سال تھا موسمِ گرما کی طویل تعطیلوں کے بعد جب وہ واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ پہلے سے وہ زیادہ خوش نظر آتا ہے مطالعہ کے اوقات میں بھی زیادہ مصروف رہتا اور فرصت کا زیادہ حصہ کمرے میں اکیلا رہ کر گذارتا تھا۔ مجھ سے اُس کا رویّہ ویسا ہی مخلصانہ تھا۔ مگر گفتگو ویسی یاس انگیز نہ ہوتی تھی جیسی کہ وہ کرنے کا عادی تھا۔ میں اس تبدیلی کا سبب دریافت کرنے کی کوشش میں تھا کہ وہ خود ہی ایک روز اپنے مخصوص عنوان پر گفتگو کرتا ہُوا کہنے لگا "تم جانتے ہو ہمارے

ہاں شادی کا مسئلہ والدین کے ہاتھوں میں اس طرح سونپ دیا
گیا ہے کہ اُس میں تبدیلی کی کوشش کرنا گستاخی پر محمول
کیا جاتا ہے۔ بیوی کا حقِ انتخاب اُس شخص کے ہاتھ میں
نہیں جسے بیوی کی ضرورت ہے بلکہ اس امر کا ٹھیکہ ہماری
عورتوں نے لے رکھا ہے۔ وہ اپنے بوسیدہ مذاق اور پستیٔ
معیار سے ایسا جوڑا تلاش کرتی ہیں جن کی طبیعتوں میں زمین
آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کے لئے
بجائے خاوند بیوی کے دردسری بن جاتے ہیں ہماری
معزز بزرگ خواتین لڑکے کے جذبات کا سمجھنا تو کجا اُس
غریب کی رائے تک نہیں سنتیں۔ اور اگر وہ اُس انتخاب
سے جن کی ذمہ دار اُس کی صد سالہ بوڑھی دادی اماں
ہیں اختلاف ظاہر کرکے انکار کر دے تو بس وہ اپنی
اس بیباکی اور بے ادبی کی وجہ سے گردن زدنی قرار
دیا جاتا ہے۔ کس قدر شرمناک بات ہے کہ اس زمانہ
میں جبکہ ہماری زندگی کے تمام شعبوں میں ترقی ہو رہی
ہے شادی بیاہ کا مسئلہ ویسا ہی تاریک نظر آ رہا ہے
لیکن تم خوش ہو گے کہ میں اس اصول سے مستثنےٰ ہو گیا
ہوں۔ میرا مستقبل مجھے روشن نظر آ رہا ہے اور میں
سمجھتا ہوں کہ ہندوستانی تمدن میں رہ کر یہ میری
بڑی کامیابی اور خوش قسمتی ہے،،

میں نے خوش ہو کر استفسارانہ نگاہوں
سے پوچھا،، تو اپنی اس غیر معمولی کامیابی کی مفصل
کیفیت مجھے سناؤ۔ اُس نے لبوں پر ایک عجیب
تبسم پیدا کر کے بولنا شروع کیا،، گذشتہ رخصتوں میں
والد صاحب نے یہ سوچ کر کہ اس سال کے اخیر میں
میں فارغ التحصیل ہو جاؤں گا مجھ سے ایک روز
علیحدگی میں فرمایا،، دیکھو تمہاری تعلیم کا سلسلہ ایک سال
تک ختم ہو جائیگا اور اُس کے بعد تم انشاءاللہ برسرِ روزگار
ہو گے۔ مجھے تمہاری شادی کی فکر ابھی سے ہے
اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر تمہارے ایم۔ اے کرنے کے
بعد تمہاری شادی کر دی جائے تو نہایت مناسب
ہو گا۔ میں اُن والدین میں سے نہیں ہوں جو صرف اپنی
عارضی خوشی دیکھنے کی غرض سے اولاد کو قبل از وقت
شادی کے شکنجے میں کس دیتے ہیں۔ حصولِ تعلیم کے
دوران میں شادی کو میں ہمیشہ غیر مفید سمجھتا رہا ہوں اور
اب جبکہ تم ماشاءاللہ ہونہار نوجوان ہو تمہاری رائے
کو باقی رایوں سے ضروری اور مقدم خیال کرتا ہوں۔
تم جہاں چاہتے ہو مجھ سے کہو میں سلسلہ جنبانی کرنیکو
تیار ہوں۔ میں اگرچہ بہت آزاد خیال اور آزاد گو تصور
کیا جاتا ہوں لیکن اُس وقت میری زبان اپنے
دیرینہ مدعا کے حصول کے لئے کچھ نہ بول سکی۔
آخر انہوں نے خود ہی کہا کہ تم اپنی والدہ کے سامنے
اپنی خواہش کا اظہار کر دو اور یہی مناسب ہے،،
اتنی گفتگو کر چکنے کے بعد افتخار ذرا سستایا اور
میرے نزدیک ہو کر رکتی ہوئی آواز میں بولا میں نے
اپنی مرضی کا اظہار کر دیا ہے۔ میرا انتخاب منظور اور

کامیاب ہوچکا ہے ——— "حبیبہ" میری آرزوں
کی انتہا ہے۔ میری راتیں اور میرے دن اب اُسی کی یاد
میں کٹتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو خوش قسمت یقین
کرتے ہیں۔ اُس دن کے لئے جو ایک سال کے بعد
آنے والا ہے ہم دونوں بیقرار منتظر ہیں۔ ہماری یہ
محبت ایک سال کے بعد پائدار ہوجائے گی۔ اور ہم
ناقابلِ گسل استحکام کے ساتھ ایک دوسرے سے
وابستہ ہوجائینگے"

افتخار نے جس جانفشانی کے ساتھ طالب علمی
کا یہ آخری سال گذارا اُسی کا حصّہ تھا۔ وہ کتابوں کا کیڑا
بنا رہا لیکن مجھ سے ملنے میں اُس نے کمی نہیں کی۔
امتحان میں جیسی کہ امید تھی وہ اچھے نمبروں پر کامیاب
ہُوا۔ فراق کا وقت گذر چکا تھا اب افتخار چند ظاہری
دنیوی رسموں کے بعد اپنی "حبیبہ" سے ناقابلِ گسل استحکام
کے ساتھ وابستہ کردیا گیا۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد
اُس نے مجھے ایک خط میں لکھا "میں نے گوہرِ مقصود
پالیا اور اب میری زندگی مالامال ہے۔ "حبیبہ" اور میں
زندگی کی اس کٹھن منزل میں ایک دوسرے کے ساتھی
ہیں۔ وہ اپنی تبسم آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتی
ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میں فضائے علوی میں پرواز
کررہا ہوں۔ "حبیبہ" کا پاک قلب محبت اور وفا سے
پُر ہے۔ اُس کی آنکھیں کس قدر حسین ہیں۔ دن بھر
کی کوفت کے بعد جب میں واپس گھر میں آتا ہوں
تو اُس کی تلطف آمیز آواز میرے کانوں کو ایک حقیقی
موسیقی سے لبریز کردیتی ہے اور مجھے ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ میرا دماغ اب سو رہا ہے۔ گرمیوں کی پُرفضا شام
ہم ایک مختصر سے گھاس کے میدان میں گذارتے ہیں
"حبیبہ" اپنی نازک اُنگلیوں سے ہارمونیم کے تاروں
کو چھیڑتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا موسیقی کا ہی
مجسّمہ ہے۔ ہر چیز اپنے انتہائی حسن میں نظر آرہی
ہے تعطیل کے روز میں اور حبیبہ سارا دن یکجا رہتے
ہیں۔ میری آنکھیں اُسکو دیکھتے ہُوئے نہیں تھکتیں
میں نے اکثر تمہارا ذکر کیا ہے۔ تم جلد آؤ میرے
مکان کو جو اب جنتِ ارضی ہے آکر دیکھو۔ ہماری
دلچسپیوں میں آکے حِصّہ لو۔ تمہاری آمد ہم دونوں کے
لئے موجب راحت و اطمینان ہوگی"۔ میں خوش تھا
کہ آخرکار افتخار کو وہ رفیقہ میسّر آگئی" جو اپنی آنکھوں
سے محبت کے دو قیمتی آنسو بہاکر اُس کے پریشان
قلب کو نجات دِلاسکتی ہے" افتخار کی شادی کے
بعد میں دو سال تک اُس سے نہ مِلسکا۔ اس عرصہ
میں مجھے اُس کے صرف دو خط ہی ملے۔ ان دو
سال کے بعد میری اور اُس کی آخری ملاقات انبالہ
کے اسٹیشن پر ہُوئی۔ پٹنہ کو جاتے ہُوئے مجھے
وہاں پر گاڑی تبدیل کرنی تھی۔ رات کے ۹ بجے
میں "کلکتہ میل" سے انبالہ اسٹیشن پر اُترا تو میرے
تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا

کہ افتخار وہاں پلیٹ فارم پر ٹہل رہا ہے۔ میں اُس سے عرصہ سے نہ ملا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ راولپنڈی اپنی ملازمت پر ہوگا لیکن اب وہ انبالہ ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر متجسسانہ نگاہوں سے "کلکتہ میل" میں کسی کو تلاش کر رہا تھا۔ مجھے اُسکو وہاں دیکھ کر حیرت ہوئی مگر اس کے چہرے پر مطمئن مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ آگے بڑھا اور خلافِ معمول بغلگیر ہوکر ملا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور وہ پہلے سے بہت زیادہ لاغر معلوم ہو رہا تھا۔ پہلا سوال اُس سے میں نے یہی کیا "افتخار تم یہاں کیسے آئے اور کس کو ڈھونڈھ رہے ہو؟"

افتخار:۔ "میرے بڑے بھائی یہاں ملازم ہیں اور مجھے اُنکے پاس آئے ہوئے آج بیس روز ہو گئے ہیں"

میں:۔ "تو اسٹیشن پر کس کو تلاش کر رہے ہو؟"

افتخار:۔ "مجھے آج صبح ایسا معلوم ہوا تھا کہ تم یہاں آنے والے ہو۔ دوپہر کی گاڑی تو خالی گئی لیکن اب تم آ گئے۔ اچھا ہوا"

میں نے کہا کہ "میں تو پٹنہ جا رہا ہوں تمہارے پاس ایک گھنٹہ سے زیادہ نہیں ٹھیر سکتا"۔ افتخار نے پُر التجا آنکھوں سے جن میں مجھے آنسو جھلکتے نظر آتے تھے میری طرف دیکھا اور کہا "نہیں! آج رات یہیں رہو کل شام کو چلے جانا"۔ میں اپنے میں اتنی جرأت نہ پاتا تھا کہ افتخار کی اس درخواست کو رد کر سکوں۔ آخر اُس نے میرا اسباب اُٹھوا کر باہر تانگے میں رکھوا دیا اور میں بھی بیٹھ گیا۔ راستہ بھر وہ زیادہ تر خاموش ہی رہا۔ میں حیران تھا کہ افتخار کو کیا ہو گیا ہے۔ مجھے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اُس کی زندگی میں کوئی بہت بڑا اور غیر معمولی اہم واقعہ پیش آیا ہے جس نے اُس کی صحت اور ظاہری حالت میں بڑا نمایاں اور گہرا اثر کیا ہے۔ لیکن میں وہ حادثہ معلوم نہ کر سکتا تھا۔ آدھ گھنٹے میں ہم مکان پر پہنچ گئے۔ افتخار کے بڑے بھائی یہاں ڈپٹی کلکٹر تھے اور افتخار اُنہیں کے پاس ٹھیرا ہوا تھا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد میں نے افتخار سے کہا "تم بہت لاغر معلوم ہو رہے ہو کیا بیمار ہو؟ تم نے خط تک بھی مجھے نہیں لکھا" افتخار نے ایک مصنوعی تبسم پیدا کر کے کہا "میں بیمار تو نہیں میری صحت اچھی ہے" مگر میں نے دیکھا کہ یہ فقرہ کہتے ہوئے اُسکی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے تھے۔ وہ اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا میں نے اُس کے قریب جا کر اپنا دایاں بازو اُسکے کندھے پر رکھ کر کہا "افتخار! مجھ سے اپنا رازِ دل کہو۔ دیکھو تم مجھ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھا کرتے۔ آج یہ تمہاری کیا حالت ہے؟ خدا کے لئے مجھے اس تذبذب سے نکالو" افتخار نے اپنا پژمردہ چہرہ جو کسی زمانہ میں تمام خوشیوں اور راحتوں کا مرکز ہوا کرتا تھا میری طرف اُٹھایا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ بے اختیار ہو کر مجھ سے

لپٹ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا میرا بھی جی بھر آیا۔ افتخار جیسا عزیز دوست اور متحمل مزاج شخص ایسی بے چین حالت میں تھا۔ مگر میں نے ضبط کرکے اُسکو آرام کرسی پر لٹا دیا اور خود بھی اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ میں نے اُس کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے تسلّی دینے کی آواز میں کہا "افتخار تم مجھے کس قدر عزیز ہو۔ بتاؤ تمہیں کیا تکلیف ہے۔ میرا دل تمہیں اس حالت میں دیکھ کر کڑھ رہا ہے" اُسکی ہچکیاں ابھی تک بند نہ ہُوئی تھیں۔ میرے گلے میں اُس نے اپنی دونوں باہیں ڈالدیں "آہ مراد! میری "حبیبہ" ——— میری "حبیبہ" مجھ سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہوگئی"........ مجھے ایسا معلوم ہُوا کہ مجھ پر بجلی گرگئی ہے۔ میرے دماغ میں ایک آگ سی لگ گئی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آئے۔ اب میں حیران تھا کہ دل کا بخار کس طرح نکالوں۔ آنسو بہانے میں افتخار کے کرب اور تکلیف میں اضافہ ہوتا تھا۔ مَیں نے دو منٹ کی خاموشی کے بعد پھر سوال کیا، "یہ حادثہ کب واقع ہُوا؟ مجھے تو اطلاع تک بھی نہیں دی گئی افتخار تم پر واقعی ظلم ہُوا ہے" اُس نے اپنی آنکھیں جن سے بدستور آنسو جاری تھے میری آنکھوں میں ڈال کر بولنا شروع کیا "آہ ظلم سا ظلم۔ میں تو تباہ ہوگیا۔ میری زندگی ایسی افسردہ ہوگئی ہے جس کو

اب دنیا کی کوئی چیز سر سبز نہیں کرسکتی۔ اِس حادثۂ جانکاہ کو برداشت کرنے کی اب طاقت مجھ میں باقی نہیں رہی اس لئے دُنیا میں زندہ رہنا۔ اور آنے والی مصیبتوں کا مقابلہ کرنا میرے لئے بے حد مشکل ہے۔ قدرت نے "حبیبہ" جیسی عزیز ترین شے مجھے دیکر پھر چھین لی۔ آہ مجھ پر ناقابلِ برداشت ظلم کیا گیا۔ کاش میں حبیبہ کی رُوح پرور صحبت ہی سے محروم رہتا۔ اے کاش مجھے حبیبہ جیسی عظیم نعمت ہی نہ ملتی اور میں اُس کی محبت ہی سے واقف نہ ہوتا تاکہ اُس کے ضائع ہوجانے کے دلخراش غم سے بھی پالا نہ پڑتا۔ رات کے خاموش اور منجمد اندھیرے میں "حبیبہ" کی رُوح آکر مجھے بلاتی ہے۔ آفتاب کی آتشیں شعاعوں کے ساتھ "حبیبہ" کی روح آکر مجھے وہ وقت یاد دلاتی ہے جب ہم نے آپس میں کبھی نہ جدا ہونے کا وعدہ کیا تھا "حبیبہ" میرے بغیر بے چین ہے۔ اُس کی بے چینی کو رفع کرنے کے لئے میرا دل تڑپتا ہے۔ میں "حبیبہ" کے پاس چلا جاؤنگا۔ بہت جلد چلا جاؤنگا" افتخار کے غمگین الفاظ میرے دل میں نشتر کی طرح چبھ رہے تھے۔ افتخار جو مایوسی کے عالم میں بھی مسرور رہُوا کرتا تھا اب درحقیقت خشک ہوچکا تھا۔ "حبیبہ" کی جوانا موت سے افتخار پر بہت تکلیف دہ صدمہ ہُوا تھا۔ میں نے پھر پوچھا کہ "حبیبہ کا انتقال

کب ہُوا؟"

"میری پیاری "حبیبہ" کا انتقال؟ ...... تین مہینے ہُوئے جب ہیضہ کی وبا زوروں پر تھی میں نے اور حبیبہ نے ایک روز معمول کے مطابق صبح کا کھانا اکٹھے کھایا۔ میں کچہری چلا گیا۔ مجھے گئے "دو گھنٹے نہ گذرے ہونگے کہ نوکر بھاگتا ہُوا آیا اور اُس نے مجھے اطلاع دی کہ حبیبہ کو میرے بعد قے ہُوئی ہے میرے ہوش حواس جاتے رہے اور سٹ پٹا کر میں گھر کو بھاگا۔ دیکھا کہ "حبیبہ" واقعی بیمار ہے۔ میں نے اُسی وقت ڈاکٹر کو بُلوایا۔ ڈاکٹر نے تشخیص کے بعد کہا کہ مرض تو واقعی ہیضہ ہے مگر حملہ اتنا سخت نہیں اُمید ہے جلد صحت ہو جائے گی۔ میری پریشانی کی کوئی حد نہ تھی۔ میں نے اُسی وقت ایک تار حبیبہ کے والد کو اور ایک اپنے گھر دیا۔ رات کی گاڑی سے دونوں تشریف لے آئے۔ حبیبہ کی حالت پہلے سے اچھی نہ تھی۔ طبی امداد جس قدر ممکن ہو سکتی تھی ہم پہنچائی گئی مگر حبیبہ اچھی نہ ہو سکی۔ آہ میں جانتا ہوں وہ رات میری پیاری حبیبہ نے کتنی تکلیف میں گذاری۔ بار بار وہ میرا منہ تکتی تھی اُس کی نظریں کس حسرت سے پُر تھیں۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر شدتِ مرض نے اُس کو عاجز کر دیا تھا۔ صبح چار بجے روشنی نمودار ہونے سے قبل حبیبہ نے آخری دم ہمارے ہاتھوں میں لیا۔ اور مجھے قریب المرگ اور زندہ درگور چھوڑ کر اپنے پروردگار کی طرف چلی گئی"

افتخار کا ضبط رخصت ہو چکا تھا۔ اُس کے آنسو تھمتے نظر نہ آتے تھے۔ میں نے کہا "تم جانتے ہو دُنیا میں مرگ و زیست کا سلسلہ قایم ہے ہر شئے کو جس کا تعلق سفلی طبقہ سے ہے اپنی مقررہ معیاد کے ختم ہونے پر فنا ہونا ہے۔ دُنیا میں کتنے آدمی مر گئے اور کتنے مر رہے ہیں لیکن پھر بھی دنیا قائم ہے اور ہم زندہ ہیں۔ زندگی کی گھڑیاں پوری کرنے سے پہلے کوئی اپنی مرضی سے موت کو نہیں بلا سکتا "حبیبہ" کی یاد کو اپنے سینہ کی تمام وسعت میں جگہ دیئے رکھو اور جبتک کہ حبیبہ تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہے اپنے تئیں اس قابل بنانے کی کوشش میں مصروف رہو کہ اِس عارضی فراق کے بعد تمہیں اُس سے ایسا دائمی وصال نصیب ہو کہ اُن مسرتوں اور راحتوں میں موت اور جُدائی کا خیال آکر پریشان نہ کر سکے"

افتخار نے ایک سرد آہ بھر کر کہا" یہ عقلی دلائل ہیں ان کو جذبات سے کیا تعلق۔ میری "حبیبہ" اور میں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ حبیبہ میرے انتظار میں چشم براہ ہے وہ زیادہ دیر میری منتظر نہ رہیگی۔ میں اب اُسکے پاس پہنچنے کی بہت جلد کوشش کروں گا۔

اس دنیا کی دلچسپیاں میرے لئے اس وقت سے فنا ہو چکی ہیں جب سے "حبیبہ" مجھ سے چھین لی گئی"

افتخار کا بدن لرز رہا تھا۔ الفاظ اُس کے منہ سے اس طرح نکل رہے تھے گویا وہ اُنکے مفہوم سے بے خبر ہے۔ اگر میں گفتگو کو اور طول دیتا تو یقیناً اُس کی حالت میں اور زیادہ رقت پیدا ہو جاتی۔ رات بہت گذر چکی تھی۔ میں نے یہی مناسب سمجھ کر کہ اب افتخار کو آرام کرنا چاہیئے کہا "اب سو رہیں"۔ وہ بغیر جواب دیئے چار پائی پر لیٹ گیا۔ نیند تو مفقود ہو چکی تھی۔ دو تین گھنٹے جو باقی تھے میں نے افتخار کی پریشانی کے متعلق سوچتے سوچتے کاٹ دئے۔ اگلے روز شام کی گاڑی سے مجھے ایک نہایت ضروری کام کی انجام دہی کے لئے پٹنہ جانا تھا۔ اگر وہ کام بہت ضروری نہ ہوتا تو میں افتخار کو ہرگز نہ چھوڑتا۔ شام کو وہ میرے ساتھ اسٹیشن پر آیا۔ جدا ہوتے وقت کہنے لگا "اپنے افتخار سے آخری بار مل لو ممکن ہے اسکے بعد میرا خیال ہی تمہارے دل میں رہے اور میں نہ رہوں" میں نے اُس کو تسلی بخش آواز میں جواب دیا "ایسی اُمید سوز باتیں نہ کرو۔ چونکہ تم کچھ عرصہ کے لئے انبالہ ہی میں رہو گے اس لئے میں واپسی پر تمہیں یہیں ملوں گا" اُس نے آہستہ آواز میں کہا "خدا ایسا ہی کرے"

مجھے پٹنہ میں ایک مہینے سے زیادہ قیام کرنا تھا۔ ہر وقت افتخار کا خیال میرے دماغ میں رہتا تھا۔ اُس کی طبیعت کا سکون غائب ہو چکا تھا۔ اور مجھے ڈر تھا کہ اس مایوسی اور وارفتگی کے عالم میں وہ کچھ کر نہ بیٹھے۔ پٹنہ میں مجھے تین ہفتہ ہو چکے تھے۔ ایک روز جب میں باہر سے آیا تو نوکر نے ایک ملفوف خط میرے حوالے کیا۔ یہ خط افتخار کا تھا۔ بڑا مختصر تھا مگر اُس کے اختصار نے میرے حواس معطل کر دئے۔ میرے دل و دماغ میں ایک آگ سی لگ گئی۔ لکھا تھا۔

"دو بڑی کوشش کرتا ہوں کہ تمہارے درمیان میں رہ کر کھوئے ہوئے اطمینان کو حاصل کر لوں مگر ہر قدم جو آگے اُٹھاتا ہوں مجھے ایک ایسے مہیب اور خطرناک غار کی طرف لئے جاتا ہے جس کا تصور ہی یقین دلا رہا ہے کہ اطمینان کا حاصل کرنا اسی میں ہے کہ اپنی کوششوں کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دوں۔ میں اگر تم میں رہا بھی تو تمہارے ایامِ حیات کو غمگین بنانے کے لئے میرے حواس زائل ہو چکے ہیں . . . . . .

"حبیبہ" دونوں ہاتھ پھیلائے مجھے لینے کے لئے تیار کھڑی ہے۔ "حبیبہ" کے ملاپ پر میں ہزاروں زندگیاں قربان کرتا ہوں۔ میری رہائی اب کسی سے ممکن نہیں۔ تم سے ملنے کا آرزومند ہوں مگر مل نہیں سکوں گا۔ میرے لئے دعا مت کرو

کہ اب دعا کا وقت گذر چکا ہے۔ تمہاری زندگی خوشگوار ہو۔ میرے خیال کو بھلا دو کیونکہ اب اُسکا رکھنا فضول ہے۔ یہ خط میری محبت اور عقیدت کی آخری قسط ہے۔ خدا تمہارے ساتھ ہو۔ الوداع ......

تمہارا افتخار

اس خط کے ملنے کے پانچویں روز بعد میں اپنے کام کو نامکمل چھوڑ کر واپس انبالہ لوٹا اور سیدھا افتخار کے مکان پر گیا تو معلوم ہوا کہ آج چار روز ہوئے وہ شام کے وقت سیر کی غرض سے باہر گیا تھا اور پھر واپس نہیں آیا۔ اُن تمام مقامات پر جہاں اُس کا جانا گمان کیا جا سکتا تھا میں گھنٹوں اُس کی تلاش میں سرگرداں رہا ہوں مگر کچھ پتہ نہیں چلا۔ اُس کے باقی دوستوں نے جنکو وہ میری طرح عزیز تھا اس تلاشِ لاحاصل میں کچھ کمی نہیں کی مگر افتخار اب ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ ہم سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو گیا ہے۔

آہ! افتخار تم کہاں ہو؟ - اگر ابھی پیکارِ حیات میں وار کرنے اور وار کھانے کے لئے زندہ موجود ہو تو آؤ ہم پر وار کرو کیونکہ ہماری زندگی کی لذت بھی تمہارے وار کھانے ہی میں ہے۔ اگر ابھی دنیا کے اِس بے پایاں شور و غل میں تم حیات میں موت کا مزا چکھ رہے ہو تو آؤ ہماری انتہائی کوششیں تمہارے لبوں پر تبسم - تمہاری آنکھوں میں نور اور تمہارے دِل میں سرور پیدا کرنے پر خرچ ہونگی۔ اور اگر تم حیات کی قید و بند سے آزاد ہو چکے ہو تو خدا کرے تمہاری روح کو ابدی راحت نصیب ہو۔ ہماری دعائیں تم تک پہنچتی رہیں۔ تمہاری روح جو دنیاوی اطمینان سے مایوس ہو کر گئی تھی خدا کرے اپنی "حبیبہ" سے مل کر ایسا اطمینان حاصل کرے کہ دنیا کے لاکھ اطمینان اُس پر قربان ہوں۔ آمین!

عاشق حسین بٹالوی

مجھے یقین ہے کہ اگر میں نہیں تو میرے بعد آنیوالے بچے ضرور اس دن کا منہ دیکھینگے جبکہ سائنس کے ابتدائی قاعدوں اور اصولوں کی لاعلمی مذہبی قوانین اور اصولوں کی لاعلمی کے بعد سب سے بڑی کمزوری تصور کیجائیگی۔ (سی کنگز لے)

جستجو اور معنی:۔ سائنس کا کسی خاص قسم کے خیالات کا پابند ہونا اُسکے لئے خودکشی ہے۔ (ہکزلے)

ایک صدی کی فلاسفی آئندہ صدی کی فہم عامہ بن جاتی ہے۔ (ایچ۔ ڈبلیو۔ بیچر)

ریاض احمد بی اے انبالوی

ندرتِ ذوق و نظر

(۴)

مظہر، رشید کا اک ایسا مزاجدان اور ادا شناس دوست ہے کہ قدرت بہت کم، خوش نصیبوں کو ایسے دوست عطا کرتی ہے، متین ہے شائستہ ہے ظریف بھی، اسی کو اس بات کا جملہ احباب میں فخر حاصل ہے کہ رشید اس درجہ وحشت و رمیدگی کے باوصف اکثر اور گھنٹوں اُس کے پاس بیٹھا رہتا ہے، اُس کے مزاج میں اگر کچھ درخور حاصل ہے تو مظہر ہی کو، اگر کسی کو اُس کی طبیعت کے آداب سے واقفیت کا دعوےٰ ہے تو مظہر ہی کو،

پچھلے دنوں میں ایک مرتبہ رشید کو پھر چپ لگی، احباب پر رشید کی خموشی کی طوالت اور شدت بے حد شاق گذر رہی تھی مگر تدبیر کسی سے کچھ بن نہ پڑتی تھی، آخر مظہر ہی کو مجبوراً مائلِ سعی کیا اور وہ کامیاب ہُوا ۔

اُن ہی دنوں میں سے ایک دن، ابھی رشید، مغموم و دل ریش کہیں سے آیا، اور ابھی آ کے بیٹھا ہی تھا کہ مظہر نے کہا" رشید! افسوس کیجئے مجھے میرے بزرگوں سے نوید ازدواج ملی ہے، میں جانتا ہوں اس خبر سے تمہیں الم ہی ہوگا مگر شاید تمہارے ملال میں یہ سُن کر کچھ کمی واقع ہو کہ صنفِ لطیف و نازک کے جس فردِ کو میری مسرت کی شرکت کے لئے منتخب کیا ہے وہ یکسر حسن اور مجسمۂ نسائیت ہے، مجھے تمہارے اتباعِ تجرّد کے ترکِ عمل سے شرمندگی ہوگی، اگرچہ اختلاف نہیں۔ مگر کیا کروں اعزا کے حکم سے انحراف کی مجھے قطعاً جرأت نہیں ہوتی، رشید بتاؤ کیا کروں ——"

ہم سب نے دیکھا رشید بیتاب ہوگیا، اُس نے پہلے حیرت سے مظہر کو دیکھا اور پھر نہایت مایوسی کے ساتھ بولا —" ہائے کیسا عبرت خیز زمانہ آگیا کہ نسائیت اور عصمت دنیا پر وبال ہوگئی، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حُسنِ نسائیت، اور جمالِ دوشیزگی، اپنی مثال فردوس کے گوشوں میں تلاش کرے، دنیا اب شاید اس نوع کی تہذیب و تحسین کے جواب سے عاجز ہوجائیگی! مظہر، تمہاری شادی کیجاتی ہے اور کہتے ہو اک عفیفہ تمہارے لُطفِ ازدواجی کے لئے منتخب کیجا چکی —— میں نے تم کو پیکرِ وقار تعقل سمجھا تھا، سُنایا جاتا ہے لڑکی بھی مجسمۂ جمالِ نسائیت ہے، مگر حیف کہ نہ تم سے نسائیت کا احیا، ممکن ہُوا، اور نہ لڑکی سے ایثار شباب و دوشیزگی بن پڑا، تم خیال کی لذت سے مغلوب اور وہ ذکی الحس ہونے پر بھی خاموش، ہائے کیا غضب ہے ——"

ایک حور آسمان سے بہ کمالِ رعنائی، زمین پر اتری

اور اس مادیت آبادِ ارضی سے ذرا اونچے ہی اونچے معلق ہو کر رہ گئی، اُس کا نام اِس عالم میں نسائیت ہُوا تھا، اور یہ شے عام سطحِ عورت سے اک بلند تر چیز تھی، لیکن اب دیکھا جا رہا ہے کہ شاید حُسنِ نسائیت اس دُنیا سے رخصت ہو جائیگا اس لئے کہ اُس کے پرستار اُس سے نہایت بے اعتنائی کے ساتھ افسوس کہ مُنہ موڑنے لگے!"

جمالِ عصمت و دوشیزگی جو استعمالِ غیر سے بیگانہ و اجنبی ہے اپنی طہارت عزیز دلفریبیوں کے ساتھ اس عالمِ ویران کی زینت ہُوا تھا مگر حیف کہ اب عنان گیر لذت ہو رہا ہے، اس لئے کہ دُنیا میں درندگی و بہیمیت کا دور دَورہ ہے ——"

مظہر! اس نوع کی پاسمائی نکہت سے تمہارے ذوق کی جراحت کا سامان فراہم ہوگا، اور یاد رکھو عمل کی اس لغزش سے تم اپنی رُوح کی شگفتگی کو گنوا بیٹھو گے اور پھر ساری عمر تلاش کروگے مگر یہ شے میسر نہ آئیگی!

آج وہ غریب لڑکی، اپنے حُسنِ لطافت اور وقارِ صنمیت کو ضائع کر رہی ہے مگر زندگی کے آنے والے دَور میں جب وہ امن و شاہزادگی کو اپنے ساتھ نہ دیکھیگی تو محسوس کریگی کہ اُس نے کیا چیز کھو دی ——!!

مظہر نے دیکھا کہ رشید اب محوِ جذبات و تقریر ہو گیا اور ذوقِ گویائی اُس کی ہر ادا سے ظاہر ہونے لگا تو اُس نے عمداً ایسے عنوان کی جانب رشید کو دعوتِ تکلم دی، جو اُس کے جاذبیتِ ذوق کا اور لطفِ سخن سرائی کا واحد ذریعہ ہے۔

مظہر نے کہا، رشید! ہماری نادانیوں پر دل نہ دُکھائیے، اگر ہم آپ سے کچھ دریافت کریں تو ہمارے استفسارات کے جواب میں آپ اک خندۂ مضحک نہ ہو جائیں، ہم بے وقوف سہی اور سب کچھ، مگر اصولاً آپ اپنی تقریر کے وضوح پر مجبور ہیں، معاف فرمائیں اگر ہم آپ سے یہ کہیں کہ ابھی ہم نسائیت اور عورت کے اُس خاص فرق و امتیاز کو نہیں سمجھے جو جناب کے وظائفِ ادبی کا اک جزوِ غیر منفک ہے، صورت یہ ہے کہ کسی سنگین ستون، کسی قامتِ چوبین کو اک رنگین، ریشمی ساڑھی باندھ دیجئے آپ بیتابِ جذبات ہو جائینگے اور فوراً آپکی ادبیت کی سرکار سے پیکرِ نسائیت کا پاکیزہ خطاب عطا ہو جائیگا ——"

موسمِ برشگال ہے، گھنگھور گھٹائیں ہیں، میں نے بارہا دیکھا ہے، سُنا ہے کہ آپ کسی سبزہ زار سے گُذرے ہیں، آپ نے قدرت کی محبوب ترین مخلوق تیتریاں اُڑتی ہُوئی دیکھیں، اور آپ پر قیامت چھا گئی، مست ہیں پُر کیف ہیں اور بقولِ خود۔ رقصِ نسائیت دیکھ رہے ہیں!"

آپ ٹہلنے جا رہے ہیں اور میں معیتِ سفر سے مشرف ہوں، اب جناب کا لکا سے جو کھڑکی سے منہ باہر نکال کر بیٹھے تو چھ ساڑھے چھ گھنٹے کال ہٹ گئے

نہ کچھ منہ سے بولتے ہیں اور نہ مجھے دیکھتے ہیں، بات کیا نکلی کہ گاڑی جب گھوم پر مڑتی ہے، جب قینچی پر آ کر کٹتی ہے تو حضور کو رفتار کا یہ انداز بہت لطف دے رہا تھا، قہرمانِ دخانی کی یہ موجِ خرام، جناب کے خیال میں آتشیں پھول کتر رہی تھی، پوچھا کیوں صاحب! کیا اس میں بھی نسائیت کا دخل ہے تو ارشاد ہُوا ہاں اس میں تو نسائیت کا بہت ہی دخل ہے!"

سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ کے دروازے میں کوئی یورپین لڑکی اپنے دونوں ہاتھوں سے دروازے کے بالائی حصے کو اک لا او بالیانہ انداز سے تھامے کھڑی ہے، حضور ہیں کہ اِدھر اُدھر اُس کے یوں ہی سگرٹ جلاتے اور دھواں اُڑاتے پھر رہے ہیں، پوچھا جاتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے دیکھو یہ ہے استغنائے نسائیت ــــــ!"

مصوری میں شملے میں کوئی لیڈی رائڈنگ ڈریس میں گھوڑے پر سوار ہے اور گھوڑا تیز رفتار سے پہاڑ کے نشیب و فراز کو طے کر رہا ہو اور اُس سے نسوانی ساخت کے اقتضاء سے سوار کے جسمِ نازک میں کچھ لوچ اور لہر پیدا ہو رہی ہو، جناب ہیں کہ مِٹ رہے ہیں۔ کبھی دفارِ رواں کہتے ہیں کبھی ارتعاشِ شعاع کہتے ہیں، کبھی جنبشِ شاخسار فرماتے ہیں اور کبھی ترنمِ موج ــــ آخر یہ نسائیت ہے کیا بلائے بے درماں؟

میرے خیال میں تو رشید تمہارے التفاتِ نظر اور انجذابِ ذوق کا کوئی خاص معیار نہیں ہے کبھی تو نسائیت اور عورت بالکل مترادف المعنیٰ بتاتے ہو اور کبھی اُس کا علو ہمسرِ ملکوتیت ہے، کبھی اُسکو سراپا اک لذت قرار دیدیتے ہو اور کبھی یکسر نکہتِ گل، کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ مرد کی آغوش میں اُس کے لئے ایک گدگدی پیدا کرنا چاہتے ہیں اور کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ نہیں جنسِ کرخت کی پیشانیوں کو اُس کے حضور صرفِ سجدہ ہوجانیکی تعلیم ہے ــــ"

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا کبھی اس عالم میں نسائیت اور عورت کا امتزاج خمیر ہُوا ہے ــــ؟ اور اگر ہُوا ہے تو کیا وہ برکت ازدواجی سے محروم رہی ہے؟"

ایسی نسائیت جس کو درجۂ ملکوتیت تک آپ سراہتے ہیں اور جس کی پرستش، پرستش کی تحریک و تبلیغ آپ نے اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے رکھا ہے، کیا بتا سکتے ہیں کہ آپکی یہ سعی، فطرتِ صالحہ کے خلاف نہیں ہے، اور اس سے منشائے تخلیقِ نسوانی کی توہین تو نہیں ہوتی ــــ"

ایسی عورت جس میں نسائیت کا عنصر غالب ہو آپ کیوں اُس کے واسطے مسرتِ ازدواج جائز نہیں رکھتے۔ حالانکہ اک نسائیت سے معمور مظہرِ لطافت عورت آپ کے نزدیک محبت کے قابل ضرور ہے، پھر محبت کے پاکباز انہ مقاصد بغیر عقد کئے، کسی

شریف عورت سے کوئی مرد کیونکر حاصل کرسکتا ہے"؟!

رشید حقیقت یہ ہے تمہارا عروج نظر امکان وسعی کی حد سے بالاتر ہے آپ دیکھتے اُس کو ہیں۔ جہاں سے ہمیشہ نظریں تھک تھک کر مایوس ہو ہو کر لوٹ آئیں۔ کہتے آپ اُس سے ہیں کچھ، جو یا تو سنتا ہی نہیں، یا اگر سنتا ہے تو کم سے کم آپکی آوازوں کو قابلِ التفات نہیں سمجھتا، اگر ایسی ہی اچھوتی دلکشی کا نام نسائیت ہے کہ جو کبھی میسر ہی نہ آسکے تو یقیناً آپ جیتے اور ہم ہارے نہ کبھی یہ کسی کو نصیب ہوگی اور نہ آپ کے مقرر کردہ معیارِ نسائیت کا کبھی تجزیہ ہوگا ——"

مظہر تم نے خوب کیا جو میرے سکونِ فراغت کے درپے غارت ہوئے، تم نے اچھا کیا جو میرے جذبات کی بیکسی و مایوسی سے تمسخر و استہزا برتا، مجھے تو اس دنیا کے ہر گوشے سے بوئے بیگانگی آتی ہے۔ دوستوں کی اجنبیت سے اگر لطف اندوز نہ ہوتا تو اک نوع کی لذت سے محروم جاتا، خدا کا شکر ہے مجھے تمہارے ہی خوانِ کرم پر دعوۂ رسوائی عطا ہوئی، شبانہ روز کی یکجائی، ایسا قرب و اتحاد۔ اُس پر کچھ آپکی جانب سے ایسی جراحت ریز نمک افشانیاں واللہ میرے زخموں کا منہ نہیں جو اظہارِ شکریہ کرسکیں"

حقیقت ہیں، میرے ہم خیال، میرے ہم نوا اگر اس دنیا میں مجھے ڈھونڈے نہ ملیں تو مجھے قطعاً متاسف نہیں ہونا چاہیئے۔ میرے ہذیانِ محبت کو اگر جماعتِ انسانی کے بعض خوش مذاق افراد مہمل کہیں تو مجھے ہرگز متالم نہ ہونا چاہیئے اس لئے کہ قدرت نے نعمتِ بصیرت و بصارت کے خزائن کو وقفِ عام نہیں کیا ہے، مجھے کب آرزو ہوئی کہ جو کچھ میں کہوں اسکو آپ لوگ باوجود سعی و کوشش کے، سمجھتے چلے جائیں۔ مجھے ہی اسکی کب تمنا ہے کہ میری لطافتِ حس آپکی بے بہرہ شانِ تعقل کا طواف کرتی پھرے، ہر چند کہ تم سے اب نزاکتِ ذوق و فہم کی توقع تو قطع ہو چکی ہے مگر میں احیائے حقیقت کے لئے عجز کا الزام برداشت نہیں کرونگا آپ کے اعتراضات اور تلمیحات کے لایعنی انبار میں سے کچھ بھی نظرانداز نہ کرونگا اور اک اک بات کا جواب دونگا"

آپکا عنوانِ مزخرافات، نسائیت اور عورت کے فرق و امتیاز کی دریافت ہے، ایسے لوگ جو شاخوں پر سے شاداب پھولوں کو بلا تکلف توڑ لیں اور مٹھیوں میں بھینچ کر سونگھنے کھڑے ہو جائیں، اُسکے مقابلے میں، جو شاخ ہی پر پھول کی شادابی و شگفتگی کو دیکھتا ہے اور گھنٹوں اُس کے طلسمِ رنگ و بو پر غور کیا کرتا ہے، کیا حق حاصل ہے جو دعوائے خوش مذاقی کریں۔ نازک ترین سوالات کرنے سے آدمی خوش فعق نہیں بن جاتا۔ اُس میں لطافتِ حس ہونی چاہیئے۔

تم خود غور کرلو دنیا میں واثر و نئے عمل کے کس قدر نقوش ہیں
اور کس کس سے متعلق ہیں، تم نسائیت اور عورت کا
فرق دریافت کرنے ہو۔"

مظہر: نسائیت اک آئینہ ہے کہ جسکو ہم دیکھتے
اور لطفِ نظارہ اُٹھاتے ہیں مگر اُس میں ہمارا عکس مرتسم
ہوکر رہ نہیں جاتا۔ بخلاف اس کے عورت بالکل
بلاٹنگ پیپر کے اسلوب پر واقع ہوئی ہے کہ ذرا
سے اتصال پر تمام نقوش مادی اُس میں منتقل ہوجاتے
ہیں ـــــ نسائیت، اک ساکن سطحِ آب ہے مُصفا،
ہم جس میں عکس پذیر ہوسکتے ہیں مگر دامن تر نہیں ہوسکتے،
برعکس اس کے عورت سراسر بارانِ لذت و اتصال
ہے کہ آدمی کو تردامن بنا دیتی ہے ـــــ!!"

اگر تم اپنے ذہن میں اس نازک سے فرق کو محفوظ
کرلوگے تو کبھی پھر تمہارے ذوق کو شبہ سے واسطہ
نہ پڑیگا ـــــ دیکھو،

تم نے اپنی دانست میں میرے ذوق کا یہ کہکر
مضحکہ اُڑایا ہے کہ کسی سنگین ستون، کسی مجسمۂ چوبین کو
ایک رنگین ساڑھی باندھ دی جائے تو میں اس کو
پیکرِ نسائیت کہدیتا ہوں، مجھے بھی اس سے انکار نہیں
بیشک یہ صورت پیکرِ نسائیت ہی کہنے کی سزاوار ہے
شک ہے میں نے کبھی مجسمۂ عورت تو نہیں کہدیا ہے
پیکرِ سنگین، مجسمۂ چوبین اپنے اندر مفاسدِ مادیت نہیں
رکھتے پس لباس کی قطع، کپڑے کی وضع اور رنگ
کی نزاکت باقی رہی، اگر ریشم اور رنگ کی ترکیب کو
میں نے اسٹیچو، پر دیکھ کر پیکرِ نسائیت کہدیا تو کیا
ظلم کیا۔ بسا اوقات یہی ملبوس، یہی رنگ، یہی ریشم جب
کسی خاص جسم پر دیکھے جاتے ہیں، تو عنوان بدل جاتا
ہے، اسکو تزئین اور عورت، عورت اور امارت کہا
جائیگا۔ پیکرِ نسائیت نہیں، افسوس پیکرِ نسائیت کہنے
میں جو میرے طہارتِ ذوق کی رعایت تھی اُس کی
تم نے ذرا پروا نہ کی!"

برسات کے موسم میں گھنگھور گھٹائیں ہیں اور
رنگین تیتریاں باغوں میں، سبزہ زاروں میں اُڑتی پھرتی
ہیں، میں قوس قزح کے اس نیرنگ کو اور کرن کی اس
جھمک کو اگر رقصِ نسائیت سے تعبیر کرتا ہوں تو تم میرا
منہ کیا تکتے ہو، اپنا سر پیٹو۔ اپنے ذوقِ محاکات کا
ماتم کرو۔ تم نے آجتک نسائیت کو عورت سے علیحدہ
کرکے دیکھنے کی، سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی، رنگ
اور ارتعاش کے اس مجموعے کو رقصِ نسائیت کہنا
جس بلاغتِ ذوق کا شیوہ ہے افسوس اُس کی
تم کو ہوا ہی نہیں لگی ـــــ"

اگر گاڑی کا پیچ وخمِ رفتار، مجھے بھاتا ہے اور
میں خرامِ نازنے کے لوچ سے اس کو عبارت کرتا ہوں
تو آپکو اچنبھا کیوں ہے، کاش تمہاری نظر سے
رفتار کی کچھ نزاکتیں گذر لیتیں۔

سیکنڈ کلاس گاڑی کے دروازے میں اک

تمثالِ حسن یورپ کو دیکھا کہ دروازے میں دونوں ہاتھ
اُٹھائے کھڑی ہے اور اِدھر اُدھر دیکھ رہی ہے۔ میں نے
لاریب کہ اُسکے حسنِ تماشا زا کو دیکھا، تم سگرٹ کو سُلگاتے
دُھواں اُڑاتے پھرتے رہے۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ
تم حسن کے حضور نمائشِ ملبوس و امارت اور نشرِ ہوس
و انگریزیت کر رہے ہو۔ میں نے اگر اس عدمِ التفات و
توجہ کی علت غائی کو پوچھا اور اُس کو وقارِ نسوانی اور
استغنائے نسائیت کہا تو کیا غلط کہا ؟"

میں نے اُسکی آنکھوں کی کیفیتِ احتراز و
استکراہ کو دیکھا یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ تو سخن سرا ہیں اور
کہہ رہی ہیں کہ ہم پیمانۂ حور ہیں ہم ساغرِ ملک ہیں
اے مادیت پرست تیرے لب و حلقوم کی تشنگی کہیں اور
جا کر رفع ہو، میری عرضِ استغنائے نسائیت کا تو یہ
خلاصہ تھا تم کیا سمجھا ــــــ"

عورت جب گھوڑے پر سوار ہوتی ہے۔ تو
پھر وہ عورت نہیں رہتی۔ اُسکی تبدیلیٔ ہیئت و لباس
اس حُس کا بھید ہے کہ وہ اس وقت مادیت نسوانی
سے بیزار و گریزاں ہے، مظہر غور فرماؤ خدا کے لئے
سمجھو، عورت جب اپنی خلقت کے مقصدِ مادی
سے علیحدہ ہوگئی تو پھر وہ یکسر نسائیت نہ ہوگئی تو کیا
ہوئی۔ آہ وہ وقار رواں ہے ضیاء اور برق کی تڑپ
اجمل ہے، کوئی شک نہیں وہ ارتعاشِ شعاع ہے۔
نسیم اور نکہتِ گل کے اتحاد کو شاخسار کی
اک جنبشِ بے اختیار ہی کہا جا سکتا ہے نسوانی تخلیق
کے سیلاب لطافت میں یہ عقدہ ہائے یاسمینی ترنم
موج و حباب ہی کے سے پاکیزہ عنوانات کے
حقدار ہیں ــــــ"

مظہر! تم تو شاید یہ چاہتے تھے کہ سنگین ستونوں
اور چوبیں مجسموں میں سے کسی عنوان سہی عورت
پیدا کیجاتی ــــ تیتری کے عُریانی رقص کو لذتِ
مادی قرار دیا جا سکتا ــــ "ریل کے دروازہ میں
عورت کو دیکھا، اُس کے عدم التفات کو کیوں نہ غمزۂ
دل طلب ثابت کیا"، شملہ ریلوے لائن کے پیچ و خم میں
نسائیت کا ذکر عبث ٹھیرا، آرزو تو یہ تھی کہ محض انجینرنگ
ترقی اور میکانیکل فروغ کو سراہا جاتا ــــــ"

صنفِ نازک کے کسی فرد کو گھوڑے پر سوار دیکھ کر
مجھے نسائیت کے بیان کا کیوں موقع ملا ــــ"

حالانکہ مظہر میں نے بارہا کہا ہے کہ نسائیت۔ اور
عورت کے فرق کو ہر لحہ ملحوظ رکھو مگر تم نے ہمیشہ
تنزلِ مادی اور علو روحانی کی طنابیں ملانی چاہئیں ــــ
چوبین مجسموں پر ساڑھی کی زیبائش کو میں نے پیکرِ نسائیت
کہا، اچھا تم ہی کہو کیا ستون سنگین سے تم شادی
کر سکتے ہو ؟

تیتریوں کے اُڑنے، اُلچنے کو رقصِ نسائیت کہا
پاکیزگیٔ ذوق کا یہی اقتضاء تھا، مجھے بتاؤ نیرنگِ لون
سے مناکحت کر لوگے ؟ ریل کے پیچ و خم میں میں نے

نسائیت محسوس کی حقِ محاکات ادا کیا، تم اسکی تردید کر سکتے ہو مجھے اسی خم و پیچ محض سے تعلقِ ازدواج کر کے دکھاؤ؟ جب یہ چیزیں مجبور ازدواج نہیں ہیں تو پیارے دوست! میں حقِ اظہارِ نسائیت سے عہدہ برا ہو گیا! سیکنڈ کلاس گاڑی کے دروازے میں کسی لڑکی کے تہذیب نظارہ اور اندازِ تماشا کے لئے اگر میں نے استغنائے نسائیت کا عنوان تراشا تو آپ کو غور کرنا چاہیئے تھا کہ میں نے اُس لڑکی کی کونسی جمیل جس کو اپنے عنوان کا ماخذ ٹھیرایا میں نے لڑکی کے دیکھنے کی ادا کو مستقل اک شے فرض کیا اُس کی حس کی بلندی کو علیحدہ اک جسم دیا۔ اور اُسکے تمام مادیت معمور اثاثۂ شباب میں سے میں نے صرف اُس وقت اُسکی اُس ادائے سادہ و پاک کو لیا، جس میں حقیقتہً تمہارے اضطرابِ شباب کے مقابلہ میں سچی نسائیت و ملکوتیت پیدا تھی۔ اس لئے میں نے بالکل صحیح طور پر اُس کے دیکھنے کو، اس طرح دیکھنے کو کہ وہ کسی کو بھی نہیں دیکھ رہی تھی، دیکھا۔ دیکھنے والے اُس کے سارے متاعِ حسن و شباب کو دیکھ رہے تھے مگر اس سے غافل تھے کہ یہ لڑکی، حُسن کا یہ سب کچھ ہوتے ہوئے ابھی وہ اور کچھ اگر ہے، تو کیا ہے ——،

عین اُس وقت جبکہ موجودہ سب کچھ سے الگ، وہ کچھ اور تھی، میں نے دیکھا اور وہ اُس کا صرف یہ سادہ و بے لوث دیکھنا تھا — کہ جسکو یکسر استغنائے نسائیت ہی کہا جا سکتا ہے اور کچھ نہیں"

میں نے شملہ میں مصوری میں اگر کسی لیڈی کو گھوڑے پر سوار دیکھ کر چند مقدماتِ ادبیہ کے تحت میں اُسکو وقارِ رواں، ارتعاشِ شعاع، جنبشِ شاخسار ترنم موج کہا۔ تو بالکل صحیح کہا۔ ان میں سے کسی میں بھی اگر مادیت کی گنجایش ہے تو مجھے جھٹلا دو ——،،

کیا کہا! نسائیت ہے کیا بلائے بے درمان"

ہاں ایسے مرمریں بت جو گدازِ حس سے محروم ہیں۔ ایسے پہلو انسانیت کے جو دھڑکن کے مفہوم سے نا آشنا ہیں۔ ایسی آنکھیں جو نم محبت سے ناواقف ہیں وہ دارفتگانِ زلیست کے وظائف کو ہرگز نہیں جان سکتیں۔ دل کے دُکھ جانے کا معاملہ وہ دل نہیں جانتے جو کبھی ٹوٹے نہ ہوں، حیاتِ یاس والم کی کیفیات وہ زندگیاں نہیں سمجھ سکتیں جو تنعم و تعیش سے علاقہ رکھتی ہیں، نسائیت وہ داروئے غم ہے جس کی تلاش میں کائنات کا ذرہ ذرہ بیتابِ جستجو ہے۔

یہانتک جواب تھا آپکی تقریر کے اُس حصہ کا جسکو محض لطافتِ تخیل کہا جا سکتا ہے اس سے آگے آپ نے معتقداتِ مذہبی سے کام لیا ہے۔ اور افسوس اس نوع کی سنجیدگی کا احترام میں اپنی خاموشی سے بجالاؤنگا —— تاہم اعتقادی جذبہ کو ٹھیس پہنچائے بغیر جس قدر مجھ سے ممکن ہے عرض کرونگا۔

آپ میرے التفاتِ نظر و انجذاب ذوق کا
کوئی خاص معیار تسلیم نہیں فرماتے مگر آپکی تقریر کا ہر جزو
میرے افکار و اجتہاد کی اہمیت کو تسلیم کر رہا ہے۔ آپ
کہتے ہیں تم نسائیت اور عورت کو مترادف المفہوم قرار
دیتے ہو اور کبھی اُسکو ملکوتیت کا ہمسر۔ آپنے مجھے
دھوکا دینا چاہا ہے یا خود آپکو فریبِ التباس نصیب
ہُوا، میں یہ کہتا ہوں کہ بیشک نسائیت کا بہترین امن
مسکن عورت کی ذات ہے، اور نسائیت کی نمایش
کا اعلیٰ ذریعہ قدرت نے عورت کی تخلیق میں پیدا کیا
ہے، لیکن پھر عورت ہی کو نسائیت کا مظہرِ اتم قرار
دیدینا جائز نہیں، کبھی میری توصیف، نسائیت کے
لئے درجہ ملکوتیت منجر ہے تو یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے۔
اکثر نسائیت اس درجہ سے اوپر گذر گئی ہے، جب انسانی
ملکاتِ روحی قوی ہو جائینگے، ابن بشر کے لئے یہ مرتبہ
دُور نہیں کیسا لغو و بے سر و پا اعتراض ہے ــــ،،

پھر یہ کہنا کہ میں کبھی اسکو سراپا لذت کہتا
ہوں اور کبھی یکسر نکہت گل۔ یقیناً صحیح ہے۔ وہ
لذت ہے بہر نوع چاہے خیال کی ہو چاہے عمل کی
وہ نکہتِ گل ہے۔ بلا شک۔ اُس کی ساخت نزہت
طلب بھی ہے اور اُسکی حیات عطریت پاش بھی

آپ مجھے الزام دیتے ہیں کہ میں اُسکے لئے
مرد کی آغوش میں گدگدی پیدا کرنا چاہتا ہوں اور کبھی
انسانی پیشانیوں سے سجدے کرانا ــــ،،

مظہر، مسلمات پر گفتگو کرنے کے لئے مبادیات
مسائل کا بیان کرنا ناگزیر ہے، مسئلہ کو ممکن الفہم بنا کے
جب نسائیت کی تشریح کیجائیگی تو عورت مبادی بحث
ٹھیرے گی، چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ اب بعض کوتاہ اندیش
نسائیت کی ایسی حیثیات کو جو عورت میں پیدا ہیں،
مجھ سے سن کر اپنی آغوش میں گدگدی محسوس کریں
تو میرا اس میں کیا قصور؟ مگر میری تقریر جب اس
درجہ سے گذر جاتی ہے تو صرف بندگی اور پرستش
کا مفہوم باقی رہ جاتا ہے، اور مجھے اس گذارش
سے چنداں شرمندگی نہیں ــــ،،

آپ پوچھتے ہیں دُنیا میں کبھی نسائیت اور
عورت کا امتزاجِ خمیر ہُوا ہے، اور اگر ہُوا ہے تو
وہ مسرت ازدواجی سے کیا محروم رہا ہے ــــ،،

بیشک قدرت نے ایسی مخلوق بھی پیدا کی
تھی اور پیدا ہے مگر اُس کا دائرۂ عمل واثر ہمیشہ ممتاز
و ممیز رہا ہے۔ تم تاریخ کے صفحے پڑھو۔ تم کو
ضرور معلوم ہو جائیگا کہ اتنی عورتیں گذری ہیں اور
اتنی نسائیت تمثال ہستیاں جلوہ دے گئی ہیں،
کبھی انکارِ مادی نسائیت پر غالب نظر نہ آئینگے عورتیں
جذبۂ مادی سے متاثر گذر گئیں وہ قابلِ ذکر نہیں نسائیت
تمثال ہستیاں پرستیدۂ عالم ہو کر رہی ہیں۔ اور دُنیا
اُنکو ابھی تک یاد کرتی ہے، پوجتی ہے، اُنکے مجسّمے
مورتیاں موجود ہیں ــــ اُنکی شادیاں ہُوئیں یا نہ ہُوئیں

یہ افسانہ طلب داستان ہے۔ شادی فقدان نسائیت
کے لئے لازم نہیں۔ امکان ہے ایسا بھی ہُوا
ہو۔ مگر نسائیت کی تکمیل عروج روحانی کی مقتضی
ہے ضرور۔ اس کا فیصلہ سہل نہیں پھر اعتقادی
گفتگو شروع ہو جائیگی۔ جو نامناسب ہے۔۔۔"

مجھ سے ارشاد ہے، نسائیت کی پرستش
پرستش کی تبلیغ کئے جارہے ہو کیا فطرتِ صالحہ
کے اور منشائے تخلیق نسوانی کے یہ خلاف تو نہیں ہے؟"

مظہر! فطرتِ صالحہ نہیں چاہتی کہ دنیا کو
مجموعۂ لذات بنایا جائے علم الٰہی کی تحصیل اپنی ذات
کے عرفان سے شروع ہوتی ہے انسان کی اپنی کائنات
اک مشتِ خاک۔ اُس خمیر میں یہ مفاسد جنم لیں
، اللہ۔ اللہ کن آلایشوں میں مبتلاء ہونیکی تحریک
کو اقتضائے فطرتِ صالحہ قرار دیتے ہو۔ یہ
بوقلموں التباس ہے یہی جگہ تو تدبر اور تفکر کی ہے
منشاءِ تخلیق نسوانی کی اک کہانی تو وہ ہے جس سے
جدامجد آج تک متہم ہیں۔ دوسری کہانی تفریق قبائل
کی ہے جو دوسرے ہی دور انسانی میں مرتب ہوگئی
تھی کوئی اور قصہ باقی ہو تو حضور سُنا دیں۔۔۔"

تاہم مظہرِ انفاسِ قدسی زمین پر موجود ہیں
اب بھی حوریں زمین پر جمالِ ظاہری و باطنی سے
جلوہ گر ہیں۔ فرشتے انسانوں میں ابھی جنم لیتے ہیں
تم خدا کی عظمت کو اپنے عقل کے پیمانے سے
کیوں ناپتے ہو۔ سب طرح کے لوگ دنیا میں ہیں
تعجب نہ فرمائیے۔

آپ کا خیال ہے شاید اشتراکِ جنس کے
اختلافِ عمل سے انسان مشرک ہو جاتا ہے۔
حالانکہ بات یہ نہیں ہے اور اگر آپ خاص اِسی
مسئلہ پر گفتگو چاہتے ہیں تو مجھے عذر نہیں پہلے
آپ احیاء العلوم کا باب النکاح پڑھ لیجئے ۔۔۔

اب آپ کا یہ اعتراض البتہ دلچسپ ہے"
کہ اک نسائیت سے معمور عورت اگر محبت کے
قابل ہے، تو پھر محبت کے پاکبازانہ مقاصد بغیر
عقد کئے کسی شریف عورت سے کوئی مرد کیسے حاصل
کر سکتا ہے ۔۔۔۔"

مظہر! نسائیت سے محبت، الفتِ بے مدعا
ہے۔ اُس کا مقصد کیا۔ وہ الفت کرتا ہے۔
اپنے آپ کو مٹاتا ہے اور نہیں جانتا کہ میرا مقصو
کیا ہے۔

کوئی عورت اگر نسائیت سے معمور ہے تو
پھر وہ عورت کب ہے وہ تو دیوتیت کا مجسمہ ہے
اُس سے محبت کا مقصد کیا، پرستش اور پوجا ہے
انسان اپنی بیچارگی پیش کرتا ہے۔ نہ کہ مقصدِ محبت
قائم کرتا ہے ۔۔۔ پھر پاکبازانہ مقصد عورت؛
اک چیستان ہے، میں نسائیت کا پرستار ہوں اور
دیویت کا پجاری۔ یا عورت سے محبت کرنیوالا

اور پاکبازانہ مقاصد محبت کی تاویلیں بگھارنے والا۔ ذرا مجھے دیکھ کر کچھ کہا ہوتا۔ تاہم عورت کے احساس اور مرد کی کیفیات کو محو کر دو تو دنیا میں اپنی جنس سے اور دوسری جنس سے بھی پائیدار محبت کر سکتا ہے اور وہ محبت نہایت پُرلطف شاندار اور مستحکم ہوگی ـــــــ"

عورت سے جو محبت خون کے رشتے کو ملحوظ رکھ کر کیجاتی یا نفسانی اغراض کی تکمیل کو مدنظر رکھ کر کیجاتی ہے وہ ہمیشہ نا استوار وغیر مستحکم ہوتی ہے، عورت سے محبت وہی شاندار ہے جو ان علائق سے آزاد ہو کر کیجائے، رُوحانی دنیا میں ایسی محبتوں کی بہت قیمت ہے، اسی خیال کو ٹیگور کی محترم ہمشیرہ نے لکھا ہے +

پیارے مظہر! نسائیت کمیاب ہے۔ نایاب نہیں، میرا عروج نظر کیوں قابلِ نکوہش ہے۔ یہ نظروں کا تھک تھک کے واپس ہو جانا تو تپشِ ذوق کا سامان ہے۔ یہ آواز کا یاسِ ناشنوائی سے مضمحل ہو ہو کر لوٹ آنا تو کاوشِ عمل کا وسیلہ ہے۔ نسائیت اچھوتی دلکشی کا نام ہے۔ جو میسر نہیں آسکتی"، ہاں سچ کہتے ہو میں اس کی تعریف کر سکتا ہوں مگر تمہارا انقلابِ ذوق میرے قابو سے باہر ہے اور نہ میرے خیال میں دنیا میں کوئی ایسی قوت ہے، جو لذت کو دکھاوے۔ ترنم کو چکھاوے، لطفِ مشاہدہ کو سُنادے۔ اور سونگھنے کی شے کو مس کرا سکے ـــــــ"

خلیقی دہلوی

رات کے وقت جب شور درماندہ ہو جاتا ہے، سمندر کا دھیما زمزمہ ہوا کو معمور کرتا ہے۔
دن بھر کی آوارہ خواہشات آرام کے لئے روشن چراغ کے اردگرد واپس آجاتی ہیں،
محبت کا کھیل کُود خاموش ہو کر پرستش میں تبدیل ہو جاتا ہے، زندگی کا آبجو سے بحرِ محیط کو جا چھوتا ہے، اور دنیائے صَور اپنے نشیمن میں آجاتی ہے، اُس حُسن و خوبی میں جو تمام صورتوں سے بالاتر ہے

وہ کون ہے جو اس خوابیدہ زمین میں، بے حرکت پتوں کے درمیان سوئی ہُوئی ہوا میں، تنہا جاگ رہا ہے؟ ـــ خاموش پرندوں کے آشیانوں میں، غنچوں کے نہاں خانوں میں، جاگ رہا ہے؟ ـــ رات کے مرتعش ستاروں میں، میرے دردِ ہستی کے عمق میں، جاگ رہا ہے؟

(ٹیگور)

ہادی حسین۔ مشن کالج لاہور

موت

نہیں۔ تجھے مجھ سے ذرا بھی پیار نہیں۔ اے زمینوں کو گردش میں مبتلا کرنے والی طاقت تجھے مجھ سے ذرا بھی پیار نہیں۔ تو نے مجھے کیا سکھایا؟

مانگنا!

میں نے مانگا۔ بار بار مانگا۔ التجا سے، محبت سے، آنسوؤں سے، رو رو کر، بلبلا کر! کیا؟

بچپن میں چاند۔ جوانی میں چاندنی راتوں کی رفیق اور اب .... اب .... صرف ہری ہری گھاس کا تحمل۔ مگر ترا وہی سہ حرفی جواب +

مانگنا چھٹ گیا؟ نہیں میں اپنے آپ سے چھٹ گیا ورنہ مانگتا اور سدا مانگتا رہتا۔

"سبحان ربی الاعلیٰ" کی خوگر جبینِ نیاز گدا نہ کرتی تو اَور کیا کرتی مگر.... مگر اے آسمانوں کی وسعت کو ملیا میٹ کرنے والی طاقت تو نے میری خودی پر ڈاکہ مارا۔ میرا مال تو نے چھینا۔

اب میری صدا ختم ہو چکی۔ یہ اس کی بازگشت بھی چند ساعت میں سنائی نہ دیگی۔ تیرے سہ حرفی جواب (موت) نے آخر کار جیتے جی مجھے آلیا۔

اے زندگی کے مصرعے میں سکتہ کو دور کرنے والے کہنہ مشق استاد تیرا شکریہ۔

عبدالعزیز

خیالات

اے حسینوں سے حسین تر! اے چاند سے مکھڑے والے! اے تاروں کے محبوب! تُو کہاں ہے؟
میری تلاش کو کاوش ہی رہتی ہے کہ تو کہاں ہے؟

چاندنی راتوں میں

جب قمرِ تابندہ فلک پر جلوہ افروز ہوتا ہے تو زمین و آسمان اُس کی سفید و شیریں کرنوں سے پُرنُور ہو جاتے ہیں! اسرارِ ظُلمت پر یہ نرم و نازک روشنی پڑتی ہے اور تخیل ہوائیں بے پر ہلائے اُڑتا ہے اُڑتا ہے اور گاتا ہے! گاتا ہے اور اُڑتا ہے!!

پھر ــــــــ شبِ تاریک میں

جب دُنیا و مافیہا پر سناٹا چھایا ہوتا ہے تو ٹمٹماتے ہُوئے تاروں کی ننھی روشنی سے کائنات مخمور نظر آتی ہے! شمعِ زندگی جھلملانے لگتی ہے اور دل کسی دوسری دُنیا کے خواب دیکھنے کی تمنا میں مدہوش ہو جاتا ہے!!

یا ــــــــ پہاڑوں کی گھاٹیوں میں

جہاں آبشار بلندی سے گر کر سبزۂ خودرو پر اپنے اَچھوتے موتی بکھیر دیتا ہے اِک شاداب و مخملیں تبسم خلوت آرا ہوتا ہے! لطیف روشنی چمن کی تر و تازہ رنگینیوں میں کھیلتی ہے اور نسیم جنگلی پھولوں کی بُو باس سے مستِ ناز ہو کر اٹھکھیلیاں کرتی ہُوئی چلتی ہے!!

اور ــــــــ سمندر کی بے پایاں وسعت میں

جب صبا کے ہلکے ہلکے جھونکے ننھی نیلگوں لہروں سے سرگوشیاں کرتے ہیں تو سازِ قدرت وحدت کے میٹھے راگ سے بیقرار ہو جاتا ہے! اِدھر رُوح بیخودی کی شکستہ کشتی پر سوار ہو کر اپنے تئیں بحرِ امواج کی دائمی کشمکش کے سپرد کر دیتی ہے!!

آہ ــــ اے ماہِ درخشاں! اے ستارۂ تاباں! اے آبشارِ حُسن! اے قُلزمِ محبّت! کیا تُو وہاں ہے؟
میری تلاش کو روز و شب کاوش ہی رہتی ہے کہ تُو کہاں ہے؟؟

میں گمان کرتا ہوں کہ اگر میں یہ چاندنی کا گُداز! یہ تاروں کی مستی! پہاڑوں کی یہ سطوت! اور

سمندر کی یہ شان وشوکت! کسی اک نقطے پر جمع کر کے اُسے منتشر کردوں تو فضا تیرے نور سے معمور ہو جائے!!!

طلوع سحر کے گلابی دُھندلکے میں

جب بیباک چڑیا مسرت کی راگنی چھیڑتی ہے تو چمن کے سبز پوش اپنی میٹھی نیند سے بیدار ہو کر اُس آزاد گیت کو گاتے ہیں اور حالتِ وجد میں جھومنے لگتے ہیں! جھاڑیوں کی نازک پتیاں اور پھولوں کی پنکھڑیاں اپنی خوشی میں آکر تالیاں بجاتی ہیں اور کسی کی آمد آمد کا راگ گنگناتی ہیں!

پھر ـــــــ بہار کی مست گھڑیوں میں

جب بادل نوزائیدہ آسمان کی محفل میں "رقص و سرود" کرتے ہیں اور پھر اِدھر اُدھر اپنی رنگ رلیوں میں بکھر جاتے ہیں تو کسی محبوب کے لئے رنگ برنگ کے موتیوں کا ایک جھولا ڈالا جاتا ہے! کرنیں اُسکا ریشمیں تار ہوتی ہیں اور بارش کے قطرے اُس کے گوہرِ سُفتہ!

یا ـــــــ طفلی کے مسرور دنوں میں

جب معصومیت بھولے بھالے بچے کے مُنہ پر آبِ رواں کے چھینٹے دیتی ہے تو چہرہ عصمت و پاکیزگی کی تابش سے چمک اُٹھتا ہے! آنکھوں میں اُلفت کا چراغ درخشاں ہوتا ہے اور پیشانی پر ستارہ بلندی روشن!! کیا وہ تُو ہی ہے جو بےخبری کے ساتھ اُن ننھے ننھے کھلونوں سے کھیلتا ہے اور دُنیا کے ساز و سامان کو اک نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا؟؟

اور ـــــــ عنفوانِ شباب میں

جب حُسن خوبرویوں پر اپنی شرمیلی اداؤں کی بارش کرتا ہے اور دردِ عشق طالب ہنوز ناآگاہ ہوتے ہیں تو راستی رہ رہ کر رُخِ دلکش پر اپنا ایثار نچھاور کرتی ہے! کھلے ہوئے بال آزادی کے ساتھ شانوں پر پڑتے ہیں اور لبریزِ حُسن آنکھیں محبت کے بار سے جھکی رہتی ہیں! تو کیا وہ تو ہی ہے جو اک مسکراہٹ کے ساتھ یوں اپنی دلکشی کا نت نیا منظر دیکھتا رہتا ہے؟؟

آہ ـــــ اے نغمۂ شیریں! اے قوسِ رنگیں! اے معصومیِ دلکش! اے خوبیٔ دلفریب! کیا تو وہاں ہے؟ آہ آہ! میری تلاش کو ہمیشہ یہی کاوش رہتی ہے کہ تُو کہاں ہے؟

ہاں! میں خیال کرتا ہوں کہ اگر میں یہ راگ کا سوز! یہ بہار کی رنگینی! بچپن کی یہ معصومی! اور شباب کی یہ دل آویزی! زندگی کے ساغر میں بھر کر اپنی پژمردہ صورت پر چھڑک دُوں تو ضرور ہے کہ میری خوابیدہ آنکھیں بیدار ہو جائیں اور میں تیرا پر تو اپنے ہی آئینۂ دل میں عیاں طور پر دیکھ لُوں!!!

ب ل

محبّت

اسرارِ مذہب کی نقاب کشائی شاذ و نادر مناسب ہوتی ہے، اور رموزِ محبت کی تو مطلق نہیں، اس خطاکاری کی سزا میں دیوتا ہمیں شگفتہ طبعی اور مسرتِ پاکیزہ کے احساس سے محروم کر دیتے ہیں، کنواں اپنے تغذیۂ آبی کے سرچشمہ سے بے بہرہ کر دیا جاتا ہے، اور جو پانی پایاب تہ میں کھُلا پڑا رہتا ہے وہ صرفِ تبخیر ہو جاتا ہے،

جب محبت رُوح کو پا لیتی ہے وہ جسم سے بالکل بے التفات ہو جاتی ہے، اور اُس کی طرف محض بیکاری کے لمحوں میں رجوع ہوتی ہے، جیسے کوئی کسی وقت سے بعد میں آنے والے خیال کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اُس کی لطیف ترین کشش آفرینیاں ضیافتِ الٰہیہ کی لذائذ نُقل ہیں،

وفورِ جمال کے مالک شاذ ہی جذباتِ محبت کے امین ہوتے ہیں۔ یہ اصنامِ گراں قدر ولولوں کی دست افرازی سے بالاتر دھرے جاتے ہیں، وقت تنہا اس کا مجاز ہے کہ اُنہیں مٹا دے، — وقت جو دیوتاؤں کا باپ ہے، بلکہ اُن کا فنا کرنے والا ہے،

عورتیں اس سکوت کو جو اُنکی سحر طرازیاں ہم پر طاری کر دیتی ہیں، کسی پاس یا رحم کا اہل نہیں سمجھتیں، وہ اُس پرستش سے بالکل بیگانہ ہیں جو ہم اُنہیں، اُس حالت میں رہ کر ادا کرتے ہیں، جس سے عشقِ حقیقی کے دلدادہ کو ہمیشہ رغبتِ ابتلا ہوتی ہے، اور جو اُنہیں بے توجہی، سرد مہری، یا بدمزاجی معلوم ہوتی ہے،

(لارڈ بردک) جب ایک عورت ہم سے تعلقات کی بہم یکسانی ترک کر دے، تو کوئی مضائقہ نہیں چاہے وہ کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہو جائے،

(سٹڈنی) خاموش! میں تمہاری زبان سے تمہارے سوا کسی اور کے تخیلات نہ سنونگا۔ اور یہ خیال تمہارا کسی طرح نہیں ہو سکتا، عمدہ سے عمدہ موسم میں بھی درجۂ حرارت کے تغیرات دم بدم ہوتے رہتے ہیں: اور صادق ترین دل میں بھی ہر وقت ایک ہی کیفیت کی دھڑکن نہیں رہ سکتی، اگر ہم میں معذرت طلبی اور عذر بخشی کے قابل کوئی چیز نہ ہوتی، تو ہم شاید اپنی حالتِ حاضرہ سے زیادہ کامل نظر آتے، لیکن درحقیقت ہم اس سے بھی کہیں کم ہو جاتے، خود پرستی تنگ ظرف اور ناآمرزگار ہے، محبت رنج سہتی ہے اور درگذر کرتی ہے +

(لینڈر)

محمد ہادی حسین (مشن کالج لاہور)

محفلِ ادب

علم و ادب۔ خواہ کتنی کوشش کیوں نہ کیجائے انگریزی زبان ملک کی زبان نہیں ہو سکتی اور یہی وجہ ہے کہ وہ آئندہ ذریعۂ تعلیم بھی نہیں رہ سکتی اور نہ اس وقت یہ عام اور مشترکہ زبان ہے البتہ جدید تعلیمیافتہ طبقہ کے اظہارِ خیالات کا ذریعہ ہے، اور اس حد تک اسے مشترکہ زبان کہہ سکتے ہیں اور غالباً کچھ عرصہ تک اُسے یہ حیثیت حاصل رہیگی، لیکن ہمیشہ اُسے یہ حیثیت حاصل رہے، اور وہ ملک کی عام اور مشترکہ زبان بن جائے، ناممکن ہے، کوا کبتک ہنس کی چال چل سکتا ہے، اور مستعار پروں سے کہانتک پرواز ہو سکتی ہے، اگر ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں، اور اس عالم اسباب میں ترقی و نمود کے خواہاں ہیں تو زبان کی غلامی سے نکلنا اور ذہنی و دماغی آزادی حاصل کرنا پہلی شرط ہے، کوئی قوم ترقی یافتہ نہیں کہلا سکتی جسکی زبان میں ادب نہ ہو، جو حکیمانہ اور شاعرانہ خیالات اور نازک اور لطیف جذبات کے ادا کرنے سے قاصر ہو، جو معمولی قصے کہانیوں اور مقبول عام گیتوں اور دوہوں سے نکلکر فلسفیانہ نکات عالمانہ مباحث، اور اعلےٰ درجہ کے اصناف سخن پر قادر نہ ہو یا اس میں علوم و فنون کی سمائی نہ ہو جو کوئی قوم ایسی ہے وہ بہت بڑی نعمت سے بے بہرہ ہے گویا وہ گونگی بھی ہے، اور ساتھ ہی بھکاری بھی اور ظاہر ہے کہ اقوام عالم میں ایک گونگی اور بھکاری قوم کی کیا وقعت ہو سکتی ہے، (اُردو)

بنگال میں تعلیم۔ بنگال میں لوگ خواہ مرد ہوں یا عورت تعلیم میں اس قدر ترقی کر چکے ہیں اور کم سے کم متوسط طبقہ میں یہاں وہ حالت کہیں نہیں جیسی کہ میسور یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے اپنی کنوکیشن (Convocation) کی تقریر میں اہل ہند کی نسبت بیان کی تھی کہ اس ملک کے ایک ہی گھر کے لوگوں میں ایک شخص تو اعلیٰ درجہ کا تعلیمیافتہ ہے اور دوسرا شخص جاہل اور کندہ ناتراش، بنگالہ میں اس قسم کا تباین کہیں نظر نہیں آتا، یہاں صحیح معلومات کی اشاعت پر مغز کتابوں اور پرائمیروں کی مدد سے نہیں ہو رہی بلکہ بنگالی ماہوار رسالے جنکے مطالعہ کی سب سے زیادہ شوقین عورتیں ہوتی ہیں اشاعت علوم کا نہایت عمدہ ذریعہ بنگئے ہیں۔ ہمارے یہاں کے گریجوایٹوں کی تعداد کم و بیش تیس ہزار مندرجۂ فہرست ہے، ان میں زیادہ تعداد اُن لوگوں کی ہے جنہوں نے گذشتہ بیس سال میں سندیں حاصل کی ہیں۔

شاعر اور قدرت

شاعر

رونقِ باغِ جہاں پھر وہی رعنائی ہو — پھر وہی میں ہوں وہی چشمِ تماشائی ہو
پھر مرے ساز سے ہو نغمۂ اُلفت پیدا — پھر مری بزم میں وہ زمزمہ پیرائی ہو
محشرستانِ تجلی ہو مرا کاشانہ — شعر ویوں کی یہاں انجمن آرائی ہو
پھر سے چرچا ہو مرا عشق کی آبادی میں — پھر پریشانئ دِل باعثِ رسوائی ہو
لے چلے خواہشِ دیدار کسی کے در پر — پھر وہی ذوقِ تقاضائے جبیں سائی ہو
پھر سروکار ہو آوارگی سے شام و سحر — پھر وہی میں ہوں وہی بادیہ پیمائی ہو

قدرت

دیکھ! آئینۂ ایام میں صورت اپنی — بگڑی صورت کو بنا محوِ خود آرائی ہو
پرتوِ حسنِ رُخِ شاہدِ عالم پہ نہ جا — جلوۂ شانِ کریمی کا تماشائی ہو
نورِ کامل کی جھلک ہے تری خاکستر میں — بے خبر جلوۂ باطل کا نہ سودائی ہو
تیری فطرت میں ہے وہ نور اگر تو چمکے
مضطرب تیرے لئے شعلۂ سینائی ہو

شایق

جذباتِ عالیہ

یاس

موجِ ہوائے خاک اگر آشنا نہ ہو
دل کو جلا کے سُرمۂ بینش بنائیے
شکل اسکی دیدنی بھی ہے نادیدنی بھی ہے
سجدہ وہ کیا کہ سر کو جھکا کر اُٹھا لیا

دنیائے گردباد کی نشو و نما نہ ہو
آنکھوں سے معرفت کا اگر حق ادا نہ ہو
جو تجھ کو جانتا ہو مگر مانتا نہ ہو
بندہ وہ ہے جو بندۂ بندہ نما نہ ہو

پار اُترے کیا دو آبۂ امید و بیم سے
آمین تک زبان سے نکلتی نہیں ہے کیا
ایسا نہ ہو کہ تھک کے کہیں بیٹھ جائے دل
دل نشۂ خودی میں پڑا جھومتا ہے کیا

جب ناخدائے دل کو یقینِ خدا نہ ہو
مغرور اتنا اے دلِ بے مدعا نہ ہو
دیر و حرم میں گم نگۂ نارسا نہ ہو
زور آزمائی کو کوئی درد اُٹھ کھڑا نہ ہو

امیدِ صُلح کیا ہو کسی حق پسند سے | پیچھے وہ کیا ہٹیگا جو حد سے بڑھا ہو
دل کھول کر تڑپنے دے اے صبر الوداع | پرہیز کیوں کرے دن جب اُمیدِ شفا ہو
پچھلا پہر ہے کاتبِ اعمال ہوشیار | آمادۂ گناہ کوئی جاگتا نہ ہو
صورت نہ پکڑے جلوۂ بے معنیٔ حباب | قطرہ اگر اسیرِ طلسمِ ہوا نہ ہو

یاسؔ آپ کو خدا کی خدائی سے کیا غرض
وحدت سرائے دل میں کوئی دوسرا نہ ہو

وقار الاعظم شرفؔ (جاورہ)

اشکِ خوں رنگتیں بدلتا ہے | دل کا کانٹا نہیں نکلتا ہے
جانے کیا کل بگاڑ دی تم نے | دل سنبھالے نہیں سنبھلتا ہے
ڈھونڈھتا ہے تجھے ترا بیمار؟ | ہجر میں کروٹیں بدلتا ہے
تم سے روشن ہے آئینہ کا گھر | پانی میں بھی چراغ جلتا ہے
ہجر میں بندھ رہے ہیں خام خیال | ان کھلونوں سے دل بہلتا ہے
دردِ الفت کو اور دھندا کیا | میری چھاتی پہ مونگ دلتا ہے

اے شرفؔ غیر کو بلا رکھو
یونہی دنیا کا کام چلتا ہے

احسن مارہروی

میری طرح جہان ہے شیفتہ اہلِ ناز کا
کس سے نہیں ہے واسطہ حسنِ زمانہ ساز کا
عقل نے سو جتن کئے ذہن نے لاکھ فکر کی
قفل مگر نہ کھل سکا تیرے طلسمِ راز کا
چھوڑ کے سنگِ آستاں ناز کا ہمکنار ہے
عجز نے کیا بڑھا دیا رُتبہ سرِ نیاز کا
جھیل کے سختیٔ جفا نرم مزاج بن گیا
عشقِ بتاں سے مل گیا دل کو مزا گداز کا
اس دلِ ہیچکارہ کو کام کا اپنے کر لیا
کیوں نہ رہینِ لطف ہوں عشوۂ دلنواز کا
دیکھ رہا ہے سب کو وہ دل ہے مگر تری طرف
پاؤں نہ ڈگمگائیگا عاشقِ پاکباز کا
بیعتِ بوریا نشیں احسنِ بے ریا نہ کر
دل سے نیاز مند بن درگہِ بے نیاز کا

ثاقبؔ

وہ نگاہِ ناز جو دزدِ متاعِ ہوش ہے | حاصلِ صد آرزو ہے باعثِ صد جوش ہے
آرزوئے وصل ہے تمہیدِ یادِ ہجرِ دوست | انتظارِ صبحِ محشر یادگارِ دوش ہے
اف شبِ غم کی اداسی تجھ سے اے ہمدم نہ پوچھ | اک چراغِ آرزو تھا وہ بھی اب خاموش ہے
میرا غم برہم زنِ ہنگامۂ محفل ہوا | کیوں اداسی چھا گئی کیوں انجمن خاموش ہے
کون بیخود ہو گیا کس پر گری برقِ جمال | کیا تجھے بھی او تغافل آشنا کچھ ہوش ہے
اب وہ نالے ہیں نہ وہ ارماں نہ وہ سوز و گداز | دل ہے پہلو میں مگر افسردہ ہے خاموش ہے
اپنی آنکھوں کی قسم تجھکو ابھی آنکھیں نہ پھیر | ہاں ابھی اے ساقیٔ ذی ہوش مجھکو ہوش ہے

دیکھنے والو! ذرا ثاقب کی صورت دیکھنا
آہ وہ بیکس ہجومِ یاس میں خاموش ہے

برقعہ نو ایجاد

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس صیغۂ نسوان کے سکرٹری کے انعامی اعلان پر اسکی اختراع ہوئی کانفرنس منعقدہ لکھنؤ نے بہترین برقعہ قرار دیکر اول انعام طلائی تمغہ دیا ہندوستان کے دیگر صوبوں کی کانفرنس نمائش ہائے صیغۂ نسوان سے بھی بارہ طلائی و نقرئی تمغہ۔ سند و انعامات حاصل کر چکا ہے۔

سولہ سال سے ہندوستان کے ہر گوشہ اور ہر طبقہ کے لوگوں میں مقبول ہے

بنگال برقعہ بہت پسند ہوا۔ واپس نہیں کیا جاویگا بچہ کی ٹوپی جلد روانہ کریں۔
از جناب شمس الرحمٰن صاحب پلیڈر۔ کھلنا بنگال۔

دکن برقعہ ہے نہایت آرام دہ اور پردہ دار ہیں دو برقعہ رنگین میرے بھائی کے گھر کے لئے روانہ کریں۔
جناب محمد عبداللہ حسن صاحب اسٹیشن روڈ۔ حیدرآباد۔ دکن۔

بہار۔ ایک برقعہ چینی ریشم جس قدر جلد ممکن ہو اور روانہ کریں جو برقعہ رنگین بھیجا ہے۔ اسکی وضع بہت پسند ہوئی۔
از جناب راجہ محمد یعقوب صاحب۔ راجہ ریاست۔ پرسونی۔

مدراس آپکا اشتہار اکثر نظر سے گذرتا تھا۔ برقعہ منگوانے میں اشتہار کے مطابق ثابت ہوا۔ ایک برقعہ اپنا کپڑا روانہ کر کر تیار کراؤنگا
از جناب حسن صاحب۔ رئیس حسن۔ میسور۔

یوپی برقعہ واقعی بہت آرام دہ ہے ہر ایک بہن کو خریدنے کی ترغیب دونگی۔ ایک برقعہ میری بہن کے نام روانہ کریں۔
از جناب بنت سید عبدالحمید صاحب۔ ایم۔ اے۔ لکھنؤ۔

سی پی میں نے بھائی احمد حسن صاحب کے پاس آپکا برقعہ دیکھا اسکی وضع پسند ہے ایک برقعہ رنگین روانہ کریں۔
از جناب ایس حامد حسین صاحب۔ جی۔ آئی۔ پی ریلوے۔ بنیہ۔

پنجاب جو برقعہ واپسی کی شرط پر منگوایا تھا۔ بہت پسند ہوا گھر پر پہنچنے پر دو برقعہ طلب کروں گا۔
از جناب ایم فضل خاں صاحب نمبر ۳۳۲۔ لائل پور۔

احاطہ بمبئی آپکی دوکان سے دو برقعہ چینی ریشم خرید کئے تھے یہاں پر سب نے پسند کئے ایک برقعہ اور روانہ کریں۔
از جناب ایم۔ اسمعیل۔ پوسٹ نمبر ۵۔ کولابا۔ بمبئی

آپ بھی بشرط واپسی منگوا کر خود ملاحظہ کریں و پردہ نشین خواتین کو معائنہ کا موقع دیں

برقعہ نو ایجاد کی وضع عام طرز کے بدنما تکلیف دہ اور ناکافی پردہ برقعہ سے بالکل مختلف ہے اس کی اختراع میں پردہ نشین کی ہر ایک ضرورت کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔

اتفاقیہ بے پردگی کا بچاؤ۔ تازہ ہوا کی آمد کا کافی انتظام بچہ کو دودھ پلانے میں سہولیت

دیر تک پہنے رہنے کی تکلیف سے محفوظ مکمل پردہ دار۔ خوبصورت آرام دہ زمانہ کے حسب حال

وضع دو حصوں پر منقسم ہے بالائی حصہ سر سے شروع ہو کر ہاتھ کی انگلیوں سے تین انچہ نیچا رہتا ہے۔ اس میں ہماری ایجاد کردہ ٹوپی نما کمانی لگی ہوئی ہے جو نقاب کو چہرہ سے بالکل الگ رکھتی ہے تاکہ چہرے پر پڑے رہنے سے دم نہ بولائے اور باہر سے چہرہ کا خاکہ نہ معلوم ہو سکے زیرین حصہ مثل ڈھیلے ڈھالے کوٹ کے کندھے سے شروع ہو کر پیر کے ٹخنہ تک رہتا ہے کوٹ ہی کی مانند سامنے کے رخ بٹن لگے ہوئے ہیں۔ پہلو میں ہر دو جانب ہاتھ باہر نکالنے کے لئے جگہ ہے۔ سامنے کے رخ دو جیبیں ہیں۔

آج ہی منگائیں۔ کندھے سے لیکر پیر کے ٹخنہ تک کی لمبائی اور سر کے دور کی ناپ روانہ کریں۔

ہر جگہ پردہ نشین خاتون کو اس کی ضرورت ہے

قیمت سفید لٹھا ۵ رنگین ۱۰ الپکہ ۲۵ چینی ریشم ۳۵ سفید کھدر ۱۲ رنگین کھدر ۱۶

خاتون اسٹورز۔ نمبر ۱۲۔ فیض بازار۔ دہلی

گریجوایٹ عورتوں کی تعداد بھی ہمارے یہاں اچھی خاصی ہے، تمام دیگر ہندوستانی صوبجات کے مقابلہ میں اس صوبہ میں اعلیٰ تعلیم بہت زیادہ پھیل گئی ہے یہ گریجوایٹ عام طور پر بنگالی زبان کے بہترین انشا پرداز ہیں، بنگالی عورتوں نے بھی بہت سی کتابیں اپنی زبان میں لکھی ہیں، اور آجکل بھی چار یا پانچ ایسی گریجوایٹ عورتیں موجود ہیں جنکے نام بنگالی مصنفین میں بلند پایہ رکھتے ہیں ؛ (اُردو)

لٹریچر - وہ مُلک خوش نصیب ہے جس کا لٹریچر عُمدہ ہے۔ اُسکی راتیں روپہری اور دن سنہری ہو جاتے ہیں۔ رنج و غم وہاں سے رفع ہو جاتا ہے اور اُس کے افراد کے دل و دماغ میں پاکیزہ اور بلند خیالات پیدا ہونے لگتے ہیں۔

اُس مُلک میں جذبۂ اتحاد حکومت کرتا ہے اور اطمینانِ قلب ہر شخص کے دل کو نصیب ہو جاتا ہے۔ خیالات کی پستی، کم ظرفی یادہ گوئی اور کدورت کا نام و نشان تک مٹ جاتا ہے۔ اور فضا میں ایک قسم کی عظمت کا ظہور ہو جاتا ہے۔

وہاں کے لڑکے عقیل، لڑکیاں باحیا، مرد شجاع اور مستورات باعصمت ہو جاتی ہیں۔ اور ہر شخص دوسرے کو محبت و احترام کی نگاہوں سے دیکھتا ہے،

ساہتیہ کلکتہ (ہندی)

ہندوستان میں اخبار نویسی - ہندوستان میں سب سے پہلا اخبار بابر کے عہدِ حکومت میں جاری ہُوا تھا۔ جس کا صرف ایک پرچہ ہاتھ سے لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا جاتا تھا۔ پانی پت کی لڑائی میں جب ہندوؤں نے صلح کی درخواست کی اُس وقت بابر اخبار ہی دیکھ رہا تھا۔ شہنشاہ اکبر کے عہد میں بھی ماہوار پرچہ شائع ہوتا تھا۔ جسے گورنمنٹ گزٹ کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح جہانگیر اور شاہجہان کے عہد میں بھی سرکاری اطلاعنامہ باقاعدہ شائع ہوتا تھا۔ چنانچہ شاہجہاں ایک جگہ اپنے روزنامچہ میں لکھتا ہے۔ کہ اخبار میں یہ دیکھ کر کہ الہ آباد کی ہندو رعایا میں بغاوت کے آثار نمایاں ہیں، مجھے حیرت ہُوئی۔ شہنشاہ اورنگزیب کی وفات کی خبر پیغامِ ہند نامی فارسی اخبار میں شائع ہُوئی تھی۔ تاہم یہ اخبارات عام اشاعت کے لئے نہیں تھے۔ عوام کے لئے سب سے پہلا اخبار ۱۷۸۰ء میں ہکی گزٹ Hicky's Gazette نکلنا شروع ہُوا اسکے بعد ۱۷۹۳ء میں انڈین ورلڈ جاری ہُوا اور بعدہٗ بنگالی میں بنگلہ گزٹ نکلنے لگا۔

مادھری لکھنؤ (ہندی)

نامکمل - چودھویں کا چاند خوبصورت ہے لیکن مجھے وہ اُس وقت پیارا لگتا ہے۔ جب کمان کی

شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اُس کے مقابلے میں پورا چاند کس قدر پھیکا، کس قدر کم بضاعت اور اوچھا معلوم ہوتا ہے۔

مصور کی تصویر اُس وقت دلکش نہیں رہتی جب وہ اُسے مکمل کر لیتا ہے۔ اُس کی دلکشی دیکھنا ہو تو اُسے اُس وقت دیکھو۔ جب وہ ابھی نامکمل ہو اور اُسکے رنگ صبح کی روشنی کے مانند ہلکے ہلکے ہوں۔

پھُول حسین ہے۔ لیکن غنچہ اُس سے بھی حسین ہے۔ کیونکہ پھُول کا تمام حُسن اُسکے اندر موجود ہے۔ اور اپنے اظہار کا موقعہ تلاش کر رہا ہے۔

محبت کی نظم پیاری شے ہے، لیکن وہ فقرہ ناقابل بیان جذبات سے لبریز ہے۔ جس میں نصف بات کہہ دی گئی ہے اور نصف مُنہ میں ہے۔

اُس دلاویز چہرہ کی شان کون بیان کر سکتا ہے۔ جو آدھا ننگا ہے اور آدھا دیکھنے کے لئے آنکھیں چاروں طرف دیکھتی ہیں۔ مگر کامیاب نہیں ہوتیں۔

سُندری سوبھاگیہ (گجراتی)

کیا تُم بھی نمائش پسند ہو؟ میں تم سے ملنے کے لئے تاریکی میں بیٹھا ہوں، مگر تم چراغ لے کر میرے پاس آتے ہو۔

میں صرف تمہاری خاطر تنہائی چاہتا ہوں۔ اور راہ کا بھکاری بن کر تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ مگر تم باجوں کے شور کے ساتھ بیش قیمت زیور پہن کر میرے پاس آتے ہو۔

میں نے تمہاری خاطر سب کچھ لٹا دیا ہے۔ مگر تم سب کچھ لیکر ہی میرے پاس آتے ہو۔

میں تمہاری ملاقات کے لئے رات کا وقت بہترین سمجھتا ہوں۔ مگر تم سُورج کی کرنوں کا تاج پہن کر میرے پاس آتے ہو۔ میں خاموشی کا جویا ہوں، تم گیت کے مشتاق ہو۔

کیا تم بھی نمائش پسند ہو؟ ــــ میں نے تمہیں آجتک نہ پہچانا تھا۔

بھارتی (بنگالی)

شباب کے خواب۔ وقت نے کہا۔ کیا میں نے تمہارے دانت کمزور اور تمہارے سیاہ بال سفید نہیں کر دئے؟ کیا میں نے تمہاری طاقت تمہارے جسم سے سپنج کے پانی کے مانند نہیں نچوڑ ڈالی اور کیا میری بیٹی موت تمہاری زندگی کا تعاقب نہیں کر رہی۔ آخر تم میرا نام سُن کر لرزتے کیوں نہیں جاتے۔ میری طاقت خوفناک ہے۔"

بے پروا بڈھے نے ہنس کر جواب دیا "تم نے مجھ سے بہت کچھ چھین لیا ہے لیکن میرے شباب کے خواب تا حال میرے قبضہ میں ہیں۔ اور جبتک اُنکے باعث میرا خون گرم ہے۔ تمہاری موت کی سرد اُنگلیاں بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں"۔

وقت کو شکست ہوئی۔ اُس نے ندامت سے گردن جھکالی۔

رائل میگزین (لنڈن)

حصّۂ نظم

ماضیات

کلام حضرتِ فردوس منزل ابو المظفر شاہِ عالم ثانی بادشاہ غازی متخلص بآفتاب نور اللہ مرقدہٗ

ایک قلمی نسخہ ہے

مژدہ اے یار کہ ہیں وصل کے ایام قریب　　دُور ہوتے ہیں سبھی ہجر کے آلام قریب

بے قراری، طپش، اور بیکلی، اور بیتابی　　دل نے کاٹی بہت اب ہوتا ہے آرام قریب

دے گئے مجھکو ہزاران چمن خوش خبری　　"غنچہ دل مت ہو" کہ ہے وصلِ گل اندام قریب

آفتاب اپنے خدا کا نہ ہوں کیونکر شاکر　　میرے ہر کام کو وہ دیتا ہے انجام قریب

سیر کرتا ہوا اُس رُخ کی پھنسا زلف میں دل

آفتاب آیا جو مغرب میں ہوئی شام قریب

رباعیات

جناب مرزا حکیم جمشید علیخاں اختر دہلوی طبیب خاص مہاراجہ جے پور

کچھ تو ہی نہیں بلبل نالاں غمناک　　اس باغ میں ہے دامنِ گل بھی صد چاک

مُرجھا کے یہاں سینکڑوں گل خاک ہوئے　　ہیں غنچۂ ناشگفتہ لاکھوں تہ خاک

اے چرخ ہر ایک سے ہے کینہ تیرا　　نام اس لئے رکھا ہے کمینہ تیرا

اے خاک ہزاروں گنج نکلیں مدفون　　دیکھے کوئی چیر کر جو سینہ تیرا

کل صبح یہ میخانہ میں آئی آواز　　اے رندِ خرابات تری عُمر دراز

تسبیحِ ملایکہ سے بہتر ہے ہمیں　　وہ آہ کہ ہو جس میں بھرا سوز و گداز

نوائے درد

ایک نوعمر علم دوست عزیزہ کی وفات پر

پھولا پھلا نہ وہ گُلِ رعنا ہزار حیف ! — بدتر ہوئی خزاں سے ہماری بہار حیف !

جاری ہے ملکِ زیست میں پروانۂ اجل — زندوں کو زندگی پہ نہیں اعتبار حیف !

رونق تھی جن کے دم سے جہاں کی وہ چل بسے — چلتے رہے جہاں کے مگر کاروبار حیف !

وہ باغ جس کا نام تھا گلزارِ زندگی — کہتے ہیں اُس کو موت کا اب لالہ زار حیف !

آنکھیں تھیں فرشِ راہ مری جن کے واسطے — آنکھوں کے سامنے ہیں وہی خاکسار حیف !

جن کے لئے تھی تیرے تبسّم میں زندگی — روتے ہیں تیرے سر پہ کھڑے زار زار حیف !

پتھر کا ہو جگر تو کوئی تیرا غم سہے — ہے تار تار جامۂ صبر و قرار حیف !

جی بھر کے دیکھنے بھی نہ پائے تھے تجھ کو ہم — تُو نے بھی زندگی کی نہ دیکھی بہار حیف !

بچنا ہو گر غموں سے تو مر جائیے کہیں — رنج و محن ہیں زیست کے لیل و نہار حیف !

وہ بھی تھے دن کہ گرم تھی جب بزمِ انبساط — یہ بھی ہے وقت شب کو نہیں ہے قرار حیف !

وہ بھی تھی زندگی کہ محبت کا دَور تھا — یہ بھی ہے عُمر بزم کا ہے انتشار حیف !

وہ بھی تھے دن کہ موت سے بدتر تھا انتظار — یہ بھی ہے وقت موت کا ہے انتظار حیف !

رو رو کے آنسوؤں کی لڑی کیا پرو دیئے؟ — کھویا گیا ہے اپنا دُرِ شاہوار حیف !

ذکرِ خوشی گنہ ہے دلِ زار کے لئے

یعنی غمِ عزیز میں ہے داغ دار حیف !

زار

اُجرت نامہ اشتہار رسالہ ہمایوں

اجرت اشتہار پیشگی لی جاویگی فحش اور دل آزار اشتہار نہیں کیا جاویگا۔

ٹائیٹل کے اشتہارات فی صفحہ ٹائیٹل ۲۵ روپے۔ دوسرا صفحہ سالانہ دوسو روپیہ۔

تیسرا صفحہ ایکسو اسی روپیہ چوتھا صفحہ سالانہ دوسو روپیہ۔

تعداد طبع	ایک صفحہ	نصف صفحہ
۱۲	۶۵ روپے	۳۵ روپے
۹	۵۲ روپے	۲۷ روپے
۶	۳۵ روپے	۱۸ روپے
۳	۱۸ روپے	۱۰ روپے
۱	۶ روپے	۳ روپے

اشتہارات کے چربے بھجوانے چاہئیں یا اگر خود کاتب سے نہ لکھوا سکیں تو ایک روپیہ کاتب کی اجرت اشتہار کی اجرت کی علاوہ بھیجیں نصف صفحہ سے کم کا اشتہار نہ بھیجیں۔

مینجر رسالہ ہمایوں مزنگ روڈ۔ لاہور

خریداران ہمایوں

خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرماویں

سونا کوڑیوں میں ملتا ہے خرید لیں

خدا کا شکر ہے کہ مصنف گنجینہ طبیب کی اس عاجز کو ہر خاص و عام جانتے ہیں۔ اشتہاری تعریف کرنا فضول سمجھتا ہوں۔ آپ تجربہ فرما کر دیکھ لیں اور صداقت کی داد دیں۔

سرمہ اصغری

یہ سرمہ دافع جمیع امراض چشم ہے قیمت فی تولہ بارہ ۱۲ آنہ معہ محصولڈاک ایک روپیہ دو آنہ اگر چھ ماشہ منگواؤ گے تو بھی آپ کا ۶ر قیمت اور ۶ر محصولڈاک کل بارہ ۱۲ آنہ خرچ ہوگا۔ اگر دس تولہ منگواؤ تو بھی خرچ ڈاک چھ آنہ ہوگا۔ یہ خیال رکھیں کہ اگر آپس میں ملکر منگوائیں تو محصول میں فائدہ ہوتا ہے یہ سرمہ اصغری جسکا نسخہ گنجینہ طبیب حصہ اول کے صفحہ پچاس ۵۰ پر درج ہے اور یہ سرمہ عرصہ بائیس ۲۲ سال سے برابر تیار ہو کر بفضل خدا فروخت ہو رہا ہے۔ اس میں پارہ۔ سنگہ۔ ورق طلا۔ ورق نقرہ۔ ممیران چینی۔ موتی۔ تخم سرس سیاہ۔ تخم نیل۔ لکڑی نیم وغیرہ سے تیار ہوتا ہے۔ اور یہ مقوی بصر کے علاوہ دافع جالا۔ دھند۔ غبار۔ سرخی چشم بھی ہے اگر مفید نہ ہو تو واپس لینے کے ہم ذمہ وار ہیں آزمائش شرط ہے افسوس ہے کہ عام اشتہاری لوگوں نے دنیا میں بہت بدنامی کر دی ہے لیکن خیر کاٹھ کی ہانڈی ایک دفعہ چڑھتی ہے۔ اسی کے مثل سرمہ اصغری سفید بھی موجود ہے جو قیمت فی تولہ ایک روپیہ محصولڈاک چھ آنہ ہے +

دوسرا سرمہ ظہوری

کے نام کا ہے جس کا نسخہ کتاب مذکور کے حصہ دوم کے صفحہ ۱۴۱ میں درج ہے نہایت مقوی بصر ہے قیمت فی تولہ پانچ روپیہ۔ چھ ماشہ بھی مل سکتا ہے +

اکسیر اصغری

یہ ایک مرکب ہے وعن بفضل خدا ایک سو پچیس ۱۲۵ مرضوں پر خداک بوندوں میں اکسیر کا حکم رکھتا ہے اور اسکا مکمل نسخہ گنجینہ طبیب حصہ دوم کے صفحہ ۴۹ پر درج ہے اس اکسیر اصغری کی شیشی ہر ایک کے گھر میں ہونی چاہیئے یہ ایک حکیم حاذق کا کام دیتی ہے۔ اور فوراً مرض کو بحکم خدا دور کرتی ہے درد خواہ کسی جگہ اور کسی بھی قسم کا ہووے خارش بدن پر کسی قسم سے ہووے۔ اور چھپاکی۔ امراض جگر گردہ۔ لقوہ۔ فالج۔ کیڑہ دانت بواسیر ہر قسم۔ آتشک۔ سوزاک۔ جریان۔ بدہضمی۔ ہیضہ۔ دست قے کو فوراً روکے۔ ناسور۔ چنبل۔ داد۔ نزلہ۔ زکام۔ کھانسی۔ دمہ مرگی۔ سرسام۔ ہاؤگولہ۔ عورتوں کی کل مرضوں اور بچوں کے لئے مفید ہے مکمل پرچہ ہمراہ شیشی وزن تولہ کے قریب قیمت ایک روپیہ عہ ہر محصولڈاک و باردانہ وغیرہ ۸ر کل ایک روپیہ آٹھ آنہ چھ شیشی کے خریدار کو باردانہ معاف اور درجن کے خریدار کو باردانہ اور محصولڈاک معاف صرف بارہ ۱۲ روپیہ میں وی۔پی کیا جاتا ہے +

صابون بال صاف فی ٹکی چار آنہ۔ صابون آملہ فی ٹکی ۴ر صابون روغن نیم فی ٹکی چار آنہ۔ صفائی چہرہ صابون آٹھ آنہ ۸ گولیاں ہمہ صحت اطفال ہم نے اپنی تصنیف کردہ کتاب طبیب الشیوخ ان سے نسخہ بڑی محنت سے سب دوائیں جمع کر کے تیار کیا ہے تاکہ جو شخص خود ان گولیوں کو نہ بنا سکیں وہ ہم سے تیار ایک روپیہ چار آنہ سینکڑہ منگوائیں ان گولیوں کے استعمال سے بفضل خدا بچے کا پیٹ ہر طرح سے درست رہتا ہے اور کبھی کسی قسم کی بیماری نہیں ہوتی اور دانت بھی آسانی سے نکل آتے ہیں۔ سو کھا مسان والے کو بھی مفید ہے۔ فرمایش لکھتے وقت اپنا پتہ صاف خوشخط لکھیں بہ تاکید ہے فہرست کارخانہ کا ر بھیجکر مفت طلب کریں

المشتہر حاجی محمد صغر علی اینڈ سنز و منیجر یونانی دواخانہ شہر لودیانہ

قواعد

۱- ہمایوں بالعموم ہر ماہ کے نصفِ اول میں شائع ہُوا کریگا۔
۲- علمی و ادبی۔ تمدنی و تاریخی۔ اخلاقی و روحانی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پُورے اُتریں درجِ رسالہ کئے جائیں گے۔
۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہ ہوں گے۔
۴- جواب طلب خطوط کے لئے ۱ر کا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔
۵- کوئی ایسا اشتہار نہ لیا جائیگا جو خلافِ تہذیب ہو۔
۶- سالانہ قیمت پانچ روپے۔ ششماہی تین روپے نمونہ کا پرچہ ۸ر علاوہ محصولڈاک
۷- ہمایوں کی ضخامت کم از کم چونسٹھ صفحے ماہوار اور ۷۶۸ صفحات سالانہ ہوگی۔
۸- خط و کتابت کے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھیں۔
۹- ناپسندیدہ مضمون ۱ر کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔
۱۰- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۲۰ تاریخ کے بعد اور ۲۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔
۱۱- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کریں۔

منیجر رسالہ ہمایوں

۳۰- مزنگ روڈ- لاہور

باہتمام لالہ دیوان چند مالک مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوایا

فہرست مضامین بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۲ء

جلد ۲ | نمبر ۴

حصۂ نثر

حصۂ نظم

جذباتِ عالیہ

جہاں نما

کلکتہ یونیورسٹی کی آمدنی۔ کلکتہ یونیورسٹی کی سنہ ۲۱-۱۹۲۰ء کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سالِ زیر بحث میں اس کے اخراجات کی میزان ۲۱۴۹۲۵۴ روپے تھی۔ اس خرچ کو مفصلہ ذیل مدات سے پورا کیا گیا۔

اُمیدوار طلبا	۱۶۰۸۱۹۲
دیگر ذرائع سے آمدنی	۲۰۰۸۴۴
چندے	۱۷۷۰۳۰
سرکاری امداد	۱۶۳۱۸۹
میزان	۲۱۴۹۲۵۵

ہندوستان کیلئے پیغام گذشتہ مئی میں پروفیسر ونے کمار سرکار نے یونیورسٹی آف برلن (جرمنی) کے طلباء کے سامنے "ہندوستان کا نقطۂ نظر" کے مضمون پر ایک دلکش تقریر کی۔ جس کے جواب میں جرمنی کے ممتاز فاضل اجل پروفیسر الائس برانڈل نے تالیوں کی پرجوش گونج میں کہا:۔

"ہندوستانیوں تک ہمارا پیغام پہنچا دو۔ کہ ہم مستقبل میں ہندوستان کے کارناموں کا زیادہ احترام کرینگے۔ اختلافات کے باوجود انسانیت ہر جگہ یکساں ہے۔ نوجوان ہندوستان آرام کی نیند میں سرشار نہیں۔ بلکہ زندگی کے میدان میں جدوجہد کر رہا ہے جس طرح کا دلفریب اور خوبصورت پیغام آج ہمارے کانوں تک پہنچایا گیا ہے۔ ہندوستانیوں کو کہو۔ کہ ایسے ہی مدلل اور پُراثر پیغام ہم تک پہنچاتے رہیں اور پھر وہ دن دور نہ ہوگا۔ جب یورپ کو اپنے طریقِ تعلیم اور سائنس کے فیصلوں پر نظر ثانی کرنی پڑیگی"

جاپانی بچوں کی خبرگیری۔ جاپانی بچوں کی خبرگیری اور اُن کی تربیت کے لئے حکومت جاپان کی طرف سے مفصلہ ذیل انسٹی ٹیوشن جاری ہیں۔

بچوں کی تربیت گاہ۔ بچوں کا ہال۔ بیمار بچوں کے لئے شفاخانہ۔ کمزور بچوں کے لئے ہسپتال محتاج بچوں کا گھر۔ آوارہ لڑکوں کے لئے اصلاحی مدرسہ کمزور دل بچوں کے لئے مدرسہ۔ غریب لڑکوں کے لئے خط و کتابت کا اسکول۔ اندھے لڑکوں کے لئے اسکول بہرے لڑکوں کے لئے اسکول۔ بچوں کیلئے پاگل خانہ بچوں کی امداد کرنے والی انجمن۔ لڑکوں پر مظالم کا انسداد کرنے والی انجمن وغیرہ وغیرہ۔ اسکے علاوہ بچوں کے متعلق اُن کے والدین کو مفید مشورہ دینے

والی سوسائٹیاں بھی جا بجا موجود ہیں۔ اس سے معلوم ہوسکتا ہے۔ کہ گورنمنٹ جاپان اپنے بچوں کے لئے کس قدر مصارف برداشت کرتی ہوگی!

جہاز شماری۔ لائڈز رجسٹر آف شپنگ کے تازہ ایڈیشن سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کل دنیا بھر کے جہازوں کی تعداد ۳۳۵۹۳ ہے۔ جن کا مجموعی وزن آبی ۶۴۳۷۰۰۸۶ ٹن ہے سب سے زیادہ جہازوں کی مالک برطانیہ ہے جس کے قبضہ میں ۱۹۰۵۳۰۰۰ ٹن وزنی جہاز ہیں۔ ۱۹۱۴ء کی نسبت اس میں صرف ۱۷۶۰۰۰ ٹن وزنی جہازوں کا اضافہ ہوا ہے۔ امریکہ کا شمار دوسرے درجہ پر ہے۔ اُس کے پاس ۱۲۵۰۶۰۰۰ ٹن وزنی جہاز ہیں حالانکہ ۱۹۱۴ء میں اُسکے پاس صرف ۱۸۳۷۰۰۰ ٹن وزنی جہاز تھے۔

۱۹۱۴ء میں جرمنی کا شمار دوسرے درجہ پر تھا۔ اس وقت اُس کے قبضہ میں ۵۰۰۰۰۰۰ ٹن وزنی جہاز تھے۔ مگر اب صرف ۱۷۸۳۰۰۰ ٹن رہ گئے ہیں۔ ناروے کا درجہ پہلے تیسرا تھا۔ اب ساتواں ہے۔ جاپان کا نمبر پہلے چھٹا تھا۔ اب تیسرا ہے۔

جرمنی کا لٹریچر۔ کسی قوم کے دلی رجحان کا اندازہ کرنا ہو۔ تو اُس کے لٹریچر کا مطالعہ کرنا چاہیئے اس خیال کو لے کر اگر جرمنی کی تازہ کتب کا مطالعہ کیا جائے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ جرمن کدھر جا رہے ہیں اور کیا سوچ رہے ہیں۔ جرمنی میں حال ہی میں ایک کتاب Die drie Kommenden Krieg. شائع ہوئی ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے۔ کہ جرمن کس طرح کسی اتفاق سے فائدہ اُٹھا کر تمام دُنیا میں ہلچل مچا کر اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو برقرار کرنے کے خواہاں ہیں اس کتاب کی قبولیت عامہ کا یہ عالم ہے کہ شائع ہونے کے ساتھ ہی اس کی دو لاکھ بیس ہزار جلدیں فروخت ہوگئی ہیں۔ اور یہ اپنی قسم کی ایک کتاب نہیں۔ ایسی سینکڑوں کتب آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اور جرمن اُنہیں ہاتھوں ہاتھ خرید کر پڑھتے ہیں *

حکومت جاپان اور عورت۔ جاپان میں حکومت کی طرف سے ایک انجمن جاری ہے۔ جس کا کام محض یہ دیکھنا ہے۔ کہ عورتوں کا اخلاق خراب تو نہیں ہو رہا۔ اس انجمن کا دوسرا کام یہ ہے۔ کہ گورنمنٹ کو عورتوں کی بہبودی کے متعلق مفید مشورے دے *

علمی شعاعیں

دن کے وقت تاروں کے فوٹو۔ فلکیات کے ماہرین اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ دن کو آفتاب کی تیز روشنی کے باعث رات کو ٹمٹمانے والے تارے نظر نہیں آتے۔ اس لئے اُن کے فوٹو رات ہی کو لئے جاتے ہیں مگر اب اس باب میں ایک نیا قدم اُٹھایا گیا ہے۔ لارڈ ریلے کا نظریہ ہے۔ کہ آسمان کا رنگ آفتاب کی روشنی کے انعکاس سے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اسی نظریہ کی بنا پر اب ایک ایسا آلہ بنایا گیا ہے۔ جس میں دیکھنے سے آفتاب کی روشنی کا اثر زائل ہوجاتا ہے۔ اور اُس کی امداد سے دن کے وقت بھی تارے دیکھے جاسکتے ہیں اور اُن کے فوٹو لئے جاسکتے ہیں۔ اس دریافت سے دنیائے فلکیات کے متعلق عجیب و غریب حالات کا انکشاف ہوگا۔ اور بے شمار نئے تارے دریافت ہونگے۔

طویل العمری۔ فرانس کے مشہور سائنسدان موسیو طورسن کا نظریہ طویل العمری کے متعلق مستند ہے اور وہ یہ کہ انسان جتنے سال بڑھتا رہتا ہے۔ اُس سے پانچ گنا سال اُس کی عمر ہوتی ہے چونکہ عام طور پر انسان کا جسم بیس اکیس سال کی عمر میں بڑھنا بند ہوجاتا ہے۔ اس لئے انسانی عمر ایک سو پانچ سال تک ختم ہوجاتی ہے۔ مگر زیادہ سے زیادہ احتیاط کرنے پر آدمی چالیس سال تک اپنے جسم کو بڑھا سکتا ہے۔ اس لئے دوسو سال سے زیادہ عرصہ زندہ رہنا امر ناممکن ہے۔

لیکن اب سوئٹزرلینڈ کے مشہور ڈاکٹر سپالنگر نے ایک ایسی دوا تیار کی ہے۔ جس کی پچکاری کرنے سے انسانی جسم کی ترقی کا سدِ باب کرنے والے جراثیم ہلاک ہوجاتے ہیں۔ اور انسان زیادہ عرصہ تک زندہ رہ سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کا دعوےٰ ہے۔ کہ دوسو سال کی عمر مستقبل قریب میں معمولی عُمر متصور ہوگی۔

دنیا کا گرم ترین طبقہ۔ دنیا کا گرم ترین طبقہ کیلفورنیا کا ایک ایسا قطعہ زمین ہے۔ جو ڈیڑھ سو میل لمبا اور بارہ میل چوڑا ہے۔ اس جگہ ایسی گرمی پڑتی ہے کہ برف کا پانی چند ہی منٹوں میں بھاپ بن جاتا ہے۔ اور رات کے بارہ بجے بھی ایکسو بیس درجہ کی حرارت رہتی ہے۔ اس جگہ جا کر زندہ بچنا

قطعاً ناممکن ہے۔ اس لئے اس جگہ کا نام "وادیٔ موت" رکھا گیا ہے۔

مگر اسی مقام پر ایک ایسی دوا پائی جاتی ہے۔ جو مرگی کے لئے نہائیت ہی مفید ثابت ہوئی ہے۔ اُسے حاصل کرنا آسان نہیں۔ ایک ایسی پوشاک تیار کی گئی ہے۔ جس کو پہن کر مزدور وہاں جا سکتے ہیں۔ مگر پھر بھی اُن میں سے ایک چوتھائی حصّہ ہلاک ہو جاتا ہے۔

سمندر کی گہرائی اور وزن۔ سمندر کی گہرائی اور اُس کا وزن کتنا ہے۔ یہ بتانا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ اس مضمون پر کئی سال سے بحث ہو رہی ہے۔ اس کے متعلق کئی قسم کے تجربات کئے جا رہے ہیں۔ اس وقت تک اس باب میں جو کامیابی ہو چکی ہے۔ اور جو نتائج اخذ کئے جا چکے ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں:-

بحر اوقیانوس تین کروڑ پچاس لاکھ کوس رقبہ زمین میں پھیلا ہوا ہے۔ اور بحر اطلانطک ایک کروڑ پچاس لاکھ کوس میں اس وقت تک بحر اوقیانوس کے پانی کا وزن جو تخمینہ لگایا گیا ہے وہ ۹۴۸۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ کروڑ ٹن ہے۔ بحر اطلانطک کی گہرائی زیادہ تر مقامات میں تین میل کے قریب ہے اور اس کا وزن قریباً ۲۵۰۰۰۰۰۰۰۰ ۳ کروڑ ٹن ہے دوسرے سمندر ان دونوں کے مقابلہ میں بہت چھوٹے ہیں۔

آواز کی طاقت۔ کیا آپ نے کبھی سوچا کہ آواز میں کس قدر خوفناک طاقت ہے۔ اور اُس کو بے جان اشیاء پر کتنا اقتدار حاصل ہے۔

سائنسدان کہتے ہیں۔ کہ موسیقی کا بیجان اشیاء پر حیرت خیز اثر ہوتا ہے اور دُنیا کی ہر ایک چیز کا کسی نہ کسی خاص سُر سے تعلق ہے۔ وہ سُر اُس چیز کو حرکت میں لا سکتا ہے۔ مثلاً ایک مکان کا تعلق پنچم سُر سے ہے۔ تو اگر کوئی شخص اس کے پاس پنچم سُر میں گانا شروع کر دے تو نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ وہ مکان کانپنے لگے گا۔ مگر اس طرح کہ اُس کے رہنے والوں کو محسوس تک نہیں ہو سکے گا۔ لیکن اگر بہت سے آدمی مل کر ایک ہی وقت میں اُسی سُر میں گانا شروع کر دیں۔ تو مکان اتنا مست ہوگا اور ایسے زور سے جھومنے لگے گا کہ آناً فاناً گر جائیگا۔

کینیڈا کے ایک آدمی نے ایسا موٹر ایجاد کیا ہے جو اُسکی سیٹی کی آواز پر چلتا ہے۔ اُس کی تہ میں یہی اصول پوشیدہ ہے +

نسوانی دُنیا

احاطہ مدراس میں ارودمیونسپلٹی پہلی میونسپلٹی ہے۔ جس نے اپنی ابتدائی جبریہ مفت تعلیم کی اسکیم میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تمیز روا نہیں رکھی۔ وہاں اس آزادخیالی اور نسوانی حمایت کو قدردانی کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے۔

مدراس کی سات نسوانی انجمنوں کا ایک مشترکہ عظیم الشان جلسہ مدراس سینیٹ ہُوس میں ہُوا۔ جس میں طالب علم لڑکیاں، اُستانیاں، گریجوایٹ خواتین اور تعلیم نسوان کی بہی خواہ معزز عورتیں شامل ہُوئیں۔ صدر جلسہ لیڈی ٹی سداسوآئر تھیں عورتوں نے پُرزور تقاریر میں لڑکیوں کی جبریہ تعلیم کے خیال پر اظہارِ پسندیدگی کیا۔

اس وقت دوسو سے زائد چینی لڑکیاں امریکہ میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ جنہوں نے اپنی تعلیم کا مقصد محض یہ قرار دیا ہے کہ چین کو مغربی علوم سے فائدہ پہنچایا جائے۔

پیرس میں حال ہی میں ایک طبّی کانفرنس منعقد ہُوئی تھی۔ اس میں اتفاق رائے سے فیصلہ ہُوا ہے کہ مستورات کے جسم کی بناوٹ اس قسم کی ہے کہ گھر کے کام کاج ہی سے اُنکی صحت درست رہ سکتی ہے۔ ورنہ نہیں۔

امریکن عورتیں سیاسی جدوجہد میں بیش از بیش حصّہ لینے لگی ہیں۔ اُن کا زیادہ تر وقت اب سیاسی بحث ہی میں صرف ہوتا ہے۔ اس وقت چار عورتیں سینیٹ کی ممبری، بیس عورتیں کانگریس کی ممبری اور دو عورتیں ریاستوں کی گورنری کی اُمیدوار ہیں۔

آجکل اخبارات میں ایک انگریز لڑکی کا بہت شہرہ ہے جس نے لنڈن میں منعقدہ موسم بہار کی نمائش میں مصوری کیلئے انعام حاصل کیا ہے! اس لڑکی مس للین شوپر کی عُمر اس وقت صرف پندرہ سولہ سال کی ہے جب اُس نے اپنی تصویر نمائش میں روانہ کی تو اُسے شبہ تھا۔ کہ آیا میری تصویر کو وہاں رکھنے کی اجازت بھی ملیگی یا نہیں۔ مگر اُسکی تصویر کو بارہ ہزار مصوّروں کی تصاویر سے عمدہ قرار دیا گیا۔

ہمایوں

جلد ۲ — اکتوبر ۱۹۲۲ء — نمبر ۴

اُمیّد

جگر میں یاس قیامت اُٹھائے پھرتی ہے
اُمید سوچ میں بیٹھی ہے سر جھکائے ہُوئے!

کُرۂ ارض پر یاس و حرماں کی کالی کالی گھٹائیں چھا رہی ہیں، اِدبار کی تیز و تند ہوا مطمئن پانیوں کو جنبش میں لاتی ہے اور بحرِ ناپیدا کنار کی لہریں اس طرح اُٹھتی گرتی ہیں گویا اُنکا مدّ و جزر دُنیا کے دل کی دھڑکن ہے! ہلاکت کا دیوتا اپنی چیخ پکار سے نوعِ انسان کی بستیوں میں شدت کا اضطراب پیدا کر دیتا ہے اور عالمِ موجودات کا ہر وجود اُس طوفانِ عظیم کے خیال سے کانپ اُٹھتا ہے جسکا آغاز اسقدر ہیبتناک اور جسکا شباب اس سے بڑھ کر جانفرسا ہوگا! —— ایسے دلگداز وقت میں اسی کُرۂ ارض پر ایک صورت تنِ تنہا بیٹھی ہے، اُسکے غرور کو رنج و اندوہ نے سرنگوں کر دیا ہے، اُسکی آنکھوں پر مصیبت نے جفا کی پٹی باندھ دی ہے، وہ سر جُھکائے اُس ساز کو جسکے ہر تار سے زندگی کے نغمے نکلتے ہیں تھامے ہُوئے ہے!! قسمت کے ہاتھوں ایک کے بعد دُوسرا تار ٹوٹتا ہے۔۔۔ یہانتک کہ اب صرف ایک ہی تار باقی ہے!،،، تاریکی چاروں طرف کاجل کی طرح برس رہی ہے۔۔۔ ہاں ایک ستارہ ہنوز نمودار ہے اور اُسکی ننھی کرن اس ظلمت آباد میں آوارہ و تنہا پھر رہی ہے:،،،—— یہ صورت کون ہے؟ اُمید! اور یہ جھلملاتی ہُوئی روشنی اُمید کی آخری کرن!! —— نغمۂ اُمید بدستور جاری ہے اور شعاعِ اُمید بدستور تاباں!

کیا اِس نغمہ کو جوابِ نغمہ نہ ملیگا؟ گُذرے دنوں میں جب یہ ساز ہمنوائی سے معمور تھا تو موسیقی یُوں تشنۂ وصال نہ تھی، نغمہ

راگنی کے سپرد تھا راگنی نغمہ میں غرق تھی! لیکن اس قُربِ ظاہری میں کمالِ محبت کیلئے جگہ نہ تھی اور مُطربِ حقیقی کو منظور یہ تھا کہ وہ سازِ حیات میں خود اپنی شانِ کمال کا آوازہ سُنے جو اس وقت تک آوازوں ہی کے ہجوم میں گُم تھا!! ـــــ تار سے عجزِ محبت کا نغمہ نکلتا تھا کہ حُسنِ ازل کی ہم آہنگی کائنات کے کونے کونے سے اُسکی پذیرائی کو بڑھی اور یہ لاتعداد صداؤں کی آواز ہمیشگی کے گنبد سے ٹکرا کر مخلوقات کے ذرے ذرے میں نفوذ کر گئی! ـــــ بادل جو تو بہ تو چھائے ہُوئے تھے پھٹے، ستارے کا نُور پھیلا اور ہزاروں لاکھوں ستاروں نے اپنی اپنی کرن سے زمین و آسمان کی تاریکیوں کو روشن و پُر نور بنا دیا!!

سچائی کی آواز دُنیا میں ہمیشہ ایسے اوقات میں بلند ہُوئی ہے جب ظلم و کذب کا اندھیرا انسانی آبادیوں پر چھا گیا ہے، جب اخلاق و مذہب کے مُنہ خاک سے بھر دیئے گئے ہیں، جب چند نفوس نے دیگر ہمجنسوں کو یا ایک قوم نے کسی دوسری قوم کو بے اعتنائی کے ساتھ اپنے پاؤں تلے روند دیا ہے!

مغرب جہالت و ناشائستگی میں مگن تھا، روما کی سطوت محض طاقت کے گورکھ دھندوں میں آشکار تھی، شمالی ملکوں میں ابھی رُوحانیت کا نام تک نہ سُنا گیا تھا کہ ـــــ مسیح نمودار ہُوا اور اپنے ایثار سے کروڑوں مُردہ دلوں میں جان ڈال دی!

ہند میں مذہبی جبر و تفوق کا بازار گرم تھا اور انسانی زندگی بے معنی قربانیوں میں صرف ہو رہی تھی کہ بُدھ نے آکر انسانی مساوات اور نفس کُشی کا عملی درس دیا!

عرب کا خمارِ جاہلیت کسی طرح اُتارے نہ اُترتا تھا، دُنیا بت پرستی کے نئے نئے طریق اختراع کرتی تھی، بندے اپنے پروردگار سے کوسوں دُور پڑے تھے کہ پیغمبرِ اسلام نے ہادئ عالم بنکر راستی اور وحدانیت کا سیدھا رستہ دکھا دیا!! ایسے نازک وقتوں میں افراد سینکڑوں بار نا اُمید ہو ہو گئے ہیں لیکن خود فطرت کبھی نا اُمید نہیں ہُوئی! ایسی مشکل ساعت میں انسانیت ہمیشہ رفعت کی چوٹیوں پر اُمید کی شکل میں جلوہ افروز ہُوئی ہے!! ـــــ یُورپ کے خود پرست مطلق العنان اور خود کام جاگیردار اپنے موروثی حقوق پر جمے بیٹھے تھے اور کسانوں مزدوروں کو پیٹ بھر کے کھانا نصیب نہ ہوتا تھا کہ فرانس میں اک انقلابِ عظیم نے کروٹ بدلی اور دُنیائے مغرب یکسر آزادی کے نعروں سے گونج اُٹھی!

ایشیا کے رہنے والو! اپنے خدا پر بھروسہ کئے رہو اور ہمت و استقلال کا دامن نہ چھوڑو کہ حُریت کی رُوح کرۂ ارض پر تمہارے لئے سرنگوں ہے اور اُمید کی آخری کرن، ہنوز بے تابی کے ساتھ چمک چمک کر، سیاہ بادلوں کو اپنی آسمانی روشنی سے زریں و تاباں بنا رہی ہے!!

بشیر احمد

دوشیزۂ فرانس

۲

پہلی فتح

کہتے ہیں کہ وہ دُعا جو خلوصِ دل سے کی جائے قبول ہو جاتی ہے!

کیا ہر ایسی دُعا قبول ہوتی ہے؟ یہ دُعاؤں کا قبول کرنے والا ہی جانتا ہے! گنہگار بندوں کو اس لاحاصل بحث سے کیا واسطہ؟ انہیں تو یہی بس ہے کہ دل میں خلوص پیدا کریں اِس خلوص کے ساتھ دُعا کریں اور پھر یقین رکھیں کہ یہ دُعا قبول ہو چکی!

گنہگار سے گنہگار کے لئے بعض اوقات اک ایسی قبولیت برسوں تک پوشیدہ حقیقت رہتی ہے کہ اُس کی صدائے بازگشت صدیوں کے گنبد سے ٹکرا کر عرصۂ کائنات کے کونے کونے میں پھیل جاتی ہے!

ایسی ہی تھی شہزادۂ فرانس کی دُعا جو اِک دردمندی کے لمحے میں عشرت گاہِ شاہی سے بلند ہوئی اور جس کے لئے فلک پر پہنچتے ہی بابِ اجابت وا ہو گیا!

وہ گنہگار تھا! برسوں سے اجنبی غنیم، فرانس کا بن بلایا مہمان، ملک کو تباہ و برباد کر رہا تھا، ہر سُو ہلاکت اپنے کارنامے سُنا رہی تھی، لوگ امن و امان کی زندگی بھول کر سمجھے بیٹھے تھے کہ اُن کی قسمت مُصیبت سے تبدیل ہو چکی ہے، شہزادہ ان کی تنہا اُمید تھی، اُسے مُلک کو آزاد کرنا اُسے ہی فرانس کو ازسرِنو قومیت کی عام خوشیوں سے معمور کرنا تھا۔ لیکن وہ گنہگار تھا، باوصف اُن مایوسیوں اور ناکامیوں کے جو ہر میدانِ جنگ میں اس کے نبرد آزماؤں کا حِصّہ تھیں، اُس غارتگری کے ہوتے ہُوئے جو غنیم وہاں سے چند ہی کوس پر نہایت سنگدلی کے ساتھ کر رہا تھا وہ اپنے اُمرا و خوانین میں گھرا ہُوا، خوشامدیوں اور نکھٹوؤں کے جمگھٹے میں پابندِ عشرت ہو کر عُمر کے رہے سہے دن کاٹ رہا تھا!

ہاں! قدرت کبھی کبھی گناہوں کی کدورت سے اپنی سحرکاری کے جلوے دکھاتی ہے شہزادہ گاہے گاہے اس عیش وتنعّم سے الگ ہوکر ملک کے درد و رنج کو اپنے عمقِ دل میں محسوس کرتا اور سوچتا کہ میرا کام یہ نہیں جو میں کر رہا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ جاں فرسا خیال کہ میں حقیقی ولیعہدِ سلطنت ہوں یا نہیں ہوں بنیادِ ہستی کو متزلزل کر دیتا اور مایوس و برافروختہ ہوکر شہزادہ پھر نشاط و مسرت میں غرق ہوجاتا!

× ×

ایک صُبح، نُور کے تڑکے، جب کہ دربار کی جُملہ عشرتیں تھک کر گہری نیند سو رہی تھیں اور صرف عنایتِ ایزدی بیدار تھی، اک ایسے لمحے میں جب دُنیا شک و شبہ سے تعبیر ہوتی تھی اور صرف مشیتِ پروردگار کی ہر بات پر یقین کرنے کو جی چاہتا تھا شہزادہ اپنی خلوت گاہ میں آیا اور اپنی آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھا کر دل ہی دل میں کہنے لگا "بارِ خدایا! اگر میں در اصل وارثِ حقیقی ہوں، فی الحقیقت فرانس کے شاہی خاندان سے ہوں اور اس مملکت کا میں ہی حقدار ہوں تو اپنی رحمت سے میری حفاظت کر اور مجھے اپنی پناہ میں لے لے یا اگر تجھے یہ منظور نہیں تو اتنی توفیق دے کہ میں بچ کر ہسپانیہ یا اسکاٹلینڈ کو بھاگ نکلوں جہاں کے باشندے پُشتوں سے شاہانِ فرانس کے حلیف و ہم درد چلے آتے ہیں اور وہاں میرے لئے کوئی ٹھکانہ بنادے!"

اس کے چند ہی روز بعد خبر آئی کہ دومرمی کی کم سن لڑکی شہزادے کے سامنے حاضر ہونے کی اجازت چاہتی ہے!!

شینوں جو شہزادے کا مقام تھا کارزارِ طور سے، جہاں سات سو برس پیشتر عربوں اور فرنگیوں کے درمیان یورپ کی قسمت کا فیصلہ عیسائیت کے حق میں ہُوا، تھوڑے ہی فاصلے پر واقع ہے اور یہی اِن دِنوں حکومتِ فرانس کا عارضی دارالسلطنت تھا!

ژان کے آنے کی خبر سُن کر قلعہ میں غیر معمولی جنبش نظر آئی۔ چارلس کا وزیرِ اعظم طریمول ژان کی حوصلہ افزائی کرنے کے قطعی مخالف تھا۔ لیکن خود چارلس تذبذب کی حالت میں تھا اور بعض اُمرا یہ سمجھ کر کہ اور کچھ نہیں تو تفریحِ طبع کا سامان ہوجائیگا خیر مقدم کرنے کو تیار تھے۔

مارچ کی اک شام تھی جب ژان قلعہ میں داخل ہُوئی۔ دیوانِ عام میں اُمرا و وزرا کا دربار

منعقد تھا، پچاس بڑی بڑی مشعلیں جل رہی تھیں، بیسیوں صوبہ دار اپنی زرق برق پوشاکیں پہنے جلوہ آرا تھے اور فرانس کے تین سو چوٹی کے شہسوار اپنی تنگ وچست وردیاں زیب تن کئے شانِ سپہ گری کے ساتھ استادہ تھے۔ ایوان سے شاہانہ شوکت وجلال ٹپکتا تھا اور دلوں پر زیب و زینت کا رعب چھایا جاتا تھا! ایک امیرزادہ نے ژان کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ اپنے موٹے جھوٹے دیہاتی کپڑے پہنے اندر داخل ہوئی، چارلس کچھ شاید تفریح کے طور پر اور کچھ دل ہی دل میں محسوس کر لینے کے باعث اپنی جگہ سے اُٹھا اور عام لوگوں میں جا کھڑا ہوا" بھولی بھالی کسان لڑکی درباریوں کی مسکراہٹ اور ظاہرا شک و شبہ سے ذرا نہ جھجکی بے دھڑک سیدھی شہزادے کی طرف چلی گئی اور اُس کے سامنے دو زانو ہو کر بولی" شریف دوفین! خدا تمہاری عمر میں برکت دے"۔ چارلس نے کہا" مگر میں تو بادشاہ نہیں ہوں، بادشاہ وہ دیکھو وہاں ہے" "شریف شہزادے!" ژان نے کہا" تمہیں ہو، اور کوئی نہیں!" پھر اُٹھ کھڑی ہوئی اور بولی" اچھے دوفین! میں ہوں ژان دوشیزہ! مجھے آسمانوں کے بادشاہ نے تمہارے پاس پیغام دیکر بھیجا ہے کہ ریمز پر تمہارا تقدس" اور تاجپوشی ہوگی اور شاہِ فلک کی طرف سے جو حقیقی شاہِ فرانس ہے تم فرانس کے حکمران مقرر کئے جاؤ گے"!

ہنسی اُڑانے والے خاموش ہو گئے، تفریح و استہزا کی گنجایش نہ رہی، درباریوں نے جب شہزادے کی متین صورت دیکھی تو اُن کی مسکراہٹ سنجیدگی سے بدل گئی۔ شہزادہ ژان کو الگ دریچے کی طرف لے گیا، رات کی تاریکی میں اوپر تاروں کی خوشنما ٹمٹماہٹ اور نیچے دریا کا دلفریب بہاؤ تھا، ژان نے اُسے کہا" مجھے تم کو اپنے آقا کی طرف سے یہ پیام دینا ہے کہ تم فرانس کے حقیقی ولی عہد اور بادشاہ کے اصلی بیٹے ہو۔ اُس نے مجھے بھیجا ہے کہ میں تمہیں شہر ریمز کو لے چلوں جہاں تمہاری رسمِ تقدس اور تاجپوشی ہوگی"۔۔۔ یہ کہہ کر ژان نے نہ معلوم شہزادے کی نگاہ میں کیا دیکھا کہ ذرا سختی کے لہجے میں بولی" اگر تمہاری مرضی ہو!"

کیا یہ جوابِ ایزدی تھا شہزادے کی اُس دُعا کا جو دل ہی دل میں کی گئی تھی اور جسکا بجز اُس کے کسی کو علم نہ تھا؟ چارلس لڑکی کی صداقت اور نیک نیتی سے غایت درجہ متاثر ہوا۔ لیکن درباریوں کی یہ کیفیت نہ تھی۔ عورتیں تو ہمیشہ اُس پر یقین رکھتی ہی تھیں اور ہر بات میں

اُس کی سچائی کی قائل تھیں مگر کلیسا کا مسلک کبھی غیر جانب داری کا تھا کبھی مخالفت کا اور فوجی آدمی اُسے علانیہ نفرت و استہزا کی نظروں سے دیکھتے تھے اور اِس خیال کو صریح حماقت سمجھتے تھے کہ اک ایسی نوعمر لڑکی کے ہاتھ میں سپاہیوں کی جان اور مُلک کا تحفظ و انتظام دے دیا جائے اور بظاہر کون کہہ سکتا تھا کہ شک کرنے والے یا ہنسی اُڑانے والے حق بجانب نہیں ہیں؟ کون بے سوچے سمجھے ملک و اہل ملک کی قسمت کو اک ناتجربہ کار کے کہنے پر اُس کے سپرد کر دیتا؟ تجویز کی گئی کہ حکما و علما کی ایک جماعت ژان کا امتحان لیکر اپنی رائے سے شہزادے کو مطلع کرے چند استقفوں کے مختصر سوالات کے بعد ژان کو پُواتیئر بھیجدیا گیا جہاں کے دارالعلوم مقامی مجلس شوریٰ اور کلیسا کے اربابِ حل و عقد اُس کا امتحان کرنے کو جمع ہوئے۔ ژان اک مجرم کی طرح اِن منصفوں کے سامنے لائی گئی اور اُس پر یوں جرح کی بوچھاڑ ہونی شروع ہوئی

ایک راہب نے کہا، "تم کہتی ہو کہ خدا فرانس کو بچالیگا، اگر اُس کی مرضی ایسی ہی ہے تو اُسے جنگجوؤں کی کیا حاجت ہے!"

لڑکی نے ذرا تندی سے جواب دیا، "آدمیوں کا لڑنا ضروری ہے، فتح خدا دیتا ہے!"

ژان کسان لڑکی تھی بعض باتوں میں کسانوں کی طرح اکھڑ مزاج۔ ایسی لایعنی باتیں سُنتی تو غصّے میں آجاتی۔

ایک پادری نے جو تحقیقات کو اپنے فضول سوالات سے کمزور کرنا چاہتا تھا پوچھا "تمہارے آسمانی مہمان کونسی زبان بولتے ہیں؟" ژان نے جھنجھلا کے جواب دیا "تمہاری زبان سے بہتر!" اُس نے بھی تند خوئی سے کہا "کیا تم خدا کو مانتی ہو؟" لڑکی نے اُسی طرح کہا "ہاں! تم سے بہتر۔" ایسی ہوشیار ترکی بہ ترکی جواب دینے والی کو بحث مباحثے سے عاجز کرنا دشوار تھا۔ راہب نے کہا "نرے لفظوں سے کچھ نہیں بنتا خدا ہمیں تم پر یقین نہ لانے دیگا جب تک تم اُس کی کوئی نشانی ہمکو نہ دکھاؤگی" اس کا جواب ژان نے نہایت متین لفظوں میں، اگرچہ ذرا غصے سے، یوں دیا، "میں پُواتیئر کو اس لئے نہیں آئی کہ اپنی نشانیاں دکھاتی پھروں۔ البتہ مجھے اورلیاں لے چلو پھر میں وہ نشانیاں دکھادوں گی جن کے دکھانے کو میں بھیجی گئی ہوں۔ مجھے چاہے کتنا ہی چھوٹا دستہ لڑنے والوں کا دو لیکن مجھے جانے دو"۔

اورلیاں کی حالت اس وقت نازک تھی۔ وہاں انگریزوں نے فرانسیسیوں کو محصور کر رکھا تھا یہ شہر پیرس سے چالیس پچاس میل جنوب مغرب اور شینوں سے اسی نوے میل شمال مشرق میں دریائے لوار کے کنارے واقع ہے۔ اس کے اردگرد کوئی پہاڑی یا بلند سطح زمین نہیں بلکہ کوسوں تک میدان ہی میدان چلا گیا ہے جیسا کہ وسط فرانس کی عام سطحی حالت ہے۔ محاصرین نے اُس کے چاروں طرف اونچے اونچے برُج بنا رکھے تھے اور ان سے وہ شہر پر گولہ باری کرتے تھے، صرف جنوبی طرف جدھر دریا بہتا تھا کچھ کھُلی تھی اور ادھر ہی سے محصورین کو سامان خورونوش بہم پہنچتا تھا۔ محاصرے کا کام انگلستان کے بہترین سپہ سالاروں کے ہاتھ میں تھا۔ باشندوں کو کمک پہنچنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ شہر کا فتح ہو جانا یقینی تھا۔ ہاں کہیں سے کوئی بڑی فوج حملہ آوروں کو پس پا کرتی ہوئی آجاتی تو اور بات تھی لیکن سب جانتے تھے کہ غریب الوطن شہزادہ کے ہاتھ خالی ہیں وہ اتنی بڑی فوج کیونکر بہم پہنچا سکتا ہے۔ ژان نے ہمیشہ انگریزوں کی شکست اور اورلیاں کا محاصرہ اُٹھانا اپنے مقررہ کام کا پہلا مرحلہ قرار دیا تھا۔

اس باضابطہ سرکاری تحقیقات کے علاوہ ژان پر عوام الناس کے سوالوں کی بوچھار ہونے لگی۔ لوگ جوق جوق اُس کے گھر آتے اور سوالوں کی بھرمار کرتے یہاں تک کہ وہ اور اُس کی آوازیں شہر بھر میں مشہور ہو گئیں اور گردونواح کی آبادیاں بھی اُس کے ذکر سے گونجنے لگی۔ عورتیں اُسے سچا گردانتیں مگر اُس کا لباس دیکھ کر ذرا سر ہلاتیں کہ یہ مردوں کا لباس کیوں پہنتی ہے؟ ژان کا جواب تسلی بخش تھا۔ اول تو یہ کہ یہی جنگی لباس تھا، جنگ کرنا عورتوں کا کام نہیں لیکن جب یہ کام کرنا پڑے تو بجز اس کے چارہ نہیں کہ وہ لڑنے والوں کی وردی زیب تن کریں۔ دوسرے اس لئے کہ اُسے مردوں کے درمیان رات دن رہنا تھا اور یہ لباس ہی اُس کا بہترین محافظ ہو سکتا تھا۔ ان باتوں کا چرچا لازم تھا۔ اگر اُسے اپنا کام سرانجام دینا تھا تو بہتر یہی تھا کہ خاص عام اُس کی بات بات کو جان جائیں۔ آخر علماء و حکماء نے فیصلہ کیا کہ وہ ژان کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتے اور اُنہوں نے مجبوراً بادشاہ کو کہلا بھیجا کہ آپ اِس سے جو کام چاہیں لے سکتے ہیں۔ اس کے بعد ژان کو شینوں لایا گیا جہاں ملکۂ فرانس اور دوسری خواتین نے ایک نسوانی تفتیش پہلی تحقیقات سے زیادہ سخت اور نتیجہ خیز، شروع کر کے اُس کے بھولے پن اور عصمت کی اچھی طرح پڑتال کی۔

نتیجہ وہی ہوا کہ وہ بھی ژان کے خلاف کوئی سخن زبان پر نہ لاسکیں اور اُسے قطعی نیک و پاک کہہ کر انہوں نے اُس کے حق میں فیصلہ کر دیا +

اب وقت آگیا کہ دوشیزہ کو اُس کے عظیم الشان کام کے لئے تیار کیا جائے۔ اُس کی رہائش کا باقاعدہ انتظام کیا گیا اور ایک فوجی عملہ اُس کی خدمت و مشورت کے لئے مامور کیا گیا جسکا سرکردہ ژان دولوں تھا + چارلس اُسے اپنے پاس سے ایک تلوار دینا چاہتا تھا لیکن ژان نے خود ہی حکم دیا کہ فیئر بوآ کے گاؤں میں (جو شینوں کو آتے راہ میں پڑتا تھا) سینٹ کاترین کے گرجا کی اونچی قربانگاہ کے عقب میں ایک تلوار مدفون ہے وہ اُس کے لئے لائی جائے۔ تلوار وہیں ملی جہاں ژان نے بتایا تھا۔ صاف و صیقل کر کے گرجا والوں نے اُسے اک قرمزی مخمل کے میان میں رکھا۔ اور ژان کو تحفۃً بھیجدی + دوسری چیز جس کی اُسے ضرورت تھی اُس کا عَلَم تھا جس کی اُس کے دل میں بڑی اہمیت تھی + یہ عَلَم جو طور میں تیار کیا گیا سفید کتان کے کپڑے کا تھا۔ جس پر ریشمیں جھالر ٹکی تھی اور حضرتِ مسیح کی اک شکل بنی تھی کہ اپنے ہاتھوں میں کرۂ ارض کو تھامے ہوئے ہیں اور دائیں بائیں دو فرشتے حسنِ عقیدت سے دوزانو ہیں + نیچے لکھا تھا "مریمؑ مسیحؑ" + عَلَم ژان کی ہدایات کے مطابق بنایا گیا تھا۔ جو دراصل اُس کی مرشد مارگریت اور کاترین کے اشارات تھے + طور میں اب تک اس کی نقل موجود ہے نسلاً بعد نسلٍ لوگ اِس کا نقشہ اُتار کر ایسے بیسیوں جھنڈے تبرکاً تیار کرتے رہے + ژان نے ارادہ ظاہر کیا کہ وہ خود ہی عَلَم بردار بنے گی۔ سپہ سالار کے لئے عَلَم برداری اک عجیب سا کام تھا لیکن ژان کے آسمانی رہبروں کا ارشاد یہی تھا جس سے سرِمو تجاوز ناممکن تھا۔ اُنکی ہدایت تھی کہ "خدا کی راہ میں عَلَم کو تھام لے اور اُسے دلیرانہ لئے جا" علاوہ بریں اس میں اُس کا اک سادہ طفلانہ مطلب بھی تھا جو اُس نے شرماتے ہوئے ظاہر کیا کہ "میرا مطلق ارادہ نہیں کہ میں اپنی تلوار چلاؤں اگرچہ مجھے اُس سے بڑی محبت ہے، میں کسی شخص کی جان نہیں لینا چاہتی" عَلَم برداری کا کام کسی کو دُکھ نہ دیگا، اس سے کسی کا خون نہ بہے گا! ملاحظہ ہو کہ عَلَم بھاری اتنا تھا کہ اک نازک اندام شہری خاتون اُسے نہ اُٹھاسکتی، یہ اک مضبوط کسان لڑکی ہی کا کام تھا کہ اُسے گھنٹوں اُٹھائے اُٹھائے پھرے!

تحقیقات و تفتیش میں بہت وقت گذر گیا یعنی قریب قریب دو ماہ صرف ہو گئے تھے + ژان کی نظروں میں یہ وقت محض ضائع ہوا کیونکہ اس دَوران میں اورلیاں کے مصیبت زدہ لوگ

انگریزوں کے حملے سہتے سہتے تھک گئے، یُوں تو ڈُونو آسا سالار شہر کی محافظت پر کمر بستہ تھا لیکن اس کھیل میں ہار ہی ہار تھی ہار فرانساوی قوم کی سیرت سے مطابقت نہ رکھتی تھی۔ انگریزوں سے پے در پے زک اُٹھانے کے باعث اُن کی اٹل فتحمندی کا خیال لوگوں کے دل و دماغ پر چھایا ہُوا تھا، یہ قسمت کی اک بدنصیبی تھی جس سے وہ اپنے تئیں بچا نہ سکتے تھے اور ڈونو آ کو بھی یقین تھا کہ ہتھیار ڈال دینے کے بغیر کوئی چارہ نہیں + ایسی حالت تھی کہ ژان طُور سے ہوتی ہُوئی بلوآ پہنچی + جنگجوؤں کی ایک چھوٹی سی جمعیت اور بہت سے قائد اور کپتان ساتھ تھے + ملکہ صقلیہ نے غازیۂ فرانس کو اپنے ہاتھوں سے آراستہ کیا تھا۔ اپنی سفید و تاباں زرہ پہن کر وہ فرشتۂ میکائیل کی سی اک نورانی صورت بن گئی۔ اُس کا سر برہنہ تھا اور چمکتے ہُوئے سورج میں وہ ایک آسمانی خاتون معلوم ہوتی تھی جو سرسبز شاداب میدانوں کو اپنی مختصر جمعیت کے ساتھ عبور کر رہی ہے تاکہ اُنہیں کسی پاکیزہ عبادت گاہ کی طرف لے چلے + ژان پہلے سے یہ بات واضح کر چکی تھی کہ حملہ کرنے سے پہلے وہ ربّانی پیغام کے بموجب انگریزوں کو خدا کا واسطہ دے کر یہ آخری تجویز پیش کریگی کہ وہ اپنی فتوحات ترک کر دیں اور فرانس کو فرنساوی قوم کے حوالے کر کے انگلستان کو چلدیں + پس طُور سے اُس نے یہ خط انگریزوں کے نام بھیجا:۔

یسُوع مریم!

شاہِ انگلستان اور تُو ڈیوک بیڈ فورڈ جو اپنے آپ کو ناظمِ فرانس کہتا ہے اور تُو طامس میر میزان جو اپنے آپ کو اس بیڈ فورڈ کا قائد پکارتا ہے! آسمانوں کے بادشاہ کا پیام سُنو! دوشیزہ کو جسے مالکِ زمین و آسماں نے یہاں بھیجا ہے تمام اُن اچھے شہروں کی چابیاں دے دو جو تم نے اُس کے فرانس میں بجبر و تشدد فتح کئے ہیں۔ اُسے خدا نے بھیجا ہے تاکہ وہ چھنے ہُوئے حقوق شاہی کی بحالی کرے۔ وہ تمہارے ساتھ مصالحت کرنے کو تیار ہے اگر تم مناسب بات کو مان لو اور فرانس کے ساتھ انصاف کرو اور جو کچھ تم نے غصب کیا ہے ادا کر دو + اور تم تیر انداز و جنگجُو خدا کے بندو جو اورلیاں کے گرد پڑے ہو! خدا کی راہ میں سلامتی کے ساتھ چل دو۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو جلد ہی دوشیزہ کی آمد آمد کی خبر سُن لو گے جس سے تمہیں عنقریب

بہت دُکھ پہنچے گا۔ شاہِ انگلستان! اگر تم اس کی تعمیل نہ کرو گے تو سمجھ لو کہ اس جنگ کی سرکردہ میں ہوں اور جہاں کہیں فرانس میں میں تمہارے آدمیوں کو پاؤں گی اُنہیں مُلک چھوڑ دینے پر مجبور کردوں گی + میں خُدا کی طرف سے جو آسمانوں کا بادشاہ ہے یہاں بھیجی گئی ہوں کہ تم سب کو فرانس سے باہر نکال دوں۔ اگر تم میرا حکم مالو گے تو میں نرمی کے ساتھ پیش آؤنگی۔ اور اپنی ہٹ پر قائم نہ رہو اس لئے کہ تم مریم مقدس کے بیٹے کی طرف سے مُلک کے سپرد دار نہیں ہو بلکہ خدا کی طرف سے چارلس، حقیقی ولی عہد ہی سچا حُکمران ہے کیونکہ مشیتِ ایزدی یوُں ہی ہے۔ اور یہ الہام ہے دوشیزہ کا جو پیرس میں اچھے لوگوں کے ہمراہ داخل ہوگی + اگر تم اپنے پروردگار اور دوشیزہ کی یہ باتیں نہ مانو گے تو یاد رکھو کہ جہاں کہیں بھی تم پناہ گزیں ہوگے ہم تمکو ڈھونڈھ نکالیں گے اور ایسا ہنگامہ برپا کردیں گے کہ فرانس نے ہزار برس سے نہ دیکھا ہوگا۔ اور یقین کئے رہو کہ آسمانوں کا بادشاہ دوشیزہ کو اور اُس کے لڑنے والوں کو اتنی قوت بخشیگا کہ تمہاری طاقتیں سب کی سب دھری رہ جائیں گی + اے ڈیوک بیڈ فورڈ۔ دوشیزہ تجھ سے منت کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ تُو لوٹ مار کو ختم کردے۔ اگر تو عقل سے کام لے تو اب بھی تُو اُس کے دائرۂ مصاحبت میں آجائے جہاں فرانس مسیحیت کیلئے وہ کام کر دکھائے جو کبھی نہیں کیا گیا + تو جواب دے کہ کیا اب بھی تُو شہر اورلیاں کی تباہی پر کمر بستہ رہیگا؟ اگر تُو ایسا کریگا تو تھوڑی ہی مُدت کے بعد اُن مُصیبتوں کو روئے گا جو تیرے سر پر لوٹ پڑینگی!

المرقوم بروز ہفتہ (۲۲ر مارچ ۱۴۲۹ء) +

ژان نے اس اثناء میں اپنی مختصر فوج میں اک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا تھا۔ اب تک اُسے مطلق خبر نہ تھی فوج کسے کہتے ہیں اور فوجی انتظام کس طرح کیا جاتا ہے؟ لیکن اب جب کہ وہ اُن کی سپہ سالار بن چکی تھی وہ اپنی طبیعت کے مطابق بالکل نڈر اور صاف گو ہو کر فوج کے کونے کونے میں گشت کرنے لگی + عام بُرائیاں جو ایک معمولی کپتان نظر انداز کر دیتا ہے اُس کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکیں، اُس نے حکم دے دیا کہ سپاہی بڑی بڑی لایعنی قسمیں کھانا اور مغلظات بکنا قطعی طور پر چھوڑ دیں چنانچہ بڑے کپتان لائیر کو بھی جو ایک نامہذب کھردرا سا آدمی تھا صرف یہ اجازت تھی کہ وہ اپنے ڈنڈے کی قسم کھائے + ژان بے دھڑک فوج

کی صفوں میں اِدھر سے اُدھر پھرتی، شریر و خبیث لشکری اُس کے آنے پر تتر بتر ہو جاتے وہ جہاں جاتی اپنے غوغائی اکھڑ بھائیوں کو نصیحت کرتی کہ جتنے دنوں اس دنیا میں جیتے ہو اپنا اپنا فرض ادا کرو اور اگلی دُنیا کو دل سے محو نہ کردو۔ اگر وہ جان لیتی کہ کسی سپاہی کو "اعترافِ گناہ" کرنا ہے تو کوچ کرتی ہُوئی فوج کو ٹھیرنے کا حُکم دیتی، اُس کا دل نہایت نرم و حسّاس تھا۔ وہ کسی کو مرتے دیکھنا گوارا نہ کرسکتی تھی حالانکہ اُس کا منصبی کام ہی یہ تھا کہ اپنے مقصد کے حصول میں دائیں بائیں خون کی ندیاں بہتی دیکھے۔ جہاں کہیں کسی فرانسیسی یا انگریز کو بھی دم توڑتا دیکھ پاتی اُسے یہی فکر ہوتی کہ کہیں یہ بدنصیب "اعترافِ گناہ" کئے بغیر آنکھیں نہ بند کرلے۔

اورلیاں کے قریب ڈونوا جو محصورین کا سرِعسکر تھا اور ژان کا استقبال کرنے کو نکلا تھا ملا۔ دراصل ژان کو دھوکا دیا گیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ بلاتوقف انگریزی قلعہ بندیوں پر حملہ کردے لیکن وہ یہاں کی جغرافی حالت سے آگاہ نہ تھی اور اُس کے رہبر اُسے جان بوجھ کر سامنے کے کنارے پر لے آئے۔ یہ اُن فریب کاریوں کا آغاز تھا جن سے دوشیزۂ فرانس کو مسلسل واسطہ پڑا۔ قائد کپتان لفٹنٹ سب اُس کی شہرت و سبقت سے جلتے تھے۔ جہانتک ہو سکتا تھا۔ وہ اُس کی تجویزوں کو رد کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن عموماً ناکام رہتے اور نتیجتہً شرمسار۔ ژان دریا کو عبور کرکے ڈونوا سے ملی اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اُس کے ساتھ صاف صاف باتیں کرنے لگی:۔ "کیا تم اورلیاں کے قائد ہو؟" اُس نے جواب دیا۔ "ہاں میں ہی ہوں" اور مجھے تمہارے آنے کی خوشی ہے"! ژان نے کہا "کیا تمہیں ہو جو مجھے دریا کے اس کنارے پر لائے ہو۔ اور اُس کنارے پر نہیں لے گئے جہاں ٹالبٹ اور اُس کے انگریز ہیں؟" اُس نے عذر کیا کہ اُسکی اور دوسرے معاملہ فہموں کی یہی رائے تھی۔ ژان نے ذرا زور سے کہا "خدا کی رائے جو ہمارا آقا ہے زیادہ صائب اور زیادہ سودمند ہے" مسافری کشتیوں کی کمی کے باعث فوج کو تو بلوآ لوٹنا پڑا اور ژان اپنی مرضی کے خلاف اُس وافر سامانِ رسد کے ساتھ جو وہ اپنے ہمراہ لائی تھی دریا کو عبور کرنے لگی۔ ہوا مخالف تھی، لدی ہُوئی کشتیوں کے لئے پار ہونا دشوار نظر آتا تھا۔ ژان بولی "ذرا صبر کرو۔ خدا کی مدد سے سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا"۔ کہتے ہیں کہ ہوا کا رُخ فوراً تبدیل ہوگیا اور سب کشتیاں کنارے لگ گئیں۔ غنیم نے بھی کچھ دخل نہ دیا جیسا

کہ ژان نے پہلے ہی سے پیشین گوئی کردی تھی۔ کنارے کنارے ہوتے یہ جماعت شام کے آٹھ بجے شہر میں داخل ہوئی۔ دوشیزہ کے استقبال میں شہر کے سب جوان اور بوڑھے عورتیں اور بچے گھروں سے نکل نکل کر بازاروں میں دورویہ کھڑے تھے۔ ژان سیاہ زرہ والے جنگجوؤں کے عین بیچوں بیچ ایک سفید گھوڑے پر سفید زرہ پہنے اور سفید جھنڈا لئے آرہی تھی ایسے جیسے اندھیری رات میں تاریک بادلوں کے درمیان چودھویں کا چاند اپنے نقرئی حسن کے ساتھ تیرتا ہے۔ اُس کا سفید جھنڈا ہوا میں لہرا رہا تھا، اُس کی سفید زرہ چراغ و مشعل کی تیز روشنی میں جگمگا رہی تھی وہ ہوبہو اپنے فرشتۂ رحمت میکائیل کی تصویر معلوم ہوتی تھی!۔ شہر والے لڑتے لڑتے تھک گئے تھے، امید کی بعید سے بعید جھلک بھی کہیں نظر نہ آتی تھی، اُن کی شکست یقینی تھی اور پھر اس ذلت کا خیال کہ اورلیاں کی فتح فرانس کی تسخیر کا پیش خیمہ ہوگی غایت درجہ جاں فرسا اور یاس انگیز تھا۔ پھر کیا تعجب ہے کہ لوگوں نے اُس کا یوں خیر مقدم کیا گویا انہوں نے خدا کو اپنے درمیان اُترتے دیکھا۔ وہ اپنے دائیں بائیں لوگوں کو تقریر کئے جاتی تھی، اُنہیں تسلی دیتی تھی کہ گھبراؤ نہیں اور کہتی تھی کہ اگر تم میں ایمان باقی ہے تو تم یقینی طور پر اس دُکھ سے نجات پالوگے۔ ان مجمعوں سے گذر کر اُس نے گرجا میں جاکر اپنی نماز پڑھی اور خدا کا شکر ادا کیا اور پھر اُس مکان کو لوٹی جو اُسکی رہائش کیلئے منتخب ہوا تھا۔ یہ ڈیوک اورلیاں کے خزانچی کا مکان تھا۔ وہاں اِس سر برآوردہ مہمان کی آمد کی تقریب میں ایک پُرتکلف ضیافت دی گئی۔ ڈونوآ اور لائیر دونوں نے خوب پیٹ بھر کے کھانا کھایا لیکن ژان نے صرف روٹی کے چند ٹکڑوں پر اکتفا کیا۔ اس کے بعد وہ ایک خاموش کمرے میں اپنے بستر پر جا لیٹی جہاں دستورِ قدیم کے مطابق گھر کی چھوٹی بچی شارلوت اُس کی شریکِ بستر ہوئی۔ دونوں ژان دَمتیز، دُپولینی اور دوشیزہ کا بھائی پیئر سب اسی مکان کے دوسرے کمروں میں مقیم تھے یہ ۲۹، اپریل ۱۴۲۹ء کی رات تھی!

× ×

دُوسرے دن ایک مجلس حربی منعقد ہوئی جس میں سب فوجی افسر جمع تھے۔ ژان کی دلی خواہش تھی کہ انگریزوں پر فوراً حملہ کیا جائے۔ حالانکہ ابھی تک اُس کے ہمراہی جنگجو

شہر میں نہ پہنچے تھے۔ اُس کی قطعی رائے تھی کہ حملے میں ایک لمحہ بھی توقف نہ کرنا چاہیئے لیکن کپتانوں نے جو مدت سے محض مدافعانہ کارروائی میں مصروف رہے تھے اس کی سخت مخالفت کی۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے ژان کے اس قومی کام کے دَوران میں سوائے چند در چند افسروں کے (جن میں دُونوآ لائیر آلاسہن زین ترائی وغیرہ شامل تھے) باقی سب فوجیوں نے قدم قدم پر اُس کی مخالفت کی دشمنی میں کبھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور ہمیشہ ہر بات میں رخنہ اندازی کی پُوری کوشش کی۔ وہ دوشیزہ کی شہرت پر خار کھاتے تھے۔ اُن کا دل جلتا تھا کہ ہم مہینوں برسوں سے لڑتے آئے ہیں ہر ہر میدان میں ہمیں زک اُٹھانی پڑی ہے اور اب یہ کسان لڑکی یہ گنواری آکر ہماری سردار بنتی ہے اور میدانِ جنگ میں سپاہیوں کی سرکردہ بنکر فتح کی آرزومند ہے اور فتح حاصل بھی کر لیتی ہے!! یہ حاسد ہمیشہ اُسے گنواری کہہ کر پکارتے تھے۔ شریف النسل، اپنے اور اپنے باپ دادا کے کارناموں پر فخر کرنے والے اک گمنام عورت کی قیادت میں لڑنا ننگ و عار سمجھتے تھے۔ یہ تھی ژان کے ہم مُلکوں کی شرمناک حالت۔ اُدھر انگریز اُسے اپنی دشمن اور ایک جادوگرنی جانتے تھے جس کی سحر کاریاں سورماؤں کے بازو شل کر دیتی ہیں جس کی فسونگری بڑے بڑے جوانمردوں پر ایسا اثر کرتی ہے کہ اُنہیں بھاگتے ہی بنتی ہے ژان اِس فیصلے پر بہت ناراض تھی۔ اُسے اپنی ساری مُصیبتوں میں کبھی ایسی مایوسی نہ ہُوئی تھی جیسی کہ اِن باتوں سے ہُوئی۔ لیکن وہ حرفِ شکایت لب پر نہ لائی اور بلا چون وچرا اپنا کام کئے گئی۔ اُس نے دو قاصد انگریزوں کے پاس یہ پیام دے کر بھیجے کہ حکمِ خدا کے مطابق تم اپنے قلعے چھوڑ دو اور گھر چلے جاؤ۔ اُنھوں نے جواب میں دوشیزہ کو تندی کے ساتھ بُرا بھلا کہا کہ "تُو گوالن ہے گھر جاکر اپنی گایوں کو سنبھال" اور یہ بھی کہلا بھیجا کہ "اگر تُو اپنی ہٹ سے باز نہ آئیگی تو تجھے پکڑ کر جلادیں گے"۔

اِسی روز شام کے وقت وہ اپنے چند مصاحبوں کے ساتھ پُل کی طرف گئی۔ پُل بیچ میں سے توڑ ڈالا گیا تھا۔ دریا کے پار غنیم اپنی قلعہ بندیوں میں متمکن تھا۔ ژان ٹوٹے ہُوئے پُل پر غنیم کے قلعہ ٹُوریل کے جتنا قریب ہو سکا گئی اور بلند آواز سے اُنہیں کہا کہ ابھی وقت ہے چلے جاؤ اُدھر سے گالیوں کی ایک بوچھاڑ ہُوئی۔ "گوالن" اور "گنواری" پر بس ہوتی تو خیر برداشت ممکن

تھی، غنیم نے ایسے فحش اور دل آزار کلمات کہے کہ (ایک بیان کے مطابق) بے اختیار ژان کے آنسو نکل پڑے لیکن اُس نے صرف اتنا ہی کہا کہ "تم جھوٹ بولتے ہو۔ یہ کہہ کر شہر کو واپس آگئی! اس کے بعد دو دفعہ وہ دُو نو آ کے ہمراہ اپنی فوج کو آتا دیکھنے کے لئے شہر سے نکلی اور غنیم کے پاس سے ہو کے گذری لیکن نہ کوئی آدمی اپنی جگہ سے ہلا نہ کوئی بندوق چلی جیسا کہ ژان نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ہو گا۔ جب کبھی وہ قلعہ بندیوں کے پاس سے گذرتی تو بدستور گالیوں کی بُوچھار ہوتی جس کے جواب میں وہ خدا کا واسطہ دے کر پھر کہتی کہ انگلستان کو لوٹ جاؤ۔

۴ مئی کو ایک عجیب و غریب واقعہ ظہور میں آیا۔ ژان کی فوج صبح اورلیاں میں داخل ہو چکی تھی۔ اُس کا مصاحبِ اعلیٰ دو نوں تھک کے سو رہا تھا۔ شہر کے کپتانوں نے کمک کا فائدہ اُٹھا کر بغیر سنئے قائدوں کے مشورے کے فصیل سے باہر نکل کر غنیم پر حملہ کر دیا۔ یہ اک حاسدانہ کارروائی تھی جس کا مقصد تھا کہ ژان کی غیر حاضری میں فتح کا سہرا ہمارے سر رہے۔ اچانک ژان نہایت گھبراہٹ اور خوف کی حالت میں اپنے بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کی "آوازوں" نے اُسے سوتے سے جگا دیا تھا۔ اُس نے چلا کر کہا "میری مجلسِ شوریٰ مجھے انگریزوں پر حملہ کرنیکو کہتی ہے۔ یہ میں نہیں جانتی کہ اُن کے قلعوں پر حملہ کرنا ہے یا میدان میں لڑنا ہے؟" جوں جوں اُسے ہوش آنے لگا۔ اُس کا ہیجان بڑھنے لگا۔ "ہمارے جنگجوؤں کا خون بہ رہا ہے" اُس نے کہا "انہوں نے مجھے کیوں نہ بتایا؟ لاؤ میرے ہتھیار! میرے ہتھیار!" خادم سمجھے کہ اُس کے دماغ میں خبط پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن دو نوں ژان کو خوب جانتا تھا۔ اُس نے اپنی خاتون کو جلد جلد مسلح کیا۔ ژان گھر سے باہر نکلی، گھوڑا تیار تھا، نوکر نے دریچے سے جھنڈا دیا، اُسے لیا اور اسپ تازی کو ایڑ لگا کے شہر کے کوچوں بازاروں میں وہ بجلی کی طرح کوندتی ہوئی چلی۔ مصاحب ایک ایک کر کے پیچھے دوڑے اور دُور سے شور و غل سُن سُن کر حیران و پریشان ہونے لگے کہ کیا ماجرا ہے۔ ژان کا ادراک درست تھا۔ حاسدوں کی ایک جمعیت نے شہر سے چپکے چپکے نکل کر انگریزی قلعہ سینٹ لوُپ پر حملہ کیا تھا، لیکن نتیجہ وہی ہُوا جو اِس سے پہلے سبھی حملوں کا ہُوا تھا ژان شہر کے دروازے سے سرپٹ گھوڑا دوڑائے باہر نکلی ہی تھی اُس کا جھنڈا ہوا میں اُڑ رہا تھا، اُس کی سفید زرہ سُورج میں چمک رہی تھی، کہ سامنے سے فراری اُسے ملے کہ جانیں

بچانے کے لئے اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ اُس نے اُنہیں کچھ نہیں کہا کہ تم کیوں بھاگے جاتے ہو؟ البتہ اُس کے ہمراہی سپاہیوں اور شہریوں نے اِن بزدلوں کو موڑا۔ ژاں سیدھی انگریزی قلعے کے بُرج کی طرف جارہی تھی۔ دُولنوا سٹی بھول گیا جب اُس نے دُور سے دیکھا کہ وہ عین بُرج کے نیچے جا پہنچی ہے۔ اُس کی سیرت نگار خوب لکھتی ہے کہ "جو کچھ اُس نے کیا وہ نہ عورت کے کرنے کا کام تھا نہ عورت کے بیان کرنے کی بات"۔ ژاں شہریوں کی سرکردہ بنی، دُولنوا سپاہیوں کا۔ ژاں نے پہلی بار فرانساوی خون بہتا دیکھا اور اس خیال سے کانپ گئی کہ مرنے والوں میں بعض "اعترافِ گناہ" کئے بغیر زندگی کو خیرباد کہ رہے ہیں لیکن یہ ایسے پاکیزہ خیالوں کا وقت نہ تھا، سب سے بڑی ضرورت اس بات کی تھی کہ قلعہ کے ذرائع آمدورفت منقطع کر دئیے جائیں اور اُسے الگ تھلگ کر دیا جائے۔ لڑائی گھمسان کی ہونے لگی انگریز دم توڑ کے لڑے۔ وہ اس خیال سے پاگل ہو گئے تھے کہ یہ بلائے ناگہانی کیسے ٹوٹ پڑی؟ اُدھر فرانساوی اسی خیال سے شیر بن گئے تھے کہ یہ فرشتۂ آسمانی ہماری مدد کو کیونکر نازل ہُوا!

لارڈ ٹالبٹ نے دوسرے قلعوں سے کمک بھیجی مگر وہ شہر سے آنیوالے فرانسیسیوں نے راہ ہی میں روک دی۔ شام کا وقت تھا جب کہ آخر کار قلعہ فتح ہو گیا۔ اور لینیٹیوں نے قیدی ایک نہ پکڑا، سب کو تہ تیغ کر دیا۔ اِن تاریک ساعتوں میں دوشیزہ اپنا عَلَم تھامے ہُوئے ہر جگہ سے صاف نظر آتی تھی۔ نگاہ سب سے پہلے اُسی پر پڑتی تھی، کبھی اپنے جنگجوؤں کو نعرہ مارتی، کبھی آنکھوں سے دو آنسو گراتی، سارا وقت وہ صفِ اول میں قائم رہی لیکن کسی کے قتل کو تلوار نہ اُٹھائی۔ جب فتحمندی کے ساتھ شہر کو لوٹی تو اپنے ہمراہ قیدیوں کا اک خاصہ گروہ لائی جس کی وہ خود محافظت کرتی تھی تاکہ کسی دشمن کو ذرا بھی گزند نہ پہنچے۔ یہ تھا ژاں کا پہلا حملہ کس قدر تعجب انگیز! یہ تھی اُس کی پہلی فتح، کتنی شاندار!!

دُوسرے دن مجلسِ حربی منعقد ہوئی۔ دوشیزہ کو فوجیوں کا یہ فیصلہ کہ صرف چھوٹے قلعوں پر حملہ کیا جائے ناگوار معلوم ہُوا۔ حسنِ اتفاق سے غنیم نے خود ہی چھوٹے قلعے چھوڑ دیئے اور بڑے قلعوں میں اجتماعِ قوت کے اصول کے مطابق متمکن ہو گئے۔ شہر دریا کے دائیں طرف آباد تھا اور انگریزوں کے بڑے قلعے بائیں کنارے پر تھے۔ قلعہ آگستن پر حملہ کیا گیا۔ لیکن

ناکام رہا۔ فرانسیسوں کا انبوہ دوشیزہ کے اسپ کو دریا میں دھکیلے دیتا تھا کہ اُس کی آنکھ میں عزم کی بجلی چمک اُٹھی۔ گھوڑے کو ایڑ لگا کے اک ایسا نعرہ مارا کہ من چلے فرانسیسی سب اُسکے پیچھے ہو لئے۔ آن کی آن میں وہ قلعے کی نواحی خندق کے قریب تھی، یہاں اُس نے استقلال کے ساتھ اپنا عَلَم گاڑ دیا۔ میشلے لکھتا ہے کہ یہ فتح زیادہ تر کپتانوں کے زورِ بازو سے ہُوئی۔ یہ درست ہوگا، کیونکہ ژان خود اپنے زورِ بازو سے نہ جیت سکتی تھی۔ اُس نے تو عمر میں ایک بار بھی دشمن کے مارنے کو ہاتھ نہ اُٹھایا۔ لڑنے اَور تھے وہ صرف رستہ دکھانے والی تھی، وہ کام کرنے والے تھے یہ فتح دلانے والی؛ وہ جسم تھے یہ اُن کی رُوح۔ جب اُنہیں ژان کی بدولت جوش آجاتا تو وہ وہی پُرانے شجاع تھے۔ جنہوں نے فرانس کو ایک زبردست طاقت بنا دیا تھا۔ جب ہمت ہار دیتے تو وہ تھے اور انگریزوں کا تعاقب! ایسا ہی اثر دوشیزہ کا انگریزوں پر تھا۔ جب بقول اُن کے وہ اُس کا پُرجوش چہرہ اور سفید چمکتی زرہ دیکھ پاتے تو اُن پر جادو سا چل جاتا اور وہ بھول جاتے کہ اِنہیں فرانسیسوں کو اُنہوں نے بیسیوں لڑائیوں میں پچھاڑا ہے۔

۶ رمئی کو قلعہ آگستن فتح ہوگیا۔ رات کا اندھیرا زیادہ ہو رہا تھا۔ اس لئے دُوسرے بڑے قلعہ "لے ٹوریل" پر حملہ نہ ہو سکتا تھا۔ ژان کو خفیف سی چوٹ بھی آئی تھی۔ فوجیوں نے اُسے ترغیب دے کر شہر بھیج دیا اور خود یہ صلاح کی کہ اب شہر بالکل محفوظ ہے اور شہریوں کے پاس کافی خورد نوش کا سامان ہے، چنداں ضرورت نہیں کہ لڑائی کو جاری رکھا جائے۔ ژان نے یہ خبر رنج و مایوسی کے ساتھ سُنی اور خبر رسانوں سے بولی "تم نے اپنی مجلس جمالی ہے اور میں نے اپنی۔ پھر اپنے پادری سے کہا کل پَو پھٹتے ہی میرے پاس آنا اور برابر میرے ساتھ رہنا، کل مجھے بہت کام کرنا ہے، میرا خون بہے گا اور اپنے دائیں شانے کی طرف اشارہ کرکے کہا "کل میں زخمی ہونگی" اس سے ایکماہ پہلے بھی وہ یہی پیشین گوئی کرچکی تھی اور واقعہ سے تین ہفتے پہلے براباں کی کتاب البلد میں یہ بات مرقوم بھی ہوگئی تھی۔ صبح ہوتے ہی وہ شہر چھوڑ کے نکلی اگرچہ فوجیوں اور دوسرے سازشیوں نے اُسے بہت روکا۔ اُس کے بلند مرتبہ میزبانوں نے کہا "ٹھیرو اور ہمارے ساتھ اس تازہ دریائی مچھلی کے کھانے میں شریک ہو جاؤ" وہ بولی "اسے شام کے لئے رکھ چھوڑو۔ میں پل پر سے واپس آؤں گی اور چند گوڈنوں (انگریزوں) کو بھی لئے آؤں گی کہ اپنا اپنا حصہ لیں" یہ کہہ کر وہ

روانہ ہوئی۔ اُسکے پُرجوش پیرو اُسکے پیچھے تھے۔ ایک بڑے افسر نے اُنہیں شہر کے آخری دروازے پر روکنا چاہا مگر یہ طوفان ایسا نہ تھا کہ تھامے تھم سکتا۔ لوگ دیوانہ وار کشتی میں اُسکے ساتھ کو دپڑے سامنے لے طوریل کا قلعہ تھا اور یہی غنیم کی تنہا جائے پناہ تھی۔ فرنساوی فوج پڑی سستا رہی تھی نہ اُس میں آگے بڑھنے کا خیال تھا نہ پیچھے ہٹنے کے آثار۔ ژان کے پیرو قدم قدم پر اُسکے ساتھ تھے۔ وہ فرانسیسوں کی اُس خشمگیں بلند ہمتی اور بے پروا جرأت کے بل پر کارزار میں گھُس گئے جو ایسے جوش و انہماک کے وقتوں میں اپنے کرتب دکھاتی ہیں۔ جنگ و قتال کے عین بیچوں بیچ دوشیزہ کی صاف و بلند آواز سُنائی دیتی تھی "خُدا کی راہ میں"! خدا کی راہ میں"! اور اپنے آپ سے کہتی تھی۔ اچھا دل، اچھی امید! بس اب وہ ساعت قریب ہے"! لیکن کئی گھنٹوں کے پے در پے حملوں کے بعد حملہ آوروں کی ہمت میں کمی نظر آنے لگی۔ ژان نے یہ دیکھا تو ایک سیڑھی پکڑلی اسے قلعے کی دیوار کے ساتھ رکھکر چڑھنا شروع کیا ہی تھا کہ ایک تیر عین اُسکی چھاتی میں لگا۔ دوشیزہ دھم سے زمین پر گر پڑی، لوگ اُسکے چاروں طرف آ جمع ہُوئے۔ آن کی آن تو ایسا معلوم ہُوا کہ سب اُمیدیں ملیامیٹ ہوگئیں۔ کہتے ہیں کہ اس رقت آمیز ساعت میں اُسکا سب سے بڑا دشمن جس نے ہر بات میں ژان کی تجاویز کو ردکرنیکی کوشش کی تھی، اُسکے پہلو میں کھڑا تھا، وہ بے اختیار بول اُٹھا "اے دلاور خاتون! اے میرا گھوڑا، اور دل سے کدورت مٹادے، میں مانتا ہوں کہ میں ہی غلطی پر تھا"! دوشیزہ بولی "اگر میرے دل میں کدورت تھی تو غلطی میری تھی کہ کوئی جنگجو ایسا شریف نہیں گذرا جیسا کہ تُو"۔ وہ اُسے اُٹھا کے کسی آرامگاہ میں لیجاتے لیکن ژان کو یہ منظور نہ تھا۔ اُس نے خود اپنے ہاتھ سے تیر کو جو ایک بالشت باہر کو نکلا ہُوا تھا کھینچا۔ درد شدت کا تھا وہ ضبط نہ کرسکی اور درد سے بے اختیار چِلّا اُٹھی۔ کسی نے قریب سے کہا "اس پر منتر پھونکدیں" مگر فوراً جواب ملا "اُس سے مجھے موت منظور ہے"! پھر ژان نے اعترافِ گناہ کیا گویا وہ سمجھتی تھی کہ شاید دُنیا کو خیرباد کہنے کا وقت آگیا ہے!

لیکن بہت جلد اُسکے مزاج میں اک انقلابِ عظیم پیدا ہوگیا۔ اُس نے دیکھا کہ حملہ آوروں کے پاؤں لڑکھڑا رہے ہیں اور قریب ہے کہ اُکھڑ جائیں۔ دُولوا نے کہا پیچھے کو ہٹ جانا مناسب ہے۔ یہ سُنا تو وہ جھنجھلا کے اُٹھی اور بصد دُشواری اپنے اسپ پر سوار ہو کے قائدوں سے بولی "تھوڑا آرام کرو کچھ کھاؤ پیو اور تازہ دم ہو جاؤ۔ پھر جب تم میرا علَم دیوار کے ساتھ اُڑتا ہُوا دیکھو تو قدم بڑھاؤ اور بڑھے چلو کہ قلعہ ہمارا ہی ہے"!

یہ کہہ کر ژان انگور کی ایک بیل کی آڑ میں جا ٹھہری اور خدا سے دُعا کی۔ پھر اپنا عَلَم تھام کر اپنے خادم سے بولی "مجھے بتا دیجو جب میرا عَلَم دیوار کو چھوئے! وہ بڑھے گئی حتیٰ کہ خادم نے کہا کہ عَلَم اب دیوار کو چھو رہا ہے۔ دوشیزہ نے چلّا کے کہا "بہادرو! چلو! چلو! قلعہ تمہارا ہی ہے!" فوج یک دلی کے ساتھ اُٹھی اور قلعے کی دیوار پر جا پڑی۔ ژان کا عَلَم اُس کے ہاتھ میں ہے بدستور اُس کا نعرہ تھا "سب کچھ تمہارا ہی ہے"۔ برسوں سے ایسا جوش و خروش ایسی جانفروشی و دلاوری فرانسیسوں میں نہ دیکھی گئی تھی۔ وہ دیوار پر یُوں چڑھ گئے گویا وہ ایک زینہ ہے۔ انگریز قلعے کے اندر بدحواس ہو کر چیخنے لگے کہ "کیا یہ سمجھتے ہیں انہیں موت نہیں آ سکتی؟" حیران تھے کہ یہ کوئی جادوگرنی ہے یا فرشتۂ غیب؟ ابھی زخم کاری کھا کر گرتی ہے ابھی اُٹھ کے فوج کی سرکردہ بن جاتی ہے! تیروں کی بارش ہو رہی ہے لیکن وہ ہے کہ بے دھڑک قدم بڑھائے جاتی ہے! "چلے چلو! اندر چلو! خدا کی راہ میں! کہ سب کچھ تمہارا ہی ہے"!! انگریزوں کا جنرل وہ جو ژان کو گالیاں دیا کرتا تھا چوہے کی طرح پنجرے میں قید تھا، ٹامک ٹوئیے مارتا لیکن کچھ بن نہ پڑتا۔ اک آخری کوشش اُس نے کی کہ کسی طرح قلعے سے نکل کر پُل پر سے بھاگ جائے۔ اُدھر پُل پر گولہ باری ہو چکی تھی جب یہ لوگ اُس پر دَوڑے تو وہ ٹوٹ کر ان کو لئے ہوئے دریا میں جا پڑا۔

× × × × × × × × × × × × × × × × × × ×

لڑائی ختم ہو چکی تھی فرنساوی عَلَم فصیل پر لہرا رہا تھا! لیکن ژان کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے، وہ ڈوبتے ہوئے انگریزی قائد کو دیکھ کر بھرّائی ہوئی آواز میں بولی "مجھے تیری رُوح پر ترس آتا ہے"!!

(باقی)

بشیر احمدؐ

ہندوستان کی تعلیم

(۲)

اس مضمون کے پہلے حصہ میں بطور تمہید کے تعلیم، قومی تعلیم، اور قومی زبان میں تعلیم ہونیکی ضرورت پر بحث کی جاچکی ہے اور بتایا جاچکا ہے کہ خوددار اور آزادی پسند ملک اور قوم کے واسطے قومی تعلیم کا قومی زبان میں ہونا ضروری ہے اور یہ بھی کہا جاچکا ہے کہ قومی تعلیم کا سارا نظام بلاشرکت غیرے خود قوم کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے۔ یہاں مولوی شبلی مرحوم کا ایک شعر یاد آگیا جس میں اس مشہور تعلیمی مدبر نے مسلم یونیورسٹی کا مقصد بیان کیا ہے وہ شعر یہ ہے ؎

ہمیں یک حرف از یونیورسٹی مدعا باشد   کہ ایں سر رشتۂ تعلیم ما در دستِ ما باشد

اِس شعر میں ذرا سی ترمیم کر دیجائے تو ہماری ملکی تعلیم کا مدعا بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔

ہمیں یک حرف از تعلیمِ قومی مدعا باشد   ہمہ سر رشتۂ تعلیم ما در دستِ ما باشد

یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کی تعلیم کا موجودہ نظام ہندیوں کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو ہندوستان کے جذبات، ہندوستان کے قومی حالات، ہندی قوم کی خواہشوں اور ہندی ملکی ضرورتوں سے بالکل ناواقف ہیں۔ درحقیقت جو لوگ ہندوستان کی تعلیمی حکمت عملی پر قابض ہیں وہ ایسے لوگ ہیں جو نہ تو ہندوستان کے رہنے والے ہیں نہ ہندوستان سے اُن کو وہ دلچسپی ہے جو کسی ہندی وطن دوست کو ہو سکتی ہے بلکہ ہندوستان کی تعلیمی کل کو چلانے والے ایسے لوگ ہیں جو اس ملک میں عارضی آمدورفت رکھتے ہیں۔ اس کا یقینی نتیجہ ہے کہ یہ لوگ ملک سے اِتنی واقفیت نہیں رکھتے جتنی واقفیت کی ایسے اہم سر رشتہ کی حکمت عملی والوں کو ضرورت ہے۔ خواہ سرکاری تعلیمی محکمہ انتظام کی غرض سے کسی انگریز کی نگرانی میں دیا جائے یا کسی ہندی کے ہاتھ میں ہو جبتک کہ تعلیمی حکمت عملی سے تمام غیر ملکی عنصر بالکل الگ نہیں ہو جائیگا اُس وقت تک ذاتی عزل و نصب سے ملک کے لئے مفید تعلیم کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ یہ کوئی لاطائل دعوے نہیں ہے بلکہ تجربہ بتا رہا ہے کہ ۱۷۹۶ء جب سے کہ

انگریزی سلطنت نے ہندوستان کی تعلیم کا مسئلہ اپنے ہاتھ میں لیا ہے اس سوا سو برس گذر جانے اور تین پشت ختم ہو جانے کے بعد بھی ہندوستان کی مروجہ ہندی نما انگریزی تعلیم سے ہندوستان اور ہندی قوم کو سیاسی یا اقتصادی کچھ بھی فائدہ نہیں ہُوا بلکہ غور کرنے سے ایک طرح کا نقصان نظر آتا ہے کہ اس جدید تعلیم کی بدولت ہندوستان میں نئے پڑھے لکھوں اور پُرانے پڑھے لکھوں کے درمیان ایک تفریق پیدا ہوگئی ہے اور بجائے اس کے کہ ملک کے ذہین دماغ مُلکی فلاح اور بہبودی کی تدابیر کے متعلق غور کریں آپس میں ایک دوسرے کی حقارت اور نکتہ چینی میں دونوں قسم کے پڑھے لکھوں کا وقت ابتک فضول ضائع ہُوا حالانکہ ایسے مُلک جن کی تعلیم ہندوستان کے بعد شروع ہُوئی ہے بلحاظ سیاسی اور اقتصادی ترقی کے ہندوستان سے بہت آگے بڑھ گئے جیساکہ جاپان ہے اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ جاپان اپنی مُلکی تعلیمی حکمت عملی کا خود مالک ہے۔

ہندوستان کی تعلیم پر اجنبی اقتدار کا اثر معلوم کرنے کے واسطے ذرا تفصیلی بحث کی ضرورت ہے جسکو مختصر طور پر یہاں لکھنا ضروری ہے۔

ہندوستان کی موجودہ تعلیم تین حصّوں پر منقسم ہے۔

۱۔ اِبتدائی تعلیم۔ ۲۔ ثانوی تعلیم۔ ۳۔ اعلیٰ تعلیم۔

اب ذرا ہر حصہ کے متعلق الگ الگ حالت پر نظر ڈالنا چاہیئے۔

اِبتدائی تعلیم

اِبتدائی تعلیم۔ جہاں سے علم کی اصلی بنیاد قایم ہوتی ہے جس سے آنے والی ہندی قوم میں سمجھ پیدا ہوتی ہے جس سے ہندی بچہ مُلکی افتخار، قومی خودداری اور ذاتی فرض شناسی کا سبق سیکھنا شروع کرتا ہے۔ جس کا انتظام ہر درجہ کی تعلیم سے بہتر ہونا چاہیئے۔ اُس کی ہندوستان میں جیسی ردی حالت ہے شاید اس سے زیادہ ذلیل ابتدائی تعلیم کسی دوسرے ملک میں ہو۔ نہ یہاں اِبتدائی تعلیم کے واسطے ایسے معلموں اور اُستادوں کا انتظام ہے جو علم اسباق الاشیاء سے واقف ہوں نہ ایسے سامان کا انتظام ہے جس سے ہندی بچہ مُلکی پیداوار، مُلکی پیشہ و صنعت

حرفت اور ملکی پیداوار کے نام اور اُن کی صُورتوں سے واقف ہو سکے نہ ایسی پڑھائی ہے جس سے ملکی محبت قومی الفت کی لہر بچوں کے دماغوں میں دوڑ جائے۔ اگر ہے تو کیا ہے چڑیا چڑے کی کہانی، عالمگیر سیواجی کے ذاتی جھگڑے کچھ حساب کچھ جغرافیہ کچھ تاریخ کچھ ہندو مسلمانوں کے تعصب بھڑکانے والی کہانیاں مثلاً مارسڈن کی تاریخ کا ترجمہ جو تاریخی قصوں کی صورت میں ابتدائی تعلیم میں صوبہ جات متحدہ میں مروج ہے اس میں سبکتگین کا قصہ لکھا ہے کہ اُس نے کسی جانور پر رحم کیا تھا جس کا رحم خدا کی درگاہ میں پسند آیا اور سبکتگین کو حضور سرورِ دوعالم کی زیارت کا خواب میں شرف حاصل ہُوا اور حضُور کی بشارت کے بموجب اُس کو سلطنت اور سلطان محمود غزنوی جیسا بیٹا ملا یہ ہے لبِّ لباب اُس کہانی کا جو ہندی بچّوں کو پڑھائی جاتی ہے اب ذرا اُس کے نتیجہ پر غور کرنا چاہیئے ہر مُسلمان بچہ جو اس کہانی کو پڑھیگا اُس کو سبکتگین سے ایک قسم کی محبت اس سبب سے پیدا ہو گی کہ اس کو جناب رسالتمآب کی زیارت کا شرف حاصل ہُوا تھا اور سُلطان غزنوی اور اُس کے افعال سے اسی سبب سے الفت ہونا لابدی ہے کہ وہ اُسی مقدس بشارت کا نتیجہ تھا جو سبکتگین کو خواب میں ہو چکی تھی۔ سوچنا چاہیئے کہ ایک ہندو بچّہ کے دل میں جس نے محمود غزنوی کی ہندوستان کی لوٹ مار اور سومنات کی بربادی کو پڑھا ہوگا محمود غزنوی، اسلام، اور مسلمانوں کی طرف سے کیسے جذبات پیدا ہونگے۔ کیا ایسے قصوں سے مذہبی تعصب برانگیختہ ہو جانا لابدی نہیں ہے۔ جو چھوٹے چھوٹے بچّے اِن قصّوں کو پڑھتے ہیں انکو اس کی کیا تمیز ہوتی ہے کہ یہ جھوٹی کہانیاں ہیں اور محمود غزنوی کی چڑھائیاں اور لوٹ کھسوٹ اُس کے ذاتی اعمال تھے۔ اسلام کو اُس سے کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ اسلام صاف صاف کہہ چکا ہے" لکم دینکم ولی دین" بہرحال یہاں اس قصہ کو مثال کے طور پر لکھدیا گیا جس سے ابتدائی تعلیم کا نمونہ معلوم ہو سکے جس سے ہندی، قوم تیار کیجاتی ہے۔ ہندوستان کی ابتدائی تعلیم میں کوئی ایسا سبق نہیں رکھا گیا جس سے کسی ایسے فن یا ہنر کی ترغیب ہوتی ہو جس سے بچّہ اپنے کھانے کمانے کا وسیلہ سوچ سکے۔ اِبتدائی تعلیم کی وقعت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُسکا اعلیٰ امتحان پاس کرنے کے بعد۔ جس کو عام طور پر مڈل پاس کرنا کہا جاتا ہے۔ پہلا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طالب علم اپنے آبائی پیشہ سے اور ملکی صنعت و حرفت کی طرف سے بیزار ہو کر اُس کی

توجہ ملازمت کی طرف ہو جاتی ہے۔ مگر اسکے بعد جو بہتر سے بہتر ملازمت میسر آتی ہے وہ کسی دیہاتی مدرسہ کی مدرسی ہوتی ہے۔ مدرس صاحب کی کیا وقعت ہوتی ہے؟ اس کی جانچ اُس وقت کیجا سکتی ہے جبکہ کوئی آفیسر مدرسہ کے معائنہ کو آتا ہے جس کے ایک قلم کی گردش مدرس صاحب کے روپیہ دو روپیہ ماہوار کی ترقی یا تنزل یا برخاستگی کے واسطے کافی ہے اور ایسے افسر کے حضور میں مدرس صاحب ادب کی وجہ سے بیٹھ بھی نہیں سکتے بلکہ دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں یہ حالت مدرس صاحب کے شاگرد اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں جس سے مدرس صاحب کی وقعت اُن کے شاگردوں کی نظر میں ظاہر ہے۔ یہ حالات ایسے ہیں جس سے قومی خودداری اِبتدا سے ہندی طالب علموں میں تباہ ہو جاتی ہے۔ اسی ذلیل ابتدائی تعلیم کا اہلِ مُلک پر جو اثر پڑا ہے وہ صاف ظاہر ہے کہ خوددار والدین اپنے بچّوں کو ایسے مدرسوں میں جن میں صرف ابتدائی تعلیم دیجاتی ہے بھیجنا پسند نہیں کرتے اور اسی طرح ملک کا بڑا حصّہ موجودہ ابتدائی تعلیم سے الگ تھلگ رہ جاتا ہے۔ کیا کوئی غیور ہندی ایسی تعلیم ملک میں جاری رہنا ملکی سیاسی اور اقتصادی ترقی کے واسطے مفید سمجھیگا۔ ہرگز نہیں۔ ابتدائی تعلیم کی یہ حالت صرف اسی سبب سے ہے کہ تعلیمی حکمت عملی میں غیر ملکی عنصر شامل ہے جس کو ہندی مُلکی خودداری کی کچھ پروا نہیں

ثانوی تعلیم

ثانوی تعلیم۔ ابتدائی تعلیم کے بعد شروع ہوتی ہے۔ ثانوی تعلیم سے تعلیم کا وسیلہ۔ ایک اجنبی زبان (انگریزی) بن جاتی ہے جو ہندیوں کے واسطے تلفظ کے لحاظ سے، مخرجوں کے لحاظ سے بالکل غیر مانوس زبان ہے۔ اسی اجنبی بولی اور اُس کی غیر مرغوب صرف ونحو سیکھنے میں ہندی لڑکوں کا وقت بیفائدہ ضائع ہوتا ہے۔ پھر ثانوی تعلیم میں جو کتابیں ہوتی ہیں اُن میں سے اکثر کتابیں غیر مُلکی اور اجنبی لوگوں کی تصنیف کی ہُوئی ہوتی ہیں جن کے ناموں تک سے ہندی لڑکے مانوس نہیں ہوتے اُن کتابوں میں جو خیالات ہوتے ہیں وہ ہندی خیالات اور لڑکوں کے والدین کے خیالات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ ثانوی تعلیم میں ہندوستان کے مروجہ پیشوں ہندوستان کی صنعت وحرفت، ہندوستان کے معاش کے ذریعوں کا تذکرہ برائے نام ہوتا ہے۔ اور

چمکے تھے۔ چراغوں کی بہار میں خزاں کے پہلو نمودار ہو رہے تھے۔ بازاروں کی رونق کم ہو رہی تھی۔ مگر پورن چند کی آنکھیں اس طرف سے بند تھیں۔ وہ اس طرح بھاگتا ہُوا جا رہا تھا۔ جیسے کسی عزیز بیمار کیلئے کوئی ڈاکٹر کو بُلانے جا رہا ہو۔ دفتر میں پہنچا تو چوکیدار دکھائی دیا۔ پورن چند کا ارادہ متزلزل ہو گیا۔ چوکیدار نے پوچھا "کون ہے؟"

"میں ہوں گنگادین! کہو کیا حال ہے؟"

گنگادین نے آواز سے فوراً پہچان لیا اور آگے بڑھ کر بولا "آیئے بابو صاب۔ بجار میں تو کھوب رونق رہیو ہے۔ آپ ایہاں کیسے آگئے؟"

پورن چند کا دل دھڑک رہا تھا مگر زبان پر پورا پورا قابو تھا ہنس کر بولا "کچھ کاغذ بھول گیا ہوں۔ ذرا دروازہ کھول دے"

گنگادین نے فوراً تعمیل کی۔ اگر کوئی اور ہوتا۔ تو شاید وہ انکار کر دیتا۔ مگر پورن چند خزانچی تھا۔ اُس سے کچھ عُذر نہیں کیا۔ بعض دفعہ پیشگی کی ضرورت آبنتی تھی۔ پورن چند کمرے میں پہنچا۔ اور روشنی کر کے میز کے سامنے ہو بیٹھا۔ اِس وقت اُس کی عقل اِس طرح بیتاب تھی۔ جیسے کبوتر شکرے کے پنجے میں پھنس گیا ہو۔ بار بار خیال آتا تھا۔ کہ یہ قدم تباہی کی طرف لے جانے والا ہے۔ مگر اس تاریکی میں امید کا دلفریب چہرہ بھی کبھی کبھی نظر آجاتا تھا۔ آخر پورن چند پر اُمید کا جادو چل گیا۔ اُس نے تجوری کھول کر چار سو کے نوٹ جیب میں ڈال لئے۔ اور کمرہ بند کر کے باہر نکل آیا۔ اس وقت اُسے ایسا معلوم ہُوا کہ کامیابی کا ایک مرحلہ طے ہو چکا ہے۔ حالانکہ اُس کا ہر ہر قدم اُسے سرزمین کامرانی سے دُور لئے جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر اُسی جوئے خانہ میں تھا۔ جہاں قسمتیں برباد ہوتی ہیں اور تباہی ہنستی ہے۔ اُمید اُسے راستہ دکھا رہی تھی۔ مگر بدقسمتی اوٹ میں کھڑی مُسکراتی تھی۔ پورن چند نے پھر داؤ لگائے اور پھر سب کچھ ہار گیا۔ اب چاروں طرف تاریکی تھی۔ لیکن اس تاریکی سے زیادہ خوفناک وہ سپیدئ سحر تھی۔ جو آہستہ آہستہ نزدیک سرک رہی تھی۔ اس سپیدی سے پورن چند اتنا خائف تھا کہ اُس کے تصور ہی سے اُس کی رُوح کانپ جاتی تھی سوچتا تھا۔ کیا کوئی ایسی ترکیب نہیں ہو سکتی۔ کہ کل صبح کا سورج ہی طلوع نہ ہو۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا پورن چند گھر پہنچا۔ اس وقت اُس کے پاؤں اِس طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ جیسے شراب پی رکھی ہو۔ اُس کا باپ رائے صاحب سرجن مل امیر آدمی تھا مگر اُس کی امارت سے زیادہ مشہور اُس کے بُخل کے قصے تھے۔ پورن چند کو کئی بار خیال آیا۔ کہ چل کر اُن کے سامنے ساری بات ظاہر کر دوں تو یقیناً وہ مجھے چار سو روپیہ دینے سے انکار

نہ کریں گے۔ مگر پھر سوچا۔ کہ یہ نہیں ہوگا۔ اگر ایسے نصیب
ہوتے۔ تو وہ مجھے کوئی کارخانہ نہ کھول دیتے ناحق
ذلیل ہونے سے کیا حاصل؟ کوئی اور طریقہ سوچنا
چاہیئے۔ اب اُسے عقل آگئی تھی، اُمید کوئی نیا دھوکا
نہ دے سکی۔ اُس نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ
دی۔ مگر صبح ہوئی۔ تو اُس کا چہرہ قدرے بحال ہو چکا
تھا۔ ایک گناہ پر پردہ ڈالنے کے لئے نئے گناہ کی
تیاریاں ہورہی تھیں۔ اس وقت اُس کا خیال
اپنے نوکر رونقی کی طرف تھا۔

(۲)

رائے صاحب سرجن مل کے تین نوکر تھے
اُن میں رونقی سب سے پُرانا تھا۔ اُس نے اپنی
زندگی کا بہت سا حصہ رائے صاحب ہی کی خدمت
گذاری میں صرف کیا تھا۔ اس لئے رائے صاحب
اُسے سخت لفظ نہ کہتے تھے۔ رونقی کو بات چیت
کرنے کا سلیقہ نہ تھا۔ بولتا تو ایسا معلوم ہوتا گویا لڑ
رہا ہے۔ کام کرنے سے بھی جہانتک ہو سکتا کترا جاتا
تھا۔ ہاں دوسرے ملازموں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے
میں بہت ہوشیار تھا۔ اور اس کام کو ایسی مستعدی
سے سرانجام دیتا کہ ملازم بلبلا اُٹھتے تھے۔ رونقی
کی اس مستعدی کے خلاف رائے صاحب کے
پاس اکثر اپیلیں دائر ہوتی رہتی تھیں۔ مگر رائے صاحب
رونقی کے فیصلوں کو عموماً بحال ہی رکھتے تھے
اس سے رونقی کا چہرہ شگفتہ ہو جاتا تھا۔ اکڑ کر کہتا
"نکھی کا (میرا) تم نے کیا بگاڑ لیا"

مگر رونقی میں کوئی خوبی نہ ہو۔ یہ بات نہ تھی۔
وہ مالک کے لئے جان تک نثار کرنے کو تیار رہتا تھا
رائے صاحب کو اس پر روپے پیسہ کے معاملات میں
کامل طور پر اعتماد تھا۔ اُن کو اس امر کا یقین ہو گیا تھا
کہ رونقی مرتا مر جائے گا مگر ایک پائی کی بھی بے ایمانی
نہیں کریگا۔ کئی مواقع ایسے آئے، جب رونقی چاہتا
تو سینکڑوں روپے بالا ہی بالا اُڑا سکتا تھا، ترغیب نے
سنہری جال بچھائے مگر رونقی نے اپنی طبیعت کو
ڈانوا ڈول نہیں ہونے دیا۔ وہ پرائے روپے کو
مٹی کے برابر سمجھتا تھا۔ رونقی کی اس خوبی نے اُسکے
تمام عیوب پر پردہ ڈال دیا تھا۔

(۳)

دیوالی کے دوسرے دن صبح کے وقت
رونقی اپنے کمرے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور آنکھیں بند
کئے کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ اتنے میں پورن چند
بھاگا بھاگا اندر آیا اور بولا "رونقی! مجھے بچالو"

آواز میں حسرت تھی، الفاظ میں گھبراہٹ
رونقی کے ہاتھ سے حقہ چھوٹ گیا۔ اُسے پورن چند
سے انتہا درجہ کی اُلفت تھی۔ اُس نے اُسے گودیوں
میں کھلایا تھا۔ وہ رات کے وقت عموماً بے سُدھ
پڑا سوتا رہتا تھا۔ مگر جب کبھی پورن چند بیمار

ہو جاتا۔ تو وہ ساری ساری رات اُس کے سرہانے بیٹھ کر کاٹ دیتا تھا۔ کئی آدمیوں نے اُسے زیادہ تنخواہ پر اپنے ہاں لیجانا چاہا۔ مگر پورن چند کے خیال سے اُس نے سب جگہ انکار کر دیا۔ محبت نے پاؤں میں زنجیر ڈال دی تھی۔ اُس کا کوئی بچہ نہ تھا۔ مگر وہ پورن چند سے پدرانہ شفقت رکھتا تھا جس طرح جنگل کے درخت کو پانی دینے والا اُس درخت کی شاخوں اور ٹہنیوں سے محبت کرنے لگتا ہے اُسی طرح رونقی پورن چند اور اس کے مستقبل سے محبت کرنے لگا تھا۔ جب اُسے عمر میں بڑا ہوتے دیکھتا۔ تو اُس پر روحانی سرور سا چھا جاتا تھا۔ گویا وہ اُس کا نوکر نہیں بلکہ باپ تھا۔ وہ جب کبھی تنہائی میں بیٹھتا۔ تو پورن چند ہی کے متعلق سوچتا رہتا تھا۔ وہ اس وقت بھی اُسی کے خیال میں محو تھا۔ سوچتا یہ تھا کہ رائے صاحب جلد اُس کا بیاہ کیوں نہیں کر دیتے۔ رائے صاحب کی دُور اندیشیاں اُس کے لئے بخل سے کم نہ تھیں۔ اچانک پورن چند کو کمرے میں آتے دیکھ کر اُس کا دل دہل گیا۔ گھبرا کر بولا "کیوں سرکار! معاملہ کیا ہے؟"

(۴)

یہ کہتے کہتے اُس نے کونے میں پڑی ہوئی لاٹھی اُٹھالی اور اس طرح تیار ہو گیا۔ جیسے پورن چند کے تعاقب میں کوئی خوفناک ڈاکو آرہا ہو

پورن چند کے غمگین چہرے پر ایک لمحہ کے لئے ہنسی نمودار ہوئی۔ جیسے رات کو آسمان میں جگنو چمک جاتا ہے۔ اُس نے آہ سرد بھری اور کہا "رونقی لاٹھی رکھ دو اس کی ضرورت نہیں"

رونقی کے سینہ سے بوجھ سا اُتر گیا۔ لاٹھی رکھتے ہُوئے بولا "تو سرکار ایسی کیا آپھت آئی ہے۔ جو مُوں سوکھ گیو ہے"

پورن چند نے چاروں طرف اس طرح دیکھا جیسے چور چوری کرنے سے پہلے دیکھتا ہے انتہائے فکر نے اُس کے ہوش و حواس باختہ کر دئے تھے اُسکو اندیشہ تھا۔ کہ کہیں کوئی مجھے دیکھ نہ لے۔ آہستہ سے بولا "میرے سر پر سچ مچ آفت ہی آگئی ہے تم چاہو۔ تو مجھے بچا سکتے ہو۔ کہو میرا ایک کام کر دو گے؟"

رونقی نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا۔ "ہجور حکم دیں تو کھی (کہیں) بھاڑ میں کود پڑوں"

پورن چند کا چہرہ منور ہو گیا۔ تاریکی یاس میں شعاعِ اُمید چمک گئی تھی۔ اُس نے جیب سے ایک ہار نکالا۔ اور رونقی کے ہاتھ پر رکھ کر کہا۔ "یہ بازار لے جاؤ۔ اور بیچ آؤ۔ مجھے ابھی روپے کی ضرورت ہے"

رونقی پر بجلی سی گر پڑی۔ ہار دیکھ کر وہ اس طرح سہم گیا۔ جیسے کسی سانپ نے سونگھ لیا ہو۔ اُس کی

زبان بند ہوگئی دماغ میں ہزاروں خیالات سما گئے رہ رہ کر سوچتا تھا کہ پورن چند کو ایسی کیا ضرورت آ پڑی ہے۔ جو ہار بیچنے کی نوبت آئی ہے۔ اور پھر وہ کوئی غریب آدمی نہیں۔ رائے صاحب چاہیں تو آدھا شہر خرید سکتے ہیں۔ اُن کو زیور فروخت کرانیکی کیا ضرورت ہے۔ رونقی سمجھ گیا کہ پورن چند یہ کام رائے صاحب سے یہ چھپا کر رہا ہے۔ مگر چوری کیوں کرتا ہے۔ اس کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ بحر خیالات میں بہت دیر تک غوطے لگانے کے باوجود اُسے ساحل نہ مل سکا۔ اُس نے عجیب انداز سے پورن چند کی طرف دیکھا۔ نگاہوں میں دل رکھا ہُوا تھا۔ پورن چند اُسے تذبذب میں پڑے ہُوئے دیکھ کر پھر گھبرا گیا۔ شعاعِ اُمید آنکھوں سے او جھل ہوگئی تھی۔

رونقی نے پوچھا "سرکار! مالہ کیا ہے اِتی جرورت کیا بن گئی۔ جو ہار بیچو ہو؟"

پورن چند کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور ہار جیب میں ڈال کر واپس چلنے لگا۔ اس وقت اس کا چہرہ حسرت و یاس کی زندہ تصویر تھا۔ رونقی کے کلیجے پر سانپ لوٹ گیا۔ پیچھے دوڑ کر بولا "سرکار تم کو کتے روپے کی جرورت ہے؟"

سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ پورن چند نے پھر امید کے لہجہ میں جواب دیا "چار سو کی"

"روپا کب چہیئے؟"

"ابھی"

رونقی کے پاس چھ سو کے قریب روپیہ موجود تھا۔ یہ روپیہ اُس نے کئی سالوں میں جمع کیا تھا۔ وہ ساری تنخواہ گھر نہیں بھیج دیا کرتا تھا۔ تین چار روپے ماہوار بچا رکھتا تھا۔ یہ روپے اُس نے اپنے کمرے کے ایک کونے میں دبا رکھے تھے۔ رونقی نے سوچا۔ کہ ہار لیکر بازار میں کہاں بیچتا پھروں گا۔ اپنے پاس سے روپے دیدوں تو کیا ہرج ہے۔ پورن چند کوئی اس طرح ہمیشہ تھوڑے ہی تنگدست رہے گا جب اُس کے ہاتھ چار پیسے آئیں گے۔ تو اُس سے اپنا روپیہ واپس لیکر ہار لوٹا دوں گا۔ اس وقت اُس کا کام چل جائیگا۔ یہ سوچ کر اُس نے پورن چند کے ہاتھ سے ہار لے لیا اور کہا "اچھا سرکار! تمرا کام کری دیں گے"

پورن چند کی جان میں جان آگئی۔ اُسکو ایسا معلوم ہُوا۔ گویا رونقی اُس کا نوکر نہیں بلکہ فرشتۂ رحمت ہے۔

(۵)

تھوڑی دیر کے بعد رونقی نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور زمین کھودنے لگا۔ اس وقت اُس کا دل سینہ میں زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اُس نے چوری نہیں کی تھی۔ بدنیتی نہیں کی تھی۔ مگر

پھر بھی اُس کا کلیجہ کانپ رہا تھا۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا۔ کہ پورن چند کا کام ہوجائے اور اُس کو رائے صاحب کے سامنے اپنے گناہ کا اعتراف نہ کرنا پڑے۔ وہ ہر چند کہ جاہل ان پڑھ تھا۔ تاہم اُسے یہ یقین ہوگیا تھا۔ کہ اگر پورن چند کا یہ قصور جس کے بارے میں وہ تا حال تاریکی میں تھا۔ رائے صاحب کے سامنے ظاہر ہوگیا۔ تو پورن چند کا مستقبل خراب ہو جائیگا اس خیال سے اس کا خون خشک ہوجاتا تھا۔ وہ سب کچھ برداشت کرسکتا تھا مگر پورن چند کا رنجیدہ چہرہ دیکھ کر اُس کا تحمل ہاتھ سے چھوٹ جاتا تھا۔ اُس نے جلدی جلدی زمین کھودی، روپیہ گن کر نکالا اور زمین پھر سے ہموار کر دی۔ اس وقت اُس کے چہرے پر پھر وہی بے فکری و اطمینان کا رنگ ہویدا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پورن چند اُمید وبیم کی صورت بنا ہُوا آیا اور ہچکچاتے ہُوئے بولا "رونقی"

رونقی حقہ پی رہا تھا۔ اُس نے زبان سے کوئی جواب نہ دیا مگر ہاتھ سے اپنے سرہانے کی طرف اشارہ کر دیا۔ پورن چند نے روپیہ دیکھا۔ تو تن مردہ میں جان آگئی۔ رونقی کی طرف احسانمندی کے انداز سے دیکھتے ہُوئے چلا گیا۔

یکا یک رونقی چونک پڑا۔ جیسے کسی کی کوئی قیمتی شے گم ہوجاتی ہے۔ وہ زمین کھودتے وقت ہار دبانا بھول گیا تھا۔ وہ تیر کی طرح تیزی سے اپنی چارپائی کے سرہانے پہنچا۔ ہار وہیں پڑا تھا۔ سوچنے لگا اب اسے رات کو دبانا چاہیئے۔ دن میں کسی کو شبہ بھی ہوگیا۔ تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ یہ فیصلہ کرکے اُس نے ہار کمر کے گرد لپیٹ لیا اور کام میں مصروف ہوگیا۔ مگر طبیعت میں سارے دن انتشار رہا۔

رات ہوگئی تھی رونقی نے دروازہ بند کیا اور زمین کھودنے لگا۔ مگر ہاتھوں میں سکت نہ تھی دل اس طرح دھڑک رہا تھا۔ جیسے کوئی سپاہی گرفتار کرنے کو آرہا ہو۔ جسم برسوں کے مریض کے مانند شل ہو رہا تھا۔ یہ ہونے والے واقعات کا پیش خیمہ تھا۔ پر رونقی اس سے بے خبر اپنے کام میں مصروف تھا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں نہ چلتے تھے۔ مگر وہ زمین کھود رہا تھا۔ یکا یک کسی نے دروازے پر ہاتھ مارا۔ رونقی کے وسوسے پورے ہوگئے گھبرا کر کھڑا ہوگیا اور سننے لگا کہ کیا یہ میرا واہمہ ہی تو نہیں دروازے پر پھر کسی نے ہاتھ مارا۔ رونقی کے چہرے پر پسینہ کے قطرے نمودار ہُوئے۔ سردی کے دن تھے، مگر اُس کا دم گھٹا جا رہا تھا تاہم اُس نے حوصلے سے پوچھا "ایس وکت کون ہے؟"

"دروازہ کھول دے"

رونقی کا چہرہ فق ہوگیا یہ رائے صاحب کی آواز تھی۔ جو حالت بکری کی شیر کی دھاڑ سُن کر ہوتی ہے وہی حالت اس آواز کو سُن کر رونقی کی ہوئی

اُسے اپنی رسوائی آنکھوں کے سامنے ناچتی ہُوئی دکھائی دی۔ اُس نے بولنا چاہا۔ مگر گلے سے آواز نہ نکل سکی۔ رائے صاحب نے کڑک کر کہا۔ "دروازہ کھول دے"

رونقی نے لپک کر ہار کو بستر کے نیچے چھپا دیا۔ ٹمٹماتا ہُوا دیا بُجھا دیا۔ اور دروازہ کھول دیا۔ اس وقت اُس کے پاؤں من من کے بھاری ہورہے تھے۔ رائے صاحب نے اندر آتے ہی کہا "دیا کیا ہُوا؟"

رونقی نے جواب دیا "سرکار بجھائے دیو"

ابھی تو جل رہا تھا۔ بجھائے کیسے دیو؟ فوراً روشن کر دو"

رونقی کے اندیشے مادی صورت اختیار کر رہے تھے۔ حیل وحجت کرنے لگا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ یہ وقت ٹل جائے۔ تو بعد میں بیسنکڑوں بہانے تراشے جاسکتے ہیں۔ وقت اخفائے جرم کے لئے بہترین امداد ہے۔ مگر رائے صاحب نے اس کی مہلت نہ دی۔ جیب سے دیا سلائی نکال کر خود چراغ جلادیا۔ اور زمین کی طرف دیکھ کر بولے۔ یہ تو کیا کر رہا تھا؟"

رونقی نے ہاتھ باندھ کر جواب دیا "سرکار جو مہینہ ملتا ہے۔ اُس سے بچائے بچائے کر کسی بکت کے لئے بِکھی ہیاں کچھ داب دیا کرتا ہوں"

"مگر آج کیا دابنے لگا تھا۔ ابھی تو تنخواہ بھی نہیں ملی"

جھوٹی زبان بند ہوگئی۔ رونقی رائے صاحب کا منہ دیکھنے لگا۔ رائے صاحب نے آگے بڑھ کر زمین سے مٹی ہٹائی اور روپوں کی پوٹلی دیکھی پھر بستر ہلایا۔ اُن کا خیال تھا۔ کہ شاید رونقی نے جُوا کھیلا ہے کیونکہ اُس سے اور کسی بے ایمانی کی اُنہیں مُطلقاً توقع نہ تھی۔ مگر اُنہیں یہ دیکھ کر کیسی حیرت ہُوئی۔ کہ رونقی کے بستر کے نیچے ہار پڑا تھا وہ اُسے دیکھ کر سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھے۔ اگر کوئی دوسرا شخص یہی فعل کرتا۔ تو رائے صاحب ممکن ہے درگذر کر جاتے۔ مگر رونقی کو رنگے ہاتھوں دیکھ کر اُن کا خون جوش مارنے لگا۔ اُنہوں نے نہایت نرمی سے جو سخت غصے سے بھی خوفناک ہوتی ہے پوچھا "رونقی! یہ ہار کہاں سے اُڑایا؟ یہ تو ابھی چند ہی دن ہُوئے خریدا تھا"

رونقی میں خواہ لاکھوں عیب تھے۔ مگر وہ چور نہ تھا۔ اس صفت کے لئے رائے صاحب اُس کی اکثر تعریف کیا کرتے تھے۔ اس وقت اُس کی وہ تمام نیکنامی مٹی میں ملنے کو تھی۔ رونقی نے سوچا۔ اب تمام واقعہ صاف صاف کہہ دینا چاہیئے پورن چند آخر رائے صاحب کا بیٹا ہے۔ اُسے کھا تو نہ جائیں گے۔ یہ سوچ کر اُس نے حوصلہ مندی کے انداز سے سر اُٹھایا اور ہاتھ باندھ کر جواب دیا

سرکار! معاملہ یوں ہے کہ ....

اِتنے میں اُس کی نگاہ پورن چند پر گئی۔ وہ اس طرح کانپ رہا تھا۔ جیسے کسی کو بخار چڑھ رہا ہو۔ اُس نے ایک عجیب انداز سے رونقی کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ رونقی کو ایسا معلوم ہُوا۔ جیسے پورن چند نے اُسے کہا ہے۔ آخر تم کمبنہ نِکلے۔ مَیں نے تم پر اعتبار کیا تھا۔ مگر تم اس کے ناقابل ثابت ہُوئے۔ کاش میں یہ پہلے سے سوچتا تو اس وقت رُسوا نہ ہوتا۔

جس طرح ہوا کا رُخ بدلنے سے پتنگ کا رُخ بدل جاتا ہے۔ اُسی طرح اس نگاہ سے رونقی کا ارادہ تبدیل ہو گیا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ خود بدنام ہونگا مگر پورن چند پر حرف نہ آنے دونگا۔ یہ سوچ کر اُس نے رائے صاحب سے کہا۔ سرکار معاملہ یوں ہے کہ مَیں نے چوری کری ہے۔"

رائے صاحب اُس کی چارپائی پر بیٹھ گئے اِس وقت اُن کو ایسا افسوس ہُوا، گویا ہزاروں کا نقصان ہو گیا ہے مگر پورن چند دل ہی دل میں اس پر عش عش کر رہا تھا۔ دنیا میں ایسے آدمیوں کی کمی نہیں جو اپنی غرض کے لئے دن رات جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔ مگر دوسروں کے لئے جھوٹ بولنے والوں کی تعداد کتنی ہے۔

رائے صاحب نے تھوڑی دیر سکوت کیا اور پھر کہا "تم صبح ہونے سے پہلے پہلے میرے مکان سے نکل جاؤ۔ بس یہی تمہاری سزا ہے۔"

رونقی اور پورن چند دونو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

(۶)

اس کے ایک سال بعد رائے صاحب سرجن مل کا انتقال ہو گیا۔ اب سارے روپیہ پیسے کا پورن چند ہی مالک تھا۔ اُس نے کریاکرم سے فارغ ہو کر رونقی کے نام چار سو روپیہ کا منی آرڈر بھجوایا۔ اور ساتھ ہی خط لکھا کہ تم فوراً میرے پاس آجاؤ۔ مگر ایک ہفتہ کے بعد منی آرڈر واپس آگیا۔ ساتھ ہی اُس کے بھائی کا خط آیا جس میں لکھا تھا۔ کہ اُسے مرے ہُوئے ایک سال گذر گیا ہے وہ جب آپ کے ہاں سے آیا تو ہمیشہ اُداس رہا یہ اُداسی اُس کے چہرے سے دمِ واپسیں تک نہیں گئی ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اُسے کوئی روگ ہے۔ مگر کیا روگ ہے؟ یہ کسی کو معلوم نہیں ہو سکا۔

پورن چند پر اس خط کا ایسا اثر ہُوا۔ کہ کئی دن تک روتا رہا۔ اب اُس نے جُوا کھیلنا ترک کر دیا ہے اور رونقی کے نام پر ایک دھرم سالہ بنوا دی ہے۔ اور اُس میں اُسکی قدِ آدم تصویر رکھی ہے لوگ اُسکی حماقت پر ہنستے ہیں۔ مگر وہ سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ رونقی کی جان نثاری کے مقابلہ میں اتنی وقعت بھی نہیں رکھتا۔ جتنی ذرہ آفتاب کے مقابلہ میں۔

سُدرشن

اعترافِ گُناہ

کُھلے دروازے کے سامنے، میں کوئی ایک لمحہ تک پس و پیش کے عالم میں کھڑا رہا۔لیکن جب بڑھیا نے، جو مجھے وہاں تک لائی تھی، دوبارہ کہا کہ "یہی جگہ ہے" تو میں اندر گیا۔

پہلے پہل تو میں ایک دھندلے سے 'فانوس پوش لمپ کے سوا اور کچھ نہ دیکھ سکا' لیکن ذرا دیر کے بعد مجھے دیوار پر ایک لمبے پتلے جسم کا بے حرکت سایہ نظر آیا۔کمرہ پیٹرول اور ایتھر کی بد بو سے معمور تھا صرف چھت کی سلیٹوں پر بارش کے پڑنے کی آواز سُنائی دیتی تھی، یا ٹھنڈی چمنی میں سے گذرتی ہُوئی ہوا کا غمگین ترنّم، ورنہ چاروں طرف ایک سکوتِ مزار طاری تھا۔

"موسیو!" بڑھیا کسی چیز پر جھک کر (جو مجھے بعد میں معلوم ہُوا کہ ایک بستر ہے) ملائمت کے لہجہ میں بولی "موسیو! جن صاحب سے آپ ملنا چاہتے تھے۔ وہ یہاں تشریف لے آئے ہیں"۔

سایہ اُٹھتا ہُوا نظر آیا اور ایک نحیف سی آواز سُنائی دی "بہت خوب .... جاؤ۔ میڈم تم جاؤ"

جب بڑھیا دروازہ بند کر کے چلی گئی تو آواز آئی "موسیو۔ میرے نزدیک آجایئے۔ میں تقریباً اندھا ہوں۔ میرے کانوں میں ہر وقت سنسناہٹ سی رہتی ہے۔ مجھے بہت کم سُنائی دیتا ہے۔ یہاں میرے پاس ہی ایک کُرسی ہوگی۔ اس تکلیف دہی کی معذرت چاہتا ہوں۔ لیکن مجھے آپ سے ایک نہایت ضروری بات عرض کرنی ہے"

میری طرف مڑے ہُوئے چہرے کی آنکھیں ٹکٹکی لگائے مجھے گھور رہی تھیں۔ بوڑھا کانپتا ہُوا بولا "لیکن پہلے یہ بتایئے۔ کیا آپ موسیو گرینسو ہیں۔ کیا میں موسیو گرینسو سرکاری وکیل سے مخاطب ہوں؟"

"ہاں"

اُس نے ایک اطمینان کا سانس لیا

"تو پھر میں آخرکار اپنے گناہ کا اقبال کرسکتا ہوں۔ میں نے خط پر اپنا نام پیرئیر لکھا تھا لیکن اصل میں میرا نام یہ نہیں ہے۔ اگر قریب آئی ہوئی موت نے میری قلبِ ماہیت نہیں کر دی تو آپ مجھے کچھ نہ کچھ ضرور پہچان سکتے ہیں .... لیکن خیر کوئی مضایقہ نہیں۔

"کچھ برس ہونے کو آئے۔ بلکہ بہت عرصہ گذرا، میں حکومتِ جمہوریہ کا سرکاری وکیل تھا۔

میں اُن معدودے چند اشخاص سے تھا جن کی بابت زبانِ خلق کی پیشینگوئی یہ ہُوا کرتی ہے کہ اُس کا مستقبل شاندار ہوگا" اور میں نے اپنے مستقبل کو شاندار بنانے کا ارادہ صمیم دل سے کر رکھا تھا۔ میرا اظہارِ قابلیت صرف ایک موقعہ کا محتاج تھا۔ وہ موقعہ مجھے عدالت سشن کے ایک مُقدمے کی صورت میں مل گیا۔ جُرم ایسا تھا کہ اگر وہ پیرس میں رُونما ہوتا تو کسی خاص توجہ کا جاذب نہ بنتا۔ لیکن اُس مختصر سے قصبے میں اُس سے بڑی سنسنی پھیلی۔ جس روز عدالت میں مقدمے کی رُوداد پڑھ کے سُنائی گئی مجھے محسوس ہُوا کہ مقدمہ سہل نہیں، بڑی بحث و تکرار کا موضوع ہوگا۔ ملزم کے خلاف شہادت بڑی زبردست تھی لیکن اُس میں وہ فیصلہ کُن عنصر مفقود تھا، جس کی موجودگی میں ملزم کے لئے عموماً اقبالِ جُرم کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ ملزم نے اپنی معصومیت کو کچھ ایسے پیرائے میں بیان کیا کہ حاضرین جلسۂ عدالت کے دلوں پر شک اور ہمدردی کا ایک مخلوط جذبہ طاری ہوگیا۔ اور آپ ایسے جذبہ کی اثر ریزی سے بخوبی واقف ہیں۔

"لیکن ایسے جذبات مجسٹریٹ پر کوئی اثر مرتب نہیں کرسکتے۔ میں نے ملزم کے منکرانہ بیان کے جواب میں ایسے ایسے واقعات بیان کئے جن سے شہادت کی ایک مسلسل زنجیر سی تیار ہوگئی۔ میں نے ملزم کی زندگی کے کُل سوانح عدالت کے پیش نظر کر دیئے اُسکی ساری کمزوریوں اور بُرائیوں کو بے نقاب کر دیا۔ جیوری کے سامنے میں نے جُرم کا مرقع بڑی نفاست سے کھینچا اور پھر جس طرح شکاری کُتّا شکاریوں کو ساتھ لے کر شکار کے غار کے پاس جاتا ہے۔ اُسی طرح میں نے بھی آخیر میں ملزم کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ "مجرم یہی ہے"۔

پیروکارِ صفائی نے میری دلیلوں کے جواب دیئے۔ اپنی بساط بھر اُس نے میرا مقابلہ خوب کیا۔ لیکن محض بے سُود۔ میں قیدی کے سر کا سائل تھا اور وہ مجھے مل گیا۔

وہ تھوڑی بہت ہمدردی جو میرے دل میں قیدی کے لئے جاگزیں ہوگئی تھی، میرے غرورِ بلاغت کے سامنے بہت عرصے تک موجود نہ رہ سکی۔ عدالت کا فیصلہ قانون کی اور خود میری ایک مہتم بالشان فتح تھا۔

میں نے اُس آدمی کو سزایابی کے دن پھر دیکھا جلّاد اُس وقت اُسے جکڑ کر قتل گاہ کی طرف لیجانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

جب میں نے اُسکے مایوس چہرے کی طرف نظر کی، میرے دل کو ایک شدید صدمہ پہنچا۔ اُس خوفناک وقت کی ہر ہر بات میرے دماغ میں ابتک تازہ ہے۔ جب اُنہوں نے اُس کے دست و پا کو زنجیر و سلاسل میں جکڑ دیا۔ تو وہ بالکل خاموش رہا

اُس کی طرف دیکھنے کی مجھے جرأت نہ ہوتی تھی۔ اُس کی سکون ریز آنکھیں ایک عجیب انداز سکوت سے میری طرف جمی ہُوئی تھیں۔ جب وہ زندان کے دروازے سے باہر آ کر گلوتین کے سامنے کھڑا ہُوا اُس نے دو مرتبہ چلا کر کہا "میں بیگناہ ہوں۔ میں بیگناہ ہوں" اور وہ لوگ جو اُسے مرکز لعنت وملامت بنانے پر آمادہ کھڑے ہُوئے تھے چُپ کے چُپ رہ گئے۔ پھر وہ میری طرف رجوع ہُوا اور بولا "مجھے قتل ہوتا دیکھو۔ یہ تمہاری محنت کا انعام ہے"۔ وہ اپنے پادری اور وکیل سے لپٹ گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ ایسے یاد آتا ہے کہ پھر وہ خود بخود گلوتین پر جا چڑھا۔ اور انتظارِ موت کے انجام پذیر ہونے والے لمحہ کے لئے، بغیر کسی ہچکچاہٹ کے، چاقو کا انتظار کرتا ہُوا، تختہ پر پڑا رہا۔ میں سر بر ہنہ پاس کھڑا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے کچھ دھندلا دھندلا خیال ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیوں کہ میں کچھ بھی نہ دیکھ رہا تھا، میرا دماغ ایک لمحہ کے لئے تو بالکل سُن ہوگیا تھا۔

اُس کے بعد کے دنوں میں ایک خاص تکلیف نے میرے جسم کو بےحس وحرکت کر دیا۔ میرا دماغ اس قدر پریشان خیال ہوگیا کہ اُس تکلیف کا باعث معلوم کرنے سے قاصر تھا۔ اُس شخص کی موت کا خیال ایک بے نام سے بوجھ، کی طرح ہر وقت میرے دل پر رہتا تھا۔ ساتھی وکیلوں نے مجھ سے کہا کہ "شروع شروع میں ایسا ہی ہُوا کرتا ہے"۔

میں نے اُنکی بات کا اعتبار کیا۔ لیکن رفتہ رفتہ مجھے معلوم ہوگیا کہ میری تکلیف کی ایک خاص وجہ ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شک! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جس لحظہ سے مجھے یہ علم ہُوا میری راحتِ جگر کافور ہوگئی۔ ذرا سوچو تو سہی کہ ایک مجسٹریٹ کے دل کی کیا کیفیت ہوتی ہوگی جب وہ کسی کے قتل کا حکم دینے کے بعد اپنے دل میں سوچتا ہوگا کہ

"شاید وہ مجرم نہ ہو"

مَیں نے اپنی تمام طاقت اس خیال کو رفع دفع کرنے میں صرف کر دی۔ میں نے اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ یہ خیال محض بیہودہ ہے۔ میں نے استدلال کی مدد سے اپنے دل و دماغ کے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہا، لیکن میری تمام دلیلیں اس ایک سوال کے آگے رد ہو جاتی تھیں کہ کوئی اصلی ثبوت بھی تھا کہ نہیں؟ تب میں اُس شخص کے واپسیں لمحوں کی سوچ میں محو ہو جاتا۔ اُس کی پرسکون آنکھیں میرے سامنے آجاتی تھیں۔ اور اُس کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگتی تھی۔

"اور ایک دن اُسی قتل گاہ کا درد انگیز سماں میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا کہ کسی نے مجھ سے کہا "اُس شخص نے اپنی صفائی نہایت خوبی سے پیش کی تھی بڑی حیرت خیز بات ہے کہ وہ بری نہ ہو سکا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یقین جانو کہ اگر میں تمہاری آخری دلیل نہ سنتا تو میں

یہی سمجھے رہتا کہ وہ معصوم تھا۔

تو گویا میرے زورِ بیان کی سحر طرازی اور میری مقدمہ جیتنے کی مستقل خواہش نے اُس تماشائی کے شکوک رفع کر دیئے تھے۔ شاید جیوری کے ساتھ بھی ایسا ہی ہُوا ہو۔ . . . اگر ایسا ہے پھر تو میں صرف میں —— اس آدمی کی موت کا جواب دہ ہونگا اور اگر وہ ناکردہ گناہ مارا گیا تو پھر اس کا خون میری گردن پر سوار ہے۔

کوئی شخص کسی الزام کو چپکے سے اپنے سر پر نہیں لے لیتا۔ وہ کوئی نہ کوئی مدافعانہ کوشش ضرور کرتا ہے۔ اپنے ضمیر کو کسی نہ کسی طرح مطمئن کرنا چاہتا ہے۔ اس خیال سے میں نے مقدمہ کے کاغذات کو از سرِ نو دیکھنا شروع کیا۔ تمام دستاویزات و تحریرات کے دوبارہ دیکھنے کے بعد بھی میں اُسی پہلے نتیجے پر پہنچا لیکن وہ تمام تحریرات، تمام دستاویزات میرے ہی متعصب دماغ کی تیار کردہ تھیں میری ہی ہوسِ ترقی کی زائیدہ، اور اُس شخص کو مجرم ثابت کرنے کی ضرورت کا نتیجہ تھیں۔

پھر میں نے مقدمہ کے دوسرے پہلوؤں کی طرف توجہ کی۔ ملزم سے کئے ہُوئے سوالوں کے جواب دیکھے۔ گواہوں کی شہادتیں پڑھیں۔ چند نکات ہنوز حل طلب تھے، اُن کے سمجھنے کو میں محلِ واردات پر گیا۔ میں نے قاتل کے استعمال کردہ ہتھیار کو ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ کوئی بیس مرتبہ میں نے تمام امور پر غور و خوض کی۔ آخر کار میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ بیچارہ معصوم تھا۔

اور پھر تاسف کی سلگتی آگ کو بھڑکا دینے کے لئے مجھے چند روز بعد ایک عہدۂ جلیلہ عطا کیا گیا —— آہ۔ یہ میری انتہائی دناءت کا تہدیہ عوض تھا!

موسیو! میں نہایت ضعیف دل واقع ہُوا تھا۔ میں نے بغیر اظہارِ سبب کے استعفا دیکر اپنے زعم میں یہ فرض کر لیا کہ بس گناہ کا کفارہ ہو گیا۔ میں نے ایک دور دراز سفر شروع کیا۔ لیکن افسوس؛ دل کا گم کردہ سکون طول طویل سفروں سے مل نہیں سکتا۔

اب میری زندگی کا مقصدِ وحید یہ ہو گیا کہ جس طرح ہو سکے اُس ناانصافی کی تلافی کروں۔ لیکن وہ آدمی کوئی آوارہ بے خانماں تھا۔ اس کا نہ کوئی رشتہ دار تھا نہ مونس۔ اس حالت میں مجھے ایک ہی بات زیبا تھی۔ وہ یہ کہ میں اپنی خطا کاری کو صاف صاف مان لیتا۔ مگر نہیں مجھے اس کی ہمت کہاں؟ —— یہ خوف کیا کم تھا کہ میرے ہم پیشہ واقف کار مجھ پر خفا ہوں گے، مجھے ہدفِ استہزا بنائیں گے!

آخر کار میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اپنے تمام سرمایہ کو محتاجوں اور مجرموں کی حاجت روائی اور کشودِ کار میں صرف کر دوں۔ بھلا مجھ سے زیادہ اور کون اُن تیرہ بختوں

کو قانون کے سخت گیر شکنجے سے بچانیکا کفیل تھا؟ میں نے زندگی کے تمام لذایذ و مسرات سے مغائرتِ کلّی اختیار کر لی۔ اہلِ دنیا کی نظروں سے اوجھل تنہائی میں رہتا رہا۔ وقت سے پہلے ہی بوڑھا ہو گیا ہوں میں نے اپنے لوازمِ زندگی کو بہت کم کر دیا ہے۔ مہینوں میں اس تاریک خلوتخانہ میں پڑا رہا ہوں اس مرض الموت میں بھی یہیں مبتلا ہُوا، اور آرزومند ہوں کہ یہیں مروں + ۔ اور ہاں اب میں نفسِ مدّعا عرض کرتا ہوں

اُس کی آواز اس قدر دھیمی ہو گئی تھی کہ مجھے اسکی باتوں کا مفہوم اُس کے کپکپاتے ہُوئے ہونٹوں سے کان لگا کر ہی سمجھنا پڑتا تھا۔

میں نہیں چاہتا کہ میرے ساتھ میری کہانی بھی مدفونِ فراموشی ہو جائے۔ میری تمنّا ہے کہ آپ اسے اُن اشخاص تک پہنچا دیں جن کا فرض مقتضائے انصاف کی رُو سے مجرموں کو سزا دینا ہے۔ آپ اُن پر واضح کر دیں کہ ملزموں کو ضروری طور پر سزا دینے کا خیال کس قدر ہولناک ہے۔ آپ یہ بات سرکاری وکیلوں کے ذہن نشین کرنیکی کوشش کریں کہ جب وہ کسی ملزم کو سزا دلانے کھڑے ہوں تو اس بات کا لحاظ رکھیں کہ مبادا کوئی ناقابلِ تلافی غلطی سرزد ہو جائے"۔

میں نے اُسے یقین دلایا کہ "آپکی ہدایت پر ضرور کاربند ہونگا"

اُسکا چہرہ نیلگوں اور سیاہ ہو رہا تھا۔ اُسکے ہاتھ تھرتھرا رہے تھے۔ وہ بولا "لیکن محض یہی نہیں۔۔۔ میرے پاس ابھی تک کچھ روپیہ ہے۔۔۔۔ جسے میں کسی مصرف میں نہیں لا سکا۔۔۔۔ وہ وہاں میز کے خانہ میں پڑا ہے۔۔۔۔ میرے بعد اُسے غریبوں میں تقسیم کر دینا۔۔۔ میرے نام سے نہیں، اُس شخص کے نام سے جو آج سے تیس برس پیشتر میری غلطی کا شکار ہُوا تھا۔۔۔۔ یہ تمام روپیہ اُسی رینل کے نام سے تقسیم کر دینا"۔

میں چونک اُٹھا۔

"رینل۔ لیکن اُسکا وکیل تو میں تھا۔ میں نے۔۔۔۔۔"

اُس نے اپنا سر ہلایا۔

"میں جانتا ہوں۔ اسی لئے تو میں نے آپکو بلایا تھا۔ آپکے آگے تو مجھے اپنے گناہ کا اعتراف کرنا لازمی تھا۔ میں ڈیوروکس سابق سرکاری وکیل ہوں"۔

اُس نے اپنے بازوؤں کو اوپر اُٹھانیکی کوشش کی وہ زیرِ لب آہستہ سے بولا "رینل۔۔۔ رینل۔۔۔۔"

شاید میں نے اپنے پیشہ کا ایک راز فاش کر دیا۔ اور ایک ایسے قاعدے کی خلاف ورزی کی جس پر عمل پیرا ہونا میرا فریضۂ واجبی تھا۔ لیکن اُس مرتے ہُوئے شخص کی قابلِ رحم حالت نے میرے منہ سے بے اختیار نکلوا ہی دیا:۔

"موسیو ڈیوروکس۔ موسیو ڈیوروکس۔ رینل دراصل مجرم تھا۔ اُس نے قتل گاہ کو جانے سے پہلے اس کا اقبال کر لیا تھا مجھ سے رخصت ہوتے وقت اُس نے سب کچھ مجھے بتا دیا تھا"۔

لیکن وہ تو پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ میں ہمیشہ یہ یقین کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں کہ اُس نے میری آخری بات ضرور سُن لی تھی۔

(ترجمہ) محمد ہادی حسین مشن کالج لاہور

چاند

اے چاند! ممکن ہے کہ تجھے اپنی چاندنی پر ناز ہو کیونکہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب تو چمکتا ہے تو ایک چاندی کا دریا ہماری اس میلی زمین پر لہریں مار کر اسے خوبصورت بنا دیتا ہے۔ بظاہر پتھر۔ سبزہ۔ پانی سب کو تو پیار کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان میں ایک نئی رونق۔ نیا جوبن پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ تیری نورانی شعاعوں سے انسان کے دل کی مرجھائی ہوئی کلی پھر تر و تازہ ہوتی ہے۔ دماغ میں نئی روشنی آتی ہے اور وہ جذبات جو اس دنیا کی کش مکش سے دب جاتے ہیں وہ ازسرنو جوانی کی مستانہ ادا سے جھومتے ہوئے انسانی دماغ کے باغ میں خوشی خوشی سیر کرنے لگتے ہیں۔ تیری چاندنی کیا ہے سنگِ پارس ہے، جسے چھو گئی اسے سونا کر گئی، آبحیات ہے جو مردہ دلوں کو زندہ کرتی ہے پیغام بقا ہے جو انسانی روحوں کو دیوتاؤں سے بالاتر رُتبہ عطا کرتی ہے۔ لیکن اے چاند کیا تجھے معلوم ہے کہ تیری سطح پر نہ پانی نہ ہوا نہ کوئی جاندار چیز، تیرا سینہ۔ ایک جھلسا ہوا داغدار بھیانک غاروں اور چٹانوں کا مجموعہ، جوانی کی آگ بجھی ہوئی، بڑھاپے کی پیاس مری ہوئی۔ زندگی کی آس ٹوٹی ہوئی بلکہ یہ چاندنی بھی تیری اپنی نہیں۔ تیرے گدائی کے پیالے میں سُورج کی خیرات ہے۔ اور کیسی خیرات کہ مہینے بھر میں دو چار دن پیٹ بھر کر۔ ورنہ کبھی نصف روٹی کبھی اس سے بھی کم۔ اور کبھی کچھ بھی نہیں۔

اے چاند کیا تجھے معلوم ہے کہ ہمارے ملک کا بھی یہی حال ہے۔ دور سے دیکھیں تو اچھا، سارے زمانے میں مشہور، اغیار کیلئے مالدار، مغربی سورج کا تختۂ مشق، ورنہ دراصل وہی جھلسا ہوا بے جان صدیوں کا مُردہ۔

اے چاند مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تو اس زمین سے جُدا ہوا تو بدبختی کی مٹی کچھ تو ساتھ لے گیا اور کچھ ہندوستان میں ڈالی گئی تیری اور ہندوستان کی مٹی کا خمیر ایک ہے۔ تو دیوانہ وار دُنیا کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ ہمارا ملک غلامانہ وار دُنیا کے با اقبال زبردستوں کے گرد پھرتا ہے۔ نہ تیرے لئے رہائی ہے نہ ہمارے لئے نجات۔

اے بے نصیب ہندوستان کے بدبخت بچھڑے ہوئے بھائی۔ کاش کہ تو روشن نہ ہوتا اور کاش کہ ہندوستان آباد نہ ہوتا۔ اس زمین کی اولاد میں سے ایک تو اور ایک ہمارا ملک دونو نامراد۔ دونو کے سینے داغدار۔ دونو کی آس ٹوٹی ہوئی آ۔ تو اور میرا ملک یہاں سے کوچ کریں۔ آسمان کے ہرے بھرے کھیت میں ہزاروں جگہ اور ہیں چل کہیں اور بسیرا کریں

عبدالعزیز

بہترین دُنیا

"میں تجھے بہترین دُنیا کا تذکرہ کرتے ہُوئے سُنتا ہوں، تو وہاں کے بچّوں کو جماعتِ فرحناک بتاتی ہے! اماں! وہ نورانی ساحل کہاں ہے؟ کیا ہم اس کی جستجو نہ کریں، اور اُس کے لئے آنسو نہ بہائیں؟ وہ وہاں تو نہیں ہے جہاں نارنگی کے پھول شگفتہ ہوتے ہیں، اور جہاں کنجہائے حنا میں جگنو چمکتے ہیں؟"

—"نہیں میرے بچے وہ وہاں نہیں ہے!"

"کیا وہ وہاں ہے جہاں پر رکھنے والے کھجور کے درخت اُگتے ہیں، اور جہاں آفتابی آسمان کے تلے کھجوریں پکتی ہیں؟ یا چمکتے ہوئے سمندروں کے بیچ میں، ہرے ہرے جزیروں کے درمیان جہاں خوشبو سے بھرے ہُوئے جنگل نسیمِ سحر کو معطر کرتے ہیں، اور خوبصورت چمکیلی چڑیاں اپنے پھڑ پھڑاتے ہُوئے بازوؤں پر دُنیا کے تمام الوانِ خوش رنگ کی حامل ہوتی ہیں؟"

—"نہیں میرے بچے وہ وہاں نہیں ہے!"

"کیا وہ یہاں سے بہت دور کسی قدیم کرۂ ارض پر تو نہیں ہے، جہاں دریا سنہری ذرات پر مصروفِ تگ و دو ہوتا ہے؟ — جہاں تابندہ یاقوت کی درخشاں شعاعیں چمکتی ہیں، اور ہیرے پوشیدہ معادن کو منور کرتے ہیں، اور موتی حلقہ ہائے مرجان سے ضیاء پاشِ انوار ہوتے ہیں؟ — اچھی اماں! بہترین دُنیا کیا وہیں ہے؟"

—"نہیں میرے بچے وہ وہاں بھی نہیں ہے!"

"آنکھوں نے اُس کا مشاہدہ نہیں کیا ہے، کانوں نے اُس کے عمیق نغماتِ مسرت کو نہیں سُنا ہے، تصور ایسی حسین دنیا کا نقشہ کھینچنے سے قاصر ہے — موت اور اندوہ وہاں بار نہیں پا سکتے! اس کی سدا بہار کلیوں پر زمانہ اپنا تاثر نہیں پیدا کر سکتا — بادلوں کی سرزمین سے بہت پرے، قبروں کے عمق سے بہت دُور —

میرے لاڈلے! بہترین دُنیا وہاں ہے!"

(ترجمہ)　　نعمت۔ گورکھپوری

محبّت

ہوا، آغوشِ سحر میں تھک کر مثل اُس بچّے کے سو رہی ہے جو رات بھر چیخ چیخ کر رو یا ہو ناشگفتہ کلیوں کی دلفریب چٹک چھیڑ چھیڑ کر اُسے بیدار کر رہی ہے۔

آدھی رات کے خاموش منظر کے بعد جب تاروں کی خاموش ضیاء پاشی پر اضمحلال طاری ہوتا ہے سمندر کی موجیں دامن سکون میں مُنہ چھُپانے لگتی ہیں اور پہاڑ کی بلند و برفانی چوٹیاں تاریکی میں غائب ہو جاتی ہیں تو آہ . . . . اُس وقت میری روح تیری آواز کی منتظر ہوتی ہے

محبت! محبت تیری مہربانیاں میری قاتل ہیں۔

آہ اے میری رفیقِ زندگی، خدا کیلئے اپنی روح کو سمندر پار سے میرے سوالوں کا جواب دینے کی اجازت دے آرام و آسایش کی خوشبو انقطاع نفس کے بعد محبت کی پُراسرار خاموشی میں اڑتی ہے، آہ اسی کو لوگ موت کہتے ہیں۔

ہاں میں استدعا کرتی ہوں کہ تو مجھے ایک بوسۂ محبت سے پھر زندہ کر دے۔

آرزو بیخودی کے پُرپیچ راستوں اور نشیب و فراز سے تھک گئی اور غنودگی کی خاموش وسعت میں محو رہنے والا دل جو کبھی فردوسِ محبت تھا اب نالہ کش ہے۔

آہ میں چمکتی ہُوئی گھاٹیوں اور چاند کو فریفتہ کرنیوالی خلیجوں میں تنہا ہوں . . . چشمۂ حیات کا مدّ و جزر، اُمید کے عمیق سمندر، خواہش کی متلاطم امواج میرے مسکن ہیں اور میں ان سب سے واقف، مگر آہ ہوا کا کوئی دردمند جھونکا یا شبِ ہجراں میں عاشقوں کو بہلانیوالے ستارے، اُس مقام کا پتہ نہیں دیتے جہاں تو ہے، کاش تو ہی بتا کہ تو کہاں ہے؟

آہ اے میری تقدیر مجھے وہ وقت کب میسر ہوگا جب میں اُسکے چہرۂ سیمیں کی پرستش سے اپنے خلوصِ نیازمندی کا ثبوت دے سکونگی۔

اے گذرے ہُوئے دنوں کے خیال بتا کہ انبساطِ رُوح کا کیا ساماں کروں . . . خیر اگر تو نہیں بتاتا تو نہ بتا، مگر میں خوش ہوں کیونکہ خوابِ گذشتہ کی جگمگاتی ہُوئی رُوحیں اس اندھیرے میں بھی دکھائی دیتی ہیں۔

سیّد ابو محمّد ثاقب کانپوری ,, نائیڈو ،،

محفلِ ادب

نغمۂ مغموم - آج پرانے مسودوں میں ہمیں سرور مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ نظم کا مسودہ مل گیا جس کو دیکھ کر بزمِ سرور کے چھلکتے ہوئے ساغر یاد آگئے اور گذشتہ بزم آرائیوں کی ایک دھندلی سی تصویر آنکھوں میں پھر گئی، ہم ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے یہ بادۂ کہن پیش کرتے ہیں۔

وہ ایذائے خلش ہے آہ میرے قلبِ مضطر پر — نظر آتا ہے اک قطرہ لہو کا نوکِ نشتر پر
شبِ غم میں گریں کچھ آہ ایسی بجلیاں سر پر — گماں نبضِ رگِ شعلہ کا ہے ہر تارِ بستر پر
شرارِ جستہ کا دھوکا ہے مجھکو جسمِ لاغر پر

تپِ سوزِ دروں نے دل میں ڈالے سینکڑوں چھالے — جگر کے اُڑ رہے ہیں نالۂ سوزاں سے پرکالے
پریشاں رُخ پہ گیسو ہیں کہ لہراتے ہیں دو کالے — شبِ غم میں کہاں آنکھوں میں وہ سُرمہ کے دنبالے
برستی ہے اداسی ہجر میں اب دیدۂ تر پر

چبھوتا ہے مرے پہلو میں رہ رہ کر کوئی نشتر — ٹپکتا ہے کلیجہ چشمِ تر سے اشکِ خوں ہوکر
برنگِ لالہ داغوں سے شگفتہ ہے دلِ مضطر — دوپٹے کا کہاں اب سرخ آنچل دوشِ نازک پر
کہ دھبے جا بجا اب اشکِ گلگوں کے ہیں چادر پر

وہ نقشہ اب کہاں اگلا سا شانِ دلربائی کا — وہ عالم قدِ رعنا میں کہاں رنگیں ادائی کا
گلہ کس سے کروں میں بختِ بد کی نارسائی کا — نہ پوچھو مجھ سے کچھ عالم خلش ہائے جدائی کا
بدلتی ہوں شبِ غم کروٹیں میں نوکِ نشتر پر

نہ نکلے جسکے ارماں وہ دلِ درد آشنا ہوں میں — فغانِ بے اثر ہوں، نالۂ حسرت فزا ہوں میں
نہ گلگونہ ہوں چہرے کا، نہ ہاتھوں کی حنا ہوں میں — وہ بیکس ہوں، شہیدِ پرسشِ تیغِ جفا ہوں میں
نہ پوچھو کچھ قیامت کے ہیں چرکے قلبِ مضطر پر

کہوں کیا کس کشاکش میں ہے جانِ ناتواں میری — کلیجہ تھام کر اُٹھتی ہے اب دل سے فغاں میری
وہ جوڑا ہے عروسی کا، نہ اب وہ چند ریاں میری — وہ بیکس ہوں کہ توڑیں آسماں نے چوڑیاں میری

وہ شیشہ ہوں کہ دے پٹکا فلک نے مجھکو پتھر پر

کلیجہ چٹکیوں میں کوئی رہ رہ کر مسلتا ہے
کوئی تھم تھم کے ہاتھوں سے دلِ مضطر کو ملتا ہے

برنگِ شمع مغزِ استخواں شب بھر پگھلتا ہے
نہ آتی ہے اجل مجھ کو، نہ میرا دم نکلتا ہے

قضا بھی رحم اب کرتی نہیں مجھ زار و لاغر پر

(زمانہ)

خودنمائی۔ کیسی حیرت کی بات ہے کہ جو شخص اپنی ساری کمزوریوں اور ناقابلیتوں کو جانتا ہو وہ شہرت و ناموری کی ہوس کرے، اور یہ ہوس اُسے اس قدر اندھا کر دے کہ اپنی بُرائی۔ نالائقی۔ جہالت اور اپنے سارے عیبوں کو بھی وہ تعریف کے قابل سمجھنے لگے۔ اور کوشش کرے۔ کہ جہانتک بنے انہی کے ذریعہ سے شہرت و نمود حاصل کروں کہ اپنی تعریف کے قصیدے سُنتا رہوں۔

انسان کی اکیلی خوبیوں ہی پر اگر نظر ڈالی جائے تو وہ تعداد اور مقدار میں بُرائیوں سے کہیں زیادہ ثابت ہونگی۔ اس پر بھی اگر کوئی غور کرے تو صاف کھُل جائیگا کہ ایسا شخص بھی گو اُس میں اتنی ایک خوبیاں ہیں کبھی اُن پر فخر و ناز نہیں کر سکتا۔ یُوں تو ہر شخص کو دوسرے کے مقابل اپنی ذات میں کوئی نہ کوئی خوبی مل جائیگی جو دوسروں میں نہ ہو اور جس کے لحاظ سے وہ اپنے آپ کو دوسروں سے ممتاز خیال کر سکے مگر عقل والا ایسی خوبی کا خیال نہیں کیا کرتا۔ عقلمند اور بے وقوف کے خیال میں بس اتنا ہی فرق ہے۔ عقلمند چاہتا ہے کہ خود مجھ میں کوئی خاص قسم کی خوبی ہو۔ اور بے وقوف یہ خیال کرکے اپنے آپ کو ممتاز بناتا ہے کہ میں دوسروں سے اچھا ہوں کیونکہ اُن لوگوں میں بہت سی ایسی بُرائیاں ہیں، جو مجھ میں نہیں عقلمند خود اپنے عیبوں کو دیکھتا رہتا ہے اور بے وقوف دوسروں کے عیبوں کو عقلمند کی نظر فقط اپنی برائیوں پر پڑتی ہے، اور بیوقوف کی نظر فقط اپنی خوبیوں پر۔ عقلمند اُسی وقت خوش ہو سکتا ہے جب اپنی ذات میں کوئی عیب نہ پائے۔ مگر بے وقوف کی خوشی فقط اس پر منحصر ہے کہ چند لوگوں میں اُس کی واہ واہ ہو جائے۔ مگر یہ شہرت کی ہوس چاہے کیسی ہی لغو اور بیہودہ ہو اکثر اُس سے عُمدہ نتائج بھی ظاہر ہو جاتے ہیں، کیونکہ اُس سے انسان میں فقط اسی بات کا شوق نہیں پیدا ہوتا کہ برائیوں سے متنفر و محترز رہے بلکہ یہ ہوس اُسے ہمیشہ ایسے کاموں میں لگائے رکھتی ہے جو بہت اچھے اور اعلیٰ درجے کے ہوں اور اُسی دُھن میں وہ اکثر بہت کچھ کر گزرتا ہے۔ الغرض یہ ہوس عام اس سے کہ معیوب

ہو یا عمل اس کے نتائج نوعِ انساں کے حق میں ایسے اچھے ثابت ہوئے ہیں کہ اسے چھوڑ کے ضائع نہ کردینا چاہیئے۔ مسٹر مسرو کے نزدیک دنیا میں جتنے بڑے لوگ گزرے ہیں سب اسی بیہودہ ہوس کے طفیل میں پیدا ہوئے تھے۔ (دین و دُنیا)

شانتی نکتین بولپور۔ ٹیگور کے مدرسہ شانتی نکتین کے عموماً طلباء و اساتذہ نہایت سادہ لباس میں ملبوس رہتے ہیں جسے وہ زیادہ تر اپنے ہی ہاتھ سے سیتے ہیں۔ تمام اساتذہ و طلباء برہنہ سر اور برہنہ پا پھرتے ہیں الا اُس وقت جبکہ بیماری کی حالت میں طبیب تجویز کر دے، سب ایک ہی قسم کا کھانا جو چاول اور سبز ترکاریوں پر مشتمل ہوتا ہے ایک جگہ اور ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں ایک دوسرے سے چھوت یا نفرت بالکل نہیں رکھتے، تمام طلباء عموماً صبح چار بجے اُٹھتے ہیں اللہ تعالیٰ کی حمد و ستایش کے ترانے گاتے ہیں۔ بعد ازاں کنوئیں پر جا کر سب غسل کرتے ہیں اور سفید کپڑے پہن کر نماز میں (کہ نام ہے تامل و فکر، سوچ بچار، اور مراقبہ کا) مشغول ہو جاتے ہیں، بعدہٗ ناشتہ کرتے ہیں۔

ساڑھے سات بجے درس و تدریس میں مشغول ہو جاتے ہیں، تقریباً تین گھنٹہ متواتر تعلیم کے بعد ساڑھے دس بجے اساتذہ اور طلباء منتشر ہو جاتے ہیں اور غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر کھانا کھاتے ہیں، کھانا کھانے کے بعد اساتذہ آرام کرتے ہیں اور طلباء جس طرح چاہتے ہیں اپنا یہ وقت صرف کرتے ہیں،

دو بجے کے بعد دوبارہ درس و تدریس شروع ہوتی ہے اور چار بجے تک جاری رہتی ہے، چار بجے کے بعد کا وقت عموماً ناشتہ کے بعد طلباء ریاضیات بدنیہ میں صرف کرتے ہیں۔ بعض کرکٹ و فٹ بال وغیرہ کھیل کھیلتے ہیں بعض پیدل دس دس میل تک نکل جاتے ہیں اور قرب و جوار کے دیہات و گاؤں میں پہنچ کر وہاں ہندوؤں کی اصلاح و ہدایت میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ بہت سے قریب کے دیہات میں انہوں نے رات کا مدرسہ قائم کر کے باقاعدہ ہدایت و اصلاح کی درس و تدریس شروع کر دی۔ (معارف)

خیالات کا سرقہ۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ شعرا اپنے زمانہ سے پہلے شاعروں کے خیالات پر اکثر اشعار موزون کیا کرتے ہیں۔ سنسکرت میں کالیداس نے انگریزی میں شکسپیئر نے اور ہندی میں تلسی داس نے جو لاجواب و بے عدیل نظم کی کتابیں لکھی ہیں اگر اُن پر غور کیا جائے۔ تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے شہرہ آفاق مصنف نے قدیم شعرا کے خیالات کو اپنے کلام میں جا بجا کھپایا ہے۔ ایک

انگریزی نقادوں نے تو مصور جذبات شکسپیئر کے اکثر ناٹکوں کی سطریں تک شمار کر ڈالی ہیں اور دکھایا ہے کہ یورپ کا یہ بہترین ڈرامانویس کس طرح دوسرے شعرا کے خیالات کو بے دھڑک نظم کرتا جاتا ہے ہنری ششم شیکسپیئر کا بہت مشہور ناٹک ہے۔ اُس میں کل ۶۰۴۳ سطریں ہیں۔ ان میں سے ۱۸۱۱ سطریں تو شیکسپیئر کی تصنیف ہیں۔ بقیہ تمام حصہ دوسرے شعرا کا ہے جسے شیکسپیئر نے بعینہ یا قدرے رد و بدل کے بعد اُٹھا کر اپنے ناٹک میں رکھ لیا ہے۔ ہندی کے ایک مشہور نقاد کا قول ہے۔ کہ اگر اپنے سے پہلے شاعروں کے خیالات کو اپنے کلام میں جذب کرنا چوری میں داخل ہے۔ تو ہندی کا کوئی بھی شاعر اس الزام سے خالی نہ بچے گا۔ آسمان شہرت کے سُورج اور تاروں کو بھی گرہن لگ جائیگا۔ یہی حال دوسری زبانوں کا ہے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ قدیم شعرا کے خیالات کو لے لینا ایک عام بات ہوگئی ہے۔ پھر ایک امر کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ ایسا کرنے کا حق اُسے اور صرف اُسے حاصل ہے جو درحقیقت باکمال ہو۔ اور اُس خیال پر ہاتھ ڈالنے کا مستحق ہو۔ پرانے ادب کی عمارت سے اگر وہ کوئی اینٹ لیکر اپنی عمارت میں استعمال کرتا ہے۔ اور وہ ٹھیک نہیں بیٹھتی ــــــ اُس کا رنگ، اُس کی بناوٹ، اُس کی چمک دمک سب سے الگ دکھائی دیتی ہے۔ تو یہ بلاشبہ سرقہ ہے۔ اور اس پر ملامت ہونی چاہیئے۔ لیکن اگر وہ اُس اینٹ کو ایسے طریقہ سے استعمال کرتا ہے کہ اُسے عام نظر شناخت نہ کر سکے۔ اور اُس کی عمارت کی خوبصورتی بڑھ جائے۔ تو یہ سرقہ نہیں کہلاتا۔ اور یہ خیال ہمارا نہیں بلکہ سنسکرت اور انگریزی کے علما کا ہے۔ دھونیالوک اور ایمرسن نے اس کو بوجہ احسن تسلیم کیا ہے۔ اور اس کی اجازت دی ہے۔ (اُوشا ہندی)

اُس کی آنکھیں۔ اُس نے مجھ سے پوچھا۔ "میری آنکھیں کیسی ہیں"

میں نے جواب دیا۔ "ہرن کی سی"

"ہرن کیسا ہوتا ہے، میں نے تو اُسے کبھی نہیں دیکھا"

"معصوم بچے کی طرح"

لیکن وہ کس سے ملتا جلتا ہے، اُسے دیکھ کر کیا یاد آتا ہے؟"

"پرماتما"

اُس نے تنگ آکر کہا۔ "پرماتما کیسا ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "تمہارے جیسا"

"مگر میں کیسی ہوں"

میں نے ہنس کر کہا۔ میرے دل کی رانی!

میرے آئینۂ دل کے سامنے آ اور اُس میں اپنی شکل دیکھ۔ تُو اپنے ہی جیسی ہے میں تجھ کو کس سے تشبیہ دوں ـــــ نہیں مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔

پربھا (ہندی)

میَں اور تُو۔ جب میں دیکھتا ہوں۔ کہ تُو نے اپنا مندر میرے حوالے کر دیا ہے، تو میں تیری مہربانیوں کے بار سے نیچے دب جاتا ہوں۔ مگر جب یہ دیکھتا ہوں۔ کہ تُو خود اُس میں دکھائی نہیں دیتا۔ تو وہ مندر میری نگاہوں میں تیرہ و تار ہو جاتا ہے۔

جب میں دیکھتا ہوں کہ تو نے میرے کانوں کی ضیافت کے لئے کیسا دلاویز نغمہ چھیڑ رکھا ہے۔ تو میری روح تیرے شکریہ میں زمین بوس ہو جاتی ہے۔ مگر جب میں اُس میں تجھے گم پاتا ہوں تو اُس نغمہ کی قدر و قیمت غائب ہو جاتی ہے۔

جب میں باغ میں تیرے حسن کا جلوہ دیکھتا ہوں تو میری محبت تجھ پر نثار ہونا چاہتی ہے۔ مگر جب مجھے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ تیرا جلوہ حسن ہے۔ مگر حسن نہیں۔ بُو ہے مگر پھول نہیں۔ تو میری اُمید یاس بن جاتی ہے اور میں بیتاب و مضطرب ہو جاتا ہوں۔

کیا یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ تُو مجھ سے اپنا مندر اپنا نغمہ، اپنا حسن، اپنی نکہت سب کچھ لے لے اور ان سب کے عوض میں صرف خود میرا بن جا۔

کیا یہ قیمت کافی نہیں۔ تو میں پھر اور کیا دوں

ایک ہلکی سی آواز آئی "اپنی خودی"

کیا یہ تو ہے۔ تو آ۔ اور میری خودی کو پاؤں تلے مسل کر مجھے زمین سے اُٹھا + کُنج (بنگالی)

نغمۂ زندگی۔ اے فانی انسان! اپنے کانوں کو میرے نغمہ کی طرف متوجہ کر۔ اور جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں، اُسے پورے اطمینان سے سُن + تاکہ جب تیری موت کی خوفناک گھڑیاں قریب آئیں تو تجھے کراہنے اور پچھتانے کی ضرورت نہ پڑے۔

اپنی حرص محنت کے حوالے کر اور ہر وقت خیال رکھ۔ کہ اطمینان قلب ہی دنیا کا بہترین تحفہ ہے۔ اور جو تو محنت سے پیدا کرتا ہے۔ صرف اُسی پر تیرا حق ہے۔

راہ راست سے نہ بھٹک، حسین عورتوں کی ترچھی نظر سے بچ اور اُن کے چہروں کی فانی دلفریبیاں دیکھ کر اپنے آپ کو نہ بھُول جا۔ یہ تیرے لئے تباہی آور ہے۔

تیری زندگی ہمیشہ متزلزل ہے۔ جس طرح کنول کے پتے پر پڑے ہُوئے شبنم کے قطرے ہر لمحہ خطرے میں بستے ہیں ـــــ یہ دنیا آخر کار انتہائی رنج کے بحر میں غرق ہو جانے والی شئے ہے

تو جب تک کماتا ہے، تیرے دوست تیری مدح سرائی کرتے ہیں۔ مگر جب تو بوڑھا ہو جائیگا۔ تو اُن میں سے تیرے صادق تریں دوست کی سرگرمیاں بھی سرد مہری میں تبدیل ہو جائینگی۔

جب تک تیرے جسم میں سانس ہے اور خون میں حرارت کا شائبہ ہے۔ تو اپنے لواحقین کا عزیز ہے۔ مگر جس وقت تجھ سے تیری زندگی جدا ہوگی اُس وقت تیری پیاری بیوی کو بھی تجھ سے خوف معلوم ہوگا۔

دوستوں پر فخر نہ کر، اعلیٰ خاندان پر مغرور نہ ہو۔ اپنے شباب کو دیکھ کر اپنا مآل نہ بھول تاکہ جب وقت آکر ان اشیا کو تیرے ہاتھوں سے زبردستی چھین لے گا۔ اُس وقت تجھے آہ سرد بھرنے اور ہاتھ مل مل کر یہ نہ کہنا پڑے۔ کہ میں کیسا بیوقوف تھا۔

غفلت سے جاگ اور وقت کے گذرنے سے پہلے سنبھل۔ اس نغمۂ زندگی کو سُن اور اپنے کانوں میں بند کرلے۔ یہ تیری بہتری کا ضامن ہے ✦

ایوری مینتھ ریویو (مدراس)

وادیٔ تخیّل۔ ایک بوڑھا آدمی وادیٔ تخیّل میں لمبے لمبے قدم بڑھائے چلا جاتا تھا۔ ایک فرشتہ اُس کی رہنمائی کر رہا تھا۔

راستہ میں ایک آدمی شاہانہ شان و شکوہ سے آتا دکھائی دیا۔ اسکے چہرے پر شادمانی کھیلتی تھی اور آنکھوں میں امارت بھری ہوئی تھی۔ شباب اُس کے جسم کے ذرے ذرے سے نمایاں تھا۔ بوڑھے نے پوچھا "یہ کون ہے؟"

فرشتہ بولا "یہ تیری بیوی کا تصور خود تیرے متعلق ہے"

تھوڑی دور جا کر ایک تخت دکھائی دیا۔ اُسکے اوپر ایک حکیم مسند لگائے بیٹھا تھا۔ سینکڑوں آدمی آتے تھے اور اُس سے صلاح مشورہ طلب کرتے تھے۔ وہ حکیم ہنس ہنس کر ہر ایک سے مخاطب ہوتا تھا اور حکمت و دانائی کے مختصر الفاظ میں ہر ایک کو مشورہ دیکر وداع کر دیتا تھا۔ لوگوں کے ہونٹوں پر اُسکی تعریف کے کلمات دکھائی دیتے تھے۔

بوڑھے نے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟"

فرشتے نے جواب دیا "یہ تیرے متعلق تیرے بیٹوں کا تصور ہے"

دونو پھر چلنے لگے۔

راستہ میں ایک کنواں تھا۔ جس میں ایک تباہ حال شخص گرا ہوا تھا اور لوگ اُس پر اینٹیں پھینک رہے تھے۔ وہ بچارا بچنے کے لئے پناہ کی جگہ ڈھونڈتا تھا۔ مگر پناہ کہاں تھی؟ اُس کی سراسیمگی اُسکی بے بسی کا مکمل اظہار تھی۔ بوڑھے نے ہمدردی سے پوچھا۔ "یہ بدنصیب کون ہے؟"

"تیرے پڑوسی تجھے اس حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں"

جب سفر قریب الاختتام ہوا تو ایک اوسط درجہ

کا آدمی درختوں کے نیچے کھڑا پھل توڑتا دکھائی دیا۔ اُسکے کپڑے میلے تھے اور جوتوں کے تلے پھٹے ہُوئے تھے وہ پتھر مار مار کر پھل توڑ رہا تھا۔ مگر بسا اوقات اُن پتھروں سے خود اسی کا سر ٹوٹتا تھا۔ اس کا سارا جسم لہو لہان ہو رہا تھا۔ مگر پھر بھی وہ پھل توڑنے میں ہمہ تن محو تھا۔ اور جونہی کوئی پھل کسی درخت سے گرتا۔ اسکی خوشی نعرہ کی شکل میں ظاہر ہوتی تھی۔ بوڑھے نے فرشتے سے سوال کیا۔ "اب یہ کون ہے؟"

"تو اپنا عکس آئینہ میں دیکھ رہا ہے"

بڈھا حیرت سے فرشتے کا منہ تکنے لگا۔

سمارٹ سٹ (لنڈن)

نئے مضمون نویسوں کے لئے۔ ہم نے انگلینڈ کے بہترین مصنفوں سے درخواست کی تھی۔ کہ وہ نئے مضمون نویسوں کو ایک فقرہ میں کیا نصیحت کریں گے اس کے جو جوابات موصول ہُوئے ہیں اُن میں سے بعض حسب ذیل ہیں:-

۱- اگر تمہیں کسی کی تقلید کرنا ہے۔ تو تم پر شہرت کے دروازے کبھی وا نہ ہونگے۔

۲- اگر تمہیں بطور مصنف کے زندہ رہنا ہے۔ تو تصنیف کے لئے اپنی قربانی کرو۔

۳- مضمون لکھنے سے پہلے سوچو۔ کہ اس سے دُنیا کو کیا فائدہ ہوگا۔

۴- جب کوئی مضمون لکھو تو اُسے صندوق میں بند کردُ اور چند ماہ کے بعد اُسے پھر پڑھو۔ اُس وقت اگر تمہیں اُس میں لطف محسوس ہو۔ تب اُسے شائع کرنے کے لئے بھیجو۔ ورنہ جلا دو۔

۵- عبارت خیال کا لباس ہے۔ اس لئے خیال کی طرف توجہ کرو۔

۶- ہر ایک شخص مضمون نویس نہیں ہو سکتا۔

۷- دُنیا میں مضمون نویس بہت ہو چکے ہیں۔ اب مزید کی ضرورت نہیں۔

۸- اگر تم محسوس کرتے ہو۔ کہ تم عام آدمیوں سے مختلف نہیں تو لکھنا فضول ہے۔

۹- کیا تم روپے کے لئے لکھتے ہو۔ اس سے تو قہوے کی دوکان کھول لینا بدرجہا بہتر ہے۔

۱۰- تھوڑا عمدہ لکھنا زیادہ فضول لکھنے سے اچھا ہے۔

۱۱- اس سفر میں استقلال کی اشد ضرورت ہے ناکامی سے ہراساں نہ ہو۔ طعنوں سے ہمت نہ ہار۔ نکتہ چینی سے دل برداشتہ نہ ہو۔ آگے بڑھ۔ منزل قریب ہے۔

آرٹ اینڈ لیٹرز (لنڈن)

حصّۂ نظم

جلوۂ سحر

نکلا وہ آفتاب شبستانِ شرق سے
پھیلی ضیائے صُبح درخشاں قریب و دُور
ملبُوس بادلوں کے ہیں کیا زرق برق سے
افلاک سے زمیں پہ برستا ہے ایک نُور

تاروں کی اب کہاں ہیں وہ جلوہ نمائیاں
گُل ہیں چراغ مہرِ منوّر کے سامنے
چھٹتی ہیں ماہتاب کے رُخ پر ہوائیاں
کیا رنگ جم سکے شہِ خاور کے سامنے

زرتار ہوگئیں ہیں پہاڑوں کی چوٹیاں
سیماب پیرہن ہے ہر اک موجِ آبشار
پانی میں کوندتی ہیں شعاعوں سے بجلیاں
خیمے حباب کے ہیں لبِ آب زر نگار

ہیں نغمہ زن، طیورِ سحر خیز باغ میں
محوِ سپاسِ حق ہیں یہ طاعت گذارِ صُبح
شبنم کی ہے شراب گلوں کے ایاغ میں
کتنی سرور خیز ہے۔ سیرِ بہارِ صُبح

انگڑائی لے کے سبزۂ خوابیدہ جاگ اُٹھا
اُترا خمار۔ نرگسِ بدمستِ خواب کا
سُورج مُکھی کا اخترِ قسمت چمک گیا
کھولی ہے آنکھ دیکھ کے مُنہ آفتاب کا

کیا تازگی ہے خندۂ گُل کی شمیم میں
فرحت فزائے قلب ہے۔ تازہ کُنِ دماغ
اعجازِ جانفزائی ہے موجِ نسیم میں
وقتِ سحر بجھے ہُوئے دل بھی ہیں باغ باغ

مصروفِ کاروبارِ جہاں ہے ہر اک بشر
ہو کر شرابِ خوابِ شبانہ سے تازہ جاں
منزل سے قافلے بھی ہیں گرمِ رہِ سفر
پرچم شعاعِ مہر کا ہے کُوچ کا نشاں

بیٹھا جہاں پہ سکۂ خورشیدِ خاوری
زیرِ نگینِ مہر ہے اورنگِ کائنات
ظاہر ہیں ذرّے ذرّے سے آثارِ زندگی
چاروں طرف ہے گرمیٔ ہنگامۂ حیات

برق دہلوی

رباعیات

از آتشِ گرما جگر از دیدہ چکید
از گردشِ چرخ رنگ از چہرہ پرید
خود ابر بگوشِ تشنگاں میگوید
خاکم بر سر کہ آبم آتش گردید

دیباچۂ اسرارِ نہانی مائیم
درخورد جوابِ لن ترانی مائیم
جولانگۂ ما خط وجود و عدم ست
بازیچۂ مرگ و زندگانی مائیم

گرامی

مسجد میں ہیں رندانِ خوش اوقات کہاں
جو بات ہمیں چاہیئے وہ بات کہاں
رکھتا ہے مرا نام خراباتی تو
اے خانہ خراب آہ خرابات کہاں

زر

ہے دولت و زر مایۂ آرامِ جہاں
بے دولت و زر باغِ جہاں ہے زنداں
ہے دستِ تہی سے سر بزانو بلبل
ہے کیسۂ زر سے گل چمن میں خنداں

پی بادہ کہ ہے دولتِ محمود یہی
سُن نغمہ کہ ہے سنتِ داؤد یہی
کیا نیک و بدی کی فکرِ باطل اختر
ہر حال میں خوش رہ کہ ہے مقصود یہی

اختر دہلوی

جذباتِ عالیہ

گرامی

جہل آمد یقینِ ما بگریخت
عقل بگریخت دینِ ما بگریخت

آتشیں آہِ ما اثر دارد
آسمان از زمینِ ما بگریخت

نکتۂ لا الہ بر خواندیم
نقشِ غیر از جبینِ ما بگریخت

آنچناں از وجود رم کردیم
کہ اجل از کمینِ ما بگریخت

ز آب و گل رفتہ ایم بردرِ دل
فتنہ از ما و طینِ ما بگریخت

عشق سر بر زد از گریبانے
عقل از آستینِ ما بگریخت

عشق نام و نشاں نمیخواہد
نقشِ ما از نگینِ ما بگریخت

اجل آمد نشست بر بالیں
نفسِ واپسینِ ما بگریخت

علم افراخت امتحان فراق
جانِ اندوہگینِ ما بگریخت

زندگانی چناں رمید از مرگ
کہ گمان از یقینِ ما بگریخت

تا گرامی بخانقاہ نشست
شیخِ خلوت نشینِ ما بگریخت

ابرِ قدوائی

گلے پر رکھکے خنجر پوچھتے ہو مدعا کیا ہے
نویدِ عیش وقتِ مرگ یہ طرزِ ادا کیا ہے

وہ شوخی نگہ کیا تھی یہ تمکینِ حیا کیا ہے
ارادہ اس فریبِ حسن سے او بیوفا کیا ہے

لبوں پہ جان آئی جان جانے میں رہا کیا ہے
نہیں حدِ وفا گر یہ تو پھر حدِ وفا کیا ہے

محبت میں کسے یاں ہوش فرقِ امتیازی کا
کسے فرصت جو یہ سوچے ادا کیا ہے قضا کیا ہے

ہمارے سادہ دل نے کی اجل کی ناز برداری
نہ کچھ سمجھا کہ یہ چین جبیں خنجر نما کیا ہے

سرشکِ غم میں خونِ دل کی رنگ آمیزیاں توبہ
بلائے جاں ہے یہ خون گرمیِ جوشِ وفا کیا ہے

نہ آہِ نارسا جس بیخبر کے کان تک پہنچے
وہ کیا جانے شکستِ شیشۂ دل کی صدا کیا ہے

کھلا ابتک نہ کچھ او ناز پرور بامِ تیو اپر
کہ تیری ناز برداری کی آخر انتہا کیا ہے؟

یہ مانا ہمنے نازِ حسن ہے اک شانِ محبوبی
مگر یہ شیوۂ پندارِ ہمت آزما کیا ہے

اثر کچھ چاشنیٔ مرگ کا کچھ لذتِ غم کا
سوا اسکے شکستہ دل کے ٹکڑوں میں مزا کیا ہے

ہم اپنی جان سے اے ابر جاتے ہیں وہ ہنستے ہیں
تماشا گاہ ہے یا امتحانگاہِ وفا کیا ہے

وقار الاعظم شرف (جاورہ)

ہر سانس میں دردِ آرزو ہے
ہر پھر کے اسی کی جستجو ہے

کیا ہنستے ہو میرے حال پر تم
ان پھولوں میں رنگ ہے نہ بو ہے

خنجر ہو ترا کہ بادۂ ناب
جو کھنچ گیا اس کی آبرو ہے

کیا پوچھتے ہو مزاج میرا
آئینہ تمہارے روبرو ہے

شمشاد نے انگلیاں اٹھا دیں
گلزارِ جہاں میں تو ہی تو ہے

مارا تری نرم بولیوں نے
ظالم یہ کہاں کی گفتگو ہے

کیا ایسے پہ تمکو رشک آیا
تم تم ہو شرف عدو عدو ہے

وحشت کلکتوی

دل ہنگامہ جو ہے اور ہجومِ صد تمنا ہے
نہیں کھلتا کہ آخر خاص اسکا مدعا کیا ہے

نہیں اک ذرہ بھی عالم میں جد و جہد سے خالی
کشاکش سعی کی ہے عام، گویا سب کو سودا ہے

تلاش آخر ہے کسکی باعثِ محویتِ عالم
سمجھ ہی میں نہیں آتا الٰہی ماجرا کیا ہے

جہاں کی دلفریبی ہائے گوناگوں کا کیا کہنا
مگر جب غور سے دیکھو تو ہر نقشِ ایک دھوکا ہے

اسی کا حق ہے جذباتِ کمی حق زورِ بازو سے
یہ لفظِ دلفریبِ خلق معنی سے معرا ہے

ضعیف از بسکہ ہے بنیاد فرقِ انتہائی کی — بہت مشکل ہے کہنا کون ادنیٰ کون اعلیٰ ہے

جبینِ شوق ہے اور سجدۂ محرابِ دل وحشت
یہ کس کا گوشۂ ابرو نہ جانے کار فرما ہے

حافظ رام نگری

میں بے پتہ کروں تو کروں جستجو کہاں — اتنا مجھے بتا دے کہ ملتا ہے تو کہاں

مرحوم دل کے ساتھ گئی دل کی آرزو — دل ہی نہیں رہا تو ہے آرزو کہاں

باغوں کے پھول اور ہیں داغوں کے پھول اور — ان میں وفا کا انکی طرح رنگ و بو کہاں

یہ کہکے بزم عیش سے اٹھوا دیا ہے مجھے — اے غمکشیدہ محفلِ عشرت میں تو کہاں

پائیگا تو بھی بار یہ سودا اے خام ہے
حافظ وہ بزم ناز کہاں اور تو کہاں

احسن مارہروی

چاک ہوتے نظر آتے ہیں گریباں دو چار — کہ تری بزم سے نکلے ہیں پریشاں دو چار

ایک وہ حسرت و ارماں ہیں تو پیکاں دو چار — رونقِ خانۂ دل ہیں یہی مہماں دو چار

غیر ہمراہِ جنازہ ہیں بہت دوست ہیں کم — مجھ پہ خنداں ہیں جو دشمن ہیں تو گریاں دو چار

نظر آتا نہیں کچھ اور شبِ ہجر ہمیں — دیکھ لیتے ہیں مگر خواب پریشاں دو چار

کیا تعجب ہے جو دنیا کو اٹھالیں سر پر — اور ہوں تجھ سے اگر ناصحِ ناداں دو چار

زخم کھانیکا مزا ابھی تو کچھ آئے ہمکو — ساتھ رکھے ستم ایجاد نمکداں دو چار

ایک عالم پہ ہزاروں ہیں ترے لطف و کرم
کاش احسن بھی اٹھاتا ترے احساں دو چار

آغا حشر کاشمیری

روتا ہے دل جفائے محبت سے ٹوٹ کے — اچھا ہے آبلہ جو یہ بہ جائے پھوٹ کے

دل چھیدتی ہے شرم سے سمٹی ہوئی نظر — خنجر بنی ہے آپکی تلوار ٹوٹ کے

غمزے ہیں انکے اور سرِ سرمایۂ نشاط — حصے لگا رہے ہیں مرے دل کی لوٹ کے

اک لطف کی نظر ہے علاجِ شکستِ دل — جڑ جاتا ہے یہ آئینہ سو بار ٹوٹ کے

دل ہے ادا پرست تغافل بھی ہے ادا — عاشق ہیں ہم تو وعدۂ وفا پہ جھوٹ کے

کتنی گھٹائیں آئیں برس کر نکل گئیں — آنسو مگر مرے نہ تھمے تجھ سے چھوٹ کے

دیکھا فریب رہزنِ دنیا و دیں کہ حشر — یوں لٹ کے خوش ہے گویا کہ آیا ہے لوٹ کے

تاجور

علاج دردِ دل اے چارہ ساز مہرباں کردم
کہ دردِ جاں ستانش را شریکِ بزمِ جاں کردم
ندادی رخصتِ فریادم از جورِ زباں بندی
دو چشم را بر نگیں اشک لبریزِ فغاں کردم
بخندید آسماں بر حالِ زارم از سرِ کینہ
من آہ آتشیں را بزمِ سوزِ آسماں کردم
زبانم را برید از بیم فریاد آں جفا پرور
بہ فریادِ جفائش ہر بنِ مو را زباں کردم

مردِ خسیس

یہ ایک دلچسپ ونتیجہ خیز ڈراما ہے ترکی زبان سے ایران کی مروجہ فارسی میں ترجمہ ہوا ہے اس کی گرانقدری کا ثبوت اس سے مل سکتا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی نے اسے منشی فاضل اور بی اے کے کورسوں میں داخل کر دیا ہے۔ چونکہ ایران کی مروجہ فارسی۔ ترکی۔ فرانسیسی اور انگریزی الفاظ سے پُر ہے۔ فارسی دان جو ایران کی موجودہ زبان اور اہل ایران کے محاورات سے واقف نہ ہو اس قسم کی کتابوں سے کما حقہ فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ طلباء بچاروں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ ان کو تو ہر ہر سطر سمجھنے میں دقت ہوتی ہو گی۔ طلباء کی مشکلات کو مدنظر رکھ کر مولانا سید اولاد حسین شادان لکھنوی پروفیسر اورینٹل کالج رامپور نے اس ڈرامہ کا فارسی سے بامحاورہ اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ مولانا شاداں قدیم فارسی ادب کی طرح جدید فارسی لٹریچر سے بھی واقفیت تامہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس قابلیت سے ترجمہ کیا ہے کہ ہر فارسی دوست اور اردو دان کے لئے یہ ڈراما دلکشی رکھتا ہے۔ شروع میں ۷۵ صفحات میں ہر ملک کے ڈراما کی تاریخ اسکی تدریجی ترقی پر ایک محققانہ مقدمہ لکھا ہے۔ مصنف اور مترجم کے حالاتِ زندگی، کتاب میں فارسی کے جتنے جدید الفاظ، جدید محاورات اور ترکی فرانسیسی وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں انکے بحوالۂ لغت معنی اور تشریح کیلئے آخر کتاب میں ۴۸ صفحات کی فرہنگ لکھی ہے یہ فرہنگ نہایت مفید ہے۔ ترجمہ اس طور پر کیا ہے کہ ایک صفحہ میں اصل فارسی عبارت اور اسکے بالمقابل ایک ہی صفحہ میں اردو ترجمہ ہے گویا کہ اس ترجمہ کو لینے والا اصل کتاب خریدنے سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے۔ ترجمہ کیا ہے اسکے لئے مولانا شادان کا نام لے دینا کافی ضمانت ہے انکی عمر فارسی تراجم اور تصانیف میں گذرتی ہے یہ ترجمہ منشی فاضل اور بی اے میں فارسی پڑھنے والے طلباء کیلئے تو مفید ہے ہی (کہ انکے کورسوں میں یہ کتاب داخل ہے) فارسی پڑھانے والے پروفیسروں اور جدید فارسی سے واقفیت پیدا کرنیوالے حضرات کیلئے بھی مفید ہے۔ کتاب کا حجم تین سو صفحات کے قریب ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ (عہ) ۔ ذیل کے پتہ سے کتاب مل سکتی ہے۔

دی رائل ٹریڈنگ کمپنی
بیرون اکبری دروازہ لاہور

دو نہایت قیمتی اور دلچسپ سوال

جو ہر خوش نصیب آدمی کو غور اور توجہ کے ساتھ حل کرنے چاہئیں

کیا میر اشمار بھی ایسے خوش نصیب لوگوں میں ہے؟ یا ہو سکتا ہے؟	کون شخص دنیا میں کامیاب۔ نامور اور بامراد زندگی بسر کر سکتا ہے۔

اگر جناب کو ان دو سوالوں سے ذرا بھی دلچسپی ہے اور نہ صرف اُن اصولوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں جو دنیا کے ناموروں اور اقبالمندوں کی **کامیاب زندگی** کی جڑ ھیں بلکہ ساتھ ہی اپنے اندر ایک بجلی کی سی لہر پیدا کرنی چاہتے ہیں جو جناب کو کامیابی و مرادمندی کی منزلِ مقصود پر پہنچا سکے اور ہمیں یقین ہے کہ آپکی موجودہ کاوش و محنت اور سینکڑوں ہزاروں کا صرف زراسی لئے ہے کہ آپ اپنے ارادہ میں کامیابی اور کمالیت حاصل کریں اگر آپ اپنی زندگی کے آنے والے سالوں کو کامیابی **عزت و ناموری اور دولت و اقبال** جیسی نعمتوں سے مالامال بنانا چاہتے ہیں تو آیئے آج اپنی عمر کے چند لمحے کتاب **کامیابی** کے بغور مطالعہ کرنے میں ہماری سفارش پر ضائع کر ڈالئے یہ کتاب مشاہدات کی بنا پر ایک عجیب روح بخش لہجہ میں جناب کو بتادیگی کہ دنیا میں **بڑا بن جانا**، دولت و عزت حاصل کر لینا، کسی کی میراث یا ملکیت نہیں۔ بلکہ یہ آدمی کے اپنے ہاتھ کے کھیل ہیں اور اگر آپ بھی چاہیں تو صرف چند اصولوں پر چلکر کچھ کا کچھ بن سکتے ہیں۔ نہایت محنت اور آبنائے ملک کی سچی ہمدردی سے لکھی گئی ہے ایک ایک لفظ قیمتی ہے جناب کے صدہا ساتھی ضرور اس سے فائدہ اُٹھائینگے آپ بھی اپنی کامیابی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں۔ کتاب کے ملاحظہ سے گذرنیکے بعد آپ ہم سے کہیں زیادہ اسکی قدر کرینگے۔ نہایت مؤثر اور دلچسپ سات ابواب پر مشتمل۔ لکھائی خوشخط سلیس۔ چھپائی عمدہ۔ کاغذ نفیس۔ خوبصورت جلد بندھی ہوئی۔

قیمت علاوہ محصولڈاک ایک روپیہ پانچ آنے ۵/۱ فرمایش کے ساتھ رسالہ ہذا کا حوالہ ضرور دیں۔

اگر منگوانی ہو تو فرمایش جلدی روانہ فرماویں۔ دوسرے ایڈیشن کا انتظار نہ کرنا پڑے۔

حافظ غلام رسول سوداگر۔ "کامیابی ڈپو" وزیر آباد (پنجاب)

اُجرت نامہ اشتہار رسالہ ہمایوں

اُجرت اشتہار پیشگی لی جاویگی۔ فحش اور دل آزار اشتہار نہیں لیا جاویگا۔ ٹائیٹل کے اشتہارات فی صفحہ ٹائیٹل ۲۵ روپے۔ دوسرا صفحہ سالانہ دوسو روپیہ۔

تعداد طبع	ایک صفحہ	نصف صفحہ
۱۲	۶۵ روپے	۳۵ روپے
۹	۵۳ روپے	۲۷ روپے
۶	۳۵ روپے	۱۸ روپے
۳	۱۸ روپے	۱۰ روپے
۱	۶ روپے	۳ روپے

تیسرا صفحہ ایک سو اسّی روپیہ چوتھا صفحہ سالانہ دوسو پچاس اشتہارات کے چربے بھجوانے چاہئیں یا اگر خود کاتب سے نہ لکھوا سکیں تو ایک روپیہ کاتب کی اجرت اشتہار کی اجرت کے علاوہ بھیجیں، نصف صفحہ سے کم کا اشتہار نہ بھیجیں۔

مینیجر رسالہ ہمایوں مزنگ روڈ۔ لاہور

خریدارانِ ہمایوں

خط وکتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا ضرور تحریر فرما دیں

قواعد

۱ - ہمایوں بالعموم ہر ماہ کے نصفِ اوّل میں شائع ہوا کرے گا -

۲ - علمی و ادبی - تمدنی و تاریخی اخلاقی و روحانی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اُتریں درجِ رسالہ کئے جائیں گے -

۳ - دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہ ہوں گے -

۴ - جواب طلب خطوط کے لئے ۱؎ کا جوابی کارڈ آنا چاہیئے -

۵ - کوئی ایسا اشتہار نہ لیا جائے گا جو خلافِ تہذیب ہو -

۶ - سالانہ قیمت پانچ روپے ششماہی تین روپے - نمونہ کا پرچہ ۸؍ علاوہ محصول ڈاک -

۷ - ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور ۸۶۴ صفحات سالانہ ہوگی -

۸ - خط و کتابت کے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھیں

۹ - ناپسندیدہ مضمون ۲؎ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے -

۱۰ - رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۲۰ تاریخ کے بعد اور ۲۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے - اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا -

۱۱ - منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کریں -

منیجر رسالہ ہمایوں
۳۰ - مزنگ روڈ - لاہور

(باہتمام لالہ دیوان چند مالک مرکنٹائل پریس لاہور چھپوا کر شائع کیا)

محفوظ

ت ہمایوں شد

ں میں بہ سبع مزوں شد

بیادگار عالی جناب جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

مرتبہ

میاں بشیر احمد بی۔اے۔(آکسن) بیرسٹر ایٹ لا۔ ایڈیٹر

مولانا تاجور نجیب آبادی (فاضل دیوبند) جائنٹ ایڈیٹر

منشی محمد صادق منیجر رسالہ ہمایوں نے
مرکنٹائل پریس میں چھپوا کر شائع کیا
(لاہور)

فہرست مضامین بابت ماہ نومبر ۱۹۲۲ء

جلد ۲ — نمبر ۵

حصۂ نثر

حصۂ نظم

جذباتِ عالیہ

جہاں نُما

ہندوستان کیلئے ایک خطرہ۔ بنگال اور مدراس کے چند دور اندیش اصحاب نے مشترکہ دستخطوں سے ایک اعلان شائع کیا ہے کہ ہندوستان کے امرا میں شہروں سے باہر رہنے کا رواج عام ہو رہا ہے اور یہ امر متحدہ ہندوستان کیلئے باعثِ خطر ہے۔ کیونکہ اس سے امیر اور معقول طبقہ عوام سے الگ ہوتا جاتا ہے اور غربا کی تکالیف و مصائب کا صحیح اندازہ کرنے کے قطعی ناقابل اس کا دوسرا تباہ کن نتیجہ یہ ہے کہ مُلک کا غریب اور کم تعلیمیافتہ طبقہ اُنکے اثر اور فیضِ صحبت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور اتنا ہی نہیں۔ رفتہ رفتہ حالت یہ ہو جائیگی کہ ہندوستان کے روشن دماغ اور معقول لوگ صرف اُنہیں پڑھے لکھے آدمیوں کے خیالات و جذبات سے آشنا ہو سکینگے۔ جو اُن سے مُلاقات کر سکتے ہیں۔ حالانکہ کثرت اُن آدمیوں کی ہے جنکی رسائی، ”عمدہ آب و ہوا“ نے اُن کے در تک ناممکن نہیں تو دشوار ضرور کر دی ہے۔

چین کی خانہ جنگیاں۔ اس وقت چین خانہ جنگیوں کا مرکز بنا ہُوا ہے۔ اور قریباً سوا سو مربع میل میدان میں دُھواں دھار جنگ ہو رہی ہے۔ اس جنگ کا باعث کیا ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے ہمیں چند سال پیچھے جانا پڑیگا۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں چین کی مطلق العنان حکومت کا خاتمہ ہُوا اور جمہوری حکومت قائم ہُوئی۔ لیکن چند ہی سال کے بعد اس وقت کے صدر حکومت یوآن شی کائی نے تمام اختیارات پر قبضہ کر لیا اور سیاہ و سفید کا مالک بن گیا اس کے بعد ایام جنگ میں کچھ فوجی لوگ شاہی خاندان کی حمایت میں کھڑے ہو گئے۔ اور اُنہوں نے جاپان سے امداد کی درخواست کی نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ جاپان نے چین میں اپنے پاؤں جمانے شروع کر دئیے۔ اور حکومت کی ایک اور مدعی جماعت کھڑی کر دی۔ اس جماعت کو دیگر ممالک نے تسلیم کر لیا۔ مگر چین کے اپنے لوگوں میں اُسے کوئی قدر و منزلت حاصل نہ ہو سکی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ حکومت کے دو فریق ہو گئے۔ جن میں سے ایک کا زور شمالی چین میں ہے، دوسرے کا جنوبی میں۔ اب یہ دونوں فریق جمہوری حکومت کے مدعی ہیں۔ دونوں متحدہ چین دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ لیکن سوال ذاتیات کا ہے اس لئے دونوں میں جنگ ہو رہی ہے۔ اور اس جنگ میں بہترین ہتھیاروں زہریلی گیسوں اور ہوائی جہازوں سے کام لیا جا رہا ہے۔

اس جد و جہد کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کے متعلق کئی خیال ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ چونکہ چین نے نئے آلات

جنگ کا استعمال کرنا سیکھ لیا ہے۔ اس لئے اب وہ پہلا چین نہ رہیگا۔ اور ایشیا کے لئے طلوع سحر ثابت ہوگا۔ مگر بعض مدبروں کی رائے ہے۔ کہ چین کا یہ طوفان تمام دنیا کو لرزہ براندام کردیگا۔ جاپان موقعہ کی تاک میں ہے وہ بہانا پاتے ہی چین کو اپنے آہنی پنجے میں جکڑ لے گا اور اُسے سر کھجلانے کا وقت نہ دیگا۔

دیکھیں پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ اور کارکنان قضا و قدر کیا کیا گل کھلاتے ہیں۔

وزیر اعظم کا استعفیٰ۔ ماہ گذشتہ کا سب سے اہم واقعہ وزیر اعظم برطانیہ مسٹر لائیڈ جارج کا مستعفی ہوجانا ہے افواہیں مشہور تھیں، لیکن یہ کسی کو خیال تک نہ تھا۔ کہ یہ تبدیلی اتنی جلد ہوجائیگی۔ بظاہر وزیر اعظم کی آخری تقریر اُنکی اپنی جگہ پر کھڑے رہنے کی انتہائی کوشش تھی لیکن بیرونی اور اندرونی مخالفت نے کچھ پیش نہ جانے دی اور اُنہیں مجبوراً اپنے عہدہ جلیلہ سے مستعفی ہونے کی ضرورت محسوس ہُوئی۔ مسٹر چیمبرلین۔ چرچ ہل اور اسکوئتھ کے اس عہدہ پر فائض ہونے کی توقع تھی۔ لیکن قلمدانِ وزارت مسٹر بونرلا کے سپرد کیا گیا۔ اور آپ نے نئی وزارت مرتب کرلی لیکن یہ انتظامات تاحال عارضی ہیں۔ کیونکہ نیا انتخاب عنقریب ہونیوالا ہے۔ اور اُس میں کامیابی حاصل کرنیکے لئے **ہر ایک جماعت** اپنی انتہائی کوششیں صرف کر رہی ہے ۔

کونین کا نعم البدل۔ موسمی اور سیاہ بخار کے دفعیہ کے لئے اس وقت تک کونین ہی استعمال ہوتی رہی ہے۔ لیکن اب ایک اور درخت دریافت ہُوا ہے۔ جس کے پتّوں کا عرق موسمی اور سیاہ بخار کے مریضوں کے لئے بے حد مفید ہے۔ یہ درخت بہار اور بنگال میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ اس کا ذائقہ کونین کے مانند کڑوا نہیں ہوتا ۔

ایک نیا لمپ۔ بائسکل میں لگانے کا ایک نیا لمپ ایجاد ہُوا ہے۔ جس کے لئے تیل یا گیس کی ضرورت نہیں پڑتی بائسکل کے پہیئوں کی حرکت ہی سے اُس میں بجلی پیدا ہوجاتی ہے اور لمپ روشن ہوجاتا ہے۔ یہ لمپ اسقدر مختصر اور سادہ ہے کہ اُسکے خراب ہونیکا کوئی اندیشہ نہیں برسوں تک بغیر مرمت کے کام دے سکتا ہے اس کی قیمت صرف ۲۶ شلنگ ہے ۔

علمی شعاعیں

زمین کی عمر۔ تین سال ہُوئے، مشہور سائنسدان لارڈ کیلون نے برسوں کے تجربات کے بعد کہا تھا۔ کہ زمین جس رفتار سے سرد ہو رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عمر دو کروڑ سال سے کم نہیں۔ مگر آج کل جو دور حاضرہ کے سائنسدان اس بارے میں تحقیقات میں مصروف ہیں وہ اس عمر کو اصل عمر سے بہت کم بتاتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ زمین کی کئی تہئیں ۴۲ کروڑ سال سے بھی قدیم ہیں۔ اور بعض ماہرین ارض تو یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ یہ عمر چھ ارب سال سے بھی زیادہ ہے۔

درخت پانی کس طرح پیتے ہیں؟ درخت اپنی خوراک دو ذریعوں سے حاصل کرتے ہیں۔ ہوا سے اور پانی سے مٹی میں جو خوراک کے اجزا ہیں۔ وہ پانی میں حل ہو کر درخت کی جڑھوں میں داخل ہوتے ہیں۔ اور پتوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ پانی درختوں کی چوٹیوں تک کیسے پہنچ جاتا ہے۔ اس پر کئی صدیوں سے بحث ہو رہی ہے۔ لیکن اس وقت تک اس کا فیصلہ کن تصفیہ نہیں ہُوا تھا۔ سر جگدیش چندر بوس نے ثابت کیا ہے کہ درختوں میں جو (Living cells) زندہ کوٹھڑیاں ہیں۔ اُنہیں کی بدولت وہ پانی اوپر کھینچ سکتے ہیں۔ اسے واضح کرنے کے لئے آپ نے ایک درخت کو زہر دیدیا۔ جس سے اس کی زندگی کی کوٹھڑیاں بے ہوش ہو گئیں۔ اس پر اُسکے پتے خشک ہو گئے شاخیں مُرجھا گئیں اور درخت زمین پر لیٹ گیا اسکے بعد جب اُس سے زہر کا اثر دُور کیا گیا تو درخت پر لُٹی ہُوئی شان واپس آ گئی اور ایسا معلوم ہُوا، گویا بُجھتے ہُوئے چراغ میں کسی نے تیل ڈالدیا ہے۔ اس سے صریح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ درخت اپنی زندگی کی کوٹھڑیوں ہی سے پانی کھینچتے ہیں اور خوراک حاصل کر کے اپنی زندگی برقرار رکھتے ہیں۔

تری سے خشکی۔ اس وقت تک آبادی کے لحاظ سے لندن دنیا کا سب سے بڑا شہر تسلیم کیا جاتا تھا مگر نیویارک نے گذشتہ چند سال میں اتنی ترقی کی ہے کہ اُس نے لندن سے یہ طرۂ امتیاز چھین لیا ہے اور اب بلا تردید کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا شہر نیویارک ہے۔ وہاں زمین اتنی گراں ہے کہ

جس کسی کو بھی مل جاتی ہے وہ اُسے آسمان کی طرف لے جاتا ہے اور خلا سے پورا پورا فائدہ اُٹھانیکی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ اس شہر میں ایک عمارت ۵۷ منزل تک اوپر جا چکی ہے۔ مگر اب اس سے بلند جانا خلاف صحت قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے انجنیئر چاہتے ہیں کہ سمندر کے پانی سے کچھ زمین خالی کرالی جائے۔ اور اُس پر مکانات تعمیر کئے جائیں۔ چنانچہ محکمۂ تعمیرات نے تحریک پیش کی ہے کہ آبادی کے لئے ۳۸۴۰ ایکڑ رقبہ کی زمین سمندر سے لے لی جائے۔ اس پر جو خرچ ہوگا۔ اُسے منہا کر کے میونسپلٹی کو قریباً دس لاکھ ڈالر کا منافع ہوگا۔

جذبات کی پیمائش۔ جب کبھی ہم جھوٹ بولتے ہیں۔ تو ہمارا دل اُچھلتا ہے اور ہمارے خون کا دباؤ زیادہ ہوجاتا ہے اور اس سے چہرے اور گردن میں غیر معمولی حرارت محسوس ہوتی ہے۔ نیز رخساروں کا رنگ سرخ ہوجاتا ہے۔

انگلستان کے ڈاکٹروں نے اس قانون قدرت کی بنا پر ایک ایسی مشین ایجاد کی ہے جو خون کے اس دباؤ کی پیمائش کرتی ہے۔ اور کذب بیانیوں کی حقیقت آشکارا کردیتی ہے یہ مشین ایک معمولی ربڑ کی نالی ہے جس پر دوران خون کی معمولی حالت میں ایک سیدھی لکیر کے نشانات سے پڑتے جاتے ہیں۔ لیکن جب زیر تجربہ آدمی جھوٹ بولنے لگتا ہے۔ تو دل دھڑکتا ہے، اور نشانات کی سوئی اپنی سطح سے بلند ہوجاتی ہے اور پھر بے قاعدہ نشانات بنانے لگتی ہے۔ ڈاکٹر پر راز بے نقاب ہوجاتا ہے۔ یہ آلہ ایسا کامیاب ثابت ہوا ہے کہ پیشہ ور کاذب اشخاص کے راز بھی کھول چکا ہے اور مجرموں کی حالت میں ایک آسمانی امداد بن گیا ہے۔

عمل جراحی کا ایک عجیب ترین واقعہ۔ گذشتہ کئی سال سے امریکہ میں ایک نوجوان لڑکی کا شہرہ رہا ہے جو ہنسنا اور مُسکرانا نہیں جانتی تھی وہ جوش غضب سے تلملا اُٹھتی تھی۔ مگر جب خوش ہوتی تھی تو اسکے چہرے پر خوشی کے آثار نظر آتے تھے نہ ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہوتی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے معلوم ہی نہیں کہ ہنسنا اور مُسکرانا کسے کہتے ہیں وہ جب دوسروں کو ہنستے اور مسکراتے دیکھتی تھی تو بہت متعجب ہوکر کہتی تھی یہ تم نے اپنا چہرہ ایسا مضحکہ خیز کیوں بنالیا ہے اور یہ بات اُسکی سمجھ سے بالاتر تھی کہ ایسا کسطرح ممکن ہے۔ آخر گذشتہ دسمبر میں اُسے ڈاکٹروں کے بورڈ کے سامنے پیش کیا گیا جنہوں نے کئی ماہ کے بحث مباحثہ کے بعد فیصلہ کیا کہ اُسکے دماغ میں نقص ہے جسے عمل جراحی سے رفع کیا جاسکتا ہے۔ لڑکی کے والدین نے عمل جراحی کی اجازت دی اور ایکماہ کے بعد لڑکی نے جب ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا تو ڈاکٹر کی مسرت چھپائے نہ چھپ سکی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

نسوانی دُنیا

شہ زوری کے مشہور جاپانی کھیل جیوجستو کی نمائش مقابلہ میں جو گذشتہ مہینے میں ہوئی تھی۔ ایک ہندوستانی عورت انوسوئیا بائی نے اول درجہ کا تمغہ حاصل کیا ہے۔ اسکے مقابلہ میں بڑے بڑے گرانڈیل پہلوان آئے لیکن اُس نے کسی کی پیش نہ جانے دی۔ جیوجستو ایک قسم کی کسرتی تعلیم ہے۔ جس سے آدمی ایک معمولی سے ڈنڈے کی امداد سے اپنی نسبت کئی گُنا طاقتور آدمی کو شکست دے سکتا ہے +

حکومتِ جاپان کی طرف سے تعلیم یافتہ جاپانی عورتوں کا ایک وفد دنیا بھر کے مہذب ممالک کا دورہ کریگا۔ اور دیکھیگا۔ کہ حکومت جاپان اپنی عورتوں کے لئے کیا کچھ کرسکتی ہے۔ یہ وفد سب سے پہلے انگلستان جائے گا۔

بلفاسٹ میں ایک چٹھی رسان ولیم کے میک نیل کی بیوی سب سے پہلی عورت ہے جس نے چٹھی رسانی کا پیشہ اختیار کیا ہے۔ وہ اسکے متعلق تمام امتحانات میں کامیاب ہو چکی ہے +

جہاز کے انجینئر کا کام نہایت ذمہ داری کا کام ہے۔ کیونکہ اُسکی ذراسی غلطی سے سینکڑوں زندگیاں خطرے میں پڑ جاتی ہیں اس وقت تک یہ ذمہ داری صرف مردوں ہی کو سونپی جاتی تھی۔ پر اب اس عہدے کے دروازے عورتوں پر بھی وا ہونے لگے۔ چنانچہ معلوم ہُوا ہے۔ کہ سب سے پہلی انجینئر عورت امریکن لیڈی مسز کارلیا ہیس ویسٹکاٹ ہیں۔ جو آج کل ایک بڑے جہاز میں چیف انجینئر کے فرائض انجام دے رہی ہیں آپ کی رائے ہے۔ کہ عورتیں اس کام کے لئے نہایت موزوں ہیں اور مردوں سے زیادہ کارآمد ہیں +

ہمایوں

جلد ۲ نمبر ۵

نومبر ۱۹۲۲ء

اکبر اور اخلاقیات

اکبر اور کلام اکبر پر ایک بسیط تبصرہ غالباً شروع سال سے "ادارۃ" کی جانب سے پیش ہو گا۔ ہماری خواہش تھی کہ مولانا اکبر کی تصویر کے ساتھ ادارۃ کا تبصرہ شائع کیا جائے۔ لیکن کثرتِ مشاغل نے اس کی تکمیل میں رکاوٹ پیدا کر دی۔ سردست تصویر کے ساتھ پنجاب کے اک ہونہار ادیب میاں محمد تصدق حسین صاحب خالد بٹالوی بی اے کے زیر تحریر تبصرہ کا ایک حصّہ شائع کیا جاتا ہے۔ اس مضمون کو درج کرتے ہوئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ حضرات اہل الرائے کے حملوں سے بچنے کے لئے اس مشہور سپر کو پیش کر دیں کہ

"اڈیٹر کا کسی مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں"

تاجور

آرٹ سچے معنوں میں انسانی جذبات اور خیالات کی حقیقی ترجمانی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ جو کچھ کہا جائے تہِ دل سے کہا جائے، جس میں تصنع اور ریاکاری کی کوئی آمیزش نہ ہو، جو کچھ کیا جائے راستی کے لئے کیا جائے نہ کہ نمود کے لئے۔ اور بلند سے بلند خیالات کو جو حسنِ معنوی سے لبریز ہوں، نہایت سادگی، بے ساختہ پن، اور اختصار لیکن وضاحت سے بیان کیا جائے۔ حُسنِ شعری اور حُسنِ اخلاق ایک ہی جڑ سے نمو پاتے ہیں اس لئے دونوں کے لئے حقیقی بلا تصنع اور راست ہونا چاہیئے۔

انسان فطرتاً حُسنِ اخلاق کا شیدائی ہے، اگر کسی کا مذاق اخلاقاً گرا ہوا ہے تو وہ ہر گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ انسان کی اخلاقی صحت کے بغیر اس کی تمدنی، معاشرتی اور سیاسی تندرستی ہمیشہ معرض خطر میں رہتی ہے، مولانا حالی فرماتے ہیں کہ شعر سے جس طرح نفسانی جذبات کو اشتعال ہوتی ہے اسی طرح روحانی خوشیاں بھی زندہ ہوتی ہیں۔ اور انسان کی روحانی اور پاک خوشیوں کو اس کے اخلاق کے ساتھ ایسا صریح تعلق ہے جس کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ شعر اگرچہ براہِ راست علم اخلاق کی تلقین اور تربیت نہیں کرتا لیکن از روئے انصاف اس کو علم اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں[1]

پس اگر ایک شاعر یا مُصنف کا اخلاقی اثر مخرب تہذیب ہے، یا اس کی تصانیف پوچ اور لچر ہیں۔ یا اس کی فطرت اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ اس کی قوت متخیلہ درست سوچ نہیں سکتی۔ نہیں اگر اس میں محض اتنی اہلیت نہیں کہ وہ رفیع و عالی ہو سکے تو ہمارے خیال میں اس کی دماغی استعداد یا شاعرانہ محاسن کسی صورت میں اسے بری التشنیع نہیں کر سکتے۔ لیکن اس معاملہ میں ہمارا فرض ہے کہ ہم بڑے فیاض اور کشادہ دل ہوں اور کسی سے یہ توقع نہ رکھیں کہ فطرت سے بڑھ کر اخلاق آموز ہو، ورنہ یہ ہماری تنگدلی کا بیّن ثبوت ہوگا۔ شاعر کو انسان کے اخلاقی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔ اور اس سے ملکوتی محاسن اور صفات کی تمنا نہ رکھنی چاہیئے۔ اس سے حُسنِ شعریت عنقا ہو جاتا ہے۔ البتہ شاعر کے لئے راست گو اور حقیقت شناس ہونا ضروری ہے کیونکہ "حقیقت حُسن کا پہلا اصول ہے"

اس بات کے تسلیم کرنے میں کوئی شک نہیں کر سکتا کہ بعض مصنف یا شاعر اخلاق کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے اور فطری تناسب کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک فانی مقبولیت اور وقتی ہر دلعزیزی حاصل کر لیتے ہیں۔ نہیں یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی کامیابی اس سے بڑھ کر ہو۔

عام خیال اشخاص اکثر اُن لوگوں کے پیچھے ہو لیتے ہیں اور بعض اوقات عام خیال نہیں بلکہ وہ بھی جو اس زمرہ میں شامل نہیں لیکن جو حقیقی ادبی مذاق نہ ہونے کے باعث خواہشِ حسّیات کی شورشوں اور اُلجھنوں میں گرفتار ہو کر معنیِ حُسن کھو بیٹھتے ہیں اور جو سفلی جذبات کو علویات سمجھنے لگتے ہیں، ان شعرا کو یکتائے روزگار تصور کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ شُہرت (اگر اسے شہرت کہا جا سکے) نہایت ہی فانی اور

[1] شعر و شاعری صفحہ ۱۱

ناپائدار ہوتی ہے، ان عام خیال لوگوں کی رائیں روز بروز تبدیل ہوتی رہتی ہیں

وہ شاعر یا مصنف جو حال میں شہرت کی تمنا رکھتا ہے یا جس کے دل میں اس مقبولیت کی خواہش بھی ہوتی ہے ہرگز بقائے دوام حاصل نہیں کرسکتا کیونکہ وہ جمہورِ عامہ کی توجہ کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کریگا، وہ ایسے خیالات نظم کریگا جو ان لوگوں کے دلوں پر اثر کریں۔ اور ان کے مرغوبِ خاطر ہوں۔ لیکن عوام ہمیشہ ایسے خیالات کو پسند کرتے ہیں جو ان کی سفلی کیفیتوں کے ساتھ منطبق ہوسکیں۔ شاعر ان لوگوں میں (جو اکثر تعداد میں بہت زیادہ ہوتے ہیں) مقبولیت حاصل کرنے کے لئے انہیں کے خیالات کی ترجمانی کریگا، وہ اپنے عالی جذبات اور رفیع خیالات اپنے حسنِ اخلاق اور نہ صرف یہی بلکہ اپنی شاداب ذہانت، خداداد قابلیت اور معاملہ شناس فراست کو ایک فانی شہرت اور ناپائدار مقبولیت کی بھینٹ چڑھا دیگا۔

علاوہ ازیں انسانوں کا جزوِ غالب، کوئی ایک وقت لے لیں، ہمیشہ غیر متناسب اور غیر مترتب اشیاء کو پسند کرتا رہا ہے۔ اور ہمیشہ اخلاقی تناسب کے اصول کو توڑتا آیا ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ جمہور میں "حسن" کی سچی شناخت نہیں بلکہ ان کے دلوں میں یہ قوت اتنی مدھم اور کمزور ہوتی ہے کہ ان کو اُس چیز کے تاثرات سے محفوظ نہیں رکھ سکتی جو اُن کے سفلی جذبات پر اثر انداز ہوتی ہے۔

پس جو اس اصول پر کاربند ہوتا ہے کہ "مجھے مناسب دائرۂ ادبیہ کی ضرورت ہے خواہ محدود ہی کیوں نہ ہو" جو ادب شناس، ادب آموز اور ادب نگار شخصیتوں سے خراجِ تحسین لیتا ہے اور عوام کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا بالآخر عوام کو بھی اپنی طرف کھینچ لاتا ہے۔ وہ عوام کا پہلا انتخاب نہیں بلکہ آخری انتخاب ہوگا۔ ذوق نے عوام میں شہرت حاصل کی آج بہت کم اس کے کلام کے پڑھنے والے ملینگے۔ غالب عوام سے مستغنی تھا۔ آج جو ہر دلعزیزی اسے حاصل ہے کسی تشریح کی محتاج نہیں۔

ہماری اس سے یہ مراد نہیں کہ ایک شاعر لازماً مذہبی اور متقیانہ جذبات مواعظ و عبر اور پند و نصائح کو نظم کرتا رہے۔ ہمارا موضوع اس وقت اثاث شاعری نہیں بلکہ منبع شعری ہے۔ اخلاقی نصائح کی شعر میں کوئی ضرورت نہیں۔ شاعر کا یہ فرض نہیں کہ ایک خاص مقصد کو لے کر

وعظ کرتا پھرے، شاعر کے لئے واعظ ہونا لازمی نہیں۔ ہم پھر کہینگے اور زور سے کہینگے کہ اخلاقی تادیب اور شاعری میں باہمی مماثلت تطابق قطعاً غیر ممکن ہے یہ دونوں غیر نوعی اور متضاد چیزیں ہیں لیکن ایک شاعر کے دل و دماغ میں ایک وہبی اخلاقی طاقت کا رہنا ضروری ہے تاکہ اس کی تصانیف حقیقت کی ضوریزیوں اور حسنِ فطرت کی جلوہ پاشیوں کا مجموعہ ہوں۔ اگر اس میں اس قدر اہلیت اور قابلیت ہے کہ اپنے جذبات اور واقعاتِ عالم کی صحیح ترجمانی کر سکے تو اس کی شاعری مؤید اخلاق ہوگی اور ضرور ہوگی۔ لیکن اگر وہ کسی مقصد کو لے کر، خواہ وہ کتنا ہی مؤید اخلاق کیوں نہ ہو، چیزوں کو فطرت کے خلاف بیان کریگا تو اس کی تعلیم محرومِ اثر ہوگی۔ اگر وہ، جیساکہ بہت سے طباع اور فہیم اشخاص نے کیا اپنے اخلاقی خیالوں کی جلوہ آرائی سے ہماری آنکھوں کو خیرہ کرنا چاہتا ہے اگر اسکے دل میں نمود زہد کی ٹھنی ہے تو پھر یا تو وہ شاعر نہیں اور یا شاعر سے بڑھ کر کوئی اور ہستی ہے۔ ہم اس کا غلطی سے مطالعہ بھی کرتے رہینگے لیکن اس میں "حسن وحقیقت" کی کشش نہ ہوگی۔

اردو شاعری میں فلسفۂ اخلاق کا معتد بہ حصہ ہے، اخلاق کا موضوع وہ اصول وعملیات ہیں جن کی بنا پر انسانی زندگی ہر حیثیت سے کامیاب ہو سکتی۔ اس کا تعلق زیادہ تر علم معاشرت اور علمِ سیاست مدن سے ہے لیکن چونکہ تمدن اور معاشرت کا اثر شاعر پر بہت گہرا ہوتا ہے اور چونکہ شاعر کی اختصار نگاری اور سحر طرازی کا طبائع انسانی پر عمیق اور فوری اثر ہوتا ہے۔ اس لئے اور مضامین کے ساتھ شعرا نے اخلاق کو اپنا موضوعِ سخن قرار دیا۔ ایران میں اخلاقی شاعری کی ابتدا **بدایعی بلخی** سے ہوئی جس نے نوشیرواں کی اخلاقی تعلیمات موسومہ **پندنامہ** کو نظم کیا اور اس کے بعد غالباً ہر قابلِ قدر شاعر نے فلسفۂ اخلاق پر کچھ نہ کچھ ضرور کہا[1]۔ جس میں سعدی، حافظ، عمر خیام، ابن یمین، اور عرفی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن اس بارہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جملہ شعرائے ایران نے اخلاق کی حقیقت کو قطعِ نظر کرتے ہوئے پند ونصائح اور مواعظ وعبر کو اپنے کلام میں جگہ دی وہ لوگوں کو نیکی کی راہ پر لانے کے لئے تلقین و ہدایت کرتے رہے اور یہ نہ جانا کہ وہ شاعر ہیں واعظ نہیں۔ ترکِ دنیا، قناعت، توکل، تواضع، خاکساری، عفو، حلم، جود وسخا، رضا بالقضا، کم آمیزی، قول و عمل، ترکِ طمع وغیرہ، ان کی تلقین ایک مذہبی واعظ اور مبلغ اخلاقیات کا کام ہے نہ کہ شاعر کا +

[1] علامہ شبلی الشعر العجم جلد پنجم

اس میں شک نہیں کہ آرٹ مذہب کی طرح عمیق اور زندگی کی طرح وسیع ہے لیکن آرٹ کا یہ مقصد نہیں کہ انسانیت کے نظریوں کے متعلق وعظ کرے نہ اس کا یہی مقصد ہے کہ شرافت اور نیکی کے بڑے بڑے سبق جو انسانوں اور قوموں کی زندگیوں میں مرموز ہیں لوگوں کو پڑھائے۔ اسکا مقصد یہ ہے کہ زندگی میں جو راستی اور اچھائی نظر آتی ہے اسے "حسن" کا جامہ پہنائے، جس طرح سائنس خوبصورتی اور اچھائی کو "حقیقت" میں بدل دیتا ہے اور مذہب، حقیقت اور حسن کو شرافت اور راست روی میں تبدیل کر دیتا ہے۔

اردو ادب نے فارسی کے آغوش میں پرورش پائی اس لئے اکثر شعرا نے اخلاق کو پند و موعظت سمجھا اور حقیقت شعری سے دور پڑتے چلے گئے گو بعض پیغمبران سخن (جن میں غالب اور اقبال کا پایہ سب سے بلند ہے) ایسے بھی اُٹھے جن کی اخلاقی عظمت ان کے کلام میں طاری و ساری ہو گئی۔

اکبر ان شاعروں میں سے ہے جن کے کلام میں اکثر اخلاقی تعلیم کی جھلک دکھائی دیتی ہے اس نے اگرچہ اپنی زندگی میں ایک قابلِ رشک شہرت حاصل کر لی تھی لیکن اس کی شہرت کا آغاز عوام سے نہیں ہُوا بلکہ ہندوستان کی تمام ادبی شخصیتوں نے اس کی شاعرانہ استعداد کو تسلیم کیا اس لئے اس کی شہرت کو ایک کامیاب شہرت کہا جا سکتا ہے۔

اکبر کے کلام میں اکثر اخلاقی اشعار اور اخلاقی تعلیم نظر آئیگی لیکن یہ تعلیم ایک واعظ کی حیثیت سے نہیں دی گئی بلکہ اکبر کے ضمیر میں ایک زبردست اخلاقی طاقت مضمر تھی۔ جو اکثر اس کے کلام میں ایک خاص اثر اور لطف پیدا کر دیتی تھی۔ وہ انسانی فطرت کی گہرائیوں کا غور و خوض سے مطالعہ کرتا رہتا تھا، دنیا کی نیرنگیاں اسے حقیقتِ دہر کا سبق دیتی رہتی تھیں۔ اس لئے اس کی اخلاقی تعلیم جو کسی خاص مقصد کے لئے نہیں بلکہ خود اس کی پُر سوز و گداز طبیعت کا نتیجہ تھی۔ ہمیشہ ابنائے وطن کی بزمِ حیات کے لئے شمعِ ہدایت رہی اور رہیگی۔ اسی لئے اکثر دیکھا جاتا ہے کہ اس کا ایک اخلاقی جذبہ لوگوں کو تجربہ کار بنانے کے لئے واعظوں کی اخلاقی نصائح کی ضخیم جلدوں سے مفید ثابت ہوتا ہے۔ اکبر نے اپنی روح کو حسنِ اخلاق کے ازلی شعلوں کے سپرد کر دیا تھا جس سے تمام وساوس جل کر خاکستر ہو گئے اور اسکی مشتِ خاک اکسیر ہو گئی

اکبر کو ایک اخلاقی شاعر کی حیثیت سے سعدی شیرازی سے زیادہ مشابہت ہے جنہوں نے اس خدائے سخن کی کلیات کا مطالعہ کیا ہے ان کو معلوم ہوگا کہ جہاں ان کا کلام گوناگوں پند و نصایح کا دلچسپ مجموعہ ہے وہاں وہ اخلاق سوز اور مخرب اخلاق اشعار بھی نظم کئے ہیں کہ آنکھیں بند کرنا پڑتی ہیں۔ ان مطائبات و مضحکات کے متعلق "حیات سعدی" کا فاضل مصنف لکھتا ہے کہ "یہ مجموعہ فی الحقیقت شیخ کے عارض کمال پر ایک بدنما مسّہ ہے جو شیخ کی شان سے نہایت بعید اور اس کے فضل و کمال و بزرگی کے بالکل منافی ہے اس میں زیادہ تر نظم اور کسی قدر نثر ہے۔ حضرت نے اس حصہ میں اپنی شیخوخت اور تقدس کو بالائے طاق رکھ کر خوب آزادی اور بیباکی سے دل کھول کر فحش اور ہزل کی داد دی ہے جس پر ہرگز یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ یہ پوچ اور لغو اور بیہودہ کلام اسی شخص کا ہے جس کے نتائج افکار سے گلستاں اور بوستاں جیسی بے بہا کتابیں موجود ہیں۔ آدمی کا خطاوار اور ناقص ہونا یہی اس کے انسان ہونے کی علامت ہے۔ اور اس کے اقوال و افعال کا تفاوت اور اختلاف اور ان کا ہمیشہ ایک ضابطہ اور ایک قانون کے موافق سرزد نہ ہونا یہی وہ چیز ہے جو اس کو دیگر حیوانات سے تمیز دیتی ہے۔ انسان کو ایک نادان بچہ کی حرکتوں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ جس کی ایک حرکت پر بے اختیار پیار کرنیکو جی چاہتا ہے اور دوسری عادت پر حد سے زیادہ غصہ آتا ہے"[1]

اکبر کے کلام کا مطالعہ بھی یہی عبرت انگیز منظر پیش کرتا ہے۔ اکبر کی روحانی اور اخلاقی وجاہت میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا لیکن ؎

اقتضا فطرت کا رکتا ہے کہیں اے ہمنشیں
شیخ صاحب کو بھی آخر کارِ شب کرنا پڑا

اکبر نے بھی وہ وہ خرافات نگاریاں کی ہیں کہ "سوزنی کی عمر بھر کی گالیوں اور پھکڑ کا جواب ہو سکتی ہیں" ظاہر ہے کہ "جو برائی سوسائٹی میں عام اور بے عیب ہو جائے اس سے بالکل پاک اور مبرّا رہنا بشر کی معمولی طاقت سے باہر ہے اور اس کے ارتکاب پر ایسا سخت مواخذہ نہیں کیا جاسکتا۔ جس کا وہ عیب فی نفسہ مستحق ہے"، اردو زبان کے کسی شاعر کا دیوان دیباتشنائے

[1] مولانا الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی حیات سعدی صفحہ ۱۹۱

بعض) اُٹھالیا جائے۔ فحش۔ رکاکت اور ہزل کی وہ اخلاق سوز مثالیں نظر آئینگی کہ جن کی تصریح کرنے سے شرم آتی ہے۔ ہم اس موضوع کو طول نہیں دینا چاہتے اور صرف چند اشعار نقل کر دیتے ہیں جو ان کے دامنِ تقدس پر بدنما دھبا ہو کر باصرہ خراش ہو رہے ہیں۔[1]

دل میں جو ہے وہ ہو گا شبِ وصل میں ضرور ہو گا حضور آپ کی شرم و حیا سے کیا

خدا کے واسطے تشریف لائیں آج ضرور رہیں وہ دو ہی گھڑی پاس رات بھر نہ سہی

کہا جو میں نے کہ دل چاہتا ہے پیار کروں تو مسکرا کے وہ کہنے لگے کہ پیار کے بعد

بہت ہی بگڑے وہ کل مجھ سے پہلے بوسے پر خموش ہو گئے آخر کو تین چار کے بعد

لیا نہ تخلیہ میں ان کا بوسہ چوک ہوئی بلا سے مجھ پہ وہ ہوتے اگر خفا ہوتے

تخلیہ بھی ہے ہوا سرد بھی ہے رات بھی ہے پھر بھی انکار مری جاں یہ کوئی بات بھی ہے

خیر چُپ رہیئے مزا ہی نہ ملا بوسے کا میں بھی بے لطف ہوا آپکے جھنجھلانے سے

کس ناز سے کہتے ہیں وہ جھنجھلا کے شبِ وصل تم تو ہمیں کروٹ بھی بدلنے نہیں دیتے

وغیرہ وغیرہ۔

اس میں شک نہیں کہ اکبر کی طبیعت پر ظرافت اور مزاح غالب تھا لیکن جب یہ صفت حد سے گذر جاتی ہے تو اس سے فحش اور ہزل پیدا ہوتا ہے جیسا کہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے

مجھے اک بوسہ دینے پر بھی وہ مس بخل کرتی ہے نصیب اچھے نہیں اپنے لئے حاتم بھی مُمسک ہے

لیا صبحِ شبِ وصل اس کا بوسہ میں نے یہ سچ ہے اسی پر بول اُٹھی وہ شوخ بس یہ فائنل ٹچ ہے[2]

ان اخلاق سوز اشعار کو قطع نظر کرتے ہوئے جو کچھ پند و موعظت کے بارہ میں اکبر نے کہا وہ اس کی اخلاقی عظمت کے شایان شان ہے۔ ایرانی شاعری جس چیز کو اخلاق فی الشعر سمجھتی ہے غالباً اس کا حقیقی پر تو شعرائے اردو میں اکبر کے سوا اور کسی میں کامل طور پر نظر نہیں آتا۔ اکبر کی پند و موعظت کو طرزِ بیان کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] بہت سے حیا سوز اشعار میں ہم نے وہ چند شعر انتخاب کئے ہیں جن میں تفحش کم ہے ۱۲

[2] آخری جنبش کو فائنل ٹچ کہتے ہیں۔

۱- اخلاقی نصائح کی تنظیم
۲- ضمیر کی اخلاقی طاقت کا فطری اظہار

حصہ اول کے شاعرانہ پہلو پر کچھ کہنا فضول ہے۔ اس میں زاہدانہ پند و نصائح و مواعظ و عبر کو موزوں طریقہ سے ادا کر دیا گیا ہے جس میں تخیل، موسیقی، اثر یا جوش کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ البتہ ان نصائح پر وہی اعتراض عائد ہو سکتا ہے جو شعرائے ایران کے فلسفہ اخلاق پر عموماً کیا جاتا ہے کہ "اس سے بجائے ترقی کرنے کے پستی کی طرف میلان ہوتا ہے۔ جو مسائل بار بار مختلف پیرایوں میں ادا کئے جاتے ہیں یعنی ترکِ دنیا، قناعت، توکل، تواضع، خاکساری، عفو، حلم۔ ان میں کچھ باتیں پست ہمتی پیدا کرنے والی ہیں کچھ اعتدال سے متجاوز ہیں۔ کچھ اصولِ تمدن کے خلاف ہیں[۱]"۔ شعرائے ایران کے فلسفہ اخلاق کی عذر خواہی علامہ شبلی نے معقول فرما دی البتہ اکبر کی ان تعلیمات کا سبب اس کے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا کہ یہ ان کی یاس پرستی کا لازمی نتیجہ ہیں۔

قناعت - اکبر کے نزدیک قناعت وہ واحد راستہ ہے جو منزلِ عافیت کی خبر دیتا ہے لیکن وہ قناعت کے معنی یہ نہیں لیتا کہ انسان عالمِ اسباب سے بے نیاز ہو کر سعی عمل کے جھگڑوں سے کنارہ کش ہو جائے۔ وہ قناعت کو اس لئے پسند کرتا ہے کہ ان اُلجھنوں سے آزاد ہو جن میں اہل حرص گرفتار رہتے ہیں۔ وہ سعی و عمل کا مخالف نہیں، ذوق آرام اور طلبِ رزق کو وہ جائز خواہشات قرار دیتا ہے۔ وہ صرف اعتدال پسندی کی تعلیم دیتا ہے اور ہوسِ جاہ کے خلاف اپنی آواز بلند کرتا ہے

جو اہلِ حرص ہیں ان پر مصیبت پڑہی جاتی ہے ۔۔۔ جو قانع ہے کسی دن اسکی قسمت لڑہی جاتی ہے
طلبِ رزق ہو لیکن ہوسِ جاہ نہ ہو ۔۔۔ ذوقِ آرام بجا شوقِ تعلی بے جا
قناعت مری رہنما ہو گئی ۔۔۔ نہ تھا منزلِ عافیت کا پتا
یہی بہتر ہے رہے اپنے ہی خواہ کے ساتھ ۔۔۔ طفلِ دل چھوڑے نہ دامانِ قناعت ہرگز

صبر و توکل اکبر توکل کی تعلیم دیتا ہے لیکن توکل کو تعطل نہیں سمجھتا۔ ایشیا والوں نے توکل کی تعلیم کو نہایت غلط سمجھا اور اس کا نتیجہ قوم میں دون ہمتی اور افسردہ دلی کے قاطعِ حیات امراض ہیں۔ توکل کے صحیح معنے یہ ہیں کہ اگر انسان پر مصیبتوں کا آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔ ہر طرف سے

[۱] علامہ شبلی شعر العجم جلد پنجم

بلائیں نازل ہو رہی ہوں۔ امید کی جھلک کسی طرف سے دکھائی نہ دے، مایوسیوں سے خودکشی تک کی نوبت پہنچی ہو تو اس وقت تسکینِ دل کے لئے صبر تقدیر اور اعتقاد کو مضبوط پکڑ لیا جائے اور یہی وہ واحد راستہ ہے جو مصیبت کے سمندر میں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہو گا۔ اکبر توکل کی تلقین کرتا ہے کیونکہ یہ دنیاوی سہاروں کو ترک کرنے اور خدا کو پکڑنے کی تعلیم دیتا ہے۔

جھکتا نہیں بندہ کسی بدخواہ کے آگے　　کیا غم ہے توکلت علی اللہ کے آگے
ہووے مطلوب جسے زادِ رہِ منزلِ قبر　　گرہ صبر میں وہ نقدِ توکل باندھے
آدمی کے لئے دنیا میں مصائب ہیں بہت　　خوش نصیبی ہے جو وہ صبر کی عادت رکھے
نالہ و فریاد جائز ہے مصیبت میں مگر　　صبر ہی بہتر ہے انسان کو جہانتک ہو سکے

ہوا و ہوس حرص و طمع اُردو اور فارسی کے ہر اخلاقی شاعر نے غالباً ان عنوانات پر کچھ نہ کچھ ضرور کیا ہو گا اور ان کی تعلیم کا لب لباب یہ ہے کہ انسان کو ضرورت سے زیادہ طلب نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ اپنی خواہشات پر قابو رکھنا چاہیئے۔ حرص اور طمع دنیا پرستی کی تعلیم دیتے ہیں۔ انسان کی ضروریات کبھی اختتام پذیر نہیں ہو سکتیں۔ اگر ایک خواہش پوری ہوتی ہے تو دس اور نمودار ہو جاتی ہیں۔ اس لئے ایک طامع کی زندگی ہمیشہ پیچ و تاب اور کاوش میں گذرتی ہے۔ سچی راحت اسے کبھی میسر نہیں آ سکتی۔ اس کا آتشکدۂ حرص کبھی بجھنے نہیں پاتا اور اسے ہمیشہ پُر اضطراب رکھتا ہے۔ اکبر کی تعلیم بھی یہی ہے کہ انسان کو قدرِ کفاف سے زیادہ کی طلب نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اپنی ضروریات اور خواہشات کو اعتدال پر لانے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ اسکے ساتھ وہ دُنیا کے باہمی جھگڑوں اور فسادوں کو جو خلقِ خدا میں دشمنی اور عناد کا باعث اور انسانی ہلاکت کا ذریعہ ہوتے ہیں بے جا حرص کا نتیجہ بتاتا ہے:۔

علم ہوتا گر زیادہ اور ہوتی حرص کم　　صلح ہوتی بیشتر لوگوں میں اور کم تر نزاع
کیا پا گئے جو حرص کے کوچہ میں سگ رہے　　وہ کیا بُرے رہے کہ جو اس سے الگ رہے
حرص گھٹ جائے وہی نعمتِ عظمیٰ ہو گی　　میری دولت نہیں بڑھنے کی تو اچھا نہ بڑھے
تھا سر میں کمال وہ تو سلطان بنا　　تھا دل میں جمال وہ مسلمان بنا
لذت طلبی سے نفس رندی پہ جھکا　　تھا پیٹ بہت حریص شیطان بنا

قول وعمل - انسان کی عزت واحترام اس کے قول وعمل کے توافق واتحاد پر ہے، اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بڑے بڑے زہادِ خشک "چوں بہ خلوت میروند آں کارِ دیگر می کنند"۔ ان کی نصیحتیں نمود زہد ہیں، وہ دوسروں کے لئے ہوتی ہیں نہ کہ اپنے لئے + اکبر عمل اور زندگی کو لازم وملزوم سمجھتا ہے۔ اگر زندگی جسم ہے تو روح عمل روح جس زندگی میں عمل نہیں وہ بمنزلہ اس جسم کے ہے جس میں روح کی حیات آفرینیاں ہیں اور جو ایک تودہ خاک سے بدتر ہے + قومی زندگی کا راز قول وعمل کے توافق پر ہے ورنہ محض باتوں سے نہ تو کسی نے ترقی کی اور نہ کوئی کرسکیگا اکبر لوگوں کو "اعمال کے حسن سے سنورنے" کی تعلیم دیتا ہے۔ اسے ایمان کی جستجو ہے۔

قرآن ہے شاہد کہ خدا حسن سے خوش ہے ‎ ‎ کس حسن سے یہ بھی تو سنو حسنِ عمل سے
یہ دعوئے توحید مبارک تمہیں اکبر ‎ ‎ ثابت بھی کرو اس کو مگر حسنِ عمل سے
کیجئے ثابت خوش اخلاقی سے اپنی خوبیاں ‎ ‎ یہ نمودِ جبہ و دستار رہنے دیجئے
واعظ کو بھی سلام ہے پنڈت کو بھی سلام ‎ ‎ مذہب نہ چاہیئے مجھے ایمان چاہیئے
علم وہ خوب ہے جو حسن عمل تک پہنچے ‎ ‎ ذوق وہ خوب ہے جو رازِ ازل تک پہنچے

رشوت اور خوشامد - عصر جدید کی قبیح ترین کمزوریاں رشوت ستانی اور خوشامد ہیں اور انکا مخربِ اخلاق اثر تمام ملک اور قوم میں جاری وساری ہے، اگر رشوت کی ظلمت نے نورِ ایمان کو دھندلا کر دیا ہے تو بیجا خوشامد نے ایک طرف خود پسندی اور نفرت اور دوسری طرف ذلت اور دون ہمتی کو ترقی دی ہے اور خودداری، آزادیِ خیال اور آزادی رائے کی بیخ کنی کر دی ہے + اکبر نے رشوت اور خوشامد دونو کو نہایت مذموم عادات سے قرار دیا ہے اور اس کی یہ تعلیم جیسا کہ اس باب میں ہم نے اور اخلاقی تعلیمات کو دیکھا ہے تخریبی ہونے کی بجائے تعمیری ہے اور قوم میں تمکنت، خودداری، ایمانداری اور آزادی پیدا کرنے کی طرف راجح ہے:-

خیرخواہی کا یہ سب اظہار رہنے دیجئے ‎ ‎ کیجئے رشوت ستانی سے ذرا پرہیز آپ
رشوت ہے گلو بُرِ نیک نامی کا چھرا ‎ ‎ عیاشی ہے بدی کے پہیئے کا دُھرا
ہر چند کہ بے محل خوشامد ہے بُری ‎ ‎ گستاخ مگر خوشامدی سے بھی بُرا

ریا مکاری اور بیحیائی - ریا اور مکاری انسانی سوسائٹی میں ہر جگہ موجود ہیں۔ لیکن ہر جگہ

مذموم بھی خیال کی جاتی ہیں۔ روباہ طینتی انسان کے دل سے ہمت اور راستبازی کو نکال کر اسکے خیالات کو پست کر دیتی ہے۔ عالی نظری اور وسیع المشربی کی ستودہ صفات اپنا اثر نہیں دکھاتیں اخلاق گر جاتے ہیں، روحانی ترقی رُک جاتی ہے اور وجاہت اور بلند ہمتی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اس لئے اکبر یہ تعلیم دیتا ہے کہ:-

رفیقِ حرص و مکاری دلیری ہو نہیں سکتی جو ہوں روباہ طینت ان سے شیری ہو نہیں سکتی
دسترس صید پہ حاصل تجھے ہو خواہ نہ ہو شیر ہی بن کے نکل صورت روباہ نہ ہو

اور اسے یہاں تک مذموم سمجھتا ہے کہ ایک رند کی لاابالی زندگی کو بھی اس پر ترجیح دیتا ہے۔

گھٹی گو کہ رندی سے وقعت مری طبیعت مگر بے ریا ہو گئی

لیکن مکاری اور ریا سے بڑھ کر ایک اور اخلاق کش حرکت ہے یعنی بے حیائی جس انسان میں بے حیائی کا مادہ پیدا ہو گیا وہ نہ دنیا کا رہا نہ آخرت کا۔ اس کی تمدنی اور معاشرتی۔ ملی اور ملکی، دینی اور دنیوی، اخلاقی اور روحانی ترقی ہمیشہ کے لئے رک جاتی ہے۔ وہ دن بدن قعرِ ضلالت میں گرتا جاتا ہے۔ اغیار اس پر سخت سے سخت اور رکیک سے رکیک حملے کرتے ہیں۔ لیکن اس کی خودداری کا مادہ مر چکتا ہے اور وہ انہیں اس بے حیائی سے برداشت کرتا ہے کہ گویا ہوا ہی کچھ نہیں

ہر چند کہ زور بھی ہے اک خصلتِ بد واللہ کہ بے حیا سے مکار اچھا

عزلت۔ جملہ اخلاقی شاعر ترکِ دنیا کی تعلیم دیتے رہے ہیں اور بالخصوص ایشیا کی صوفی منش طبیعتیں جو زندگی کی شورشوں اور قیدِ ہستی کے علایق سے بیزار رہتی ہیں جن کے نزدیک دنیا ایک بازیٔ طفلاں ہے جہاں انسان کو نقصان کے سوا اور کچھ نہیں۔ جو دار المحن ہے۔ بلکہ جس کی عشوہ فریبیاں دلوں کو مسخر کر لیتی ہیں اور شاہدِ حقیقی کے قرب و وصال سے محروم رکھتی ہیں، ہمیشہ آبادی کے ہنگاموں سے دور راہبانہ زندگی بسر کرنا پسند کرتی ہیں۔ لیکن اکبر اس قسم کی زندگی کو پسند نہیں کرتا وہ عزلت کا جویا ہے لیکن اس لئے نہیں کہ دنیا کو ترک کر دیا جائے اور خانقاہوں میں زیست کے بار آور ایام برباد کر دیئے جائیں۔ اس کی خانقاہ دل کا کونا ہے۔ "خانقاہ میں بیٹھنا اور پیری مریدی کے کاروبار کچھ اور ہیں، اور دل شناسی، دل آگاہی دل پر نظر کرنا کچھ اور ہے"

حرصِ دنیا سے نہیں ہے ہمنشیں عزلت مری خانقاہیں اور ہیں اور دل کا کونا اور ہے

فراخدلی۔ اکبر کی ایک اور تعمیری تعلیم جو قابلِ ذکر ہے وہ فراخدلی اور وسیع المشربی کی تلقین ہے، وہ کسی کی بُرائی نہیں چاہتا بلکہ سب کو آپس میں شیر و شکر ہو کر رہنے کی تمنا ظاہر کرتا ہے، وہ لوگوں کو فراخ دل اور روشن خیال بننے کی استدعا کرتا ہے کیونکہ اس طرح وہ نہ صرف مقبولِ جمہور ہونگے۔ بلکہ جمالِ ازلی بھی ان کی آنکھوں کے سامنے آشکار ہو جائیگا۔

تم اگر چاہو بُرائی نہ کسی کی اکبر ۔۔۔ پھر تمہارا بھی جہاں میں کوئی بدخواہ نہ ہو

دل ہو جو وسیع اور روشن ہو خیال ۔۔۔ ہر رنگ دکھائے تجھ کو خالق کا جمال

ساری دنیا ہے اس کو پیاری اکبر ۔۔۔ کہتا ہے "کم آل" جس کو حاصل ہے کمال

خدا ہی کی عبادت جن کو ہو مقصود اے اکبر ۔۔۔ وہ کیوں باہم لڑیں گو فرق ہو باہم عبادتیں

انسان ہے یہ جو بات اچھی چاہے ۔۔۔ بدیوں سے محترز ہونی چاہیے

شیطان سے وہ فلاسفی ہے منسوب ۔۔۔ جس کا مطلب ہے کہ کرو جو جی چاہے

ان کے علاوہ اکبر نے اور بہت سے موضوعات پر اظہارِ خیال کیا۔ جن پر مفصل لکھنا غیر ضروری ہے البتہ ان کو اکٹھا لکھ دیا جاتا ہے تاکہ اس کی تعلیمات کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

حدِ اعتدال سے زیادہ ارتباط نہ بڑھاؤ ؎
یہ ملنے ہی سے اکثر رنج بھی ہو جاتے ہیں پیدا
جو سچ پوچھو تو ملنے سے نہ ملنے کا گلا اچھا

شیریں زبانی ؎
بنو گے خسروِ اقلیم دل شیریں زباں ہو کر
جہانگیری کریگی یہ ادا نورِ جہاں ہو کر

لیکن محض شیریں زبانی کچھ نہیں جب تک دل اچھا نہ ہو:۔ ؎

دل اچھا ہو تو بجھ جاتی ہے شاید بدزباں ہو کر ۔۔۔ بدی طینت کی چھپ سکتی نہیں شیریں زبانی سے

لوگوں کی تعریف اور مدح کرنا حسنِ اخلاق کی سند نہیں ہو سکتی ؎

مدحتِ گفتار کو سمجھو نہ اخلاقی سند ۔۔۔ خوب کہنا اور ہے اور خوب ہونا اور ہے[1]

کہنا قول ہے اور خوب ہونا عمل ہے۔ قول اور عمل میں جو تفاوت ہے وہ ظاہر ہے جب تک خوب بن کر نہ دکھا سکیں تب تک خوب کہنے کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی۔

---

[1] Come all

لوگوں کو آرام پہنچاؤ

دلوں کا قرب حاصل کیجئے راحت رساں ہوکر
نفس نے سینہ میں جا پائی ہے آرام جاں ہوکر

خاکساری کرو

زمیں کی طرح جس نے عاجزی و خاکساری کی
خدا کی رحمتوں نے اس کو ڈھانپا آسماں ہوکر

تمکنت اور وقار

محو تمکیں رہے نفرت ہو سبک وضعی سے
صورت کوہ ہو انساں صفت کاہ نہ ہو

سیرت کو صورت پر ترجیح دینا چاہیئے

اے حُسن کے مائل یہ نصیحت مری سن لے
سیرت پہ نظر چاہیئے صورت سے زیادہ

اپنی وضع پر قائم رہنا چاہیئے

شعر میں اکبر یہی مضمون تو ہر بار باندھ
اے مسلماں سبحہ لے لے برہمن زنار باندھ

سچی خیر خواہی

جو خردمند ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں یہ بات
خیر خواہی وہ نہیں ہے جو ہو ڈر سے پیدا

راست روی اور تواضع

روش ہو راست آزادانہ ساتھ اس کے تواضع بھی
چلو تم مثلِ تیر اکبر جھکو لیکن کماں ہوکر

کسی سے کینہ مت کرو

اونچا نیت کا اپنی زینہ رکھنا
احباب سے صاف اپنا سینہ رکھنا
غصہ آنا تو نیچرل ہے اکبر
لیکن ہے شدید عیب کینہ رکھنا

علم یا دولت پر غرور نہ کرو

لطف ساقی سے نہ چھلکے جام دل
ظرف عالی کی یہی پہچان ہے

جھوٹ اور طمع سے نفرت کرو

جھوٹ سے نفرت کلی ہو طمع سے پرہیز
ہو نہ کچھ اور پر اتنا تو مسلمان میں ہو

استقلال کو ہاتھ ... اپنی جگہ سے تم نہ ہٹو گو ہو گردشیں
سے نہ جانے دو[5] ... ایسے رہو کہ جیسے انگوٹھی میں نگ رہے

اخلاق کیا ہے؟ اور اس کا ضمیر سے کیا تعلق ہے؟

اخلاق سے وہ حالت یا طاقت مراد ہے یا اخلاق وہ ہے جس سے انسان اپنے قوائے طبعی کے صحیح استعمال کا طریقہ سیکھتا ہے اور ان امور سے آگاہی پاتا ہے، جو اسے خود اپنی ذات یا اغیار کے مقابلے میں موجود، ہستی یا زندگی میں آسائش، راحت مسرت، عزت، اعتبار کی حیثیت سے عمل میں لانا ضروری یا لابدی ہیں" یا اخلاق وہ شریعت اور وہ قانون ہے جو اس کی قوتِ ضمیر سے ترتیب پاتا ہے۔ اخلاقی فلسفے، اخلاقی کتابیں ہمارے ہی افعال اور اعمال کا نچوڑ ہیں۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں ایک فلسفی انہیں ایک ضابطہ کی صورت میں لا کر "باعتبار سودمندی اور ناسودمندی ہمیں دکھاتا ہے" اخلاق ضمیر سے نشوونما پاتا ہے اور اس کا پروردہ بھی ہے، حقیقی اخلاقی تعلیم وہی ہے جس کا تعلق ضمیر سے ہو۔

اکبر کی پند و موعظت کا دوسرا حصہ اس کے ضمیر کی اخلاقی عظمت اور روحانی وجاہت کا اظہار ہے اور یہی اس کی اخلاقی شاعری کا وہ نمایاں حصہ ہے جو اسے متقدمین اور متاخرین ہر دو میں ممتاز کر رہا ہے، اس جگہ اکبر اپنی لطیف کیفیات اور پاکیزہ تاثرات سے حسن اخلاق کی زندہ تصویریں زیبِ قرطاس کرتا ہے۔ اور اس کے ساتھ حسن اسلوب کی کیفیت انگیز دلپذیری اور ترنم جوش سے جذباتِ صحیحہ کی ایک وسیع تریں مستور دنیا آشکار کر دیتا ہے۔ یہ اشعار اس کے سویدائے قلب سے نکلتے ہیں اور دلوں میں گھر کر جاتے ہیں۔ اکبر کے ظلمت کدۂ یاس میں اگر امید کی کوئی جھلک ہے تو یہی ہیں جو اپنی ضیا پاشیوں سے نفسانیات کی "تاریکیوں کو آدابِ گریز" سکھا[1] کر ایک ارفع زندگی کا پتہ دیتی ہیں۔

اکبر یہاں وعظ نہیں کر رہا، اسے اپنے زہد و ورع کی نمود منظور نہیں۔ ایک اخلاقی طاقت ہے جو خود بخود ظاہر ہو رہی ہے ایک پُر از سوز و گداز طبیعت کی آمد کی رُو ہے کہ بہتی

---

[1] کھینچ کر خنجر کرن کا پھر ہو سرگرم ستیز + ہاں سکھا تاریکیٔ باطل کو آدابِ گریز (اقبال)

چلی جارہی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو شاعر کو واعظ سے متمیز کرتی ہے۔ پروفیسر ریلے مصنف اور اخلاقیات پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے کہ:۔

"اسے کسی خاص قسم کے ایسے اخلاقی قوانین کے زیر اثر نہیں رہنا پڑتا جن کی خلاف ورزی کی جاسکے۔ البتہ اس وسیع اخلاقی نظام کی واقفیت تامہ اس کے لئے ضروری ہے جس کا کسی قسم کے ارتکاب جرم سے ٹوٹنا اسی طرح غیر ممکن ہے جیسا کہ کسی شیشے کے برتن کا گر کر ٹوٹ جانا کششِ ثقل کے قانون کو نہیں توڑ سکتا ——— وہ اخلاق جن کے بغیر حیاتِ انسانی کا امکان نہیں ——— یعنی بنی نوعِ انسان کے باہمی تعلقات اور وہ احساسات وخیالات جو سوسائٹی کا تارو پود ہیں۔ اخلاق کی ان وسیع معنوں میں اہمیت شناسی کے لئے تخیل اور حسن آشنائی کے گرانقدر اور رفیع ملکات کی ضرورت ہے"

تخیل اور قبولِ اثر کی یہ صفات اکبر کی حساس اور فہیم طبیعت میں خاص طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس کی تمام نظموں میں وقتاً بعد وقتٍ حیاتِ انسانی کے متعلق "عمیق نتائج غور و فکر" کی وجہ سے برق بار ندرت کوشیاں نظر آتی ہیں۔ جو اس کی دقیق النظری اور علوِ اخلاق کا پتہ دیتی ہیں کہتا ہے:۔

کہنے سننے کی گرم بازاری ہے
مشکل ہے مگر اثر پرائے دل میں
ایسا سنیئے کہ کہنے والا ابھرے
ایسی کہیئے کہ بیٹھ جائے دل میں

خوشی سے مرو۔

اعمال کے حسن سے سنورنا سیکھو
اللہ سے نیک امید کرنا سیکھو
مرنے سے مفر نہیں ہے جب اے اکبر
بہتر ہے یہی خوشی سے مرنا سیکھو

سچی نعمت
آپس میں موافق رہو طاقت ہے تو یہ ہے — دیکھو نہ ہم عیب محبت ہے تو یہ ہے
صحت بھی ہو روزی بھی ہو دل کو بھی ہو تسکین — دنیا میں بشر کے لئے نعمت ہے تو یہ ہے

سچی شہرت
شہوات کی پیروی کا منشو بہ نہ ہو — دولت تری خادمہ ہو۔ مجبو بہ نہ ہو
شہرت جو کمال سے ہو پیدا ہو جائے — لیکن بہ تکلفات مطلو بہ نہ ہو۔

سچی آزادی
ہونی ہے نصیب تلخ کامی تم کو — محسوس نہیں ہے اپنی خامی تم کو
اغیار نہیں بنا سکتے تم کو غلام — ہے اپنے ہی نفس کی غلامی تم کو

سچی عزت
تحصیل علم کر کہ دولت ہے یہی — اخلاق درست کر کہ زینت ہے یہی
اکبر کی یہ بات یاد رکھ اے عشرت — محفوظ ہو ہر معصیت سے عزت ہے یہی

حقیقی عزت
دولت وہ ہے جو عقل و حکمت سے ملے — لذت وہ ہے جو جوشِ صحت سے ملے
ایماں کا ہو نور دل میں وہ رفعت ہے — عزت وہ ہے جو اپنی ملت سے ملے

انسان اور شرافت
انسان میں معتبر لیاقت بھی ہے — محسوب اس وزن میں وجاہت بھی ہے
اندازِ سخن سے بھی ہے اندازہ طبع — اک جزوِ قوی مگر شرافت بھی ہے

امرسن ایک جگہ لکھتا ہے کہ بڑا آدمی صرف وہی ہو سکتا ہے جو کچھ کہ وہ ہے فطرتاً ہے اور جسے دیکھ کر ہمیں کوئی اور شخص یاد نہیں آتا"

ایک عظیم الشان انسان کی یہ تعریف واقعی بہت درست ہے اور یہی تعریف ایک "عظیم تعلیم" کی کسوٹی ہو سکتی ہے۔ ایک دریا اپنے ساحل خود پیدا کرتا ہے اسی طرح ہر "پُرحسن خیال" اپنی راہیں خود نکالتا ہے، پرانی راہیں نہیں بلکہ نئی راہیں۔

اکبر کی اخلاقی تعلیم کو ہم اس کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا یہ تعلیم واقعی "عظیم" کہلائے جانے کی مستحق ہے یا نہیں۔ اکبر کی پند و موعظت کو پڑھ کر انسان کا دماغ فوراً ایران کے "واعظانِ پختہ کار" کی تعلیمات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ تقدیر، توکل، قناعت، ترکِ ہوس، وغیرہا۔ ایسے موضوعات ہیں جو شاعری کی دنیا میں نہایت فرسودہ اور پامال ہو چکے ہیں جس ایرانی شاعر کا دیوان اٹھا لیا جائے یہی تعلیم نظر آئیگی اور اردو شعرا میں چند ایک کو مستثنیٰ

کرتے ہوئے جس کسی کی کلیات کی ورق گردانی کرینگے انہیں مواعظ و عبر کو الٹ پلٹ کر بار بار ادا کیا ہوا پائینگے۔ اس لحاظ سے اکبر نے اخلاقی شاعری میں کوئی خاص تنوع یا جدت پیدا نہیں کی جیسا کہ عرفی نے کی، اور اگر وہ اپنی رباعیات اور ان دردانگیز نظموں میں جہاں قوم کی درماندگی پر حسرت کے آنسو گرائے گئے ہیں اپنی اخلاقی وجاہت اور سوزِ باطن کا عکس نہ اتارتا تو اسکا اخلاق آموز کلام جس کا بیشتر حصہ شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے بھی کسی تحسین کے قابل نہیں (جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے جو مضمون کے پہلے حصہ میں نقل کئے گئے ہیں) کیونکہ وہ نثر سے صرف اسی قدر متمیز ہے کہ موزون ہے "اخلاقی اثر" (moral effect) سے محروم رہتا گو اب بھی اسے وہ اخلاقی اثر حاصل نہیں جو شکسپیئر، غالب یا اقبال یا ٹیگور کو ہے جنہوں نے ظاہرا اخلاقیات کی بہت کم تلقین کی ہے لیکن جن کی کلیات بحیثیتِ مجموعی اخلاق کا ایک دلچسپ اور بصر افروز گلدستہ ہیں۔

فلسفۂ اخلاق اور شاعری کو ایک سمجھنا ایک غلطی تھی جس میں شعرائے ایران مبتلا ہو گئے اور جس غلطی کا ہندوستان کے شعرا نے بدقسمتی سے اعادہ کیا۔ شاعری کا ایک مقصد انسان کی اخلاقی بہبودی کی خلاقی ہے لیکن اس کے لئے جس اسلوب کی ضرورت تھی وہ اسلوب نظرانداز کر دیا گیا۔ "فلسفۂ اخلاق ان عناصر کو ترتیب دیتا ہے۔ جنہیں شاعری خلقت کا جامہ بخشتی ہے وہ صرف سیاستِ مدن و انتظام خانہ داری کے نظام پر روشنی ڈالتا اور اس کی مثالیں پیش کرتا ہے" لیکن شاعری ایک اور طریقہ سے اثر انداز ہوتی ہے" یہ انسان کے دل کو بے شمار جدت آگیں خیالات کا جولانگاہ بنا کر بیدار اور وسیع کر دیتی ہے۔ شاعری دنیا کے پوشیدہ حسن کا نقاب اٹھا دیتی ہے اور عام چیزوں کو وہ دلفریبی بخشتی ہے کہ وہ فوق الفطرت معلوم ہونے لگتی ہیں۔ شاعری جو کچھ دکھاتی ہے اس کی تخلیق کرتی ہے۔ اخلاقیات کا سب سے بڑا راز محبت ہے یعنی ہماری فطرت کا اشیائے خارجی پر محیط ہونا، ہماری ہستی، اعلیٰ ہستی، کا اس حسن کے ساتھ ہم روح ہو جانا جو دوسری ہستیوں کے خیالات، حرکات یا ذاتیات میں چھپا ہوتا ہے۔ وہ انسان جو سچے معنوں میں نیک ہونا چاہتا ہے اسے تخیل کے وسیع اور عمیق سمندر میں غوطہ زن ہونا اور اس کے ہر قطرہ سے قطعی واقفیت رکھنا چاہیئے۔ اسے چاہیئے۔ کہ

اپنے آپ کو اور ہر دوسرے انسان کو ہر ایک دوسرے انسان کی جگہ میں رکھ کر دیکھے۔ حتیٰ کہ بنی نوع انسان کے غم اور خوشیاں اس کے غم اور خوشیاں ہو جائیں۔ حسنِ اخلاق کا سب سے بڑا آلہ تخیل ہے۔ شاعری تخیل کے محیط کو خیالات کے تنوع اور جدت سے وسیع کرتی ہے، شاعری اس قوت کو جو انسان کی اخلاقی فطرت کا آلہ ہے اسی طرح تقویت بخشتی ہے جس طرح ورزش جسم کو مضبوط کرتی ہے۔ اس لئے وہ شاعر جو نیکی اور بدی کے متعلق ان خیالات اور احساسات کو نظم کریگا جو بالعموم اس کے عصر اور وقت سے متعلق ہونگے وہ شاعری سے دور پڑ تا جائیگا، وہ جہاں تک اخلاقیات کے اس معیار کی تائید کریگا ایک بلند اور رفیع مقام کو چھوڑ کر ایک ادنےٰ مقام پر گرتا جائیگا اور ایک حقیقی شوکت کی زندگی سے مستعفی ہوگا گو اسے اپنی محدود دنیا میں ایک غیر مکمل کامیابی ہی حاصل کیوں نہ ہو جائے"

پرسی بشی شیلے کا یہ نظریہ نہ صرف شاعری اور اخلاقیات کا فرق دکھلاتا ہے۔ بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اخلاقی شاعری کیا چیز ہے اور اس شاعر کے لئے جو ہر وقت، ہر ملک اور ہر زمانہ میں اپنی اخلاقی وجاہت اور اخلاقی اثر قائم رکھنا چاہتا ہے، کس طرح رہنا، کس طرح سوچنا، اور کس طرح لکھنا چاہیئے۔

اُردو کی دُنیا میں اگر کوئی ایسے شاعر ہیں تو وہ غالب یا اقبال ہیں اکبر کا محدود حلقۂ اثر اس کے لئے یہ قابلِ رشک شہرت اور لاثانی وقعت حاصل نہیں کرسکتا تھا۔

محمد تصدق حسین خالد بٹالوی

چاند اور سمندر

تو چاند ہے اور میرا دل بحرِ ناپیدا کنار!

جب تیرے جمال کی خوبصورت اور رنگین شعاعیں میرے دل کو منور کرتی ہیں تو وہ جوشِ محبت سے متلاطم ہو جاتا ہے، رنج و مصیبت اور اندوہ و غم کی مہیب اور بھیانک چٹانیں سرور و انبساط کی موجوں میں گم ہو جاتی ہیں۔

تو چاند ہے اور میرا دل بحرِ ناپید اکنار!

لیکن جب تو آنکھیں پھیر لیتا ہے جب تیرا سکون بخش اور سرور انگیز چہرہ میری نظروں سے پوشیدہ ہو جاتا ہے تو بحرِ دل کا تلاطم فرد ہو جاتا ہے اور غم و اندوہ کی ایک ایک چٹان نمودار ہو جاتی ہے۔

اس خوفناک تاریکی اور سنسناہٹ کے عالم میں ایک مغموم اور مایوس صدا اُٹھتی ہے۔

تو چاند ہے اور میرا دل بحرِ ناپید اکنار!

(ولکاکس) "صہبائی"

دوشیزۂ فرانس

(۳)

تکمیلِ کار

دعوے کی تصدیق عمل اور صرف عمل ہی سے ہو سکتی ہے!

ہم اُوپر دیکھ چکے ہیں کہ جس وقت اِس کسان لڑکی نے کارزار کی طرف قدم بڑھایا فرانس کی سیاسی حالت ازحد نازک اور خطرناک تھی۔ نہ صرف یہی کہ مُلک کا بہترین حِصّہ اور دارالسلطنت انگریزوں کے قبضے میں تھا بلکہ وہ فرانسیسیوں کے دل و دماغ پر اپنی سطوت و قوت کا سکّہ جما چکے تھے۔ دریائے لُوار پر صرف اورلیاں اک ایسا مقام تھا جو ہنوز مطیع نہ ہُوا تھا لیکن وہ غنیم کے پنجے میں تھا اور غیر اغلب تھا کہ اُس کی گرفت سے نکل سکے۔ دلوں پر پستی کے بادل چھائے ہُوئے تھے، رات کی بڑھتی ہُوئی تاریکی قوم مغلوب کو آنے والی ذلت کا پتہ دے رہی تھی کہ دُکھیا وطن کے اُفق پر روشنی کی ایک ننھی سی کرن چمکی، مدھم ہُوئی اور پھر آسمان کے بیچوں بیچ ایک تڑپنے والی بجلی بن کر کوندی! اورلیاں کے محاصرے کو سات ماہ گذر چکے تھے، ژان دارک کی رہبری میں آٹھ روز کافی تھے کہ غنیم اپنے قلعے چھوڑ کر دریا کے شمال کی طرف کوچ کر جائے۔ اب لوگ اُسے ژان دارک، دومرمی کی کسان لڑکی نہ کہتے تھے بلکہ "دوشیزۂ اورلیاں" کہہ کر پکارتے تھے۔ اُس نے عمل سے اپنے دعوے کی تصدیق کر دی تھی، جو کہا وہی کر کے دکھا دیا۔ پھر بھی حسد کرنے والے اور شک کرنے والے اُسے فسوں ساز ہی سمجھتے تھے۔ بھلا اگر ژان جادوگرنی تھی تو کسے انکار ہوگا کہ جادو اور معجزہ میں فقط اک اضافی فرق ہے؟ اور یہ ایک مانی ہُوئی بات ہے کہ آسمانی قوت اُسی زمانے میں رُونما ہوتی ہے جب شیطانی طاقت اپنے زوروں پر ہو، کج روش اُسے بھی بناوٹ ہی خیال کرتے ہیں اور رہِ راست کی ہدایت اُنہیں کو ملتی ہے جن پر خدا کی نعمت سایہ افگن ہو؟

اورلیاں کا محاصرہ اُٹھ جانا اور اجیت انگریزوں کا بازی ہار کے چل دینا ایسی خبر تھی جو

آگ کی طرح گردونواح میں پھیل گئی اور جس نے وہ تمام دل جو جذبۂ قومیت سے معمور تھے پھر گرما گئے۔
ادھر ژان جو اپنے وقت کی قدر جانتی تھی پہلی فتح سے مطمئن ہو کر اپنی سفارت کو بھول نہیں گئی بلکہ چند روز ٹھیرنے کے بعد پھر "بادشاہ" کی طرف لوٹی اور چاہا کہ اُسے ترغیب دے کر جلد ریمز کو لے چلے تاکہ تاج پوشی کی ضروری رسم ادا ہونے میں دیر نہ ہو۔ لوش پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ "بادشاہ" بدستور اپنے دربار کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے، کچھ لوگ اُس کے نقال اور بھاٹ بنے ہوئے ہیں، کچھ لڑائی کے خطروں سے ڈرا ڈرا کے کہتے ہیں کہ ایسے وقت میں باہر قدم رکھنا حضور کی سلامتی نہیں۔ الغرض "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کی راگنی چھڑ رہی تھی۔ اُدھر دوشیزہ جو اب تک نہ ہو سکا تھا کر چکی تھی، اِدھر شہزادہ جو نہ کرنا چاہیئے تھا وہی اب بھی کر رہا تھا۔ ژان جو ایک ایک لمحے کو قیمتی تصور کرتی تھی دیکھ رہی تھی کہ دن گذرے جاتے ہیں اور یہاں کان پر جوں نہیں رینگتی۔ اُسے کچھ احساس سا تھا کہ کام کے لئے اُسے تھوڑا ہی وقت دیا گیا ہے۔ وہ اِن نیند کے ماتوں کو جھڑکتی کوستی، منت کرتی اور کہتی کہ "میں فقط ایک برس تک ہوں، جب تک ممکن ہے مجھ سے فائدہ اُٹھاؤ" وہ مسکراتے، دل ہی دل میں ہنستے، اور اپنے آئندہ کا حال پوچھتے۔ یہ اِس دخل درمعقولات پر چیں بہ جبیں ہوتی کہ کرنے کیا آئی تھی یہاں کیا ہو رہا ہے؟ ژان کوئی خیال پرست یا شرمیلی دوشیزہ نہ تھی بلکہ اک قوی زبردست نوجوان عورت تھی جو ہمیشہ ہر بات کا ترکی بہ ترکی جواب دینے اور کوئی اُسے ناجائز طور پر چھوئے تو تھپڑ تک مارنے کو تیار رہتی تھی۔ وہ آخر انتظار کرتے کرتے اُکتا گئی اور ایک دن جب "بادشاہ" خلوت میں اپنے چند مصاحبوں کے ساتھ بیٹھا تھا اُس نے دروازے پر دستک دی۔ اندر آنے کی اجازت پا کر وہ "بادشاہ کے قدموں پر گر پڑی اور عاجزی کے ساتھ بولی "شریف دوفین! (ژان کے نزدیک وہ رسمِ تقدس ادا کئے بغیر شاہِ فرانس نہ بن سکتا تھا) کیوں نہ ریمز کو چلیئے اور اپنا شاندار تاج پہنیئے"۔ ایک اسقف نے جو وہاں موجود تھا کہا "اب جب کہ تم بادشاہ کے حضور میں ہو تو ہمیں بتاؤ کہ تمہارے مشیر تم سے کیسے ہم کلام ہوتے ہیں"؟ ژان کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اُس نے جواب دیا "معلوم ہوتا ہے کہ تم جاننا چاہتے ہو، میں تمہیں خوشی سے مطمئن کر دونگی"۔ اس پر "بادشاہ" نے کہا "ژان بہتر ہو اگر تم اِن صاحبوں کو جو کچھ یہ پوچھتے ہیں بتا دو"۔ دوشیزہ فوراً بول اُٹھی اور نہایت مؤثر پیرائے میں کہنے لگی "جب میں وہ باتیں کہتی ہوں جو خدا کی طرف سے ہیں اور اُن پر یقین نہیں کیا جاتا

تو میں دنیا سے الگ ہو کر خدا کے حضور دُعا کرتی ہوں اور شکوہ گلہ کرتی ہوں کہ لوگ کیوں میری باتوں پر کان نہیں دھرتے۔ تو جب دُعا کر چکتی ہوں میں ایک آواز سنتی ہوں جو کہتی ہے اے خدا کی بیٹی! جا! جا! جا! میں تیری مدد کروں گا، جا! جب میں یہ آواز سنتی ہوں تو میں خوشی سے پھولی نہیں نہیں سماتی۔ اُس کے تاباں چہرے میں جب وہ اپنی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے تھی شانِ ایزدی کی جھلک نظر آتی تھی، مصاحب سبھی بُت کی طرح خاموش نرگس کی طرح ٹکٹکی باندھے حیرت سے اُس کی طرف دیکھتے تھے؟

چارلس متاثر ہوا اور وعدہ کیا کہ جب دریائے لُوآر کے کنارے کے سب شہر دشمن کے قبضے سے نکل کر رستہ اُس کے لئے صاف ہو جائیگا تو وہ دوشیزہ کی درخواست کو منظور کرے گا۔ یہ تھا فرانس کا فرماں روا جو اپنی قوم کا رہنما یا فوج کا قائد بن کر غنیم سے برسرِ پیکار ہونے کو اپنا فرض و عزت سمجھنا تو کجا صرف اپنی عنایت سے اتنی اجازت دے سکتا تھا کہ اُس کے لئے اُسکی غیر حاضری میں حملہ آوروں کو چند شہروں سے نکالنے کی کوشش کی جائے۔ تو مضائقہ نہیں! ژاں کے لئے یہ اجازت ہی بہت تھی خواہ اس کام کی تکمیل میں اُسے کتنی ہی دقتیں پیش آئیں اور ان دقتوں کے رفع کرنے میں "بادشاہ" کی طرف سے کوئی مدد یا ہمدردی تک بھی نہ ملے۔ دلوال اپنی ماں کو خط لکھتے ہوئے ان لفظوں میں اُس کا ذکر کرتا ہے "اُسے دیکھنا اور اُس کی باتیں سننا اک واقعی معجزہ دیکھنا تھا۔ میں نے اُسے اپنے گھوڑے پر سوار دیکھا کہ سوائے سر کے ساری کی ساری سفید زرہ میں ملبوس ہے اور ہاتھ میں ایک چھوٹی سی کلہاڑی ہے۔ گرجا کے سامنے پہنچ کر اُس نے عورتوں کی سی آواز میں کہا، گرجا والو! خدا کی بارگاہ میں دُعا کرو اور نماز پڑھو" پھر رستے کی طرف دیکھ کے بولی "بڑھے چلو"!"

دیوک دالانسوں کو ژاں کی سفارش پر اپنی بیوی سے بمشکل میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت ملی۔ دوشیزہ نے کہا "بڑی بی! ڈرو مت۔ میں اُسے تمہارے پاس صحیح و سلامت واپس لے آؤں گی"

ژاں کی فوج گرد و نواح سے جمع ہونی شروع ہوئی۔ دریائے لُوآر کے کنارے کے شہروں کو دشمن کے قبضے سے چھیننا اُن کے مدِّ نظر تھا۔ پہلے وہ مشرق کی طرف یارژو پر بڑھے۔ کُل تین ہزار

چھ سو جنگجو ہم رکاب تھے، کپتانوں کی طرف سے حملہ کرنے میں وہی پہلی سی جھجک دکھائی دی لیکن ژان پھر اُسی طرح فصیل کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔ لڑنے والے بڑھے، دوشیزہ کے سر میں ایک پتھر لگا جس سے وہ گر پڑی لیکن چوٹ لگنے سے بچ گئی۔ وہ للکاری "ہمارے آقا نے انگریزوں کو قصوروار ٹھیرا دیا ہے ـــ اور سب کچھ تمہارا ہی ہے!" تیروں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں اُس کا برہنہ سر عین کارزار میں، سب سے آگے، مستعدی کے ساتھ، کھڑے رہنا، جانفروشوں کو لڑنے مرنے پر آمادہ کرنا، اُسکا کسی پر ہاتھ نہ اُٹھانا اور خود بھی بے ضرر رہنا! ایسی باتیں تھیں جن کے حیرت انگیز اثر کا اندازہ کرنا ہمارے لئے قطعی ناممکن ہے! جو دیکھتے تھے وہی جانتے تھے اور وہ بھی فقط کچھ محسوس ہی کرتے تھے کہ اک ایسی قوت ہے جس کا رد کرنا اُن کے اختیار سے باہر ہے! لڑائی کے دوران میں ژان کا دیوک دالانسوں کی حفاظت کرتے رہنا خوب مزے کی بات تھی" اچھے دیوک! چلو! بڑھے چلو! تم ڈرتے ہو؟ میں نے تمہاری بیوی سے وعدہ کیا ہے کہ تمہیں صحیح سلامت واپس لے آؤں گی" انگریزی قائد سفک نے بالآخر ہتھیار ڈال دیئے + اِس کے بعد ژان نے مغرب کا رُخ کیا۔ پہلے بوژانسی پھر بلوآ کا قلعہ مار لیا۔ اِن دنوں ایک دِقت طلب واقعہ پیش آیا۔ کونت دَرِش مَوں جس کے ساتھ چارلس کی رنجش تھی اچانک ایک بھاری جمعیت کے ساتھ شاہی فوج کی اعانت کو آپہنچا فرنساوی قائد لگے آپس میں اختلاف کرنے، دالانسوں نے کہا کہ میں تو اُس کے ہوتے فوج میں نہ رہوں گا، اُدھر بادشاہ کے خط پر خط آتے تھے کہ اُس کی شرکت منظور نہیں۔ ژان بھی اُس کی آمد اور کمک سے زیادہ خوش نہ تھی اس لئے کہ وہ ہمیشہ آسمانی اعانت پر بھروسہ رکھتی تھی، فوج کے بڑی چھوٹی ہونے کی اُسے چنداں پروا نہ تھی۔ لیکن وہ کسی محبِّ وطن کی حوصلہ شکنی کو بھی اک گناہ سمجھتی تھی + رشموں یہ اور ژان اک دوسرے کو دیکھ کر اپنے اپنے گھوڑے سے اُتر پڑے۔ رشموں بولا" ژان! میں سُنتا ہوں تم میرے خلاف ہو، میں نہیں جانتا تم من جانب اللہ ہو یا نہیں۔ اگر تم خدا کی بھیجی ہوئی ہو تو میں تم سے نہیں ڈرتا اور اگر تم شیطان کی طرف سے ہو تو ڈرنے کی بالکل ہی ضرورت نہیں!" "بہادر کانسٹیبل" ژان نے کہا" تم میرے کہنے سے یہاں نہیں آئے لیکن چونکہ اب تم یہاں آگئے ہو۔ میں تمہارا خیر مقدم کرتی ہوں" +

انگریزی فوج بیکار حملے کرتی اور شکستیں اُٹھاتی ہوئی پیرس کی طرف لوٹ رہی تھی کہ بوس

کے میدان میں اُن کی فرانسیسوں سے مٹھ بھیڑ ہوگئی۔ ابھی تک ژان نے میدان میں دشمن کا سامنا نہ کیا تھا۔ لڑائی قلعہ بندیوں اور مستحکم مقامات ہی پر ہوتی رہی۔ انگریز میدان میں لڑائی لڑنے میں مشہور تھے۔ سو فرانسیسیوں کی زیادہ تر یہی رائے ہوتی کہ بوژانسی کو لوٹ جائیں لیکن ژان کی رائے وہی تھی جو ہمیشہ پہلے ہوا کرتی تھی۔ وہ بولی "اُن سے گتھم گتھا ہو جاؤ۔ دلیری سے اُن پر جا پڑو۔ وہ اگر بادلوں میں بھی گھس جائیں تو ہم اُن کو جانے نہ دیں گے، شریف بادشاہ کو آج سب سے زیادہ شاندار فتح نصیب ہوگی"۔

میدان میں جا بجا غلّے کی کھیتیاں اور انگور کے باغ تھے۔ فوجیں ابھی ایک دوسرے سے پوشیدہ تھیں کہ ایک بارہ سنگا فرانسادی پہرہ داروں سے ڈر کے بھاگا اور انگریزی فوج میں جا گھسا۔ یہ لوگ فرانسیسیوں کی تاک میں چھپے بیٹھے تھے۔ انہوں نے بارہ سنگے پر گولی چلائی تو فرانسیسیوں کو اُن کا پتہ لگ گیا۔ وہ بے تحاشا اِن پر ٹوٹ پڑے اور ایک ہی ہلّے میں کہیں کے کہیں نکل گئے۔ فرانسیسیوں میں ایک سے ایک بڑھ جانے کی کوشش میں تھا اور اُن کے جوش کی کوئی انتہا نہ تھی۔ الانسوں نے ژان سے کہا کہ لڑائی کا انجام کیا ہوگا؟ اُس نے پوچھا "کیا تمہاری ایڑی مضبوط ہے؟" ڈیوک نے حیرانی کے ساتھ کہا "کیا؟ تمہارا مطلب ہے کہ ہم لوگ دشمن کو پیٹھ دکھائیں گے" ژان نے جواب دیا "نہیں نہیں! انگریز لڑیں گے ہی نہیں۔ وہ بھاگ نکلیں گے اور تمہاری ایڑی مضبوط ہوگی تو اُن کا تعاقب کر سکو گے"۔ غنیم پر دوشیزہ کا جادو چل گیا۔ فوج میں افراتفری پڑ گئی۔ سپاہی اپنی اپنی جان بچا کر بھاگے، افسروں نے راہِ فرار اختیار کی۔ صرف ٹالبٹ تندی کے ساتھ لڑا اور قید کر لیا گیا۔ پاتے کی بھاگڑ (جیسا کہ اس لڑائی کو کہتے ہیں) فرانسیسیوں کی سب سے زیادہ مکمل اور شاندار فتح تھی۔ انگریزوں کے اجیت ہونے کی شہرت جاتی رہی۔ اُن کا فوجی رعب قطعی طور پر مٹ گیا۔ اور یہی اس فتح کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت تھی جس کا سبب ژان اور صرف ژان ہی کی ذات تھی۔

اب دوشیزہ نے دشمن کو قطعی شکست دے کر شہزادے کا رستہ صاف کر دیا تھا لیکن وہاں ہچکچاہٹ ہی شاہی عزم کی صورت تھی۔ درباریوں اور اُن کے "بادشاہ" کی رائے تھی۔ کہ اب تو دشمن میں کچھ دم باقی نہیں رہا، وہ فرانسیسیوں کو پیٹھ دکھا کے مقابلے سے دست بردار

ہو چکا ہے، اب بھی "حضور" کو آرام نصیب نہ ہوا تو کب ہوگا؟ پھر "بادشاہ" ناراض تھے کہ دشمنوں کو اُس کا جانب دار بنا کر نصرت میں شامل کرلینا مفسدہ پردازی سے کم نہ تھا، لیکن اس وقت تک رائے عامہ کا زور اس قدر شدید ہو چکا تھا کہ "حضور" کے لئے بھی اس کا اعتنا نہ کرنا بالکل ناممکن ہوگیا۔ بالآخر چارلس اپنے سکون کو حرکت دینے پر مجبور ہوگیا۔ اب کوئی دوشیزہ کو علانیہ طور پر جادوگرنی کہنے کی جرأت نہ کرتا تھا اگرچہ حسد و نفرت کا سلسلہ بجائے گھٹنے کے بڑھ رہا تھا۔ کلیسا والے جی میں کُڑھتے تھے۔ کہ یہ پابندِ مذہب لڑکی اس آسمانی کام میں ہمیں شریک نہیں کرتی، بغیر کلیسا کے واسطہ کے براہِ راست آسمان سے باتیں کرتی ہے، کہتے تھے "یوں تو سب کچھ خدا ہی کی برکت سے ہے مگر ہم اتنا جانتے ہیں کہ یہ لڑکی ضرور گنہگار ہے"۔ "بادشاہ" ۲۸ جون کو فوج کے ساتھ ژیاں سے چلا۔ ژان کے وفادار مددگار اُس کے ساتھ تھے بہادر دُونوا، آلانسوں جس کی حفاظت دوشیزہ کے ذمہ تھی، لائیر جسے ڈنڈے کی قسم کھانے کی اجازت تھی، لوال جو اپنی جائداد بیچ بانٹ کر اس جنگ میں شریک تھا ان میں سے کوئی نہ کوئی برابر دوشیزہ کے قریب رہتا تھا یا وہ خود کبھی فوج کے اگلے حصّے میں کبھی پچھلے میں کوچ کرنے والوں کو ڈھارس دینے والی لڑنے والوں کو جوش دلانے والی تھی۔ اوزئیر کے برگنڈ یئے تو رشوت ستانی کی برکتوں سے فائدہ اُٹھا کر بچ گئے لیکن اس کے بعد کے شہروں میں ژان کے قائدوں کی دال نہ گلی۔ ایک ایک کرکے سب نے اطاعت قبول کرلی۔ آخر ترُوآ، وہ مقام جہاں فرانس کی قسمت تباہی سے تبدیل ہو چکی تھی، نظر پڑا۔ ترُوآ کی بدشگونی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوتا کہ اُسے دیکھتے ہی فرنساوی فوج میں اختلافات ہونے لگے۔ "بادشاہ" پہلے سے بھی زیادہ بزدل بنگیا ایک مشیر نے جو ژان کے مخالفین میں سے تھا کہا کہ اگر اتنا کچھ اس لڑکی کے کہنے پر کیا ہے تو یہاں بھی اُسی کی رائے پر عمل ہونا چاہیئے۔ دوشیزہ باہر کھڑی تھی۔ حسن اتفاق سے عین اسی وقت اُس نے بے صبری کے ساتھ دروازہ کھٹکھٹایا جیسا کہ پہلے بھی ایک بار شینوں میں اُس نے بےتابی ظاہر کی تھی، اندر داخل ہوئی تو سرا سقفت نے یہ جتانے کے لئے کہ وہ ژان کے مخالفین میں سے نہیں ہے جلدی سے کہا، "ژان" "بادشاہ" اور اُس کے مشیر اس تذبذب میں ہیں کہ اب کیا کیا جائے؟ دوشیزہ بولی "اگر میں کچھ کہوں تو مانوگے؟" "بادشاہ" بیچ میں بول اُٹھا کہ "میں یہ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں اگر تم مناسب و مفید مشورہ دوگی تو میں ضرور مان لونگا"۔ اُس نے پھر دوہرایا "مجھے مانوگے؟" بادشاہ

نے کہا "ضرور جیسی تمہاری بات ہو گی"۔ ژان نے کہا "شریف دوفیں! اپنے آدمیوں کو حکم دے دو کہ ژروآ کے شہر پر حملہ کر دیں اور زیادہ سوچ بچار نہ کریں۔ کیونکہ خدا کی قسم تین دن میں نرمی سے ہو یا سختی سے میں آپ سب کو ژروآ کے اندر لے چلوں گی اور چھوٹا برگندی منہ تکتا رہ جائے گا"۔ چانسلر نے کہا "ژان اگر یہ چھ دن میں بھی ہو سکے تو ہم خوشی سے انتظار کریں گے"۔ دوشیزہ نے بادشاہ کو مخاطب کر کے استقلال کے ساتھ کہا "آپ چھ دن میں نہیں کل ہی یہ شہر مار لیں گے"!

اس کے بعد وہی واقعات ہوئے جو پہلے سے ہوتے آئے تھے۔ ژان اپنا علم تھام کر فصیل کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔ لیکن اب وہ زیادہ کار آزمودہ ہونے کے باعث جنگی تیاریوں میں ایک معتدبہ حصہ لینے لگی۔ اُس نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی اور شہر کے گرد مناسب طور پر جگہ جگہ توپیں جما دیں۔ شہری یہ شور وغل سُن سُن کر اور زیادہ بدحواس ہوئے۔ جنگجوؤں کے بازو بھی گویا جادو کے اثر سے کانپنے لگے اور سوچنے لگے کہ ہتھیار ڈال دینا ہی قرینِ مصلحت ہو گا۔ پو پھٹنے سے پہلے بھی اندھیرا چھایا ہوا تھا کہ پادریوں کا ایک جلوس شہر کے دروازے سے نکل کر باہر آیا اور شہریوں کی طرف سے "بادشاہ" کی خدمت میں حاضر ہو کر پیمانِ اطاعت باندھا اور کہا کہ قلعے کی فوج کو کوچ کر جانے کی اجازت دیجئے! یہ بات مان لی گئی اس قلعے والی فوج میں فرنساوی قیدی بھی شامل تھے جو ژان کے اصرار پر فدیہ دے کر چھڑا لئے گئے۔ ژان فوراً شہر میں داخل ہوئی۔ لیکن یہاں آؤ بھگت کا سوال نہ تھا وہ اورلیاں ہی کے ساتھ مخصوص تھا۔ دوشیزہ کو دیکھ کر لوگ جی میں ڈرتے تھے کہ یہ جادوگرنی آخر کار ہمارے شہر میں بھی آ پہنچی۔ برادر رشار شہر کا مقرر بھی جب ژان سے ملا تو اپنے آگے "پوتر پانی" چھڑکتا ہوا بڑھا تاکہ شیطان کو جو ژان کے اندر چھپا بیٹھا ہے دُور کر دے۔ دوشیزہ نے کہا "تشریف لائیے! میں بھاگوں گی نہیں"! مغلوبیت کے بعد دوسرے روز ژان "بادشاہ" کو لے کر گرجا گئی اور وہاں اُس متقدس مقام میں دوبارہ چارلس نے وہ وعدے دُہرائے جو داخلے سے پہلے کئے تھے کہ شہریوں کے سب حقوق ملحوظ رکھے جائیں گے! ژروآ کے بعد شالوں کا شہر تھا۔ یہاں کے لوگوں نے بھی اپنے شہر کے دروازے قوم پرستوں کے لئے کھول دئے۔ اور حلقۂ اطاعت میں داخل ہو گئے۔

اب ریں تک سارا رستہ صاف نظر آ رہا تھا۔ کوئی رکاوٹ نہ تھی، ژان نے جو کچھ کہا

تھا وہ کر کے دکھا دیا، اورلیاں کا محاصرہ اُٹھایا، دریائے لُوار کے کنارے کے سبھی شہروں کو زیرِ نگیں کیا، دشمن نے جہاں میدان میں مقابلہ کرنے کی ٹھانی اُسے پچھاڑا اور انگریزوں کے رُعب داب کو فرانساوی دلوں سے قطعی طور پر محو کر دیا۔ تروآ جہاں منحوس معاہدہ کیا گیا تھا" بادشاہ کے قدموں سے مشرف ہوا اور اب ریّں جو شہزادے کی رسمِ تقدس اور تاجپوشی کا مقررہ مقام تھا تھوڑے ہی فاصلہ پر تھا۔ ژاں کے آنے کی خبر دُور دُور تک مُلک میں پھیل چکی تھی۔ دومری کے ناخواندہ غریب کسان بھی اُس انبوہ میں شریک تھے جس سے سڑک آباد ہو رہی تھی۔ وہ سُن چکے تھے کہ ہمارے گاؤں کی چھوٹی عبادت گذار سب قائدوں کی سردار بن کر غنیمِ قدیم کو کئی بار فاش شکستیں دے چکی ہے۔ فرشتۂ میکائیل اُس کے پاس آتا جاتا ہے اور ربِّ دوعالم کے پیغامات لاتا ہے۔ لیکن اُنہیں یقین نہ آتا تھا کہ حقیقت میں ایسا ہی ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ اطراف سے ہو کے گذرے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہی ژاں ہے اَور کوئی نہیں، بادشاہ اس کے جلو میں ہے اور وہ فتحمند فوجوں کو فرانس کے بلند نصیبے کی طرف لئے جا رہی ہے! کیا وہ جنگ سے ڈرتی نہیں۔ تیروں کی اُس بوچھاڑ سے، توپوں کے اُن گولوں سے، اُس دیوانہ کر دینے والے شور وغل اور کُشت وخوں سے؟ دوشیزہ کا قول تھا "میں سوائے دغا کے اور کسی چیز سے نہیں ڈرتی"!

بادشاہ اور اُس کے مصاحب خائف تھے کہ نہیں معلوم ریّں کے سر کرنے میں کتنی دشواریاں اُٹھانی پڑیں۔ خوبئ قسمت سے ریّں والوں نے خود ہی شہریوں کا ایک وفد شہر کی چابیاں دیکر شہزادے کے استقبال کو بھیجا۔ "بادشاہ" اور اسقفِ اعظم دونوں کے لئے، ایک شاندار کامیابی تھی، دونوں اپنے اپنے حقوق سے محروم کئے گئے تھے اب دونوں نے دوشیزہ کی پیروی میں اپنے کھوئے ہُوئے خزانے کو پالیا! سب پیشینگوئیاں پُوری ہوگئیں! اسقفِ اعظم شہر میں صبح کے وقت داخل ہُوا، چارلس اُس کے درباری اور سب باقاعدہ۔ اور بے قاعدہ فوج، ژاں کے چیلے، قواعدداں فوج، ہزاروں وہ کسان جو رستے میں ژاں کو دیکھ کر اپنا کام چھوڑ چھوڑ کے راہِ خدا میں چل کھڑے ہُوئے تھے سب کے سب شام ہوتے شہر میں داخل ہُوئے! شہر ان نووارد فتح مندوں کی آمد آمد اور شہریوں کے جوش وخروش کے ساتھ خوشی کا جشن منانے میں مصروف ہوگیا اور ہر سو اک جدید قومی زندگی لہریں لینے

لگی! ژان شہزادے کے ساتھ ساتھ گھوڑے پر سوار چلی آتی تھی اور اُس کا عَلم اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اُس کا باپ ژاک دارک اور اُس کا ماموں دیوراں لاکسار بس نے پہلے پہل مشکل کے وقت اُس کی مدد کی تھی شہر کے چوک میں ایک سرائے میں اُس سے ملے۔ اس ملاقات کا حال ہمیں معلوم نہیں۔ اُس کے ماموں کو شہزادے نے بھی طلب کیا اور اُس سے ژان کے بچپن کے حالات دریافت کئے۔

تاج پوشی سے ایک دن پہلے شام کے وقت فرانس کے اُمرا شہزادے کو گرجا کے باہر لے گئے اور ایک قدیم دستور کے مطابق اُسے ایک مرتفع مقام پر کھڑا کر کے لوگوں کو علی الاعلان کہا "یہ ہے تمہارا بادشاہ جسے ہم فرانس کے اُمرا تاج پہناتے ہیں، یہ ہوگا ہمارا بادشاہ اور حاکمِ اعلیٰ اگر یہاں کوئی متنفس ہے جسے کوئی اعتراض کرنا ہو تو وہ بول اُٹھے تاکہ ہم جواب دے سکیں اور کل رُوح القدس کی برکت سے اس کی "رسمِ تقدس" ادا ہوگی۔ کیا تم کو کچھ اعتراض ہے؟" لوگوں نے چلّا کے کہا "مبارکباد! مبارکباد!" رات ریمز والوں نے رتجگے میں کاٹی۔ شب بھر جشن کی تیاریاں ہوتی رہیں، غریب سے غریب گھر والی نے اپنا بہترین ریشم نکال کر گھر کی آرائش کی، بازار سجنے لگے لوگوں نے اپنا بہترین ملبوس زیبِ تن کیا، دُور دُور کے شہروں سے فرانس کے رہنے والے، فرانس کے نام پر فخر کرنے والے جوق جوق ریمز میں آنے شروع ہوئے۔ ایسا دن برسوں کے بعد نصیب ہُوا تھا، غنیم کی شکست قوم کی فتح کسے خیال تھا کہ یہ ہمارے جیتے جی نصیب ہونگی؟ لندن تک اس جشن کی دُھوم تھی پیدل اور سوار صبح ہوتے شہر کے دروازوں پر ہجوم کئے کھڑے تھے "بادشاہ" کے جشن کا تماشا اور پھر اُس آسمانی قاصد دوشیزۂ اورلیاں کا جلوہ دیکھنا موجبِ انبساط تھا! علی الصباح اسقفِ اعظم کے مکان سے ایک جلوس نکلا۔ چار بانکے امیر، سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبے ہُوئے اپنے جھنڈے پکڑے ہُوئے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر سین ریمی کی قدیم عبادت گاہ کی طرف چلے۔ یہاں کا پادری اپنے کارندوں کے جھرمٹ میں فرنساوی فرماں رواؤں کی مقدس و پاکیزہ قدیم بوتل ہاتھ میں لئے نمودار ہُوا اور قسما قسمی ہونے کے بعد یہ خزانہ ان جنگجوؤں کے حوالے کیا گیا۔ لوٹتے وقت اُنہیں راہ میں اسقفِ اعظم کا شاندار جلوس مِلا اور یہ "مقدس تیل" اُن کے سپرد کر دیا گیا۔ ادھر یہ تمہیدی رسمیں ہو رہی تھیں۔ اُدھر ژان فارغ نہیں

تھی۔ جیسا کہ اُس نے لڑائی سے پہلے انگریزوں کو ایک نامۂ تنبیہ لکھا تھا ایسے ہی اب اُس نے ڈیوک برگنڈی کو جو شاہِ فرانس کے خلاف انگریزوں کا جانب دار تھا۔ ایک ہدایت نامہ تحریر کیا جس کا مضمون حسبِ ذیل تھا:۔

یسوع مریم

عالی مرتبت دلاور شہزادے ڈیوک برگنڈی ! ژان، دوشیزہ آسمانوں کے بادشاہ کی طرف سے جو میرا منصف مزاج حکمران و آقا ہے چاہتی ہے کہ شاہِ فرانس اور تم آپس میں صلح کر لو ایسی صلح جو مضبوط و پائدار ہو اور قائم رہے۔ ایک دوسرے کو دلی ارادے کے ساتھ درگذر کرو جیسا کہ اچھے مسیحیوں کا فرض ہے اور اگر تم کو لڑنا ہی ہے تو کافروں سے لڑو۔ شہزادۂ برگنڈی! میں التجا کرتی ہوں منت کرتی ہوں حلم و انکسار کے ساتھ چاہتی ہوں کہ تم مقدس ملکِ فرانس کے خلاف لڑنا ترک کر دو۔ فوراً جتنی جلد ہو سکے اپنی فوج کو جو قلعوں میں جمی بیٹھی ہے ہٹا لو۔ شاہِ فرانس تمہارے ساتھ اپنی عزت و ناموس کو مدِ نظر رکھ کر مصالحت کو تیار رہے اور تمہاری جان کی قسم! تم وفا شعار فرانسیسیوں کے برخلاف کبھی فتح نہ پاؤ گے اور سب وہ لوگ جو اس مقدس سلطنت کے ساتھ برسرِ پیکار ہونگے گویا آسمان کے بادشاہ کے ساتھ لڑائی کرینگے۔ اور میں ہاتھ جوڑ کر منت کرتی ہوں کہ اب لڑائی نہ کرو۔ نہ ہم سے لڑو بھڑو نہ تمہارے دوست نہ تمہاری رعایا۔ اور یہ یاد رکھو کہ تم تعداد میں کتنے بھی کیوں نہ ہو تم کبھی نہ جیتو گے پھر کتنی حسرت ناک ہو گی وہ لڑائی اور وہ خون جو وہاں بہے گا۔ تین ہفتے ہوئے میں نے ہرکارے کے ہاتھ تم کو ایک خط لکھا تھا کہ تم آج اتوار کے دن بتاریخ ۱۷ جولائی ریمز میں آکر بادشاہ کی "رسمِ تقدس" میں شامل ہو جاؤ جس کا مجھے جواب نہیں ملا نہ اُس ہرکارہ سے کچھ حال معلوم ہوا۔ میں تم کو خدا کے سپرد کرتی ہوں اور اگر اُس کی مرضی ہو تو وہ تمہاری حفاظت کرے اور میں خدا سے دُعا کرتی ہوں کہ وہ اک اچھے امن کی صورت پیدا کر دے! المرقوم ۱۷ جولائی ۱۴۲۹ء بمقام ریمز

خط لکھنے کے بعد ژان نے اپنی زرہ پہنی اور جشن میں شریک ہونے کی تیاری کی۔ اس شرکت کے مفصل حالات معلوم نہیں ہیں صرف اتنا پتہ ہے کہ اُس کا عَلَم اُس کے ساتھ تھا۔ اُس نے بعد میں فخر کے ساتھ کہا یہ خطرے کی حالت میں سب کے آگے ہونا تھا مناسب

تھا کہ عزت کے وقت بھی سب کے ساتھ شریک ہو۔ ژان اُمرا اور قائدوں کے زمرے میں قربان گاہ کے گرد کھڑی ہُوئی۔ اُسے گرجا میں کوئی مخصوص جگہ نہیں دی گئی۔ شہزادہ اسقفِ اعظم کے سامنے دوزانو ہُوا، اسقف نے اُس پر مقدس تیل چھڑکا۔ اور اُس کے سر پر تاج رکھ کر رسم کی تکمیل کی، گرجا "مبارکباد، مبارکباد" کے نعروں سے گونج اُٹھا۔ خُدا نے جو کام ژان کے ذمہ کیا تھا وہ آج پورا ہو گیا، اس کے سرانجام دینے میں اُسے جن صعوبتوں اور دُشواریوں کا سامنا کرنا پڑا وہ اب راحتِ جان بن کر نظر آ رہی تھیں۔ بادشاہ کو تاج پوش دیکھ کر ژان سے نہ رہا گیا۔ لوگوں کے انبوہِ کثیر میں سے نکل کر اُس نے اپنے تئیں بادشاہ کے قدموں پر ڈالدیا اور اُس کے زانو سے لپٹ گئی۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ وہ بولی "شریف بادشاہ خدا کی مرضی آج پُوری ہو گئی۔ اُس کا حکم تھا کہ میں اورلیاں کا محاصرہ اُٹھا دوں اور آپ کو اِس شہر ریمز کو لے آؤں جہاں آپ کی "رسمِ تقدس" ادا ہو۔ اب اُس نے دکھا دیا ہے کہ آپ ہی اصلی بادشاہ ہیں اور فرانس کی مملکت فی الحقیقت آپ ہی کی سلطنت ہے۔" یہ کہکر ژان نے رخصت چاہی کہ اب مجھے جانے دیجئے، میرا کام ہو چکا ہے!

ژان کی سیرت نگار لکھتی ہے کہ انسانی دلوں کی یہ دُعا کہ "اُے آقا! اب تو اپنے خادم کو سلامتی میں رخصت ہو جانے دے" عُمر رسیدہ لوگوں کے لئے تو موزوں ہے لیکن جب وہ کسی نوعُمر کے لبوں سے نکلے تو سُننے والوں کے دل کو پاش پاش کر دیتی ہے۔ لوگوں پر رِقّت کا سماں چھایا ہُوا تھا، ژان کے دل میں بھی رِقّت تھی اور اگرچہ اُس کے خیالات مسرت و انبساط سے لبریز تھے لیکن اس تکمیلِ کار کا احساس بھی تھا کہ مجھے زندگی میں جو کچھ کرنا تھا میں کر چکی، یہی تھا میرا مقصدِ حیات، اب کارزارِ دہر سے مجھے واسطہ نہیں!

ژان کی اس بے تابانہ گفتگو کے صحیح معنی کی بابت مورخین میں بہت اختلافِ رائے ہے۔ کیا دوشیزہ کا مطلب یہ تھا کہ اُس کا کام پورا ہو چُکا ہے اور اُس کا ربّانی فرض ادا ہو گیا؟ کیا اُس کے اعتقاد کے مطابق اُس کا کارِ مقررہ ختم ہو چُکا تھا؟ یا کیا اُس کے دل میں یہ تھا کہ ابھی اُسے انگریزوں کو فرانس سے باہر نکالنا ہے؟

اگر پہلی حالت تھی تو اُسے چاہیئے تھا کہ وہ یہ کام ترک کر کے چل دیتی اور ایسا نہ کرنے

میں وہ ربانی ظلِ عاطفت سے نکل گئی۔ اس امر کا صحیح فیصلہ دشوار ہے، بعض وقت ژان کہا کرتی کہ میرا کام اورلیاں کا محاصرہ اُٹھانا اور شہزادے کو ریمز میں لیجا کر تاج پہنانا ہے، لیکن بعض دفعہ وہ پیرس کو سر کرنے اور انگریزوں کو فرانس سے نکال دینے کی باتیں بھی کرتی، اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی محسوس کرتی کہ میری قوت محدود ہے اور ختم ہونے والی ہے، اُس نے بادشاہ سے کہہ دیا تھا کہ "میں صرف ایک برس تک ہوں"۔ غالباً دُولوا کی شہادت سب سے زیادہ قوی ہے کیونکہ وہ اکثر اُس کے قریب ہی رہتا تھا۔ ژان کی موت کے مدت بعد اُس نے کہا کہ "اگرچہ ژان بعض اوقات لوگوں کے دل بہلا دے کے لئے ایسے امور کا تذکرہ کرتی جو بعد میں پُورے نہ ہوئے لیکن جب کبھی وہ متانت کے ساتھ جنگ کا ذکر چھیڑتی اور اپنا اصلی ارادہ ظاہر کرتی تو صرف یہی کہتی کہ میں اس غرض سے بھیجی گئی ہوں کہ اورلیاں کا محاصرہ اُٹھادوں اور بادشاہ کو ریمز کی طرف تاج پوشی کے لئے لے چلوں"۔ اگر اصلیت یُوں ہے تو کیا اُس نے احکامِ ربانی سے سرتابی کی؟ یا کیا بادشاہ اور اُس کے دربار کی ریشہ دوانیاں اُس کی زنجیرِ پا بن گئیں؟ مسٹر اولیفنٹ کا خیال ہے کہ صرف اِنہی دو چیزوں کا سر انجام دینا اُس کے ذمہ تھا، اِس کے بعد جو کچھ اُس نے کیا وہ نیک نیتی اور عالی ہمتی سے بحیثیت ایک حسّاس و دلاور انسان کے کیا۔ اس میں ربانی منظوری کا پہلو شامل نہیں تھا! یہ اُس کی مرضی تھی کہ لڑے یا اپنے گھر کو لوٹ جائے۔ اُس کے حالات و عادات میں زمین آسمان کا فرق آگیا تھا، اُس کے خیال میں اب زندگی کی خوشی اسی میں تھی کہ وہ اپنے وطن کو قطعی طور پر آزاد کرنے کے لئے اپنی باقیماندہ زندگی نذر کر دے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ دوشیزہ کو بات بات میں اپنے ہموطنوں کی حاسدانہ مخالفت سے دوچار ہونا پڑا۔ ریمز کے بعد یہ عداوت اور جلن دُگنی چوگنی ہوگئی۔ بادشاہ اب فی الحقیقت بادشاہ بن گیا تھا، اب شکست سے کچھ کھو دینے کا احتمال زیادہ تھا فتح سے کچھ حاصل ہونے کا خیال کم اس لئے ایسے کاہل الوجود بادشاہ اور ایسے حاسد وزباں کار درباریوں سے توقع نہ ہو سکتی تھی کہ وہ حصولِ مقصد کے بعد ژان کو اپنی نظروں سے اوجھل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت کرینگے، مگر باوجود دوشیزہ کے انکسار کے "لوگوں کی وجہ سے" اُس کا نکال

دیا جانا اک مشکل امر تھا اور غالباً اُس کے ہمراہی بھی ایسا کرنے پر راضی نہ ہوتے کہ ابھی اُس کے کارنامے سب کے دل ودماغ میں تازہ تھے۔ دوشیزہ کی "آوازوں" نے بھی اُس کو اپنے حال پر چھوڑ نہیں دیا۔ نہ اُسے منع کیا کہ اس کام کو ترک کردے لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اُن کا لہجہ زیادہ غمگین ہوگیا، بتدریج اُس کے دل میں القا ہونے لگا کہ اُس پر کوئی نہ کوئی آفت نازل ہونے والی ہے۔ لیکن اس آفت میں خدا اُس کا ساتھ دیگا۔ کچھ شبہ نہیں کہ اگر وہ اپنی اس مکمل کامرانی کے بعد خلوت نشیں ہوجاتی تو اُس کا کارنامہ نہایت شاندار ہوتا لیکن ایسا کرنا تقاضائے بشری نہ تھا، اب وہ ایک قائد (رہنما) تھی جس میں جنگی جوش کی کمی نہ تھی، اُسے کافی تجربہ حاصل ہوچکا تھا، اب دومرمی کی فضا میں اپنے خیالات کے ساتھ اُڑنا اُس کی ذکاوت کے لئے موزوں نہ تھا، اب یہی کام تھا جس کو وہ اپنے حسبِ حال سمجھتی تھی خواہ قدم قدم پر اُس کے لئے رکاوٹوں کا سامان پیدا کیا جائے، بات بات میں رخنہ اندازی کے پہلو نکالے جائیں اس کام سے مفر نہ تھا! اور اس میں شک نہیں کہ اگر وہ اپنے دل کے کہنے پر عمل کرسکتی اگر وہ بلا تامل پیرس پر حملہ آور ہوسکتی تو جیسا کہ خود انگریزوں کے سرِ حکومت نے اعتراف کیا دارالسلطنت کا فتح ہوجانا یقینی تھا لیکن وہ ابو کسلان جس کی تاج پوشی ریمز میں ہوئی تھی اب اتنی شان وشوکت کے بعد کیونکر اس قدر جلد میدانِ جنگ کی طرف رُخ کرتا۔ چارلس نے درپردہ ڈیوک برگنڈی کے ساتھ معاہدہ کرلیا کہ یہ پندرہ روز کے اندر اندر پیرس اُس کے حوالے کردے گا۔ ڈیوک کی اس وقت عجب حالت تھی، وہ اُدھر انگریزوں سے بیزار تھا اِدھر شاہِ فرانس سے متنفر، وہ اس کشمکش میں تھا کہ کس کی اعانت کا دم بھرے اُدھر اجنبی دوست ہے۔ ادھر ہم وطن دشمن!

ژان کو ان ساری مشکلات کا ریمز چھوڑنے سے پہلے ہی احساس ہونے لگا۔ اُس کی باتوں میں اُداسی برسنے لگی۔ اُس نے دل ہی دل میں جان لیا کہ وہ لطیف ومسرور وقت اب انجام کو پہنچ گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ تاج پوشی کے بعد بادشاہ گردونواح کے دیہات میں اپنے جلوس کے ساتھ نکلا، لوگ ہر طرف مبارکباد کے پھول نچھاور کرتے تھے اور خوش تھے کہ اُن کا بادشاہ پھر اُن کے درمیان راج کرنے کو آ پہنچا ہے، لافرتے کے گاؤں میں ژان جو اس جلوس میں شریک تھی اسقفِ اعظم اور ڈونوا کے بیچ میں گھوڑے پر سوار جارہی تھی کہ لوگوں نے بادشاہ کو دیکھ کر مبارکباد

مبارکباد" کے نعرے لگائے۔ ژان آبدیدہ ہوکر بولی" آہ! بھولے بھالے لوگ! یہ اپنے شریف بادشاہ کو دیکھ کر کیسے خوش ہو رہے ہیں، میں کس قدر خوش نصیب ہوں اگر میرے دن ختم ہو جائیں اور میں انہیں لوگوں میں یہاں دفن کر دی جاؤں! حضرتِ اسقف ہمیشہ تاک میں رہتے تھے کہ کوئی موقع پائیں تو ژان کو جھٹلائیں۔ بولے" ژان بتاؤ تو تم کہاں مرو گی؟" دوشیزہ نے بغیر سوچے سمجھے اپنے بھولے پن کے ساتھ کہا" جب بھی خدا کی مرضی ہو، مجھے تو نہ مقام کا علم ہے نہ وقت کا!"

اتنا صلہ ژان کو اُس کی خدمات کا ضرور ملا کہ اُس کے باپ اور ماموں کو حکومت کے مصرف پر شہر میں ٹھہرایا گیا اور ژاک کو ایک سند عطا کی گئی جس کی رُو سے دومرمی اور گریٹو کے گاؤں کو تمام قسم کے محاصل اور مالگذاری کی معافی دے دی گئی! مدتوں تک سرکاری خزانے کے حسابات میں ان دونوں دیہات کے نام کے سامنے رسید کے بجائے یہ لفظ لکھے ہوتے تھے" دوشیزہ کی خاطر"!

اپنے باپ اور ماموں سے رخصت ہوتے وقت ژان بے اختیار رو پڑی۔ وہ چاہتی تھی کہ اُن کے ساتھ دومرمی کو لوٹ جائے اور مدت کے بعد اپنی پیاری ماں کو پھر ملے" لیکن ایسا کرنا اُس کے بس میں نہ تھا۔ باپ اور ماموں دونوں اُسے خدا حافظ کہہ کر چل دیئے اور جہانتک ہمیں معلوم ہے پھر کبھی اُس سے ملنا نہ ہُوا!!

(باقی)

بشیر احمد

تاریکی پھیلتی جاتی تھی۔ اس لئے وہ تیز رفتاری کی حالت میں دھیمی سروں میں اپنی تازہ فارسی غزل گارہا تھا۔ لب سڑک ایک مکان سے تیز روشنی سڑک پر پڑ رہی تھی اور باہر برآمدے میں ایک روسی عورت استرخانی ٹوپی سر پر رکھے اور اُودے رنگ کا ریشمی چیخا کوٹ پہنے ٹہل رہی تھی۔ جونہی زکریا نیچے سڑک پر سے گذرا وہ عورت بے تابانہ برآمدے میں نکل کر زکریا کے استقبال کو بڑھی اور اشتیاق اور گھبراہٹ کی حالت میں اس نے زکریا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر کہا "آخر تم پہنچ گئے" .... "اوہ معاف کرنا مجھے غلطی ہوئی میں آپ کو پہچان نہیں سکی"۔ زکریا نے ٹوپی اتار کر گردن کے اشارے سے سلام کیا اور آگے چلدیا لیکن پھر اسے خیال آیا۔ کہ شاید یہیں اسے کوئی ایسا واقعہ پیش آئے جو اس کی یکساں زندگی میں دلچسپی کا باعث ہو۔ عورت حسین بھی تھی اور پریشانی اس پر مستزاد تھی۔ جس سے اس کی شربتی آنکھوں میں آتشیں چمک پیدا ہوگئی تھی۔ زکریا نے دو قدم پیچھے مُڑ کر کہا "میڈم۔ کیا مجھے آپکی خدمت کا شرف حاصل ہو سکتا ہے"؟

اسکی تیز آنکھوں سے امید کا ایک شرارہ نکلتا ہُوا معلوم ہُوا۔ جو زکریا کو مستعد کرنے کے لئے کافی تھا۔ "اگر آپ گوارا کریں"

"مجھ پر آپ کلّی اعتماد رکھیں"

"کمرے میں تشریف لے چلیں تو بتاؤں"

چبوترے پر چڑھ کر برآمدے کے دائیں ہاتھ کو سجے ہُوئے کمرے میں داخل ہوتے ہی زکریا کو معلوم ہُوا کہ تھوڑی دیر میں اس کمرے میں کئی آدمی اس نووارد روسی خاتون کی میزبانی کا فخر حاصل کرینگے۔ کیا مجھے بھی انہیں میں ایک ناخواندہ مہمان کی حیثیت میں رہنا ہوگا؟

"ایک لحظہ آپ توقف کریں تو میں دیکھ لوں کہ کوئی اجنبی ہماری باتیں نہ سُن سکے"

اب زکریا کے دل میں پہلی دفعہ ہراس طاری ہُوا کہ کہیں مجھے جال میں پھنسا کر تو یہاں نہیں لایا گیا۔ کیونکہ سرحدی اضلاع میں روزمرہ کے حادثات میں چلتے پھرتے آدمی کا ہمیشہ کے لئے سوسائٹی سے غائب ہوجانا کوئی عجیب بات نہ تھی۔ لیکن پھر اسے خیال آیا کہ میرے پاس سوائے سگریٹ کیس پائپ اور وزیٹنگ کارڈ کے اور کیا ہے۔

جس کے لئے مجھے کوئی آزار پہنچائے۔ میری جان ایسی نادر نہیں کہ اسکے بدلے کسی کو کچھ تاوان ملنے کی بھی اُمید ہو۔ اور پھر میں تو خود تلاش ہنگامہ میں یہاں آیا ہوں۔ اس سے بڑھ کر اور عجیب موقعہ انسانیت کے مطالعہ کا کیا مل سکتا ہے۔

"آپ اگر میرے ساتھ اوپر تشریف لے چلیں تو میں زیادہ اچھی طرح اپنی حالت بیان کر سکونگی۔ لیکن آہستہ قدم آیئے تاکہ میرے ملازمین کو پتہ نہ لگے کہ آپ میرے ہمراہ ہیں"

زکریا چلنے کو ساتھ ہو لیا۔ لیکن اب اس کا دل ایسی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کہ اسے شُبہ پیدا ہُوا۔ کہ کہیں میری قلبی حرکت چہرے سے تو ظاہر نہیں ہوتی۔ بہر حال وہ دبے پاؤں چٹائی دار سیڑھیوں سے گذر کر ایک بڑے ملاقی کمرے میں داخل ہُوا۔ کمرہ ایسی خوش سلیقگی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ کہ زکریا کو شُبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ اس عشرت کدے میں کوئی خلاف معمول حادثہ واقع ہو سکتا ہے۔ اچانک اس کی نگاہ ایک مخملی سوفے پر پڑی۔ جس پر ایک آدمی بے تحاشا لیٹا ہُوا خراٹے لے رہا تھا۔

عورت نے ناٹک کے انداز میں ہاتھ پھیلا کر اور رونی صورت بنا کر کہا" دیکھئے یہ آپکے سامنے میرا خاوند پڑا ہے۔ اس کی بدمستی نے آبرو خاک میں ملا دی ہے" زکریا نے تعجب سے دیکھ کر اپنے دل میں کہا" تو کیا مجھے اپنے شرابی خاوند کی ملاقات کے لئے یہاں بلایا گیا ہے"

اس نے سرد مہری اور متانت سے جواب دیا" معلوم ہوتا ہے۔ آپکا خاوند بہت بے اعتدال ہے۔ مجھے بتائیں میں آپکی کیا مدد کر سکتا ہوں"

عورت نے ملتجی نگاہوں سے اپنے دونوں ہاتھ زکریا کے شانوں پر رکھ کر بصد الحاح کہا" کیا آپکو خیال ہے۔ کہ میں نے آپ کو بے سود زحمت دی ہے۔ آپ پہلے میری دُکھ بھری کہانی تو سُن لیں۔ تین سال ہُوئے میں نے ہارڈنگ کے ساتھ طہران میں اپنے خاندان کی خلاف مرضی شادی کی تھی۔ میرے چچا نے جو روس کی تباہی کے بعد پشاور میں چلے آئے تھے۔ مجھے ایران سے اپنے پاس بُلا لیا۔ انکا ارادہ تھا کہ میرے والدین اور تمام رشتہ داروں کو جو آجکل یہاں ہیں۔ کہہ سُن کر میرا قصور معاف کرادیں۔ چنانچہ آج شام اُنہوں نے سب کو دعوت پر میرے خاوند سے ملانے کے لئے بُلایا ہے۔ آج تیسرے پہر تک میرا

پیارا ہارڈنگ انسان تھا۔ مگر اس وقت اس پر وحشت طاری ہے۔ کیا میں ایسے وحشی کو اپنے عزیزوں کے سامنے پیش کرونگی؟"

"میں انہیں تو درکنار اپنے ملازموں کو بھی اس ذلیل حالت سے آگاہ نہیں کرسکتی۔ وہ ضرور کہینگے کہ مجھے شرم سے ڈوب مرنا چاہیئے اور میرے عزیزوں کے چہروں پر انتقامی تبسم ہوگا۔ وہ سب کہینگے۔ ہم نہ کہتے تھے! میں اپنی شرمناک حالت کو ان کی نگاہ سے چھپانا چاہتی ہوں۔ بتائیے میں کیا کروں؟

زکریا کو مشکل پڑنے پر جھوٹ بنانے اور حکایت سازی میں کبھی دریغ نہیں ہوا۔ اس نے کہا" ہارڈنگ کو بستر ے میں سلادو۔ وہ بالکل بے ہوش ہوگا۔ کہنا اچانک بیمار ہوگیا۔ اس طرح وقت گذر جائیگا۔"

"کیا وہ اوپر آکر بیمار پرسی نہ کرینگے۔ اگر میں کہوں کہ ڈاکٹر نے ملنے سے منع کیا ہے۔ تو کہینگے۔ ایسی بیماری کی حالت میں اگلے جمعہ کو وہ کراچی کا سفر کیسے کریگا۔ کیونکہ میں نے اس قضیہ کو مٹنے کے واسطے ارادہ کیا ہے کہ چار روز بعد اپنے رشتہ داروں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاؤں۔ اور اپنی شرم کو اپنے ساتھ لئے پھروں۔ میں نے ایک لڑکا ڈاکٹر کی طرف دوڑایا تھا کہ وہ آکر انہیں ہوش میں لائے۔ لیکن وہ ابھی تک نہیں لوٹا اور وقت بہت کم باقی ہے۔ میں اسی کے انتظار میں تھی۔ کہ آپ آگئے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں اس معاملے میں ملازموں سے اخفا کیوں کرتی ہوں۔ للہ مجھے بتائیے میں کیا کروں۔ یہ کہہ کر وہ زکریا کے قدموں میں فرش پر بیٹھ گئی اور ایک اندازِ دلربائی کے ساتھ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لئے اور لمبے سنہری بالوں کو پیشانی پر بکھیر دیا۔ زکریا اس تھیٹریکل حرکت کو دیکھکر کچھ محظوظ ہوا اور کچھ اس کی بدگمانی میں اور اضافہ ہوا۔ کہ کہیں مجھے کسی جال میں تو نہیں پھنسایا جارہا۔ زکریا کو معلوم ہوگیا۔ کہ ایسی تیز فہم عورت کے سامنے وہ پہلے ہی اپنی پھیکی سی تدبیر بتاکر شرمندہ ہوا ہے۔ اب مزید کوشش کرنا اپنی بیوقوفی کا اظہار ہے۔ اس لئے اس نے کہا" جیسے کہو میں ہر طرح حاضر ہوں۔"

"آپ انہیں اٹھاکر دوسرے کمرے میں چارپائی پر تو ڈالیں۔" زکریا نے کہا بہت خوب"

اس نے ریشمی رومال اپنے کف سے نکال کر اپنے لبوں پر پھیرا اور جیب میں رکھ لیا اور پائپ کی راکھ جھاڑ کر میز پر رکھ دی اور آستین چڑھاکر لاش کو سیدھا کیا۔ ہارڈنگ کی چھوٹی سرخ رنگ کی ڈاڑھی اور لمبی مونچھیں خاک سے اٹی ہوئی تھیں۔ اس کا رنگ سرخ اور سر کے گھونگریالے بال اُلجھے ہوئے تھے۔ کالر میں شکن پڑے تھے اور نکٹائی کالر سے اُتر کر گلے میں پھانسی کے پھندے کی طرح اُلجھی ہوئی تھی۔ واسکٹ اور قمیص کے بٹن کھلے تھے۔ اس ہیئت کذائی میں بھی وہ خوبصورت آدمی معلوم ہوتا تھا۔ بڑی مشکل سے زکریا نے ہارڈنگ کو کھڑا کیا اور وہ دیوانوں کی طرح اپنے گردوپیش دیکھنے لگا اور پھر زور سے کھنکار کر فرش پر اوندھے مُنہ گر پڑا۔ زکریا نے اسے اپنے شانوں پر اُٹھاکر دوسرے کمرے میں چارپائی پر ڈالا اور دروازہ بند کرکے نکل آیا۔

"کمرے کو مقفل کردینا چاہیئے۔ کہیں وہ پھر باہر نہ نکل آئیں"۔

زکریا حیرت زدہ عورت کے پیچھے پیچھے نیچے کمرے میں چلا گیا۔ وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ یا اللہ اب میری معلمہ مجھے کیا کہتی ہے "شاید آپ خیال کریں کہ میں آپ کو ضرورت سے زیادہ زحمت دے رہی ہوں۔ لیکن میں بالکل حواس باختہ ہوں"۔

زکریا تسلیم کے انداز میں جُھکا اور کرسی عورت کے سامنے رکھ کر سروقد کھڑا رہا۔ دو منٹ سکوت کے بعد عورت بولی "کیا آپ آج دعوت کی تقریب پر میرے خاوند کی حیثیت میں شامل ہو سکتے ہیں"؟

زکریا اپنی زندگی میں کسی بات پر اچنبا ظاہر کرنا انسانی کمزوری کی دلیل سمجھا کرتا ہے مگر یہ تجویز سُن کر اُچھل پڑا۔ پھر سنبھل کر بولا "لیکن اس پارٹ کو انجام تک نبھانا دشوار ہوگا"۔

"بیفکر رہیں۔ ذرا بھی دقت نہیں ہوگی۔ ان میں سے کسی نے بھی میرے خاوند کو نہیں دیکھا۔ آپکا قد میرے خاوند کے قد کے برابر ہے۔ آپکی آنکھیں ذرا زیادہ شوخ اور ناک قدرے موٹی ہے۔ ڈاڑھی لگاکر آپ بالکل میرے خاوند کے مشابہ ہوجائینگے"۔

"ڈاڑھی!"

"میں اپنی ملازمہ کو ابھی آرم جی ماموں جی کی دوکان پر بھیجتی ہوں۔ وہ مصنوعی داڑھی لے آئیگی۔ ابھی مہمانوں کے آنے میں آدھ گھنٹہ باقی ہے"

زکریا نے دیکھا کہ وہ اس کے جواب کی منتظر کھڑی ہے۔ لیکن اپنی زندگی میں پہلی بار زکریا کی زبان جو قینچی کی طرح چلا کرتی ہے۔ خاموش رہ گئی۔ اس نے سوچا۔ مشکلات کا متلاشی تو میں ہمیشہ رہا ہوں۔ لیکن کہیں یہ مشکل آخری نہ ہو۔ کیا یہ عورت اپنے مہمان بُلا کر ان کی تواضع کے لئے مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہی۔ کیونکہ اس کا ذرا سا غمزہ مجھے بھری محفل میں بے داڑھی کر سکتا ہے۔ اس وقت میری کیا حالت ہو گی۔

"خدا کے لئے آپ انکار نہ کریں۔ مجھ پر عجب وقت آپڑا ہے۔ آپ فرشتۂ رحمت بن کر آئے ہیں۔ میری دستگیری کریں تو میں ہمیشہ کے لئے شرم کی زندگی سے بچ جاؤنگی یہ مرحلہ طے ہو جائے۔ تو میں ہارڈنگ کو لے کر بغداد چلی جاؤنگی — وہاں جا کر اسے شراب پینے کا موقعہ نہیں ملیگا۔ لیکن للہ اس وقت میرے پیارے خاوند کو بے آبروئی سے بچائیے"

"میڈم میں ہر طرح حاضر ہوں"

ملازمہ داڑھی لینے گئی۔ زکریا کو ہارڈنگ کا سوٹ پہنا دیا گیا۔ اور روسی عورت نے بڑی محبت کے انداز میں اسے اپنے پاس صوفے پر بٹھا کر اس کے رخساروں پہ اپنی اُنگلیوں سے سرخ روغن ملنا شروع کیا۔ پھر داڑھی اس کے چہرہ پر مڑھ دی گئی زکریا پر جتنے عرصہ تک یہ سحر ہوتا رہا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند رکھیں۔ عورت نے پُر ترنم لہجہ میں اس کا شانہ ہلا کر کہا "ہنری پیارے۔ ہنری باہر مہمان آپکا انتظار کر رہے ہیں" اور یہ کہکر وہ قہقہہ لگاتی اور اپنی ایڑیوں پر ناچتی ہُوئی نیچے اُتر گئی۔

۹ بجے وہ مہمانوں کے کمرے میں داخل ہُوا۔ روسی عورت بولی "گھبراؤ نہیں میں نے سب کو کہدیا ہے۔ کہ تم شام کو اکثر دیر بعد شہر سے آتے ہو اور میرے سامنے عذر کر دیتے ہو۔ کہ میں یکہ توت میں مواجبات وصولی کرنے گیا تھا۔ یہ ہیں میرے چچا جوزوف۔ یہ میری خالہ میریا ہیں۔ یہ میری خالہ زاد ایمیلا کیتھرائن ہیں۔ آبا نے کہلا بھیجا ہے کہ وہ شاید بہت دیر

بعد آئیں۔ اس لئے ان کا انتظار نہ کیا جائے۔ ہنری تم خالہ جان کو راستہ بتاؤ۔ کھانا چُنا گیا ہے"۔
وہ سب دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ ہنری ہارڈ نگ نے بھاری بھرکم نئی خالہ میریا سے اپنے تئیں بے تکلف کرنے کی کوشش کی۔ اس نے میز کے گرد نگاہ دَوڑا کر اپنے دل میں کہا "اف میری بیوی کے رشتہ دار کیسے بدصورت ہیں۔ شکر ہے۔ میرا ان سے سابقہ ایک رات تک ہی ہے"۔
کھانا با افراط اور کئی قسم کا تھا اور چٹنی مربے کی زیادتی نے کھانے کو ایشیائی بنا دیا تھا زکریا کو تعجب تھا کہ کھانے پر تو میری بیوی نے اس قدر اصراف اور نفاست برتی لیکن بیٹر اس نے ایسے بے تمیز رکھے ہیں۔ جو میری طرف یوں گھور رہے ہیں گویا کھا جائینگے۔
زکریا نے خالہ میریا سے کہا "یہ آدمی یا تو بالشویک سپاہی ہے یا پولیس میں رہا ہے دیکھو تو میری بیوی کی کرسی کے پیچھے کیسا تنا کھڑا ہے۔ گویا کہ پہرہ پر کھڑا کیا گیا ہے"۔
خالہ میریا یہ بات سنتے ہی اُچھل پڑیں اور اس تیزی سے سانس لینے لگی کہ زکریا سمجھا اب انہیں غش آیا چاہتا ہے۔ اس نے کہا "خیر یہ تو مذاق تھا۔ لیکن فوج سے اس قدر سپاہی نکل کر آئے ہیں کہ جہاں دیکھو۔ بہرہ۔ ویٹر۔ چپڑاسی۔ سب کے سب سبکدوش شدہ فوجی سپاہی ہی نظر آتا ہے"۔
خالہ میریا نے سنبھل کر کہا "ایسے بھیانک مذاق کے رنگ میں سننے سے مجھے بہت الجھن پیدا ہوتی ہے"۔
زکریا نے بیوی کی خالہ کا خیال چھوڑ کر مہمانوں کی طرف توجہ کی تو دیکھا کہ سب لوگ بے دلی سے کھانا کھا رہے ہیں اور سب سے زیادہ پُرخور اس مجلس میں یا تو زکریا خود تھا یا اس کی نئی بیوی۔ وہ اب اپنے نئے عارضی خسر کے انتظار میں تھا۔ کیونکہ اس کی بیوی نے ایک سے زیادہ دفعہ افسوس ظاہر کیا تھا۔ کہ ابّا ابھی تک نہیں پہنچے ابھی آتے ہی ہونگے۔
زکریا نے سوچا کہ میں تو ایسا خوش نصیب نہیں کہ اس لیڈی کے خاوند بننے کی عزت مجھے دائمی میسر ہو۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ میری بیوی کے رشتہ داروں نے مجھے پسند نہیں کیا

میرے بعد ہارڈنگ کی زندگی اپنی سسرال میں ضرور بے مزہ ہوگی۔

آخر خواتین ہاتھ صاف کرکے دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ اور اب کمرہ تھری کیسل سگریٹ کے دھوئیں سے بھر گیا۔ زکریا کو اپنے مہمانوں سے ایسی نفرت تھی کہ اس نے زور زور سے کش لگا کر اپنے چہرے کے سامنے دھوئیں کی ایک دیوار حائل کردی۔

اسے ابھی سگریٹ سے کھیلتے تین منٹ بھی نہیں ہوئے تھے۔ کہ ہوٹل کے ویٹر واپس کمرے میں داخل ہوئے۔ دو تو دروازہ پر ایستادہ ہو گئے اور تیسرے نے زکریا کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا ”بحکم بادشاہ سلامت ہنری ہارڈنگ میں تمہیں جعل سازی کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں“ زکریا نے مسکرا کر کہا ”شیطان تجھے یہ حوصلہ کس طرح ہوا“ کیونکہ زکریا اس ڈرامے میں اپنا پارٹ خوش اسلوبی سے کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ مہمان گھبراہٹ میں کرسیوں پر گرنے لگے اور اس کے ہاتھوں میں زنجیریں ڈالدی گئیں۔

یورپین سارجنٹ نے کہا ”ولیمز! میں اور ہیبت کھاں“ تو ان کو قابو میں کرلیں گے لیکن بوڑھا کریوال پھر چلمہ دے گیا۔ تم ذرا لیڈی صاحبہ کو حراست میں کرلو۔ ولیمز یہ سن کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ سارجنٹ نے پھر تحکمانہ لہجے میں کہا ”ہیبت کھاں ان سب کے پتے لکھ لو۔

”صاحبان! مجھے آپ سے کچھ سروکار نہیں۔ آپ فقط اپنا پتہ دے جائیں تاکہ ممکن ہے۔ آپ کو شہادت کے لئے بلایا جائے۔

زکریا کی سسرال والے جب سب کانپتے ہوئے اپنے پتے لکھا کر رخصت ہوئے۔ تو اس نے کہا ”اس ڈرامے کا اب خاتمہ ہونا چاہیئے۔ کیا واقعی آپ ہنری ہارڈنگ کو گرفتار کرنے کے لئے آئے ہیں“

”ہاں یہ ہے وارنٹ۔ نہ فقط تمہیں بلکہ تمہاری بیوی مسز ہارڈنگ اور تمہارے ساتھی کریوال کو بھی۔“

”خوب! تو میں آپ کو مطلع کرتا ہوں۔ کہ آپ اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ ہنری ہارڈنگ اگر بھاگ نہیں گیا تو بدستور اوپر کی منزل میں اپنے بستر پر بے ہوش پڑا ہوگا۔“

"اوہ اب تم میرے قابو سے نہیں نکل سکتے۔ تم ہی اس گھر کے مالک ہو اور ہنری ہارڈنگ کے نام سے مشہور رہو۔ میرے پاس تمہاری تصویر ہے"

"کیا آپ میری ڈاڑھی زیادہ غور سے ملاحظہ کر سکتے ہیں؟"

سارجنٹ نے ڈاڑھی کھینچ لی اور کہا "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہاری کیفیت کا آدمی گذشتہ جرائم کی پاداش سے بچنے کے لئے مصنوعی ڈاڑھی لئے پھرے تو کیا عجب ہے"

زکریا اپنی بیگناہی پر مطمئن پولیس والوں کی ذہانت پر دل میں مسکرا رہا تھا"

دوسرا سارجنٹ اتنے میں لیڈی کو گرفتار کر کے لے آیا اور فاتحانہ انداز میں اپنا طپنچہ میز پر رکھ کر خود تن کر کھڑا ہو گیا۔

لیڈی نے قہقہہ لگا کر کہا "واقعی پولیس نے آج تو کمال کر دکھایا۔ اصلی شکار تو مدت ہوئی۔ نکل گیا۔ آپ نے بیگناہ آدمی کو پکڑ رکھا ہے۔ آپ نے اصلی ملزم کی بیوی کو گرفتار کر لیا ہے۔ جس کا آپ کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ جب آپ بطور ویٹر کے میرے پاس آئے تھے۔ تو آپ کو یقین تھا کہ آپ ہارڈنگ اور کریوال کو نہایت سہولت سے گرفتار کر لیں گے لیکن کریوال آسانی سے آپ کے قابو میں آنے والا نہ تھا۔ وہ آپکی سازش سے واقف تھا اور اس نے ہمیں بھی مطلع کر دیا تھا" پھر زکریا کی طرف ملتجی نگاہوں سے مخاطب ہوئی۔

"میں آپکی بیش قدر امداد کے لئے ممنون اور فریب سازی کے لئے شرمسار ہوں۔ مگر میں حفظ جان کے لئے ایسا کرنے پر مجبور تھی۔ آپ کی مہربانی اور خلق سے میں اس قدر متاثر ہوئی تھی۔ کہ اگر آپ کے بغیر گذارہ چل سکتا تو میں کبھی آپ کو تکلیف نہ دیتی۔ میں اپنے دروازہ پر کھڑی اپنے پیغامبر کا بیتابی سے انتظار کر رہی تھی۔ جسے میں نے امداد مہیا کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ کہ اتنے میں آپ نظر پڑے۔ آپکی شکل میرے خاوند سے اس قدر مشابہ تھی کہ بجلی کی طرح میرے دماغ میں موجودہ تدبیر روشن ہو گئی۔ پھر جو کچھ میں نے آپ سے خاوند کے بارے میں کہا۔ وہ محض سازش فریب تھی۔ میرا خاوند نشہ میں نہ تھا۔ بلکہ جب آپ نے اسے مقفل کر دیا اور آپ اس کی جگہ مہمانوں میں آ گئے۔ تو وہ پولیس کی آنکھوں میں خاک جھونک کر بھاگ گیا۔ جو لوگ یہاں میرے رشتہ دار بن کر آئے تھے۔ ان سے محض ہمارا کاروباری

تعلق ہے۔ اور انہیں میں نے بنت اس ڈرامے کے لئے تیار کیا تھا۔ بعض نے اپنا پارٹ ایسی سنجیدگی سے کیا کہ آپ کے دل میں شاید شبہ پیدا ہُوا ہو۔ میرا باپ جو آخری وقت تک نہ پہنچا۔ حقیقت میں میرے خاوند کا دوست کریوال تھا۔ میں اس کے متعلق بے تابی اور انتظار کا اظہار اس لئے بھی کر رہی تھی کہ مہلت پا کر دونوں ملزم پولیس کے چنگل سے نکل جائیں اور دوسرے کریوال کو گرفتار کرنے کی ہوس نے سراغرساں ویٹرؔوں کو بہ تعجیل مجلس درہم برہم کرنے سے باز رکھا۔ اب وہ دونوں پولیس کے ہاتھ سے بالکل محفوظ ہیں۔ آپ مطمئن رہیں۔ آپکا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ میرے قصور کو بخشدیں "

"میڈم میں آپ کے حیرت انگیز فسانہ باف دماغ اور ایکٹ کرنے کی قابلیت پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں "

اب لیڈی نے اپنی شربتی شوخ آنکھیں حجاب سے نیچے جھکالیں اور پولیس سے یوں مخاطب ہوئی۔

" آپ یقین کریں۔ اگر اسوقت آپکی ناحق کی زحمت کا کوئی ذمہ وار ہے۔ تو فقط میں اس جنٹلمین کا کوئی قصور نہیں "

لیکن پولیس زکریا کو بغیر اپنا کامل اطمینان کئے کب چھوڑنے والی تھی۔ بیچارے کو تمام رات اسی مکان میں پولیس کے پہرے میں گذارنی پڑی۔ صبح کو اس کا پتہ لکھ کر اسے رخصت کیا گیا۔ پشاور میں رہ کر ہنگامہ کی تلاش کا یہ پہلا تجربہ تھا۔

(ماخوذ)

چمنستان

جلوۂ ربانی

خداکم ظرف لوگوں کو اپنا جلوہ نہیں دکھاتا! وہ جو راستی کا طالب ہے اپنے ضمیر کی آوازوں کو کان دھر کے سُنتا ہے اور دُوسروں کے طریقِ عبادت سے متاثر نہیں ہوتا۔ بلکہ اُن کی نمازیں اُسے دُکھ دیتی ہیں جب تک وہ خود دست بدعا نہ ہو لے" رُوح اپنے خلاف دادرسی کے لئے کبھی دستِ گدائی دراز نہیں کرتی + ہمارے مذہب اپنے ماننے والوں کی تعداد پر نازاں ہیں۔ جب کبھی تعداد کا ذکر فخریہ طور پر ہوتا ہے (خواہ وہ ذکر کسی پیرائے میں کیوں نہ ہو) تو گویا یہ صاف صاف اعلان کر دیا جاتا ہے کہ مذہب مٹ چکا + وہ جو خدا کو ایک شیریں مستغرق کرنے والا خیال تصور کرتا ہے کبھی مصاحبت یا غیروں کی اعانت کا خواہاں نہیں ہوتا۔ جب میں اُس خلوت میں بیٹھا ہوں تو کس کی جرأت ہے کہ اُس گھڑی میں خلل اندازِ محبت ہو۔ جب میں انکسار سے سرشار ہوں جب میں سچی محبت سے سوزاں ہوں تو بڑے سے بڑا مصلح یا سچے سے سچا ولی کیا کہہ سکتا ہے؟

اپنی دُنیا

میں آج صبح بیدار ہو کر اپنے پُرانے اور نئے دوستوں کی محبت کے شکریہ میں دست بدعا ہو گیا" میں خدائے عزوجل کو کیوں حسن کا پُتلا نہ کہوں جب وہ مجھے ہر روز اپنی بخششوں میں اپنی حُسن آفرینی کے کرشمے دکھاتا رہتا ہے! میں بزم آرائی سے متنفر ہوں، میں خاموشی اور تنہائی کا دلدادہ ہوں۔ تاہم میں ایسا قدر ناشناس اور خودکار نہیں کہ میرے دریچے کے سامنے جو عقلمند۔ جو شکیل اور جو نیک سرشت لوگ گذرتے رہتے ہیں اُن کی خردمندی اور عالی وقاری کو قدر و منزلت کی نگاہوں سے نہ دیکھوں۔

جو میری سنتا ہے اور مجھے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے وہ میرا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے صرف میرا ہو جاتا ہے!

اور نہ قدرت کچھ ایسی کم مایہ ہے بلکہ وہ بارہا مجھے یہ خوشیاں دیتی ہے اور اس طرح ہم اک ایسا حلقۂ معاشرت قائم کر لیتے ہیں جو تعلقات کا ایک وسیع دائرہ بن جاتا ہے۔ اور جوں جوں یہ نت نئے خیالات یکے بعد دیگرے ہمارے دل میں رُو نما ہونگے ہم بتدریج اپنے تئیں اک اپنی بنائی ہوئی نئی دُنیا میں پائیں گے۔ ہم اک پُرانی اور دقیانوسی دُنیا میں اجنبی اور مسافر بن کر آوارہ و سرگرداں نہ رہیں گے!!

قُدرت اور فطرت

قدرت ہماری فطرت کے بہترین جزو کو پیاری ہے! وہ ہمیں پیاری ہے کیونکہ وہ خدا کی بستی ہے اگرچہ یا غالباً اس لئے کہ رہنے والا اُس میں کوئی نہیں + کیا دُنیا میں کوئی شے غروبِ آفتاب کی خوبی کو پہنچ سکتی ہے؟ البتہ اُس کے نظارے کے لئے سچے انسانوں کی ضرورت ہے! اور بلا شبہ قُدرت کا حُسن ہمیشہ غیر حقیقی اور مضحکہ خیز معلوم ہوگا۔ جب تک اُس کے مناظر میں ایسی ہستیاں موجود نہ ہوں جو اُس کی سی نیکی رکھتی ہوں۔ اگر نیک آدمی ہماری دُنیا میں کثرت سے ہوں تو قدرت میں یہ خلا کبھی محسوس نہ ہو!

جادۂ زرّیں

آہ! کس قدر شیریں اور کیف آور ہوتی ہے وہ گھڑی جب دن کی روشنی مدھم پڑ جاتی ہے اور مہرِ جہانتاب کی سنہری کرنیں بحرِ خاموش کی ساکن سطح پر اپنا الوداعی رقص کرتی ہوئی غائب ہو جاتی ہیں! کہ اُس وقت گئے گذرے دنوں کے پیارے خواب دل میں ننھی لہروں کی طرح اُٹھتے ہیں اور شام کے اُس خاموش دھندلکے میں مَیں تجھے چپکے چپکے یاد کیا کرتا ہوں!! —— اور جب میں اُس ضیاء آخریں کو جو مغرب سوزاں کی سمت سکوں پذیر موجوں سے کھیلتی ہے ٹکٹکی باندھے دیکھتا ہوں تو میرا غمگین دل شعاعوں

کے اُس جادۂ زریں کو طے کرنے کی اُمنگ سے لبریز ہو جاتا ہے کہ شاید اسی طرح وہ کسی درخشاں جزیرے میں پہنچ کر سکون و اطمینان کی نعمت کو پالے ! آہ !

خاموشی

جُملۂ قدیم کہتا ہے "خاموش! کہ خدا بھی خاموش ہے!" خاموشی شخصیت کو حل کر دیتی ہے اور ہمیں عظمت اور ہمہ گیری سے دوچار کر دیتی ہے !

پرندہ گیت گاتا ہے !

پرندہ گیت گاتا ہے شب و روز — کہ ہوتا کاش میں ابرِ گہر بار
اُدھر ہے ابر کو ہر دم یہ رونا — پرندوں کی سی ہوتی میری چہکار
نہیں ہے مطمئن ہستی سے کوئی — ہر اک دل زندگانی سے ہے بیزار
کسی کو کب ملی دُنیا میں تسکین — گلوں کے دل میں بھی چبھتا رہا خار
کِسی کے حال کو سمجھا نہ کوئی — ہیں سب اپنے خیالوں میں گرفتار
ہر اک کو دہر کے عشرت کدے میں — نظر آتی ہے اپنی حالتِ زار

نغمات

مُجھے حکم دے کہ میں اپنے پھلوں کو خوشنما ٹوکریوں میں اکٹھا کر کے تیرے صحن میں لے آؤں اگرچہ اُن میں کچھ تو ضائع ہو چکے ہیں اور کچھ ہنوز خام ہیں! کیونکہ بہار اپنی پختگی کے ساتھ بوجھل ہو چلی ہے اور سائے میں چرواہے کی بانسری کی غم بھری آواز سُنائی دیتی ہے۔

مجھے حُکم دے کہ میں دریا پر اپنے بادبان کو پھیلا دوں، بہار کی ہوائیں غصّے سے بھری ہوئی ننھی لہروں سے پُر شکایت آوازیں نکال رہی ہیں!" چمن اپنا سارا خرمن لُٹا چُکا ہے اور شام کی مضمحل ساعت میں غروبِ آفتاب کے وقت اُس ساحل پر تیرے

گھر سے ندا آ رہی ہے !

بہار کا تیوہار کیا صرف تازہ شگوفوں ہی کیواسطے ہے؟ کیا وہ مُرجھائے ہُوئے پتّوں اور پژمردہ پھُولوں کے لئے نہیں ؟ کیا سمندر کا گیت صرف اُٹھتی ہُوئی موجوں ہی کا ہم نوا ہے ؟ کیا وہ گرنے والی لہروں کے ساتھ نغمہ زن نہیں ہوتا ؟ ؟

قالین ہیروں سے پرویا ہُوا ہے جہاں میرا بادشاہ ایستادہ ہے لیکن کئی مٹی کے ڈھیلے بھی صبر کے ساتھ اس انتظار میں ہیں کہ وہ اُن کو اپنے پاؤں سے چھُو دے "

صرف چند ہی عاقل و فرزانہ میرے آقا کے پاس حقِ نشست رکھتے ہیں لیکن نادانوں کو اُس نے اپنے پہلو میں جگہ دی ہے اور مجھے ہمیشہ کے لئے اپنا خادم بنا لیا ہے ؟

جہاں رستے بنائے جاتے ہیں میں اپنا رستہ بھُول جاتا ہوں ! وسیع پانیوں میں، نیلے آسمان میں کہیں کسی رستے کا نشان تک بھی نہیں۔ راہ تو پرندوں کے پروں، تاروں کی روشنیوں، جاتی بہاروں کے پھُولوں سے مستور ہے اور میں اپنے دل سے پوچھتا ہوں کہ کیا تیرے خُون میں اُس اَن دیکھی راہ کی پہچان موجود ہے ؟

اے میرے دل ! تُو اپنی کشتی ڈال دے اور اُنہیں لنگر انداز رہنے دے جو رہیں ! کیونکہ تیرا نام آسمانِ سحر میں پُکارا جا چُکا ہے تُو کسی کا انتظار نہ کر" کلی رات اور شبنم کو چاہتی ہے لیکن شگفتہ پھول آزادیٔ نور کا طالب ہے۔ اسے میرے دل ! تو اپنے قبضۂ حیات کو توڑ دے اور باہر نکل آ !

گلچیں

نغمۂ محبت

شام کے پُرسکون گھنٹوں میں اُس نے اپنے "ستار" کے تاروں کو ایک خفیف سی جنبش دی، فضائے خاموش میں ایک اضطراری کیفیت پیدا ہو گئی، اور اُسکے دلکش نغموں کی آوازیں ہوا کے دامن سے کھیلتی ہُوئی میری پژمردہ تمناؤں کو چھیڑنے لگیں

کائنات کا ذرہ ذرہ خاموش ہو گیا اور نسیم سحر کے جھونکے عالم بے اختیاری میں اُسکی صبر سوز آواز پر نثار ہونے لگے وہ گاتی رہی اور میری روح کیف ترنم سے مست ہوتی رہی،

وہ خاموش ہو گئی اور اُس کے خاموش ہوتے ہی میں بے چین

بُلبل نے ترانۂ دل آویز چھیڑا لیکن میں نے اس سے کہدیا کہ تیری نغمہ سرائی میری روح کو خوش نہیں کرسکتی۔ کوئل اپنے حیات سوز لہجے میں دل کھول کر کوکی، لیکن میں نے کہا، یہ مجھے پسند نہیں،

مور نے جھنکار لی، اسکی آواز فضائے بسیط اور پہاڑیوں کے نشیب و فراز میں دیر تک گونجتی رہی، لیکن میں نے اُسے بھی ناپسند کیا اور اس انتظار میں بیٹھا رہا کہ شاید وہ اپنی نرم و نازک اُنگلیوں کو حرکت دیکر ستار کے زریں تاروں کو چھیڑے، اور اُسکے ترنم ریز نغمے ایک مرتبہ پھر فضا میں ہلچل ڈالدیں . . . . لیکن آہ وہ اپنے سر کو جھکائے خاموش ہی رہی،

دفعتاً اُس نے اپنے ستار کو پھر چھیڑا، کائنات کانپنے لگی، نغمۂ مغموم نے ساز کا ساتھ دیا، سوز نے درد اور درد نے تاثیر پیدا کی اور گاتے گاتے اُسکی آنکھیں پُرنم ہو گئیں، آنکھوں کا کاجل آنسوؤں کے ساتھ مل کر اُس کے گلابی رُخساروں پر پھیل گیا، اور وہ اُسی درد آمیز لہجے میں گاتی رہی اور میرا دل اُس کی آنکھوں کے ساتھ روتا رہا۔

یہانتک کہ تارے سپیدۂ سحر میں ڈوب گئے اور آسمان صاف، آفتاب طلوع ہُوا، سُنہری کرنیں بڑھیں اور ہلکی ہلکی روشنی جنگل کے اونچے اونچے درختوں اور شہر کے بلند میناروں پر پڑنے لگی، چڑیوں نے اپنے آشیانوں سے سر نکالے اور اُڑ گئیں لیکن وہ اُسی طرح گاتی رہی،

میں سُنتا رہا اور سُنتے سُنتے بیہوش ہو گیا، جب مجھے ہوش آیا تو وہاں ایک خاموشی چھائی ہُوئی تھی اور وہ نغمہ پرست "جوگن" اپنا ستار لیکر جا چکی تھی ❊

سید ابو محمد ثاقب کانپوری

محفلِ ادب

محمد علیؓ کی یاد میں

اے پردہ کشائے حسنِ عرفان — اے جلوہ دہِ ہلالِ احمر
صدقے تری جاں نثاریوں کے — فطرت کا بدل دیا ہے منظر
جو رنگ ہے تیری زندگی کا — آزادئ روح کا ہے مظہر
پامال ہے یوں جو کفر و باطل — یہ تیرے خلوص کی ہے ٹھوکر
لرزاں تری خاکساریوں سے — بنیادِ غرور و فتنہ و شر
ہر موجِ نفس میں تیری پنہاں — سرمستئ موجِ جامِ کوثر
کاشانۂ زندگی میں تیرے — قندیلِ حرم ہے جلوہ گستر
آئینۂ جان کا تیرے صیقل — خاکِ درِ ملتِ پیمبر
یہ چہرۂ تابناک تیرا — فردوسِ ارم کا اک گلِ تر
لبریزِ گداز ہے ترا دل — سرشارِ نیاز ہے ترا سر
ہے تیری نوائے حریت سے — معمور فضائے ہفت کشور
آتشکدۂ حیات تیرا — ہے سوزِ بلالؓ سے منوّر
ہے ذوقِ فنا پہ تیرے نازاں — جانبازئ کشتگانِ خیبر
دُنیا کو دکھا دیا ہے تونے — توحید کا پُر جلال منظر
ہے اس میں نہاں حیاتِ مُسلم — کُل ہے یہی کائناتِ مُسلم
اے جلوہ فزائے بزمِ ہستی — اے مایۂ نازشِ زمانہ
لایا ہے ازل سے تو اسیری — تیرا ہے قفس ہی آشیانہ
تو لاکھ شکست کھائے لیکن — انداز ترا ہے فاتحانہ
سرمایۂ تقویت ہے تیرا — عدلِ عمریؓ کا تازیانہ
ہر پیروِ دینِ احمدی سے — رشتہ ہے ترا برادرانہ
ہے مایۂ کیفِ روح تیرا — توحیدِ خلیل کا ترانہ
پھر یاد دلا دیا ہے تونے — سلمانؓ و صہیبؓ کا فسانہ
ہے تیری جبینِ آرزو کا — صحرائے حجاز، آستانہ
جو جامِ شرابِ آگہی ہے — سرچشمۂ کیفِ معنوی ہے
اے لمعہ فروزِ برقِ ایمان — اے آفتِ خرمنِ ستمگر
سرمایۂ نازشِ خرد ہے — تیرا یہ جنونِ رُوح پرور
وہ رُوحِ حیاتِ جاوداں ہے — جو درد ہے تیرے دل کے اندر
ایمان کی تیرے ٹھوکروں سے — رعنائی کفر ہے نگوں سر
ہے ولولۂ خلوص تیرا — آغوشِ ستم کا ناز پرور
دنیا کے جلالِ ظاہری سے — ہے شان تری بلند و برتر
تو خسروِ بوریا نشین ہے — ہے ننگ تجھے کلاہ و افسر
ہمت ترے قلبِ ناتواں کی — غیرت دہِ قیصر و سکندر
اک نعرہ ترے شکستہ دل کا — برہم زنِ صد ہزار لشکر
محرومِ وطن ہے گرچہ لیکن — ہر دیدۂ تر میں ہے ترا گھر
ایثار ترا، تری سپر ہے — بیکار ہے سعئ تیغ و خنجر
کیا خوفِ عدو ہو تجھ پہ طاری — خود رحمتِ حق ہے تیری یاور
تبلیغ پیامِ راستی ہے — کل سعی و عمل کا تیرے محور
تو تشنۂ ذوق ہے اسی کا — مقصود یہی ہے زندگی کا

(معارف)

یورپ اور ڈیماکریسی۔ ڈیماکریسی کی مختلف طور سے تعریف کی گئی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ اُس طرز حکومت کا نام ہے جس میں مدارِ حکومت کثرتِ رائے پر ہو۔ بعضوں کے نزدیک اس طرز حکومت کو ڈیماکریسی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ جس میں مزدوری پیشہ جماعت کے فوائد و حقوق کا خاص طور سے لحاظ کیا جاوے لیکن حقیقت میں یہ دونوں تعریفیں سطحی ہیں اور ڈیماکریسی کے اصل مفہوم سے بہت دُور ہیں اپنے وسیع ترین، عمیق ترین اور بلیغ ترین معنی میں ڈیماکریسی سوسائٹی کی ایک عام کیفیت کا نام ہے۔ اُسکی ابتدا نہ تو کسی ایک فرمان شاہی سے ہو سکتی ہے اور نہ جمہور کی متفقہ رائے سے بلکہ اسکے اسباب بتدریج خود سوسائٹی میں پیدا ہوتے ہیں اس لئے سوسائٹی کی وہ حالت جسکو ڈیماکریسی کا نام دیا گیا ہے محض اُس طرز حکومت ہی تک نہیں موقوف ہے جو مجوزۂ جمہور ہو بلکہ اُس حالت میں سیاسی ترقی کے ساتھ ہی ساتھ اخلاقی، سوشل، معاشرتی (اقتصادی) اور روحانی ترقی بھی شامل ہیں۔ اگر بنظرِ غور دیکھا جائے تو گذشتہ صدی کے اندر دنیا کی حالت میں نئے انکشافات نے ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے۔ ڈیماکریسی، قومیت، سوشلزم، مذہب سوسائٹی غرض ہر شعبہ زندگی حیرت انگیز انقلابی کشش کے زیر اثر رہا ہے۔ سائنس نے پیداوار میں نیا اضافہ کر دیا، باربرداری میں آسانیاں پیدا کر دیں آمد و رفت کے سلسلوں کو انتہائی ترقی دیدی، سونے کو پارہ کی طرح اکناف عالم میں بہا دیا، اور آباد کرۂ ارض میں ایسا زبردست تغیر پیدا کر دیا ہے کہ ایک صدی قبل یہ تغیر معجزہ خیال کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ خواہ اس دور ترقی میں "حریت" کے خیال کو کیسی ہی تقویت دی گئی ہو اور کیسا ہی نقصان پہنچا ہو لیکن "اخوت" کا خیال اقوام متمدنہ کے دماغ سے اتنا ہی دُور رہا جتنا کہ انقلاب فرانس سے قبل تھا۔ دُنیا میں اقتصادی انقلاب نے اقوام کے مقابلہ کو ایک دوسری صورت دیدی ہے، توپ و تفنگ، گولہ بارود، بم اور زہریلی گیس، ڈریڈناٹ اور آبدوز کشتیاں تو مجبوری کی چیزیں ہیں۔ تجارت کے ذریعہ سے اقوام کو محض شکست دینے کی ترکیب نہیں معلوم ہوتی ہے بلکہ یہ انکو تباہ کرنیکا ذریعہ ہے متمدن اقوام کے دوسری اقوام سے جو تعلقات ہیں اُن سے قطع نظر خود انکی اندرونی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ یورپ و امریکہ میں بڑی بڑی آزاد سلطنتیں قائم ہیں جنکو اپنی جمہوریت پر ناز ہے لیکن وہاں بھی بادی النظر میں جو ہمکو جمہور کی متفقہ رائے معلوم ہوتی ہے۔ وہ دراصل کسی معشوق پس پردہ زنگاری کے چشم و ابرو کا اشارہ ہے اور جسے ہم ڈیماکریسی کی نورانی اور قابل نمایش دیوی سمجھ کر دوزانو ہوتے اور اپنا سر تسلیم خم کرتے ہیں وہ دراصل الہ دین کے چراغ کا موکل ہے جو یورپ و امریکہ کے مہاجنوں کے احکامات کا تابع ہے! ڈیماکریسی کا نہ اپنا جسم ہے نہ اسکے ذاتی ہاتھ پیر بلکہ سارا کام بنکوں کے نوٹوں اور مہاجنوں کی زرپاشی کا ہے! یورپ اور امریکہ کا حال بیان کرنے سے میرا

منشاء یہ تھا کہ یورپ اور امریکہ کی سلطنتیں آزاد طرز حکومت کے عظیم ترین تجربات ہیں تاہم اُنکی اندرونی حالت پر اگر غور کیا جائے تو ڈیماکریسی کے اصل مفہوم سے وہ بھی دُور ہیں اگر اُنکو شخصی حکومت نہیں کہا جا سکتا تو چند اشخاص کی یا بالفاظ دیگر "دولت" کی حکومت کہنا چنداں بیجا نہیں۔

(زمانہ)

تنقید کا منتہائے مقصود۔ تنقید نگاری کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ جس تصنیف کی تعریف کی جائے اُس کا مصنف اُسی قسم کا مزید عمدہ اور قابل قدر لٹریچر تیار کرنیکی طرف راغب ہو۔ نیز دیگر ہمعصر مصنفین کو بھی اپنی کتب میں اُسی قسم کی دلکشی اور رنگینی لانے کا خیال پیدا ہو۔ اسی طرح نقائص دکھانے کا واحد منشا یہ ہے۔ اور یہی ہونا چاہیئے۔ کہ مصنف آئندہ کو ان نقائص سے احتراز کرے۔ اور دوسرے مصنف اُن غلطیوں سے بچ سکیں۔ لیکن اگر کوئی کتاب صرف مجموعۂ لغویات ہو اور اُس میں سوائے اسقام اور خامیوں کے کوئی خوبی نہ ہو۔ تو نقاد کے لئے لازم ہے کہ اُس پر ایسی زوردار تنقید کرے کہ اُسکے مصنف کو دوبارہ قلم اُٹھانے کی جرأت نہ ہو سکے۔ اور لٹریچر خراب نہ ہونے پائے لیکن زمانۂ حال کی تنقید نگاری میں جو طریقۂ تحریر استعمال کیا جاتا ہے۔ اُس کا مدعا محض مصنف کی مخالفت ہوتا ہے۔ اور تنقید کا ہر ایک لفظ زبان حال سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ حضرت نقاد کے دل میں مصنف کتاب کے خلاف کینہ بھرا ہُوا ہے۔ اس قسم کی تحریروں سے تنقید کا مدعا کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ مصنف کتاب فوراً سمجھ لیتا ہے کہ تنقید کرنیوالا میرا بدخواہ ہے اور اُس کا مقصد مجھے ضرر پہنچانا ہے۔ حالانکہ تنقید کی زبان اس قسم کی ہمدردانہ اور ملائم ہونی چاہیئے۔ کہ مصنف کے دل پر تاثیر ہو اور یہ خیال اُسکے ذہن میں یقین بن کر بیٹھ جائے، کہ نقاد میرا بہی خواہ ہے اور میری تصنیف میں خامیاں دیکھ کر اُسے قلق ہُوا ہے۔

مادھری لکھنؤ (ہندی)

آنسو سے۔ اے پانی کے گرم قطرے! تونے موت کی مانند سرد اور اُمید کی طرح طویل آہ کے ساتھ باہر آکر کیا پایا؟ ذراسی بات برداشت نہ کرسکا۔ آپ بے صبر بنا، مجھے بے صبر بنایا اور آخر اپنی آبرو کھو بیٹھا۔

تو نرم دل کے نازکترین حصہ میں پیدا ہُوا۔ پھر تیری طبیعت ایسی جلد باز اور گرم کیوں ہو گئی۔ تونے آنکھ میں آکر کونسا دردانگیز منظر دیکھا۔ جس سے پانی پانی ہو کر بہ گیا۔ ظالم تونے دل کا عرق نکال لیا۔ کیا آنکھوں کی چمک بجھانے کا ارادہ تھا؟

ٹھیر اے آنسو کے درخشاں قطرے ٹھیر۔ میرے دل کی اُمید بر آلینے دے۔ میرا مقصد پورا ہو لینے دے پھر آنکھوں سے نکل جانا، اور نکلتے وقت اپنے

ساتھ قوتِ بینائی بھی لئے جانا۔ کیونکہ اُس وقت مجھے کچھ اور دیکھنے کی خواہش نہ رہیگی۔ گر تو نے میری آہ وزاری نہ سُنی، اور آنکھوں سے نکل کر خاک میں کود پڑا،

تو میری مرحوم بیوی کی یاد کی، مانند شیریں تھا۔ تو میرے معصوم بچے کے حسین پتلے ہونٹوں پر کھیلنے والی مسکراہٹ کی طرح سنجیدہ اور سمندری طوفان کی طرح وحشی مزاج تھا

پربھاکا نپور (ہندی)

بدنصیب بیوہ۔ وہ حسین تھی، اسکی آنکھیں خمار آلودہ تھیں، اُس کا چہرہ چودھویں کا چاند تھا۔ اُس کا قد رعنائی کا نادر نمونہ تھا،

مگر وہ بدنصیب تھی، وہ بیوہ تھی،

ایک دن وہ مندر میں گئی۔ دیوی نے خوش ہو کر کہا۔ تو جو کچھ مانگیگی، میں تجھے دونگی۔ تیری بھگتی نے میرا دل ہلا دیا ہے،

اُس نے دولت کا مطالبہ نہیں کیا؟ اُس نے صحت کا عطیہ نہیں مانگا۔ اُس نے حکومت کی خواہش نہیں کی۔

وہ بدنصیب تھی ——— بیوہ تھی

اُس نے اپنا پھول سا چہرہ حسین ادا کے ساتھ اوپر اُٹھایا اور لرزتے ہُوئے ہونٹوں سے کہا حُسن، میری عمر، میری قدر و منزلت، میری مسرت سب کچھ لے لو میں اور کچھ نہیں چاہتی

دیوی نے حیرت سے دریافت کیا "یہ الفاظ تو ...."

ہاں میں نے کہے ہیں۔ کیونکہ میں ہندو بیوہ ہوں"

دیوی نے اُس پر رحم کیا۔ اور اپنی سنگین اُنگلی سے موت کے فرشتے کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا،

صبح ہُوئی لوگ اُس کے لاشے پر اشکباری کر رہے تھے۔ وہی لوگ جو اُسکی زندگی میں اُسکو دیکھ کر چراغ پا ہو جاتے تھے

وہ اب خوش قسمت تھی ——— موت نے اُسکی جان کے ساتھ ہی اُسکی بدنصیبی کو بھی قبض کر لیا تھا۔

واسومتی (بنگالی)

تو خود میرے پاس آگیا۔ وقت ہو گیا، مجھے چلنے کی فکر ہُوئی۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک سال بن گیا۔ میرے جسم کے بال بال میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔

میرے دوست رو رہے تھے، اُنکی آنکھیں میری طرف التجا بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ میرے پاؤں میں زنجیریں پڑ گئیں۔ مگر شوقِ دیدار اور ذوقِ وصل نے اُنکو پاش پاش کر کے زمین پر بکھیر دیا۔ اور میں روانہ ہونے کو کھڑا ہو گیا۔

یکا یک میرا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ دیکھتا کیا ہوں۔ کہ ایک حسین اجنبی میری طرف تحفوں سے لدا ہُوا آ رہا ہے۔ اور جب وہ قریب آیا، تو میں حیرت سے ساکت رہ گیا وہ اجنبی تو تھا۔

وار تا بمبئی (گوجراتی)

انجمن دانشوران۔ شیراز کے اہل قلم نے ادبیاتِ ایران کی ترقی و شعرائے سلف کے کلام کے تحفظ کی غرض سے "انجمن دانشوران" کے نام سے ایک مجلس ادبیہ قائم کی ہے۔ "معاصر عصر آزادی" شیراز اس خبر کو درج کر کے اظہار مسرت کرتا

ہُوا لکھتا ہے کہ انقلاب ادبی ہی ایران کو شاہراہ آزادی و ترقی پر پہنچا سکیگا۔

عصر آزادی شیراز (فارسی)

بہترین افسانہ ہم نے انگلستان کے مشہور افسانہ نویس اصحاب سے استفسار کیا تھا کہ اُنکے افسانوں میں بہترین افسانہ کونسا ہے۔ اور اُسے بہترین قرار دینے کی اُنکے پاس کیا وجوہات ہیں۔ اسکے جو جوابات موصول ہُوئے ہیں اُن میں سے بعض حسب ذیل ہیں:-

۱۔ میرے افسانوں میں بہترین افسانہ "بچہ" ہے۔ کیونکہ اُسے میری بیوی پسند کرتی ہے۔

۲۔ میرا بہترین افسانہ "چاندیں" ہے۔ کیونکہ اُس پر مجھے زیادہ سے زیادہ اُجرت موصول ہُوئی ہے۔

۳۔ میرے خیال میں میرا بہترین افسانہ وہ ہوگا۔ جسے میں تاحال ختم نہیں کرسکا۔ اور جسے لکھنے کی متواتر کئی سال سے سعی کر رہا ہوں۔ یہ افسانہ اس قدر خوبصورت ہوگا۔ کہ میں اُسکے لئے الفاظ نہیں ڈھونڈھ سکا۔ جو کام جتنا زیادہ وقت صرف کراتا ہے۔ وہ اتنا ہی زیادہ پائدار ہوتا ہے۔

۴۔ میرا بہترین افسانہ وہ ہے جو میں نے سب سے پہلے لکھا تھا۔ کیونکہ اُسی کی بدولت میں آج افسانہ نویسوں کی صف اولیں میں شمار ہوتا ہوں۔ محسن کُشی گناہ عظیم ہے۔ میں اُس پہلے قصے کو جذبۂ احترام سے دیکھنا اپنا لازمی فرض سمجھتا ہوں جو میری شہرت کا سنگ بنیاد ثابت ہُوا ہے۔

۵۔ میرے خیال میں بہترین افسانہ وہ ہے جو مختصر ہو اور پُر تاثیر ہو ——— میرا بہترین افسانہ "راگی" ہے۔ جو پندرہ سطروں میں ختم ہو جاتا ہے۔ مگر یہ اختصار اس قدر منجمد ہے کہ اسکی فصاحت کے لئے دو درجن تصاویر بھی ناکافی ہونگی۔

۶۔ میرا بہترین افسانہ وہ ہے۔ جو میں نے ایک ننھے معصوم بچے کو ماں کی لاش کے ساتھ چمٹے ہُوئے دیکھ کر چلتی گاڑی میں قلمبند کیا تھا اور جس پر مہینوں تنقید ہوتی رہی تھی۔

۷۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرا بہترین افسانہ ابھی لکھا جانیوالا ہے۔ جب لکھوں گا، اطلاع دونگا۔

۸۔ میرا ہر ایک افسانہ بہترین ہے ——— باپ کی نگاہ میں اُسکے تمام بچے یکساں خوبصورت ہوتے ہیں۔

۹۔ یہ فیصلہ کرنا میرا نہیں۔ آپ کا کام ہے۔ جب آپ فیصلہ کریں۔ تو مجھے ضرور مطلع کریں۔ میں اُس افسانے کو دوبارہ پڑھوں گا۔ اور دیکھوں گا۔ کہ اُس میں کون کون سی خوبیاں ہیں۔

۱۰۔ میرا بہترین افسانہ وہ ہے۔ جو کسی رسالہ نے شائع نہیں کیا۔ کیونکہ اُسکی عمدگی کو سمجھنے کا مادہ کسی میں بھی نہ تھا۔

۱۱۔ میرے افسانوں میں بہترین ایک بھی نہیں کم از کم میرا یہی خیال ہے۔

گرینڈ میگزین (لنڈن)

حصۂ نظم

شمعِ خاموش

فتیلہ سوز تھی جب تک شریکِ محفل تھی
مری حیات حقیقت میں آتشِ دل تھی

مرا جمالِ دل افروز دل کے سوز سے تھا
مرا وہ حسنِ گلو سوز دل کے سوز سے تھا

رہینِ منتِ سوزِ دروں تھا نور مرا
تپش کے فیض سے شعلہ فشاں تھا طور مرا

فروغِ حسن سراپا ظہورِ آتش تھا
غرورِ حسن کہاں تھا؟ غرورِ آتش تھا

یہ میری ذات پہ کب مرمٹے تھے پروانے؟
وہ خود بھی سوز تھے اور سوز کے تھے دیوانے

اُنہیں تو عشق مرے سوز جانگداز سے تھا
تعشق اُن کا مری اس متاعِ ناز سے تھا۔

متاعِ ناز لٹی جب سے ناز بھول گئی
وہ تار ٹوٹا کہ آہنگِ ساز بھول گئی

امین حزین

زمزمۂ حمد

بھڑکا رہا ہے دل کو سوز و گداز تیرا
نالوں سے ہو نہ جائے افشائے راز تیرا

مایوس کیوں ہو؟ بندہ اے کارساز! تیرا
رہتا ہے بابِ رحمت ہر وقت باز تیرا

ذرے کو خور بنا دے، "قطرے کو دُر بنا دے"
فیضانِ لم یزل ہے عالم نواز تیرا

بندے ہی جانتے ہیں لذت جزا سزا کی
یہ بھی ہے "ناز تیرا" وہ بھی ہے ناز تیرا

کون و مکاں میں گونجے توحید کے ترانے
مضرابِ کن نے چھیڑا جس وقت ساز تیرا

شرطِ قبولیت بھی لازم ہے بندگی کو
ہوں ورنہ میں بھی بندہ اے بے نیاز تیرا

ظاہر پرست روئیں کوتاہی نظر کو
میں جانتا ہوں جلوہ ہے دلنواز تیرا

لذت ملی اُسی کو جس نے چھپائے رکھا
سینے میں سوز تیرا دل میں گداز تیرا

کرتے ہیں سر جھکا کر سجدہ حریم دل کو ۔۔ گھر خوب جانتے ہیں اہل نیاز تیرا
اُٹھتا نہیں نظر سے جب تک حجابِ ہستی" ۔۔ کھلتا نہیں کسی پر سربستہ راز تیرا

پیش نظر ہو ندرت خود شاہد حقیقی
پردہ اگر اُٹھا دے عشق مجاز تیرا

ندرت میرٹھی

شورشِ حیات

سر بھی کٹ جائے تو جاتا نہیں سودائے حیات ۔۔ دو جہاں گیر ہے اک گیسوئے لیلائے حیات
ایک فانوس ہے اِنسان کا خاکی پیکر ۔۔ شمع فانوس ہے یہ عارضِ زیبائے حیات
تودۂ خاک بھی انسان کو کہہ دیتے ہیں ۔۔ اور اِسی خاک میں دیکھا ہے تماشائے حیات
ہر تڑپ دل کی ہے اک گام کی صورت غافل ۔۔ سوئے منزل ہے رواں ناقۂ لیلائے حیات
آگیا ہاتھ جو تقدیر سے گلگونۂ عشق ۔۔ اور پُر نور ہُوا عارضِ زیبائے حیات
لن ترانی کی صدا کان میں آتی ہی رہی ۔۔ عالم ہوش میں جب تک رہا موسائے حیات
کھول کر آنکھ ذرا دیکھ تو او تنگ نظر! ۔۔ بیضۂ مور پہ لکھا ہے سراپائے حیات
پھر وہ کیوں سنگِ درِ غیر پہ ہو سر بسجود ۔۔ جب ترے نور سے معمور ہے سیمائے حیات
آگیا مسلم جاں باز کا بر وقت خیال ۔۔ عرصۂ زیست میں جسکو نہیں پروائے حیات
ایک وہ ہیں کہ دل و جاں سے ہیں شیدائے حیات ۔۔ ایک تو ہے کہ نہیں تجھکو تمنائے حیات
مقتلِ عشق میں یوں جان کو رکھتا نہ عزیز ۔۔ تُو نے دیکھا ہی نہیں جلوۂ لیلائے حیات
تیری تخلیق جو خالق کو نہ ہوتی منظور ۔۔ سچ ہے پیدا ہی نہ ہوتی کبھی دنیائے حیات
آج مٹ جائے زمانے سے اگر تیرا وجود ۔۔ عرصۂ دہر میں خاموش ہو غوغائے حیات
تھا کبھی نعرۂ تکبیر ترا حشر فروش ۔۔ آج تک گونجتا ہے گنبدِ خضرائے حیات
تو وہ یوسف ہے کہ ہے جاں سے سوا اسکو عزیز ۔۔ کھینچتی ہے ترے دامن کو زلیخائے حیات
تیری تقدیر کی ساقی بھی قسم کھاتا ہے ۔۔ خود جھکی تیرے لئے گردن مینائے حیات

وہ ہویدا ہوئے آثارِ سحر گردوں پر
وہ کھُلا دیکھ درِ مسجدِ اقصائے حیات

تیرِ آب دم شمشیر میں مثلِ ماہی
ہے یہی مشہدِ عالم میں تقاضائے حیات

موت کا خوف نہ کر مسلمِ شوریدہ مزاج!
تیرے پہلو میں ہے موجود مسیحائے حیات

نظیر لدھیانوی

جذباتِ عالیہ

یاس

دل عجب جلوۂ موہوم دکھاتا ہے مجھے
جلوۂ دار و رسن کوئی دکھاتا ہے مجھے

دل کو لہراتا ہے ہنگامۂ زندانِ بلا
شام سے یاس سویرا نظر آتا ہے مجھے

پائے آزاد ہے زنداں کے چلن سے باہر
کس و ناکس کی نگاہوں پہ چڑھاتا ہے مجھے

بارشِ سنگ حوادث بھی ہے بارانِ کرم
شورِ ایذا طلبی وجد میں لاتا ہے مجھے

ننگِ محفل مرا زندہ مرا مردہ بھاری
بیڑیاں کیوں کوئی دیوانہ پنہاتا ہے مجھے

پھٹ پڑیں اب بھی در و بام تو پردہ رہ جائے
حق بجانب ہے مقدر جو دکھاتا ہے مجھے

عشق پر حسن کو کب تک نہ ہنسی آئے گی
کون اُٹھاتا ہے مجھے کون بٹھاتا ہے مجھے

پاؤں سوئے ہیں مگر جاگتے ہیں اپنے نصیب
فلک خانہ خراب آنکھ دکھاتا ہے مجھے

دیدنی ہے چمن آرائی چشمِ عبرت
بیچ بازار میں کھویا ہوا پاتا ہے مجھے

ہنس کے کہتا ہے کہ گھر اپنا قفس کو سمجھو
کیا سمجھ کر جرسِ گنگ جگاتا ہے مجھے

جیسے دوزخ کی ہوا کھا کے ابھی آیا ہے
سیرِ تازہ گُلِ پژمردہ دکھاتا ہے مجھے

ترکِ مطلب سے ہے مطلب تو دعائیں کیسی
سبق اُلٹا مرا صیاد پڑھاتا ہے مجھے

لبِ دریا کا ہوائیں نہ تہِ دریا کا
کس قدر واعظِ مکار ڈراتا ہے مجھے

یاس منزل ہے مری منزلِ عنقائے کمال
صبح تک کیوں دلِ بیمار جگاتا ہے مجھے

ناخدا کو نسے گھاٹ اب لئے جاتا ہے مجھے
لکھنؤ میں کوئی کیوں ڈھونڈھنے آتا ہے مجھے

فکر آروی

رہ گیا عکس روئے قاتل کا
اُف رے آئینہ چشمِ بسمل کا

قطرۂ خوں ہے نوکِ مژگاں پر
مختصر ہے یہ ماجرا دل کا

جلوۂ طور اور کیا تھا کلیم!
ایک دُھندلا چراغ منزل کا

اُن کا خنجر نیام میں رہ کر
حوصلہ بن گیا مرے دل کا

منتِ خضر! اے خدا کی شان
خود نشاں ہوں میں اپنی منزل کا

اشکِ اک روشناس آنکھوں کا
درد اک صورت آشنا دل کا

دیدۂ خونفشاں کا حال نہ پوچھ
دیکھ لے رنگ اپنی محفل کا

حیف صد حیف آپ کی غفلت
ہائے رے ہائے حوصلہ دل کا

جل بُجھا فکر کا دل زندہ
ہو گیا گُل چراغ محفل کا

وقار الاعظم شرف

یہ بت کچھ اور کہتے ہیں خدا کچھ اور کہتا ہے
یہ دل اپنی مُصیبت جانے کیا کچھ اور کہتا ہے

سرِ مقتل لپٹ جاتا ہے ظالم ہاتھ پھیلا کر
تمہارا خنجر رنگ آشنا کچھ اور کہتا ہے

تمہارا نقشِ پا چوموں نہ چوموں راہ دشمن میں
کہ دل جھکتا نہیں یہ رہنما کچھ اور کہتا ہے

نئی ہے سرگذشت عشق اُنکے جاں نثاروں کی
جسے دیکھو وہ اپنا ماجرا کچھ اور کہتا ہے

ادھر تمکو ہنسی آئی کہ اُس کو بھی ہنسی آئی
تم اس مطلب کو سمجھے آئینہ کچھ اور کہتا ہے

تمہارے سامنے لاؤں کہاں سے ہوش کی باتیں
میں کچھ کہتا ہوں میرا مدعا کچھ اور کہتا ہے

تپش

حسن یوسف شد خجل از رُوے تو
خندہ زد بر مصر رنگ و بُوئے تو

بہر کسبِ معرفت سرگشتہ اند
کعبہ و بت خانہ اندر کُوئے تو

می نماید در حریم نجدِ من
چشمِ مجنوں دیدۂ آہوئے تو

ہستئ من از تو آمد در وجود
یا فتم خود راز جُست و جوئے تو

خوردہٗ شائید تپش جام الست! مست شد بزمِ جہاں از ہُوئے تو

شائق

جذبِ اُلفت کا اثر اے دلِ ناشاد رہے
یعنی تاثیر میں ڈوبی مری فریاد رہے

جور و بیداد سہی لُطف و مروت نہ سہی
بھُولنے والے تجھے کچھ تو مری یاد رہے

دارِ فانی ہے حقیقت میں مقامِ عبرت
ہُوئے برباد جو اس دہر میں آباد رہے

لذتِ ذوقِ خلش راحتِ جاں ہے مجھکو
شوق سے دل میں ترا ناوکِ بیداد رہے

صُورتِ سروِ سہی باغِ جہاں میں شائق
جتنے پابند ہُوئے اُتنے ہی آزاد رہے

مشتاق الہ آبادی

تھی ”چشمِ لطف“ ساقی جامے سے رات بار
بھر دی ”شرابِ جلوہ“ پیمانۂ نظر میں

یہ انقلابِ عالم آنکھوں میں کیا سمائے؟
پھرتا ہے تیرا ”پھرنا“ ظالم! مری نظر میں

انسانِ ”خود غرض“ کو اسکی خبر کہاں ہے؟
کیا ”سود“ میں ”زیاں“ ہے! کیا ”نفع“ ہے ”ضرر“ میں!

تاجور

قید میں وردِ زباں شکوۂ صیاد رہے
لبِ فریاد نہ بیگانۂ فریاد رہے

خود فراموشِ محبت کو بھی کرنا کبھی یاد
او مرے وعدہ فراموش اگر یاد رہے

غم نوازی نے تری کر دیا غم دوست ہمیں
شاد ہم تیری بدولت دلِ ناشاد رہے

بننا پڑتا ہے ستمگر کو ستم کش آخر
یاد یہ بھی تجھے او بانیٔ بیداد رہے

دلِ مایوسِ مسرت کو نہ بہلا ظالم!
یہ کبھی شاد رہا ہے نہ کبھی شاد رہے

ایسی گلگشت سے زنداں کی اسیری اچھی
جب چمن میں بھی نہ اہلِ چمن آزاد رہے

ریویو

جواہرات حالی ؒ۔ اس مجموعہ میں مولانا حالی مرحوم کی وہ متفرق نظمیں ہیں جو صرف ایک مرتبہ کسی اخبار یا رسالے میں چھپ کر ہمیشہ کے لئے پبلک کی نظروں سے مخفی ہوگئیں تھیں نیز مولانا کا وہ تمام غیر مطبوعہ کلام جو آجتک کہیں شایع نہیں ہُوا تھا، شروع میں جناب مرتب (شیخ محمد اسمعیل سیکرٹری اورینٹل پبلک لائبریری پانی پت) کا ایک مفید مقدمہ ہے، پھر مولوی خواجہ غلام الحسنین صاحب (نبیرۂ مولانا حالی) کا ایک مختصر دیباچہ، اس کے بعد کتاب شروع ہوتی ہے، پہلے حصہ میں چھوٹے بچوں کے لئے نظمیں ہیں، دوسرے حصہ میں رباعیات، تیسرے میں ترکیب بند، (اسی میں فلسفۂ ترقی بیش بہا نظم ہے) چوتھے حصہ میں مرثیہ جات، پانچویں میں قطعات، چھٹے میں غزلیات، ساتویں میں متفرق اشعار وغیرہ اسی کے ساتھ ڈیڑھ سو صفحہ پر کتاب ختم ہوجاتی ہے، لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت خوب، مگر سرورق بامرہ خراش ہے، قیمت غیرمجلد عہ؍ مجلد عہ؍

حالی بُک ڈپو پانی پت سے طلب فرمائیں ⁂

سیر ایران۔ مولانا محمد حسین صاحب آزاد دہلوی کا سفرنامۂ ایران ہے، شروع میں آغا طاہر نبیرۂ آزاد مرحوم کا دیباچہ ہے، اس کے بعد پروفیسر آزاد کے ایک لکچر سے کتاب شروع ہوتی ہے، لکچر کے بعد روزنامچہ ہے، جو کہیں فارسی کہیں اُردو میں لکھا گیا ہے، بعض جگہ عامیانہ فارسی کا رنگ ٹپکتا ہے جس کی آزاد کے قلم سے توقع نہ تھی، ممکن ہے مسودوں کی درستی میں کسی "مہمل" جدید فارسی جاننے والے سے مدد لی گئی ہو، اُردو میں کہیں تغیر و تبدل نہیں کیا گیا اکثر جگہ غلطیاں ہیں، چنانچہ صفحہ ۱۱ پر "بیڑا اٹھایا ہُوا ہے"، صـ۳۷ پر "دوستو سے سُنا ہُوا تھا"، اسی صفحہ پر "میں نے سُنا ہُوا تھا"، صـ۴۵ پر "تاریخ ہرات میں دیکھا ہُوا تھا"، صـ۷۶ پر "لوگوں نے ڈرایا ہُوا تھا"، صـ۱۱۰ پر "گھنٹہ بھیجا ہُوا ہے"، صـ۱۱۵ پر "پتھر موجودہ کو لگوایا" وغیرہ، بہتر ہوتا اگر انہیں درست کردیا جاتا، کتاب کے آخر میں آغا طاہر کا لکھا ہُوا خاتمہ"

ہے، ایک سو چھیاسی صفحہ پر کتاب ختم ہوگئی ہے، شیدائیان زبان آزاد کے لئے ایک بہترین نعمت ہے، کاغذ، کتابت میں خاص اہتمام کیا گیا ہے، قیمت مجلد مطلا (عہ) معمولی عہ آغا طاہر منیجر آزاد بک ڈپو اکبری منڈی لاہور سے منگایا جائے۔

سمرنا کا چاند۔ مصور غم مولانا راشد الخیری کا ایک نیا ناول ہے، لیکن وہ خاص رنگ جس کے لئے یہ قابل مصنف مشہور ہے، اس ناول میں ایک حد تک کم ہے) کتاب کے نام کا نفس مضمون سے اتنا علاقہ نہیں کہ اس کا اختیار کرنا ضروری ہو۔ تربیت اولاد پر جس قدر دلاویزی سے مصور غم لکھ سکتے ہیں اس کا ہندوستان کی ادبیات میں جواب نہیں، یہ ناول بھی اسی موضوع پر ہے، اور خوب ہے، ایکسو چوبیس صفحہ، کاغذ معمولی، چھپائی اچھی، قیمت عہ ملنے کا پتہ۔ عبدالرشید اینڈ برادر۔ تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور

تجارت کی دوسری کتاب۔ خواجہ حسن نظامی کی تحریک پر، مولوی سید ظہور احمد وحشی نے تالیف کی ہے، اس حصہ میں اشتہار لکھنے اور چھپوانے کے مکمل اصول بتائے گئے ہیں، جنکا جاننا ہر تاجر کے لئے ضروری ہے، تجارت کے متعلق یہ سلسلۂ کتب ہر طرح قابل قدر ہے، قیمت مجلد عہ غیر مجلد عہ

تجارت کی تیسری کتاب۔ اس میں دوکانوں پر اسباب سجانے اور گاہکوں کے مرغوب نظر بنانے اور خریداروں سے بات چیت کرنیکے ڈھنگ اور وہ طریقے بتائے گئے ہیں، جن سے معمولی دوکان بھی شاندار بن جائے۔ مولفہ مولوی سید ظہور احمد وحشی۔ قیمت مجلد عہ غیر مجلد ۱۲

تجارت کی چوتھی کتاب۔ مولفۂ ماہر علم تجارت سید صفیر علی صاحب قادری، سند یافتہ سکریٹریز ایسوسی ایشن، (لندن)۔ لندن چیمبر آف کامرس وغیرہ وغیرہ،

اس کتاب میں مشرق و مغربی تجارتی خط کتابت کے عام فہم علمی و عملی اصول بیان کرکے اور ہر قسم کے تجارتی و کاروباری خطوط کے نمونے دیکر اردو انگریزی زبان میں تجارتی خط و کتابت کی تعلیم دی گئی ہے۔ قیمت لکھی نہیں،

ملنے کا پتہ نظامیہ دار الاشاعت و رسالہ دین و دنیا۔ دہلی

قواعد

۱ - ہمایوں بالعموم ہر ماہ کے نصفِ اوّل میں شائع ہوا کرے گا۔

۲ - علمی وادبی - تمدنی وتاریخی - اخلاقی وروحانی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درجِ رسالہ کئے جائیں گے۔

۳ - دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہ ہوں گے۔

۴ - جواب طلب خطوط کے لئے ۱ر کا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۵ - کوئی ایسا اشتہار نہ لیا جائے گا جو خلافِ تہذیب ہو۔

۶ - سالانہ قیمت پانچ روپے - ششماہی تین روپے - نمونہ کا پرچہ ۸ر علاوہ محصول ڈاک۔

۷ - ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور ۸۶۴ صفحات سالانہ ہوگی۔

۸ - خط وکتابت کے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھیں

۹ - ناپسندیدہ مضمون ۱ر کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۱۰ - رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۲۰ تاریخ کے بعد اور ۲۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۱۱ - منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کریں۔

منیجر رسالۂ ہمایوں

۳۰ - مزنگ روڈ - لاہور

(باہتمام لالہ دیوا ... مالک مرکنٹائل پریس لاہور چھپوا کر شائع کیا)

زمامِ ابلقِ ایام [illegible] ہمایوں شد
نویدِ دورِ خوشکامی ایں بختِ زبوں شد

بیادگارِ علامۂ فصیح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

مرتبہ

میاں بشیر احمد بی۔ اے۔ (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا۔ ایڈیٹر

مولینا تاجور نجیب آبادی (فاضل دیوبند) جائنٹ ایڈیٹر

منشی محمد صادق منیجر رسالہ ہمایوں نے
مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

عبدالمجید

فہرست مضامین بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۲ء

جلد ۲ — نمبر ۶

حصۂ نثر

حصۂ نظم

جذباتِ عالیہ

اگلا نمبر وی پی ہوگا

جن حضرات کا سال خریداری جنوری سے شروع ہوتا ہے انکا منی آرڈر نہ پہنچنے کی صورت میں انکو جنوری کا خاص نمبر وی پی ارسال کیا جائیگا جن اصحاب کو خریداری منظور نہ ہو وہ براہ کرم دفتر کو ۲۰ دسمبر سے پہلے پہلے مطلع فرمائیں۔ اطلاع نہ آنیکی صورت میں وہ پہلے کی طرح خریدار سمجھے جائینگے اور وی پی کی وصولی انکا اخلاقی فرض ہوگا۔

مینیجر

انور کاتب چوک متی لاہور

شذرات

یہ نمبر سال کا آخری نمبر ہے۔ اسے پیش کرتے ہوئے ہم خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہم نے شروع اشاعت میں مواعید و مقاصد کا ایسا کوئی سبز باغ نہیں دکھایا تھا جسکی خزاں اب ہمیں اپنے دوستوں سے شرمسار کرتی۔ بلکہ جہاں تک ہمیں یاد ہے کوئی وعدہ بجز اسکے ہماری جانب سے نہیں کیا گیا کہ ہم اپنی استعداد کے مطابق کام کرتے رہینگے۔ سو اس مقصد کو ہم نے تمام سال پیش نظر رکھا ہے اب نیا سال نئی امیدوں اور نئے حالات کے ساتھ آ رہا ہے۔ افسوس کہ آئندہ کے لئے بھی ہم ہمایوں کیجانب سے کوئی دلفریب وعدہ کرنیکی جرأت نہیں رکھتے کیونکہ ہم نے سال کی جنوری کے ساتھ اُس کے دسمبر کو بھی دیکھ رہے ہیں۔

سالِ رواں میں ہمایوں کی رفتار ترقی ہمارے خیال میں قریب قریب اطمینان بخش اور ہمارے قابل احترام اہلِ قلم اور قدرشناس احباب کی رائے میں توقع سے بڑھ کر اُمید افزا رہی ہے۔

اپنے مکرم مرزا اعجاز حسین صاحب دہلوی بی اے ایل ایل بی وکیل کے اس یقین کو ہم حوصلہ افزائی ہی پر محمول کرتے ہیں کہ "میں غور سے دیکھ رہا ہوں ہمایوں کا ہر دوسرا نمبر پہلے نمبر سے زیادہ گرانقدر بنکر شائع ہو رہا ہے اس کامیابی پر میں اس کے دونوں اڈیٹروں کو مبارکباد دیتا ہوں"

حضرت اعجاز کی طرح دیگر مشاہیر اہل قلم نے بھی ہمایوں کی تدریجی ترقی پر ایسی ہی ہمت افروز رائے کا اظہار فرمایا ہے۔

ہم اپنے آپکو خوش نصیب سمجھتے ہیں کہ اس حقیر بینی کے دور میں بھی ہم ایسے ژرف نگر حضرات کی قدر افزائی سے محروم نہیں ہیں جو ہماری ناچیز کوششوں کو عزت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔

آغاز کار میں ہمارا خیال تھا کہ سال کے ختم تک ہمایوں کی اشاعت پانسو تک بھی پہنچ گئی تو ہم سمجھیں گے کہ ہم ناکام نہیں رہے اس خیال پر نا اُمیدی دُور سے ہنستی ہوئی نظر آتی تھی مگر اُس کی اس قدر عریاں رسوائی کا تو وہم تک بھی نہ تھا کہ سال سے بہت پہلے ہمایوں کے ہزار سے زیادہ قدرشناس پیدا ہو جائینگے۔ جنس ادب کی عام کساد بازاری کو دیکھتے ہوئے ہم اعتراف کرتے ہیں

کہ ہم ترقی اشاعت میں امید سے بہت زیادہ کامیاب ہوئے ہیں ــــ مگر اس اثنا میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہمایوں کی اشاعت توقع سے زیادہ ہو گئی ہے تو اس سے نفع بھی امید سے بڑھ کر حاصل ہوتا ہوگا

افسوس ہے کہ اسکا جواب ضرورت سے زیادہ حوصلہ شکن ہے یعنی آمد کے مقابلہ میں خرچ بہت زیادہ ہو رہا ہے - اسے ناتجربہ کاری پر محمول کیا جائے یا اصول تجارت کی خلاف ورزی پر کچھ سمجھ لیجئے جو کچھ لکھا ہے یہ واقعہ ہے ادھر تو یہ حال ہے - دوسری جانب یہ خواہش دل میں چٹکیاں لے رہی ہے کہ ہمایوں کا حجم بڑھا کر ممکن ہو تو سو صفحات تک کر دیا جائے - اسکے ساتھ اسکو ظاہری و معنوی حیثیت سے زیادہ گرانقدر بنایا جائے - ظاہر ہے کہ ہمایوں کے منتظمین کو نہ ایسا کوئی منتر یاد ہے کہ اسے پڑھ کر پھونکنے سے بہتر کے اسی صفحے اور ایک کی چار تصویر ہو جایا کریں - نہ وہ ایسے خدا رسیدہ کہ سر راہ خدا کے لئے "کن" کہلوا یا اور ایک ضخیم و خوبصورت ہمایوں پیدا ہو گیا - یہ ہم تو اسی قاضی الحاجات سے سر ہو گی جس نے بقول بعض عقیدت کیش بزرگوں کے ہر روز ہزار مرتبہ یا عزیز [illegible] کا ورد کیا ہے اور جس کا مشہور نام [illegible]

ہم نے تو مالی حالات کیجانب سے آنکھیں بند کر کے بغیر اعلان در بارہ کسی سابقہ وعدہ کے چونسٹھ سے بہتر صفحے کا بنا دیا اور کوئی قیمت نہیں بڑھائی لیکن ہمایوں کو بہتر سے سو تک پہنچانا یہ ہمارے بس کا روگ نہیں ہے یہ مرحلہ ہمایوں کے قدر شناس ناظرین کو طے کرنا چاہئے اگر وہ چاہتے ہیں کہ ہمایوں ایسا ہو جیسا اسے ہونا چاہئے -

ہمارے خیال میں ہمایوں کے سرپرست و ناظرین جو اس [illegible] دیکھتے ہیں اگر اپنے اپنے حلقہ احباب میں ایک ایک خریدار بھی ہم پہنچا دیں تو اسی بالکل معمولی [illegible] مستقبل کا سوال حل ہو سکتا ہے بہت قدر دان ایسے بھی ہیں جو احساس ہمدردی سے [illegible] اپنے [illegible] ہمایوں کے دس دس بیس بیس خریدار بہم پہنچا سکتے ہیں - اس دفتر [illegible] ہم [illegible] قسم کی [illegible] درخواست کرنے کا مرتکب نہ کرتے کہ یہ ہماری اقتصادی [illegible] لیکن واقعہ چونکہ یہ ایک ادبی خدمت ہے جسے ہمایوں کے ذریعے سے ہم کثیر نقصان برداشت کر کے بھی ادا کر رہے ہیں اس لئے جی چاہتا ہے کہ ہم دوسرے ادب احباب کے ساتھ مل کر اس ادبی خدمت کو زیادہ مفید زیادہ گرانقدر اور زیادہ پائدار بنائیں اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب ہماری طرح ہمایوں کے قدر شناس بھی اپنے ادبی احساس کو بیدار کر کے ہماری مالی ذمہ داریوں کو کم کریں -

ہمیں امید ہے کہ ہماری اس استدعا کو رسمی طور پر محض ایک درخواست سمجھ کر محروم توجہ نہ کیا جائیگا

خدا نہ کرے کہ اپنے ناظرین کے متعلق اعتمادِ توجہ کی شکست کو دیکھ کر ہمیں لسان العصر مرحوم کا ہمنوا ہونا پڑے کہ

"اب اپنے دل کی عقیدت پہ رحم آتا ہے
یہ دیکھتا ہوں کہ وہ آپ کی نگاہ نہیں"

۲

اس فخر میں غالباً کوئی ہمارا حریف نہیں ہے کہ مشاہیر ادب کی دنیا ہمہ تن ہمایوں کیجانب متوجہ ہوگئی ہے یہی وجہ ہے کہ ہمارے پاس ہر وقت چھ ماہ کا ذخیرہ مضامین فراہم رہتا ہے۔ انکی اس غیر منقطع قلمی اعانت ہی کے سبب سے ہم میں سطحی مضامین شائع کرنے سے بے نیازی برتنے کی جرأت پیدا ہوگئی ہے خدا کرے کہ ہمایوں کی یہ متفنا طبیعت انکی توجہات کو ہمیشہ جذب کرتی رہے۔ قارئین کرام نے محسوس کیا ہوگا کہ ہمایوں کے صفحات کو بعض ایسی عالیجاہ شخصیتوں کے نظر فروز افادات بھی زریں بناتے رہے ہیں جنکی قابلیت و عظمت پر اردو دنیا کو ناز ہے بعض ایسے محترم انشا پرداز بھی بزم ہمایوں میں نظر پڑے ہونگے جو باوجودیکہ علمی دنیا کے لئے ازبس ضروری ہیں مگر انکا طبعی استغنا شہرت کی دردسری کو پسند نہیں کرتا بعض انشا پردازوں کے ایسے گرانقدر مضامین بھی انکے مطالعہ میں آئے ہونگے جو ارددادب کیلئے سرمایۂ افتخار کہے جاسکتے ہیں۔ ہم نے ایسے تمام محترم حضرات کے مضامین بغیر کسی تعارف تحسین و تعریف کے شائع کر دیئے اسلئے نہیں کہ انکی زریں نگاریاں تحسین و تعریف کی مستحق نہ تھیں بلکہ اسلئے کہ اک تو ہم انکی جلالتِ شان کو رسمی تحسین سے بالاتر سمجھتے ہیں دوسرے قصیدہ خوانی ہمارے مذاقِ طبع کو راس نہیں اسکے علاوہ اس مدحی انتخاب سے ہمارے باقی معاونین کی قائم کردہ توقعات کے مجروح ہونیکا سخت خطرہ تھا ہم آئندہ بھی حتی الوسع اسی پالیسی کو مطمح عمل بنائینگے مگر اظہارِ واقعیت کیلئے مختصراً اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ بلا امتیاز ہمارے تمام قلمی معاونین ہمایوں کو گرانمایہ اور جاذبِ نظر بنانے میں ہمیں گرویدۂ منت بناتے رہے ہیں۔ سچ پوچھئے تو انہیں کی توجہاتِ بیکراں ہمایوں کی صورت میں جلوہ طراز ہوئی ہیں۔

۳

مئی کے ہمایوں میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ ہم ادب آفرینی کے ساتھ ہی اپنی استعداد کے مطابق ادیب آفرینی کے فرض کو بھی انجام دینا چاہتے ہیں۔ لہذا ایسے طلباء جو ادبی مذاق سے بہرہ ور ہیں مگر اس میدان میں قدم رکھتے ہوئے اسلئے جھجکتے ہیں کہ کوئی دل بڑھانے والا نہیں۔ ہم سے خط و کتابت کریں ہم انکو مفید مشورہ دینے سے دریغ نہیں کرینگے اور اگر اُن میں سے کسی کے مضامین نظم و نثر اس قابل ہوئے کہ اصلاح کے بعد ہمایوں کے صفحات

میں جگہ پاسکیں تو انکو جائز شہرت سے محروم نہیں کیا جائیگا۔ اس اعلان کا شائع ہونا تھا کہ شش جہت سے طلباء کے مضامین برسنے شروع ہوگئے۔ اس انبار میں بعض مضامین نے ہمارے اس یقین کو اور زیادہ روشن کردیا کہ حوصلہ افزائی کے فقدان کی وجہ سے بہت سے تابناک ستارے گمنامی کے بادلوں میں پوشیدہ رہ کر اپنی چمک دمک سے دنیا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ چنانچہ ہم نے مستقبل کے ان ہونہار ادیبوں کو اس قصور پر نظر انداز کرنا گناہ سمجھا کہ وہ کوئی مشہور ادیب نہیں ہیں بلکہ نظر ثانی کے بعد ایسے تمام مضامین ہمایوں میں شائع کردئے جو اسلئے معیار سے گرے ہوئے نہ تھے۔

اس حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے تلاش کئے ہوئے یہ ادیب دوسرے معزز معاصرین کی مجلسوں میں بھی رونق افروز نظر آرہے ہیں بہت سے طلبا کو اس اعلان کے سمجھنے میں کچھ غلطی ہوئی ہے انہوں نے اسکا مطلب یہ سمجھا ہے کہ ہم ہر طالب علم کے ہر مضمون کو ہمایوں میں ضرور شائع کردیا کرینگے چنانچہ اس ہجوم میں اکثر تعداد ایسے طلباء کی ہے جنکا مرسلہ مضمون اردو نگاری کی پہلی مشق ہے اور جو مڈل کلاسز کی بنچوں سے پہلی ہی چھلانگ میں بزم ہمایوں تک پہنچنا چاہتے ہیں۔

انہیں ہم یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ رفتہ رفتہ ترقی کرکے ضرور ایکدن ہمایوں کے مضمون نگاروں میں شامل ہوسکینگے کسی رسالہ کا مضمون نگار بننے کی بے صبری انکے مقصد میں مشکلات پیدا کردیگی۔ فی الحال وہ اسی کو غنیمت سمجھیں کہ انکے مضامین نظم و نثر کو ہم اصلاح دیکر انہیں واپس کردیا کریں بعض طلبائے نے دوسرے رسالوں کے مضامین نقل کرکے اپنے نام سے ہمایوں کے لئے بھیجدئے۔ انہیں معلوم ہونا چاہئیے کہ انکے یہ ادبی شبخون دفتر ہمایوں میں آکر رسوا ہوجاتے ہیں

ہم سے وہ کیا چھپینگے وہ ایسے کہاں کے ہیں؟

۴

انعامی مضامین کا جو اعلان ہم نے کیا تھا اسکے متعلق جتنے مضامین ہمیں ابتک موصول ہوئے ہیں ہمارا ارادہ ہے کہ انکے لئے اک خاص انعامی نمبر شائع کریں۔ آئندہ فروری کا ہمایوں انعامی نمبر کے نام سے خاص اہتمام سے شائع کیا جائیگا ہم کوشش کررہے ہیں کہ اس نمبر میں اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے اسٹاف کی تصویر شائع کیجائے۔ جنوری کا ہمایوں چونکہ نئے سال کا پہلا نمبر ہوگا اسلئے حسن ابتدا کیلئے اسے ہم باعتبار رفعت مضامین بہت روح فرز بنانا چاہتے ہیں مشاہیر اہل قلم میں سے بعض حضرات نے اسکے لئے خاص مضامین ارسال فرمائے ہیں اور بعض نے حتمی وعدہ فرمایا ہے اس نمبر میں ایک نظر فریب رنگین تصویر شائع ہوگی۔ یہ نمبر چونکہ بڑی آن بان سے شائع ہوگا۔ اس لئے ہمیں انعامی نمبر فروری تک ملتوی کرنا پڑا ہے ٭

تاجور

علمی شعاعیں

کیا شیکسپیئر بنگالی تھا؟ شیکسپیئر کی شہرت سے زیادہ عجیب اُس کی ہستی ہے۔ جس کا تاحال تصفیہ نہیں ہو سکا۔ مغرب اس شخصیت پر ناز کرتا ہے اور بقول مسٹر کارلائل اُسکے مقابلے میں ہندوستان کی حکومت کی پروا نہیں کرتا۔ لیکن وہ کون تھا؟ اسکے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مغرب اس لحاظ سے تاریکی میں ہے۔ اس وقت تک یہ نظریہ ہے کہ شیکسپیئر کی کوئی ہستی نہیں۔ لارڈ بیکن نے تمام ناٹک لکھ کر شیکسپیئر کے فرضی نام سے شائع کرا دئے۔ مگر اب اخبار سٹیٹمین میں ایک صاحب نے خیال ظاہر کیا ہے کہ شیکسپیئر کے تمام ناٹک کسی بنگالی کے تحریر کردہ ہیں۔ اور اُن کی مغرب میں ہمہ گیر ہردلعزیزی کا راز بھی یہی ہے کہ مشرقی خیالات کو مغربی لباس میں پیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر کنگ لیئر کا ناٹک بالکل مشرقی انداز کا ہے۔ اور اس کا پلاٹ ہندوستان کے اکثر حصص کے جاہل طبقہ میں مشہور ہے۔ اسی طرح ٹمپسٹ کا پلاٹ بھی مشرقی ہے اور مغربی دنیا کے لئے بالکل عجیب شئے ہے۔

مغربی لباس نقصان دہ ہے۔ امریکہ کے طبی رسالہ قومی صحت میں ایک ڈاکٹر نے مغربی لباس پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور ثابت کیا ہے۔ کہ اس سے جسم کو ضرر پہنچتا ہے۔ اور انسانی عمر کم ہوتی جاتی ہے۔

"مغربی باشندہ پاؤں میں موزے پہنتا ہے۔ اور اُسکے اوپر گارٹر کس کر پاؤں کو بھاری بوٹوں میں اسیر کر دیتا ہے۔ اس کے اوپر ٹانگوں میں ڈرار پہنتا ہے اور پھر پتلون کس لیتا ہے کندھوں کو گیلس قابو میں کر لیتے ہیں۔ اور گلے کو کالر اور نکٹائی۔ اس تمام فیشن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جسم کے دوران خون میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اور صحت پر ضرر رساں اثر پہنچتا ہے۔ جو کام کرنے والے ہیں جنکے جسم مضبوط ہیں۔ جن کا خیال کسی خاص طرف محو رہتا ہے وہ اس فیشن کی قطعاً پروا نہیں کرتے"

کرنٹ اوپنیئن کے ایک نامہ نگار نے اعداد و شمار سے ثابت کیا ہے۔ کہ طویل العمری کا باعث ایک یہ بھی ہے۔ کہ ایسے اصحاب جسم کو بے حد چست و چالاک نہیں بنائے رکھتے اور ڈھیلا ڈھالا لباس اختیار کرتے ہیں۔

تارے ٹمٹماتے کیوں ہیں؟ بعض آسمانی کرے چمکتے ہیں اور بعض ٹمٹماتے ہیں۔ ٹمٹمانے کی وجہ آج تک یہی بیان کی جاتی رہی ہے کہ اُن کے اور ہمارے مابین تاریک کرُے حائل ہو جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اُن کی روشنی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ لیکن حال میں فلکیات کے ایک ماہر نے اس کے متعلق ایک تازہ انکشاف کیا ہے۔ اور اس نظریہ کو رد کر دیا ہے آن کا نام ڈاکٹر ولبیئر ہے اور آپ فرانس کے رہنے والے ہیں۔ آپ نے سیاروں کی گردش کے نقشہ سے ثابت کیا ہے کہ جس وقت تاروں کی روشنی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہے اُس وقت اُن کے اور ہمارے مابین کئی صورتوں میں کوئی سیارہ حائل نہیں ہوتا لہذا صاف ظاہر ہے کہ ایسے تاروں میں اس قسم کی دھاتیں پائی جاتی ہیں۔ جو چمکنے کی بجائے ٹمٹماتی ہیں۔

چوکیداروں کی نگرانی۔ بنکوں، کارخانوں اور امیروں کے مکانوں پر رات کے وقت چوکیدار پہرہ دیتے ہیں لیکن بسا اوقات اُن کو نیند آ دباتی ہے۔ اور چوریاں ہو جاتی ہیں۔ مالکان کے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ چوکیدار رات کو جاگتا رہا ہے یا پڑا غافل سوتا رہا ہے۔ اب اس بات میں ایک نئی مشین ایجاد ہوئی ہے۔ یہ مشین ایک تختہ کی شکل میں ہے۔ جس کے اوپر رات کے گھنٹوں کے نشانات لگے ہوتے ہیں۔ اور گھڑی کی سوئی کے مانند ایک سوئی اُس پر برابر لکیر ڈالتی جاتی ہے۔ مگر یہ اُسی حالت میں ہوتا ہے۔ جب کہ اُس پہ کوئی بیدار آدمی کھڑا رہے۔ لیکن جونہی وہ لیٹ کر سو جاتا ہے یا دیوار کے ساتھ لگ کر اونگھ جاتا ہے تو اُس کے وزن میں فرق آ جاتا ہے۔ اور سوئی بغیر لکیر کا نشان ڈالے آگے گذر جاتی ہے اور صبح کے وقت مالک کو معلوم ہو جاتا ہے کہ چوکیدار رات کو اتنے گھنٹے سویا ہے۔ اور

اتنا عرصہ اپنے کام میں مستعد رہا ہے۔

گنّے کا کوئیلہ۔ آج کل چینی کو کثافت سے صاف کرنے کے لئے ہڈی کا کوئلہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر برادران ہنود میں سے اکثر اصحاب اسے قابل اعتراض تصور کرتے ہیں اور محض اسی وجہ سے بعض لوگ چینی کے استعمال سے احتراز کرتے ہیں۔ مگر اب ایک ایسی چیز دستیاب ہوگئی ہے۔ جو قابل اعتراض نہ ہوتے ہوئے بھی ہڈی سے زیادہ کارآمد ہے۔ گنّے کا رس نکال لینے کے بعد چھلکے سے ایندھن کا کام لیا جاتا ہے لیکن اگر اسی چھلکے کو ۶۰۰ درجہ تک حرارت پہنچائی جائے۔ تو اس سے کوئلہ بن جاتا ہے۔ اگر ہڈی کے کوئیلے کی صاف کرانے کی قوت ۱۰۰ فرض کی جائے تو اس گنّے کے کوئیلے میں وہ طاقت ۶۶ ہوتی ہے۔ مگر اسے کاسٹک سوڈا میں ابالنے سے یہ طاقت ۸۶ ہوجاتی ہے۔ اور پھر نمک کے تیزاب میں جوش دینے سے یہ قوت ہڈی کے کوئلے کی قوت سے بھی ۸۰ فیصدی زیادہ ہوجاتی ہے۔ یقیناً مستقبل قریب میں ہڈی کی جگہ گنّے کا کوئیلہ استعمال ہونا شروع ہوجائیگا۔

دُنیا کا سب سے بڑا پُل۔ دُنیا کا سب سے بڑا پُل امریکہ کی جھیل سالٹ کے اوپر ہے۔ جس کی لمبائی ساڑھے ستائیس میل ہے۔ اس کے اوپر سے ریل گاڑی گذرتی ہے۔ جب ابتدا میں اُس حصہ میں گاڑی چلی۔ تو وہ جھیل کے گرد گھوم کر جاتی تھی۔ مگر اس پُل کے تعمیر ہوجانے کے بعد ۵۰۷ میل کی بچت ہوگئی ہے۔

غازی کمال پاشا

اے غیرتِ مجسم غازی کمال پاشا
اے مسلمِ مسلّم غازی کمال پاشا
ترکی کے بطلِ اعظم غازی کمال پاشا
لیکن انہیں کو تو نے نیچا دکھا کے چھوڑا
سارا تھریس آخر خالی کرا کے چھوڑا

ٹرکی کو مات دیکر یورپ بپھر رہا تھا
برباد کن شرائط وہ پیش کر رہا تھا
جن سے نہ زور ہی کچھ باقی نہ زر رہا تھا
یورپ کو تو نے اپنا لوہا منا کے چھوڑا
سارا تھریس آخر خالی کرا کے چھوڑا

محبوبِ قوم و ملّت اے فخرِ آلِ عثمانِ
اے ایشیا کے ہیرو۔ ترکی کے شیرِ غرّاں
دل سے ہیں تیرے شیدا ہر ملک کے مسلماں
لیکن یہ نقشِ باطل تو نے مٹا کے چھوڑا
سارا تھریس آخر خالی کرا کے چھوڑا

سچ مچ فدائے ملّت ہے بال بال تیرا
آخر ہُوا وہی کچھ جو تھا خیال تیرا
اعجاز سے نہیں کم ہرگز کمال تیرا
ناموس جا چکا تھا۔ تو نے بچا کے چھوڑا
سارا تھریس آخر خالی کرا کے چھوڑا

یونان کے ستمگر خوشیاں منا رہے تھے
اپنی تعدیوں پر بغلیں بجا رہے تھے
نشہ میں چور ہو کر فوجیں بڑھا رہے تھے
بگڑی ہُوئی کو واللہ تو نے بنا کے چھوڑا
سارا تھریس آخر خالی کرا کے چھوڑا

امین حزیں

مُصطفیٰ کمال

قائم ہُوا جہاں میں پھر اسلام کا جلال — پھر رو کشِ صلیب ہوئی شوکتِ ہلال
یونانیوں کے قلبِ سیہ کی زباں ہے لال — مغرب کے رہنے والے ہیں شرمندۂ سوال
تُو نے کمال کر دیا اے مصطفیٰ کمال

دُنیا کی محفلوں میں نہ تھی اپنی آبرو — سمجھے ہُوئے تھے خاک سے بدتر ہمیں عدو
"مردِ علیل" کہتے تھے تُرکی کو کُو بکُو — اب چُپ ہیں دیکھ کر تری قوت ترا کمال
تُو نے کمال کر دیا اے مصطفیٰ کمال

سکّہ چلاؤ ظُلم کا تادیب ہے یہی — جابر بنو کہ رُعب کی ترکیب ہے یہی
قوت کے بُت کو پُوجئے تہذیب ہے یہی — یعنی کہ ہیچ جانئے اَوروں کا جان و مال
یُورپ کو سمجھا تُو نے ہی اے مصطفیٰ کمال

قسمت سے دی گئی جو فضائے قفس ہمیں — باقی رہی نہ جاہ و طلب کی ہوس ہمیں
ملتا نہ تھا کہیں کوئی فریاد رس ہمیں — تُو نے بچا لیا ہے تباہی سے بال بال
امت کو تجھ پہ ناز ہے اے مصطفیٰ کمال

تُو شمعِ ایشیا مہِ اسلام ہے تُو ہی — شوریدگانِ دیں کا دل آرام ہے تُو ہی
پیشِ نظر یہاں سحر و شام ہے تُو ہی — آنکھوں میں پھر رہے ہیں مری تیرے خط و خال
تُو پیکرِ جمال ہے اے مصطفیٰ کمال!

تُو کس لئے عزیز ہے ہم کو؟ اِسی لئے — روشن ہیں تجھ سے ہمت و ایثار کے دئیے
بندش میں رہ کے کوئی جئے بھی تو کیا جئے — جینا ہے یہ کرے وطن و قوم کو نہال
اور بے غرض ہو تیری طرح مصطفیٰ کمال!

غازیٔ اسلام

ایشیا کا گلشنِ ہستی تھا تاراجِ خزاں — گر رہی تھیں خرمنِ امن و اماں پر بجلیاں
دیر سے برپا تھا اک ہنگامۂ جور و فساد — بن رہے تھے پیکرِ ظلم و ستم یورپ نژاد
خاص کر مسلم کی دُنیا درد سے لبریز تھی — ہر مصیبت اِسکی اک طوفانِ دہشت خیز تھی
جان کے پیچھے پڑے تھے چارہ سازِ مہرباں — ہو رہا تھا درد سے "بیمارِ یورپ" نیم جاں
نشۂ فتح و ظفر میں سارا یورپ چُور تھا — بادِ نخوت سے سرِ یونان تک معمور تھا
ایشیائے کوچک اک جانب تھا مصروفِ فغاں — تھا اِدھر دار الخلافتہ پائمالِ "دوستاں"
ہو رہے تھے نذرِ غم اہلِ سمرنا و تھریس — سنگدل جلاد کا یونان نے بدلا تھا بھیس
آسماں سے اُن پر آئی تھی مُصیبت ٹوٹ کر — در بدر پھرتے تھے غربت میں وطن سے چھوٹ کر
کشورِ برطانیہ کا وہ خدائی فوجدار — زندگیٔ چندروزہ کی طرح بے اعتبار
"حکم برداری" ہے جس کے جور کا مشہور نام — قومِ ایوبی سے لیتا تھا صلیبی انتقام
مجلسِ اقوام میں وہ اہلِ عالم کے کفیل — کر رہے تھے قومِ عثمانی کو برباد و ذلیل

دل تھا ٹکڑے مسلموں کو گھر سے بے گھر دیکھ کر
ہوش اُڑے جاتے تھے یہ مایوس منظر دیکھ کر

جب مُصیبت بڑھ گئی حد سے دلِ ناشاد پر — تب کیا مجبور فطرت نے خدا کی یاد پر
حق کا فرمانِ "دُعونی اَستجب" یاد آگیا — آرزو کی محفلِ یخ بستہ کو گرما گیا
اُس کو ڈھونڈا اپنے بیگانوں کو آخر چھوڑ کر — اُس سے جوڑا رشتۂ اُمید سب سے توڑ کر
اُس کے در پر جھک گئی ہر اک کی سیمائے نیاز — اُس سے رو کر عرض کی سب نے کہ اے بیکس نواز!
مسلموں کو شکوۂ مہر و محبت تجھ سے ہے — آہ تیری بے نیازی کی شکایت تجھ سے ہے
اُمتِ احمد کی دردانگیز بدحالی تو دیکھ! — اپنے کعبہ کے نگہبانوں کی پامالی تو دیکھ!
ہم سے تیری رحمتِ عام اس قدر کیوں دور ہے؟ — کچھ ہمیں معلوم تو ہو کیا تجھے منظور ہے؟
غیب سے آئی ندا اے قومِ شوریدہ مآل! — کر رہے ہیں خود ترے اعمال تجھکو پائمال

بن گئی ہے جب سے تو پابندِ کیشِ این و آں
اپنے مرکز سے بچھڑ کر ہو گئی بے خانماں

تجھ پہ لائی ہے یہ روزِ بد تن آسانی تری
اپنے ہاتھوں سے ہوئی ہے خانہ ویرانی تری

تیری خودداری کا شہرہ تھا کبھی نزدیک و دور
سمجھے جاتے تھے مرادف دونوں مسلم اور غیور

اپنی بداعمالیوں سے آج ہے خوار و ذلیل
تیری خواری تیری بداعمالیوں کی ہے دلیل

بدشعاری سے نہ اپنے نفس پر تو جور کر
"لَیْسَ لِلْاِنسانِ اِلّا مَا سَعٰی" پر غور کر

ہم سے برتی بے نیازی ہو گئی آخر تباہ
ہم سے سرکش ہو کے پائی بھی کہیں تو نے پناہ؟

اب کہ تو آئی ہمارے پاس سب کو چھوڑ کر
رخ جہاں سے پھیر کر منہ ماسوا سے موڑ کر

سن رہے ہیں ہم جو دردِ دل سناتی ہے ہمیں
ہم بھی تیرے ہیں جو تو اپنا بناتی ہے ہمیں

تیری سب اجڑی ہوئی عظمت دلائینگے تجھے
اب کرشمے اپنی قدرت کے دکھائینگے تجھے

یک بیک کروٹ جو بدلی چرخِ نیلی فام نے
دیکھتے کیا ہیں کہ غازی مصطفےٰ ہے سامنے

محوِ حیرت ہو گئی ہر آنکھ اس کو دیکھ کر
پیکرِ انساں میں قدرت جلوہ گر آئی نظر

ہر طرف سے آ رہی تھی یہ نویدِ دل نشیں
"مصطفےٰ ما ارسلنٰک الّا رحمۃً للعٰلمین"

آلِ عثمانؓ سے یہ پوچھا اس نے اے روحی فداک!
کس لئے تو ہو رہی ہے اس قدر اندوہناک

شامِ غم چھائی ہے کیسی تیری صبحِ عید پر؟
یاس کیوں طاری ہے تیرے مطلعِ امید پر؟

قومِ نا امید رسوا ہوتی ہے اقوام میں
نا امیدی کفر ہے اے بے خبر! اسلام میں

آس توڑی جب کسی نے پھر نہیں کچھ اسکی خیر
یاس کر دیگی اسے پامال بے امدادِ غیر

آیۂ "لاتقنطوا" پر غور کر قرآن میں
نکتۂ "اَلیاسُ موتُ الرّوح" کو رکھ دھیان میں

خلوتِ دل کو امیدِ عیش سے آباد رکھ!
تجھ سے وعدہ "اَنتُمُ الاَعلَون" کا ہے یاد رکھ!

کہہ کے یہ۔ اس غارِ نکبت سے نکالا پھر انہیں
اپنے نظم و نسق کے قالب میں ڈھالا پھر انہیں

منتشر شیرازۂ ملت کو یک جا کر دیا
یعنی ان قطروں کو اک طوفانِ برپا کر دیا

پھر یہ فوجِ قہر موج اک حشر برپا کر گئی
برقِ طوفاں تھی جدھر چمکی صفایا کر گئی۔

رک سکا آگے نہ اس بڑھتے ہوئے طوفان کے
لی خبر ایسی کہ چھکے چھٹ گئے یونان کے

ہو کے وہ ثابت قدم میداں میں جب اڑ گئے — شاہِ قسطنطین کو لینے کے دینے پڑ گئے
سرنگوں ہر سلطنت میں اُس کے جھنڈے کر دیئے — تعزیئے یونان کے ترکوں نے ٹھنڈے کر دیئے
بن گیا وہ شعلہ زارِ جنگ گلزارِ سمن — شامِ غربت ہی سے پیدا ہو گئی صبحِ وطن
آہ لائڈ جارج کی دنیا میں بدنامی نہ پوچھ — گرگِ باراں دیدۂ یورپ کی ناکامی نہ پوچھ
مسلم آزاری کی دُھن میں اپنی عزت کھو گیا — "چاہ کن را چاہ درپیش" آخرش سچ ہو گیا

آگیا اس وعدۂ زریں پہ مسلم کو یقین
"مصطفےٰ ماجاءِ اِلّا رحمۃً للعالمین"

اے سپہ سالارِ اعظم اے دبیرِ بے نظیر — اے شۂ سیف و قلم اے غازیٔ گردوں سریر
غازیٔ اسلام! فخرِ قومِ عثمانی ہے تو — شک نہیں امت کے حق میں خالدِ ثانی ہے تو
جمع تجھ میں شانِ دارا شوکتِ اسکندری — عزمِ طارق۔ سطوتِ فارُوق۔ زورِ حیدری
یورپ افگن! ہے ادب آموزِ قسطنطین تو — دورِ حاضر کا ہے سلطانِ صلاح الدین تو
تیری تدبیروں سے یہ از غیب ساماں ہو گیا — دفعتہً شیرازۂ یورپ پریشاں ہو گیا
خودسری یورپ کی رکھی رہ گئی سب طاق میں — تو نے ہل چل ڈالدی معمورۂ آفاق میں

دھاک یورپ پر بٹھادی تو نے اپنے نام کی
لاج رکھ لی تیری تیغِ تیز نے اسلام کی

اے وہ یورپ نام جس کا ایشیا آزار ہے — اے کہ دُنیا کے لئے اک فتنۂ بیدار ہے
بڑھ چلا ہے حد سے تیری بربریت کا جنوں — مغربی تہذیب سے آنے لگی ہے بوئے خوں
نقش کر! دل پر کہ یہ تاریخ کا فرمان ہے — جور ہی مظلوم کی امداد کا سامان ہے
ظلم۔ ظالم سوز بن جاتا ہے خود انجامِ کار — بیکسوں کا خونِ ناحق سر پہ ہوتا ہے سوار
ایشیا جس کو کیا پامال تو نے اس قدر — تجھ سے اب آمادۂ پیکار آتا ہے نظر
اپنے خونخواروں پہ ہے تجھکو بہت کچھ فخر و ناز — بے سر و سامان ترکوں کی بھی دیکھی ترکتاز

ملتِ اسلام کے ان برق آشاموں کو دیکھ!
فطرۃِ خوابیدۂ مسلم کے ہنگاموں کو دیکھ!

تاجور نجیب آبادی

ترکوں کی جدوجہد آزادی کے لئے

اِس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ۱۹۱۹ء سے پیشتر ساڑھے چار سو برس تک جن لڑائیوں میں ترک یورپ والوں سے مصروفِ پیکار رہے ہیں وہ لڑائیاں یا تو سلطنت ترکی کو وسعت دینے کی غرض سے ہُوئیں یا اس متزلزل وسعت کو برقرار رکھنے کے لئے!

پھر اس امرِ واقعہ کو کون تسلیم نہ کرے گا کہ ۱۹۱۹ء سے لیکر تاحال گذشتہ تین سال میں جو جنگ بعض اہلِ مغرب اور ترکوں کے درمیان ٹھنی رہی ہے وہ اک مٹتی ہُوئی قوم کی جدوجہد تھی جس سے اُسے فقط اپنی ہستی کو قائم رکھنا مقصود تھا کہ یہ اُس کے نزدیک نہ صرف ایک ایسا حق تھا جو قدرت نے بلاامتیاز سب افراد و اقوام کو عنایت کیا ہے بلکہ جسے دُنیا کی مُدعی تہذیب قوموں نے کم ازکم ظاہرا طور سے پچھلے چند سالوں میں بیسیوں موقعوں پر صحیح تمدن کی اصل و بنیاد قرار دیا ہے!

ترکی اور جنگِ عظیم۔ ہمیں اس گتھی کو سُلجھانے کی ضرورت نہیں کہ سلطنتِ عثمانیہ جنگِ عظیم میں کیوں شریک ہُوئی؟ کیا اُس کے لئے بہتر ہوتا کہ وہ دُولِ وسطیٰ کے ساتھ شامل نہ ہوتی؟ کیا اُس آڑے وقت میں ترک مدبروں کے لئے نتائج جنگ کو پہلے سے دیکھ لینا ممکن تھا؟ لیکن یہ دنیا جانتی ہے کہ اکثر دُولِ یورپ مدت سے جنگ اور صلح ہر دو زمانہ میں علاقۂ ترکی پر اپنا قبضہ یا اثر قائم کرنے میں ہمہ تن مصروف رہی ہیں!

جب جنگِ عظیم شروع ہُوئی تو روس کی للچائی ہُوئی نگاہیں قسطنطنیہ پر جم گئیں چنانچہ مارچ ۱۹۱۵ء میں جو خفیہ معاہدہ رُوس برطانیہ اور فرانس کے درمیان ہُوا اور جس کے ساتھ شرکتِ جنگ کے بعد اطالیہ نے بھی موافقت ظاہر کی اُس میں تُرکی دارالسلطنت اور آبناؤں پر رُوسی "حقوق" کو تسلیم کیا گیا۔ دیکھئے کس طرح یہ قوی ہستیاں دوسروں کی ملکیت کے متعلق اپنے حقوق کا احساس کرنے لگتی ہیں! ۱۹۱۶ء کے موسمِ بہار میں اتحادیوں کے گلشنِ مسرت میں اُمید کا یہ نیا شگوفہ کھلا کہ انگلستان کو عراق عرب اور شام کے بعض حصے فرانس کو سواحلِ شام اور ولایت عدانہ وغیرہ اور رُوس کو ارضِ رُوم اور اناطولیہ کے تین اور صوبے اور کردستان کا کچھ علاقہ

حصے میں آیا۔ اسی سال ماہِ مئی میں جو سمجھوتہ انگلستان اور فرانس کے مابین ہوا اُس کی رُو سے گویا یہ طے ہو گیا کہ بہ حیثیتِ سلطنت ترکی اقتدار کا قلع قمع کر دیا جائیگا!

۱۰ر جنوری ۱۹۱۷ء کو اتحادیوں نے پریزیڈنٹ ولسن کے استفسار کے جواب میں کہا کہ ہمارے مقاصدِ جنگ میں ایک مقصد ترکوں کو قسطنطنیہ سے باہر نکال دینا ہے۔ اِس لئے کہ یہ لوگ ہمیشہ مغربی تہذیب و تمدن سے قطعی بے بہرہ رہے ہیں + اس کے تین ماہ بعد برطانوی فرانسیسی اور اطالوی وزرا کی ایک مجلس نے قرار دیا کہ اطالیہ کو مغربی اناطولیہ میں ایک وسیع علاقہ دیا جائے اور بتدریج وہ قونیہ اور سمرنا کو اس میں شامل کرلے لیکن التوائے جنگ کے بعد برطانیہ اور فرانس نے غالباً یہ عذر تراشا کہ چونکہ ہمارا حلیف رُوس اس فیصلے میں شریک نہ تھا ہم اُس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے!

آئندہ سال (۱۹۱۸ء) کے مارچ میں زاریت کا خاتمہ ہونے اور اپریل میں ممالکِ متحدہ (امریکہ) کے جنگ میں شریک ہو جانے سے ترکی کی طرف اتحادیوں کا رویہ تبدیل ہو گیا۔ نئی رُوسی حکومت نے اپنی قدیم حکومت کی شاہنشاہیت کو چھوڑ کر اوروں کے مال پر قبضہ جمانے کا ارادہ ترک کر دیا اور ادھر اتحادیوں نے دیکھا کہ اب صورت حال اَور کی اَور ہو گئی ہے اور حکمت کا تقاضا بھی ہے کہ ہم جمہوری اصولوں پر عمل کرنے کو آمادہ ہو جائیں + لائڈ جارج نے ۵ر جنوری ۱۹۱۸ء کو اپنی تقریر میں کہا کہ ہم ترکی سے اُس کا دارالسلطنت نہ چھینیں گے نہ ایشیائے کوچک اور تھریس کے علاقوں پر ہاتھ بڑھائیں گے۔ صرف یہ چاہیں گے کہ آبنائیں کھُلی رہیں۔ اور ترکی سلطنت کی محکوم قومیں اپنی جداگانہ قومیت حاصل کرلیں + جمہوری پریزیڈنٹ نے تین روز بعد اپنے مشہور "چودہ اصولوں" کو بیان کرتے ہُوئے اعلان کیا کہ سلطنتِ عثمانیہ کے ترکی حصے ترکوں ہی کے زیر اقتدار رکھے جائیں گے + ۳۰ اکتوبر کو اتحادیوں اور ترکوں کے درمیان التوائے جنگ کا اعلان ہو گیا اور ترکی نے بلاشرط ہتھیار ڈالدیئے +

یونانی سمرنا میں۔ اتحادیوں کے لئے یہ اک زریں موقعہ تھا کہ منصفانہ کارروائی سے اپنی نیک طینتی کا اظہار کرتے، لیکن انہوں نے موقعہ کو ہاتھ سے کھو دیا اور مشرق قریب کی طرف سے بے پروا ہو کر یونان کے چالاک وزیر موسیو وینی زیلاس کے چکمے میں آ گئے + اتحادی اطالیہ

کے ساتھ وعدہ تو کر چکے تھے کہ اناطولیہ کا بہت سا حصہ اُسے دیا جائیگا لیکن ایک زبردست طاقت کی بجائے ایک کمزور ملک کو قبضہ دے کر اپنا احسانمند بنالینا زیادہ مرغوبِ خاطر ہُوا۔ چنانچہ جب ۲۴، اپریل سے لے کر ۵ مئی ۱۹۱۹ء تک اطالوی سفارت عارضی طور پر پیرس سے غیر حاضر تھی تو اتحادیوں کی چشمک زنی پر یونانیوں نے ۱۵ مئی کو سمرنا کے ساحل پر اپنی فوج اُتار دی اطالوی اس سے چھ ماہ پہلے عدالیہ پر قابض ہو چکے تھے لیکن ایشیائے کوچک کا بہترین حِصّہ اب یونانیوں کی نذر کر دیا گیا۔ یونان و ترکی کے سب مصائب و آلام کا منبع و مرجع اتحادیوں کا یہی عقلمندانہ فیصلہ تھا!

مسٹر چارلز وُڈز اکتوبر ۱۹۲۲ء کے فورٹ نائٹلی ریویو میں لکھتے ہیں کہ وِنی زی لاس نے میرے سامنے خود اعتراف کیا کہ یونانیوں نے پہلے ہفتے میں زیادتیاں کیں، اتحادیوں نے اِن مظالم کی تفتیش کے لئے جو جماعت مقرر کی اُس کی رپورٹ کے شائع کرنے سے اُنہوں نے انکار کر دیا کیونکہ وہ یونان کے اعمالِ سیاہ کا ایک قطعی ثبوت تھی، یونانیوں نے سمرنا پر قناعت نہ کی بلکہ جب میدان صاف دیکھا تو بے دھڑک اندرونِ ملک میں بڑھتے چلے گئے، ان باتوں سے اناطولیہ میں عام بے چینی پھیل گئی اور بے دست و پا ہو کر ترکوں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ بجز لڑنے اور لڑتے لڑتے مرجانے کے اور کوئی چارۂ کار اُن کے لئے باقی نہیں رہا!

ترکوں کی حالت زار۔ ترکوں کے لئے صورتِ حال تاریک تھی۔ یاس انگیز تھی ہولناک تھی! فرانس ساحلِ شام پر قبضہ کئے ہُوئے تھا۔ انگریز قسطنطنیہ اور دردانیال پر متمکن تھے اطالیہ عدالیہ میں لنگر انداز تھا اور یونانی سمرنا پر قدم جما کر اناطولیہ کی شاداب و پُر فضا وادیوں میں بڑھے جاتے تھے۔ عراقِ عرب تو خیر ہاتھ سے جا ہی چکا تھا فلسطین بھی چھن گیا تھا۔ عرب بھی علیحدہ ہو چکا تھا لیکن اک اناطولیہ تو باقی رہ جاتا لائڈ جارج کے وعدوں کے کچھ معنی تو نکلتے ولسن کی اصول بازی کسی کام تو آتی! وہ ترکی قوم کی سلامتی کا یقین کیا ہُوا، وہ قومیت کے تقدس کا رُعب کیا فقط اک ہیچ و ناکارہ بُت ہی تھا جو یونان کے نبرد آزماؤں کے سامنے دو منٹ بھی نہ ٹھیر سکا؟؟

ترکوں نے جان لیا کہ سانچ کو آنچ پہنچ گئی۔ دُنیا میں ہوتی آئی ہے کہ جس کی لاٹھی اُسی

کی بھینس یہی ہمارے ساتھ ہوئی! دُنیا بھر کے زبردست لوگ ہم پر آپڑے۔ اب جائیں تو کدھر اور کریں تو کیا؟ کوئی دادرس نہیں کوئی فریادرس نہیں! نہ زر ہے نہ زور ہے فقط اک اپنے ہی نالوں کا شور ہے سو وہ بھی لاحاصل!

غیب سے آواز آئی "ہمت ہے کہ نہیں"؟ "آبرو کا خیال ہے یا نہیں ہے"؟ اگر ہے تو اُٹھو ورنہ جو کچھ رہ گیا وہ بھی جاتا رہیگا۔ پھر پچھتاؤ گے کہ ایسی زندگی سے تو موت کہیں بہتر تھی۔ جتنے دنوں جیتے ہو عزت کے ساتھ جیو۔ یہ نہ ہو سکے تو عزت ہی کے لئے جان دے دو کہ یہی بہترین زندگی اور یہی بہترین موت ہے!

اس آواز کو سُن کر جو اہلِ دل اُٹھے اُن کا سرگروہ وہ بطلِ حُریت تھا جسے آج مُصطفےٰ کمال کے نام سے مہذب دُنیا کا بچہ بچہ جانتا ہے!

تحریکِ آزادی کا آغاز۔ مصطفیٰ کمال (جسے قسطنطنیہ سے جلاوطن کرنیکی غرض سے داماد فرید کے اتحادی احکام بجالانے والے کابینۂ وزارت نے مشرقی ترکی فواج کا انسپکٹر مقرر کر دیا تھا) بحیرۂ اسود کے ترکی بندر سمسون پر اُترا تو اُسے خبر ملی کہ یونانی چوبیس گھنٹے پیشتر (۵ امئی ۱۹۱۹ء کو) سمرنا میں داخل ہو چکے ہیں۔ کمال نے اپنے دل سے فیصلہ کرلیا اور وہیں آزادی کی تحریک شروع ہوگئی۔ ترکوں کی جمعیت تتر بتر ہو چکی تھی، اتحادی مُلک کے مختلف اطراف میں سیاہ بادلوں کی طرح چھائے ہُوئے تھے، فوج بے ترتیب ہوگئی تھی، نہ کوئی قومی حکومت تھی نہ کوئی ایسی ملکی مجلس جو بیرونی اثرات سے محفوظ ہو کر اطمینان اور بے باکی کے ساتھ وطن کی بہتری پر غور کر سکتی۔ ترکی وطن کے دشمنوں میں یورپ کی سبھی زبردست طاقتیں تھیں اور اُس کے دوست وہی دُنیا کے بے دست و پا مسلمان جو صرف خدا کے حضور وقارِ قومی کے لئے دعائیں مانگ سکتے ہیں! ایسے ترتیب و تہذیب یافتہ ایسے اپنی ہٹ کے پکے اپنی قوت سے مخمور مخالفین کا مقابلہ کیونکر ہو؟ ترک تہی دست ہیں۔ غنیم اپنے اور دُوسروں کے مال سے لدا ہُوا ہے! مصطفےٰ کمال نے اپنی جبلّی تیزی کے ساتھ مدافعت کی تیاریاں شروع کیں۔ ایک مرکز سمرنا کے قریب علاقہ آدین کو بنایا جہاں رنگروٹ بھرتی کئے جانے لگے دوسرا مرکز دُور شمال مشرقی ولایتوں میں بنا جہاں باقاعدہ

فوج کے بچے کھچے جنگجوؤں کو اکٹھا کر کے ایک زبردست فوج کی بنیاد ڈالی گئی۔ ارضِ روم میں ایک کمیٹی بنائی گئی اور رفعت بے اور علی فواد پاشا کے ساتھ مل کر سمسون اور سواس کے بندرگاہوں کو اجنبی گرفت سے بچا لیا گیا۔ سمسون میں انگریز قابض ہونے کو تھے۔ انگریزی کرنل کنارے پر اُترا تو اُس نے رفعت اور اُس کے ہمراہیوں کو اِدھر اُدھر گشت لگاتے دیکھ کر خیال کیا کہ یہ کسی بڑی ترکی جمعیت کا پیش خیمہ ہیں۔ چنانچہ اس ڈر سے وہ اپنے جہازوں کو لے کر لوٹ گیا اور قوم پرستوں نے اپنی پہلی فتح حاصل کی۔ لیکن اتحادی اتنی جلد پیچھا چھوڑنے والے نہ تھے، لندن میں قوم پرستوں کے نام پر ارباب حکومت مسکراتے تھے کہ یہ کم مایہ لوگ دولتِ برطانیہ کا کیا مقابلہ کرینگے۔ مصطفیٰ کمال نے قسطنطنیہ کی حکومت کے پاس اپنا استعفا بھیج دیا اور اپنے فوجی عہدوں کو خیرباد کہی۔ انگلستان کے اصرار پر حکومت نے اُسے باغی قرار دیا اور سُلطان نے اپنے خوانینِ اعزازی کے زمرے سے اس کو نکال دیا۔ قوم پرستوں نے آخری بار (۱۵ جولائی) کوشش کی۔ کہ خلیفۃ المسلمین کو اپنے مقاصد سے آگاہ کر کے اُسے اپنا مُربّی بنالیں اور کہا کہ ہم تمام دُنیا کو قومِ عثمانی کی شجاعت دکھا دینگے اور کسی کے مٹائے ہرگز نہ مِٹینگے۔ وہاں سے کچھ جواب نہ پاکر طوعاً و کرہاً یہ لوگ حکومتِ قسطنطنیہ سے الگ ہو گئے اور آپ اپنی مدد کرنے پر آمادہ ہُوئے۔

ماہِ جون میں اتحادیوں نے حکومتِ قسطنطنیہ کو پیرس میں اپنا نمائیندہ بھیجنے کی دعوت دی۔ لیکن جب داماد فرید پاشا جیسے نرم مزاج مُدبّر نے بھی قبلِ جنگ کی حالت کو شرائطِ صلح کی بنیاد قرار دیا تو اتحادیوں نے اُسے خوب ڈانٹا اور وہ اپنا سا منہ لے کر لوٹ آیا۔ ۲۷ نومبر کو بلغاریہ کے ساتھ وہ صلحنامہ ہُوا جس کی رُو سے بلغاری حدود ایڈریانوپل سے پرے پرے قائم کی گئیں۔

اُدھر مصطفیٰ کمال نے جولائی یا اگست ۱۹۱۹ء) میں ارضِ روم میں ایک قومی کانگریس مدعو کی۔ ستمبر میں بمقام سواس اس کانگرس کا دوسرا اجلاس منعقد ہُوا۔ اور سال کے اخیر سے پہلے پہلے قومی آزادی کی تحریک منضبط ہو کر قوم کے منتشر شیرازے کو جمع و مرتب کرنے لگی۔

قوم پرستوں کی جنگی تیاریاں۔ چھاپہ مارنے والی جماعتیں تیار کی گئیں۔ اندرون ملک میں ڈاک اور تار کے سلسلوں پر قبضہ کر لیا گیا اور چند ہی ہفتوں میں مغربی اناطولیہ قوم پرستوں کے زیر نگرانی آگیا۔ بغداد کی طرف انگریزوں کی چالیس ہزار فوج علی فواد کے پندرہ سو سرکیشی سواروں کے آگے پیچھے کو ہٹنے لگی۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء میں لڑائی کے دو محاذ قرار پائے ایک سمرنا اور آدین کے علاقے میں دوسرا بغداد کی طرف۔ دونوں میں انگلستان سے مقابلہ تھا ایک میں بالواسطہ دوسرے میں بلاواسطہ۔ حملہ آور آہستہ آہستہ ہٹتے گئے اور کمالئے اپنا قبضہ جماتے گئے۔ جرمن ملک کے مختلف مقامات میں جو بارود گاہیں چھوڑ گئے تھے اُن پر قبضہ کیا گیا۔ قفقاز میں جس سامان حرب کو بوقتِ التوائے جنگ انگریزوں نے اپنے قابو میں لے لیا تھا وہ ترکوں نے چھین لیا اور اُدھر اطالیوں نے عدالیہ اور قونیہ کے رستے ہر قسم کے آلات و ذخائرِ حرب کے آنے کی عام اجازت دیدی۔ کمال پاشا ان ابتدائی فتوحات سے مسرور ہوکر مغرور نہیں ہوگیا۔ وہ ہر وقت صلح کرنے کو تیار رہتا تھا اُس نے فرنساوی افسروں کے سامنے سلسلۂ گفت و شنید میں اپنے مقاصد سینکڑوں بار صاف و صریح طور پر بیان کئے۔ لیکن یونانیوں ارمنوں اور اُن کے مغربی دوستوں کی سازشوں کے شور و شر میں کسی مشرقی آواز کو لندن و پیرس میں کون سُنتا تھا؟ بتدریج مصطفیٰ کمال کو یقین ہونے لگا کہ ان لوگوں سے انصاف چاہنا سعی لاحاصل ہے۔ سو بغیر خیالِ صلح ترک کئے وہ ایشیا کی جانب متوجہ ہوا کہ وہاں اتحادِ اسلامی کا وہ سلسلہ قائم کرے جس سے آڑے وقتوں میں قومی محافظت اور ہمدردی کا کام سرانجام ہو۔

اتحادی اور قسطنطنیہ۔ اس اثناء میں یورپ کے زبردست صلح باز اپنی ریشہ دوانیوں کے ساتھ مصروف تھے۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں موسیو کلا مانسو لندن میں آیا اور وہاں قرار پایا کہ ترکوں کو "مع ساز و سامان کے" یورپ سے نکال دیا جائے لیکن اس فیصلے سے اسلامی دنیا میں ایسی ہلچل مچ گئی کہ ۲۶ رفروری ۱۹۲۰ء کو لائڈ جارج اپنی تقریر میں یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ اتحادیوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ترک قسطنطنیہ ہی میں رہیں اور یہ بھی کہا کہ ہمارا جنوری ۱۹۱۸ء کا وعدہ کہ ترکی علاقہ ترکوں سے چھینا نہ جائے گا صرف ترکوں کو ترغیب دینے کی غرض سے اک تجویز

کا پیش کرنا نہ تھا بلکہ اس سے فقط ہمیں اپنے لوگوں کو یہ بتانا مقصود تھا کہ ہمارے مقاصدِ جنگ و جدال کیا ہیں۔ یہ بھی کہا کہ اس بیان کے تیار کرنے میں نہایت احتیاط سے کام لیا گیا تھا۔ اور یہ بیان قطعی اور غیر مشروط تھا اور اسے قوم کے سب فرقوں کی مرضی سے دُنیا کے سامنے پیش کیا گیا تھا"۔ اسی مُدبّرِ متلون مزاج نے بعد میں اپنے بیان کی تاویل اس طور پر کرنی چاہی کہ یہ تجویز فقط مشروط تھی۔ مشروط کیسے تھی؟ یہ انہیں حضرت کے خیالات کی کشمکش جانتی ہو گی۔

نومبر اور دسمبر ۱۹۱۹ء میں انگریز سلیشیا اور شام سے ہٹ گئے اور اُن کی جگہ فرانسیسیوں نے لی۔ ان لوگوں نے ترکوں کے خلاف ارمنی فوج کا استعمال کیا جس کی وجہ سے وہاں کے مسلمانوں نے برافروختہ ہو کر ترکانِ احرار کو اپنی مدد کے لئے طلب کیا اور فرانسیسیوں کو مجبوراً پسپا ہونا پڑا۔ اتحادیوں نے بیچاری قسطنطنیہ کی حکومت کو ذمہ دار قرار دے کر شہر پر زیادہ مضبوطی کے ساتھ قبضہ کر لیا تمام ترکوں کو جو قوم پرست حکومت کے نام لیوا تھے گرفتار کر کے مالٹا کو جلاوطن کر دیا اور سلطان کو مجبور کیا کہ مجلسِ شوریٰ کو (وہ مجلسِ شوریٰ جس نے ۲۸ جنوری ۱۹۲۰ء کو مصطفیٰ کمال کا مشہور قومی پیمان منظور کیا تھا) برخاست کر دے۔ ۱۶ مارچ کی وہ رات قومی تاریخ میں یادگار رہیگی جب بیسیوں قوم پرست جو اتحادی گرفت سے ابھی تک محفوظ رہے تھے دارالسلطنت سے بھاگ نکلے۔ اور کمال کے گرد انگورا میں آ جمع ہوئے۔ ۱۱ اپریل کو شیخ الاسلام نے فتویٰ دیا کہ قوم پرست باغی ہیں اور وزیرِ اعظم نے قومی تحریک کے خلاف فرمان نافذ کیا۔ اسی ماہ میں انگورا میں مجلسِ قومی قائم کی گئی اور ۲۳ کو اُس کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں پیمانِ قومی کو باقاعدہ طور پر منظور کر کے اُس کا اعلان کیا گیا۔ ان واقعات سے قسطنطنیہ اور انگورا میں علانیہ طور پر قطعِ تعلق ہو گیا اور قوم پرستوں کو آزادی مل گئی کہ وطن کے لئے جو چاہیں کریں۔ اُسے بچائیں یا خود بھی طوفانِ تباہی میں غرق ہو جائیں!

اتحادی اور یونان۔ ۲۷ اپریل کو اتحادیوں نے اپنے بڑے چیلے موسیو وینی زی لاس کے چکمے میں آ کر ترکوں کے گلے پر کند چھری پھیر دی یعنی بمقام سان ریمو اُن اصولوں پر اتفاق رائے ہو گیا جو مستقبل میں علاقۂ ترکی کے لئے بمنزلہ بین الاقوامی قانون کے ہونگے۔ اس فیصلہ

کا فوری نتیجہ یہ ہُوا کہ تُرکانِ احرار کمر بستہ ہو کر اپنے قومی کام میں پوری جانفشانی سے لگ گئے کیونکہ انہوں نے جان لیا کہ اب بجز آپ اپنی مدد کرنے کے اور کوئی رستہ فلاح یا بقائے حیات کا نہیں رہا۔ ۲۸ رمئی تک یونانیوں نے مغربی تھریس اور جولائی کے اخیر تک مشرقی تھریس پر اپنے قدم جمالئے۔ لیکن اتحادیوں نے دیکھا کہ بغیر زبردستی کے اناطولیہ میں اُن کے فیصلہ کو کوئی نہیں مانے گا لہذا انہوں نے ایک اور فیصلہ یہ بھی کیا کہ ہمارے فیصلے کو منوانے کے لئے یونان کو اجازت ہے کہ اناطولیہ میں اپنا کام کرے۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ باوصف مارشل فاش اور سرہنری ولسن کی مخالفت کے موسیو وِنی زیلاس کی رائے کو وقعت دی گئی اور ۲۲ رجون تک یونان کو حملے کے لئے اذنِ عام مل گیا۔

ترکی یونانی جنگ۔ پہلا دور۔ تُرکی یونانی جنگ چار حصّوں پر منقسم کی جاسکتی ہے۔ پہلے دور میں یونانی شمال میں اسمد کی طرف اور مغرب میں سمرنا کے علاقے میں بڑھے۔ وہ ۸ جولائی کو بروصہ میں اور ۲۹ راگست کو اوشک میں داخل ہوئے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد انہیں اسمد سے ہٹنا پڑا۔ اس دوران میں پیرس میں صلحنامۂ سیور پر (۱۰ راگست کو) دستخط ثبت ہو گئے اور برطانیہ فرانس اور اطالیہ نے اناطولیہ کو اپنے اپنے اثر کے علاقوں میں تقسیم کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ اطالیہ اس انتظام بندی پر راضی نہ تھا اور یونان کو یہ رعائتیں زیادہ تر اس غرض سے دی گئیں تا کہ حضرتِ وِنی زیلاس کو اپنے وطن میں عزت حاصل ہو۔ اور اُس کا اقتدار بڑھے۔ لیکن قسمت کے کئے سے کیا چارہ ہو سکتا ہے۔ شاہِ یونان کو ایک بندر نے کاٹ کھایا اور اُس کے مرنے کے بعد شاہِ قسطنطنین جو گویا اپنے نام کے ساتھ ازل ہی سے قسطنطنیہ کو وابستہ کئے ہُوئے تھا ۱۹ دسمبر کو ایتھنز میں جلوہ افروز ہُوا۔ اس واقعہ سے اتحادیوں اور بالخصوص فرانسیسیوں کا رویہ تبدیل ہو گیا۔ وہ اس جرمن دوست فرمانروا کو پسند نہ کرتے تھے۔ اُن کے دل میں یہ خیال پیدا ہونا شروع ہُوا کہ عہدنامۂ سیور کی کم از کم ترمیم ضروری ہے۔ اس کا نتیجہ لندن کانفرنس تھی جس میں کچھ اختلافِ رائے کے بعد بالآخر انگورہ کا سفیر بکر سمیع بے ہی سلطنتِ عثمانیہ کی نمائندگی کرتا رہا۔ یہ کانفرنس اخیر فروری سے شروع مارچ ۱۹۲۱ء تک قائم رہی۔ ترکوں نے اتحادیوں کی یہ تجویز کہ ایک بین قومی

کمیشن علاقۂ متنازعۂ فیہ کی قومیت کے متعلق تحقیقات کرے منظور کر لی لیکن یونانیوں نے اُسے مسترد کر دیا۔ اگرچہ اتحادیوں کی بعد کی تجاویز میں تُرکوں کو مُراعات دینے کی جھلک پائی گئی لیکن فریقین کسی فیصلے پر راضی نہ ہو سکے۔ جانے سے پہلے بکر سمیع بے نے خفیہ طور پر فرانس اور اطالیہ سے دو عہد نامے کئے جن کی رُو سے فرانس سلیشیا کے تخلیے پر راضی ہو گیا۔ اور اطالیہ نے وعدہ کیا کہ وہ سمرنا اور تھریس کے معاملے میں تُرکی مطالبات کی داد دے گا اور اس امداد کے معاوضہ میں ان دونوں کو تُرک مشرقی و مغربی اناطولیہ میں تجارتی حقوق عطا کریں گے۔ انگورہ کی حکومت نے ان معاہدوں کو نامنظور کر دیا لیکن ان سے یہ ضرور ہُوا کہ فرانس اور اطالیہ کے خیالات میں ایک بڑی تبدیلی کا پتہ چل گیا۔ اس کے ساتھ ہی کمالیوں نے ۱۶ر مارچ کو دولتِ رُوس کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جو اپنے آئندہ اثرات کے لحاظ سے غایت درجہ اہمیت رکھتا تھا۔ آرمینیا سے تو تُرک پہلے ہی نبٹ چکے تھے ۱۹۲۰ء کی فروری میں اُس سے جنگ چھڑی اور ۱۱ر نومبر کو آرمنوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اب جارجیا پر حملہ کرنے کے بعد یہ نیا معاہدہ سوویٹے کے ساتھ ہُوا جس کی رد سے رُوس نے وعدہ کیا کہ وہ کسی عہد نامہ کو جو ترکوں کے پیمانِ قومی کے خلاف ہوگا یا جو اُن کی مجلسِ قومی کو منظور نہ ہوگا نہ مانیں گے۔ اُدھر تُرکی حکومت نے کہا کہ آبناؤں کی آمدورفت کے سوال میں بحیرۂ اسود کے ساحلی مُلکوں کی رائے کو نظر انداز نہیں کیا جائیگا۔ اس شرط کے ساتھ کہ تُرکی حکمرانی مکمل طور پر تسلیم کی جائے گی۔

دوسرا دور۔ تُرکی یونانی جنگ کا دُوسرا دَور اس طرح شروع ہُوا کہ یُونان نے ایک ماہ کی مہلت سے (جو لندن کانفرنس میں مقرر ہُوئی تھی) پہلے ہی ۲۳ر مارچ ۱۹۲۱ء کو اناطولیہ میں پیش قدمی کا بول بالا کر دیا اور شمالی اور مغربی ہر دو محاذ پر حملہ کیا۔ افیون قرہ حصار فتح ہو گیا اور عسکی شہر کے شمال کی طرف بھی ترک پسپا ہُوئے لیکن دو ہی ہفتے کے اندر ترکوں نے جوابی حملہ کیا اور سارا کھویا ہُوا علاقہ واپس لے لیا۔ اتحادیوں نے دلیر یونانیوں کو پٹتا دیکھ کر صلح صفائی کرا دینے کا پیام بھیجا لیکن ان لوگوں کا سرا بھی غرور سے بھرا ہُوا تھا۔ اکڑے اور انکار کر دیا (جون ۱۹۲۱ء)۔

تیسرا دور۔ اس جاہلانہ جنگ کا تیسرا دور یونانیوں کی جارحانہ کارروائی سے شروع ہوا ۱۱ر جولائی کو یونانی بڑھے۔ ۱۹ر کو عسکی شہر اور افیون فتح ہوگئے اور ۱۴ر اگست کو یونانی بڑی سرعت کے ساتھ انگورا کی طرف دھاوے مارتے ہوئے چلے۔ انصاف پسند اتحادیوں نے اعلان کر دیا کہ ہم کسی کی طرف داری نہیں کرینگے۔ دُنیا دیکھ رہی تھی کہ ترکوں کی شجاعت و حریت اپنے بستر مرگ پر پڑی دم توڑ رہی ہے اور چند ہی دن میں اسلام کا آخری ملجا و ماوا سر ہونے کو ہے۔ ترکوں نے دریائے سقاریہ کے اُس پار اپنے قدم جمائے اور کمال پاشا کی قیادت میں اک شدید مقابلے کا تہیّہ کیا۔ وہ ۵۷ میل تک یونانیوں کے سامنے ہٹتے چلے آئے تھے اور اب انگورا سے صرف چالیس میل کے فاصلے پر سقاریہ کے کنارے اُن کے وطن کی قسمت کا فیصلہ اُن کی شجاعت و مردانگی کے ہاتھوں ہونے کو تھا۔ اگر میدان دشمن کے ہاتھ رہا تو ترک، تُرکوں کا وطن، وطن کی آبرو، مذہب و ملت سب کے گلے پر کُند چھری پھر جائے گی۔ اُن کے لئے بہتر یہی ہے کہ اگر بازی ہار دیں تو جان بھی توڑ دیں۔ مُلک کو نہ بچا سکیں تو خود تباہ و برباد ہو جائیں۔ اُن کا قائد بھی اناطولیہ کی خاک کا سب سے زیادہ درخشاں موتی تھا۔ اُس کی تابش کے ساتھ سیاہ دل عدو کی آنکھوں کو چندھیا دینا کچھ دشوار ہو لیکن ناممکن یا غیر اغلب نہیں تھا۔ ترک شمالاً جنوباً اپنا محاذ قائم کئے ہوئے تھے یونانیوں نے دریا کو اُن کے جنوب کی طرف عبور کر کے اُن کے میسرہ پر حملہ کیا اور چاہا کہ دھاوا کر کے غنیم کے عقب میں جا پڑیں۔ یونانی مشرق کی طرف پچاس میل تک بڑھتے گئے لیکن ترکوں کا میسرہ اُن کی گرفت سے دُور ہی رہا حالانکہ اُن کا میمنہ برابر وہیں قائم تھا۔ ترکی فوجی محاذ اب شرقاً غرباً پھیلا ہوا تھا۔ یونانیوں نے ۱۲ روز تک حملے پر حملہ کیا لیکن غنیم کی فوج میں اپنے قائد کا ضبط و استقلال برقی رو کی طرح دوڑ چکا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ اُن کی عقبی حرکت کسی طرح کامیاب نہیں ہو سکے گی یونانی ۱۲ر ستمبر کو دریا کو دوبارہ عبور کر کے لوٹے اور دس دن کے بعد پھر عسکی شہر اور افیون قرہ حصار کے سامنے اپنے پرانے مقام پر پہنچ گئے۔ کلیئر پرائس لکھتا ہے کہ یہ جنگ کسی روز دُنیا کے سب سے زیادہ شدید معرکوں میں شمار ہوگی۔ کمال نے دردانیال کے بعد اس لڑائی میں اپنا جنگی کمال دکھایا اور مہذب دُنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔

انگورہ والوں پر اپنی قوت اور دشمن کی کمزوری عیاں ہوگئی اور اُن کی حکومت نے دو عہد نامے کئے۔ ایک اکتوبر میں آذربیجان آرمینیا اور جارجیا کی جمہوری حکومتوں کے ساتھ ہُوا جس (عہدنامۂ قارص) کے مطابق ترکوں کو سوائے باطوم کے وہ تمام علاقہ مل گیا جو وہ ۱۸۷۸ء میں کھو چکے تھے۔ دوسرا جو فرانس کے ساتھ ہُوا اور فرانس نے نہ صرف سلیشیا خالی کر دیا بلکہ ترکی حکمرانی کو عام طور پر تسلیم کر کے انگورہ کو ایک خود مختار ریاست سمجھ لیا۔ قوم پرستوں کا مرتبہ اور کا اور ہو گیا اور یونانی وزیر اعظم نے موسمِ خزاں میں لندن پہنچ کر اپنے ملک کی قسمت کا فیصلہ اتحادیوں کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ مارچ ۱۹۲۲ء میں پیرس کانفرنس نے قرار دیا کہ التوائے جنگ ہو کر یونانی ایشیائے کوچک کو خالی کر دیں اور ترکوں کو آبناؤں کے متعلق کچھ زیادہ آزادی دی جائے۔ یونان کے بدقسمتوں نے تخلیئے پر ناک بھوں چڑھائی اور اُدھر مصطفیٰ کمال نے مطالبہ کیا کہ یونانی بلا شرط و بلا توقف ترکی علاقہ خالی کر دیں۔ جولائی کے اخیر میں یونان نے اتحادیوں کے نام دو پروانے بھیجے۔ پہلے میں لکھا کہ چونکہ صلح کی کارروائی لاحاصل رہی ہے اس لئے ہم اپنے تئیں آزاد سمجھتے ہیں کہ جو مناسب سمجھیں کریں۔ دوسرے میں بتایا کہ مناسب بات یہی ہے کہ ہم قسطنطنیہ پر قبضہ کرلیں تاکہ صُلح کی صورت پیدا ہو جائے۔ اتحادیوں نے کڑا جواب دیا۔ کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔

چوتھا اور آخری دَور۔ ۴۔ اگست کو مسٹر لائڈ جارج نے دارالعوام میں ایک پُرخروش تقریر کی جس میں اپنے یونانی بھائیوں کی شجاعت و تہذیب و انسانیت کو سراہا اور باغی کمالیوں کی زیادتیوں اور زبردستیوں کی دلخراش داستان چھیڑ کر یورپ سے بڑی رقت کے لہجے میں کہا کہ یونان کا ایثار لائق تحسین و آفرین ہے اور تُرکوں کی ضد سراسر قابلِ الزام! دُنیا نے یہ پیام سُنا یا نہ سُنا لیکن کمال پاشا نے ضرور سُنا۔ سُنا اور لبیک کہا!

جنگ کا چوتھا اور آخری دور اگست ۱۹۲۲ء کے اخیر میں شروع ہُوا۔ اور دو اڑھائی ہفتے میں انجام کو پہنچ گیا۔ کمال پاشا نے افیون قرعہ حصار کے جنوب مغرب میں سوا لاکھ تُرک فوج جمع کی۔ پہاڑی علاقے کے نشیب و فراز میں ترکوں کی یہ فوج یونانی ہوا باز وں

کی نظروں سے اوجھل رہی اور خود یونانیوں نے بعد میں کہا کہ حملہ ہونے سے تین دن پیشتر تک ہم قطعی بے خبر تھے کہ کیا ہونے والا ہے + اُدھر افیون کے شمال مشرق میں ترکی سوار فوج قائم کی گئی تھی + ۲۳ راگست کو محاذ پر مختلف مقامات میں ترکوں نے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ اُدھر اسمد پر حملہ کیا اِدھر کوتاہیہ کے قریب نقل وحرکت کی یونانی نہ سمجھے کہ حملہ کہاں ہوگا + ۲۶ راگست کی صبح کو ترکوں نے افیون پر شدید حملہ کیا۔ حملے سے پہلے ترکی توپوں کی گولہ باری نے محمدؐ فاتح قسطنطنیہ کی یاد تازہ کردی اور ترکی ہوائی جہازوں کی تاخت سے صاف پتہ چلنے لگا کہ ترک تازہ ترین آلاتِ حرب سے مسلح ہیں اور جان چکے ہیں کہ "مہذب" دشمنوں سے مقابلہ کیونکر ہونا چاہیئے + شہر کی محافظ یونانی فوج مستعدی سے لڑی لیکن اُن کے بائیں طرف کو چوتھا رسالہ بھاگ نکلا +

۲۷ رکو افیون فتح ہوگیا۔ یونانی "فوجِ اول" پسپا ہوئی۔ "فوج دوم" بھی پیچھے کو ہٹی۔ اُن دونوں کے درمیان چوتھے رسالے کی فراری کی وجہ سے ایک خلا پیدا ہوگیا تھا۔ ترکی سوار فوج شمال مشرق سے نکلی۔ اس خلا میں گھس گئی اور فوجِ دوم پر شمالی جانب میں زور کا حملہ کیا۔ فوج بھاگی اور کوتاہیہ پر جا ٹھہری۔ یہ شکست بھی پسپائی نہ تھی بلکہ قطعی فرار کی شکل میں تھی + ترکی سوار کافی تیزی کے ساتھ تعاقب نہ کرسکے اور فوج اول اس توقف کے دوران میں جان بچاکر نکل گئی + فوجِ دوم اعلیٰ شہر میں تنظیم پاکر مقابلے کو کھڑی ہوئی لیکن فوجِ اول سے مدد حاصل نہ ہوسکنے کے باعث ترکوں کے حملے کی تاب نہ لاسکی اور دو روز کی لڑائی کے بعد اوشک کی طرف مراجعت کرگئی + ترکوں نے ایک فوج کو دوسری سے قطعی طور پر جُدا کردیا۔ اور پھر اُن پر حملہ کرکے انہیں تتر بتر کردیا + اِس دوڑ میں یونانیوں نے سارا توپ خانہ اور سامانِ حرب وغیرہ پیچھے چھوڑ دیا اور سمندر کی طرف جس قدر سرعت کے ساتھ ہوسکا۔ راہِ فرار اختیار کی + پھر طرہ یہ کہ نیا یونانی قائد اعظم اپنے نقشے پھیلائے منصوبۂ جنگ سوچ رہا تھا کہ ترک اُس پر آپڑے اور وہ قید کرلیا گیا + ترکوں کی بہادری کمال پاشا کی قیادت اور یونانیوں کی کوتاہ اندیشی یہ باتیں اس جنگِ مختصر کے اختصار کا باعث تھیں + ۲۷ راگست کو کمال پاشا نے پیش قدمی کا حکم دیا ۹ ستمبر سے پہلے بچی کھچی یونانی فوج سمرنا کے بندرگاہ میں گرتی پڑتی

اپنے تیز رفتار جہازوں پر سوار ہوگئی۔ ساٹھ ستر ہزار یونانی قیدی ترکوں کے ہاتھ آئے اور دُنیا بھر میں ترکی شجاعت و فراست کا ڈنکا بجنے لگا۔

اس غیر متوقع یونانی شکست سے یورپ کے یونان پسندوں میں ایک ہولناک تہلکہ مچ گیا۔ بہتیرا بھاگے دوڑے اور اُچھلے کودے مگر دُور ہی دُور سے دانت پیسنے سے کیا ہوسکتا تھا۔ آندھی کی طرح اُٹھے تھے مگر گرد کی طرح بیٹھنا پڑا۔ لائڈ جارج جو قدامت پسندوں یا جدّت طرازوں کے ہزار جتنوں سے اپنی کرسی زور و طاقت سے اُٹھائے نہ اُٹھتا تھا۔ کمالی حملے کے ایک دھکے سے بل کھا کے گرا اور ایسا گرا کہ پھر نہ اُٹھ سکا۔ برطانوی نوآبادیوں کو اُس نے اس یاس و غصہ کی حالت میں پکارا کہ بھاگو "دوڑو کمال چال قیامت کی چل گیا"۔ اور کسی نے جواب دیا کسی نے حیلہ بہانہ کیا لیکن نہ کسی کو آنا تھا نہ کوئی آیا۔ اُدھر فرانس اور اطالیہ جو پہلے ہی کمالیوں سے ہمدردانہ سلوک کرنا چاہتے تھے دردانیال سے اپنی اپنی فوجیں لے گئے بلکہ حکم دیا کہ ہمارے جھنڈے بھی وہاں سے اُکھاڑ لئے جائیں۔ انگریز اڑے رہے کہ آبناؤں کی آزادی کے ہمیں محافظ ہیں۔ قریب تھا کہ لڑائی چھڑ جائے لیکن انگریزی مقامی جرنل اور کمال پاشا کی دوربینی اور سرد مزاجی نے حالات کو بدتر نہ ہونے دیا اور بالآخر ۱۳ اکتوبر کو بمقامِ مدانیہ کانفرنس ہوئی جس میں فیصلہ ہوا کہ یونانی تھریس خالی کردیں اور ترک تھوڑے دنوں کے بعد اُن کی بجائے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ مشرقی رُدس اپنے حلیف کی امداد پر تُلا ہوا تھا۔ اور ترکوں کا پلّہ بھاری تھا لیکن کمال کی فراست نے صلح و جنگ کی ڈور باگ اپنے ہاتھ میں رکھی۔

یہ فیصلہ کیا گیا کہ سوئٹزرلینڈ میں بمقام لوزان ایک کانفرنس منعقد کی جائے جس میں مشرقِ قریب کا مسئلہ آخری بار طے ہو اور دُنیا میں پھر امن و امان قائم ہو جائے۔ خدا کرے یہ مدت کا جھگڑا کہیں ختم ہو اور مشرق و مغرب کے لوگوں میں ایک دُوسرے کے لئے رواداری اور خود اختیاری کا خیال پیدا ہو کر اُسے دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی جائے۔

ترک کیا چاہتے ہیں؟ یہی کہ وہ تمام ترکی علاقے پر بلا شرکتِ غیرے اپنی کامل حکمرانی قائم کرلیں اور کسی قسم کی حکم برداری منظور نہ کریں۔ ترکوں کے دوستوں سے دوستی پیدا

کریں اور دشمنوں سے بچے رہیں۔ ملک کے نظم ونسق میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔ تعلیم اور صنعت وحرفت میں کسی سے پیچھے نہ ہوں۔ قوم کے نظامِ سیاسی میں جو کمیاں ہیں اُنہیں پورا کریں۔ جو باتیں محنت اور استقلال سے حاصل ہوتی ہوں اُنہیں محض جوش وخروش سے پا لینے کی خام آرزو کو دل میں جگہ نہ دیں۔ غیروں کی زیادتیوں سے برافروختہ ہو کر انہیں موقع نہ دیں کہ وہ ترکوں کو مہذب دُنیا میں غلط طور پر بھی وحشی پکار سکیں۔ اپنی عورتوں کو تعلیم و تہذیب کی شاہراہ پر لگادیں اور اُن کے غصب شدہ حقوق کے بحال کرنے میں ہر ممکن کوشش کریں۔ اپنے ملک کی برّی وبحری قوت کو برقرار رکھیں اور تازہ ترین انکشافات و ایجادات سے مستفید ہو کر فریب کار غنیم کے ساتھ لڑائی میں پورے اُتریں۔ اس کے ساتھ ہی دُنیا کو علی الاعلان بتادیں کہ ہم ایک آزاد قوم ہیں ہم آزادی سے محبت رکھتے ہیں۔ ہم جئیں گے تو آزادی میں اور جان توڑیں گے تو آزادی ہی کا دم بھرتے ہوئے۔

بشیر احمد

آزادی

میرا وطن وہیں ہے جہاں آزادی ہو۔

آزادی کی محبت دل کے رگ وپے سے ہمکنار رہے۔

آزادی خدا کی طرف سے ہے آزادیاں شیطان کی طرف سے۔

سچی آزادی وہیں ہے جہاں عدل سب کو برابر میسر ہو سکتا ہے۔

جہاں غلامی ہے وہاں آزادی نہیں رہ سکتی اور جہاں آزادی ہے وہاں غلامی کے لئے مطلق گنجائش نہیں۔

وہ خدا جس نے ہمیں زندگی دی اُس نے اُسی وقت میں ہمیں آزادی بھی دی۔

آزادی کی قیمت کیا ہے؟ ہر وقت اُس کی نگہداشت کرنا۔

آزادی سودمند اُسی وقت ہوتی ہے جب وہ محدود ہو۔

قفس کی چڑیا نصف چڑیا بھی نہیں!

دولتِ انگورہ

جب کسی قوم کا شیرازہ منتشر ہوتا ہے تو اس کے اِدارات ربط وضبط سے مُعرّا اور اُس کے کارنامے صبر واستقلال سے خالی نظر آنے لگتے ہیں۔ تنظیم وتنسیق اُسی وقت پیدا ہوتے ہیں جب قوم کے رگ وپے میں خونِ صالح کا دَوران باقاعدگی کے ساتھ ہو جب اُسکے ارادوں میں التوا کی جھلک دکھائی نہ دے جب وہ اپنے مقررہ کام کو مقررہ اوقات میں بغیر کسی قسم کی تشویش یا غیر ضروری عجلت کے سرانجام دے اور جو کچھ اُس سے ہو سکتا کرے اور جو نہ ہو سکتا ہو اُس کے لئے دستِ حسرت ملنے میں فانی زندگی کی قیمتی گھڑیاں بے سود نہ کھودے!

باہمت قوم اپنی بنیادِ ہستی کو استوار کرتی ہے اور فقط قوس قزح کی سی رنگ آمیزیوں کے پیچھے نہیں دوڑتی۔ وہ تفریحاتِ زمانہ کی طرف مسکرا کر ایک نظر تو ضرور دیکھتی ہے لیکن اصولِ حیات کو چھوڑ کر انہیں بیکاریوں میں زندگی کو تباہ نہیں ہونے دیتی۔ وہ شعر سے زیادہ ریاضی کی طرف متوجہ ہوتی ہے وہ تاروں بھری رات میں عاشقانہ آہیں بھرنے کے بجائے اِن جگمگاتی روشنیوں کو دوربینی کی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ وہ آسایشِ موجودہ پر آئندہ عظمت کو ترجیح دیتی ہے۔ اُس کے افراد انفرادی خوشیوں سے پہلوتہی کر کے قومی خوشیوں میں حصّہ لیتے ہیں اور شبِ رقص سے کنارہ کر کے شبِ برات کی جلوہ افروزیوں کو اپنا دل دیدیتے ہیں! مسلمانوں کا جوش مشہور ہے لیکن جب یہ جوش صرف خروش میں تبدیل ہو کر رہ گیا تو اُس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ دنیا کی ترقی یافتہ قوموں نے برافروختہ ہو کر ان لوگوں کے قومی جذبے کو شورش سے تعبیر کیا۔ کس لئے؟ اسی واسطے کہ اِس کا درباری دُنیا میں جو محض کہتا ہے۔ اور کرتا نہیں اُس کی نہیں سُنتا لیکن جو کئے جاتا ہے اور کہے جاتا ہے لوگ مجبور ہوتے ہیں۔ کہ اُس کے کاموں کو دیکھیں اور اُس کی باتوں کو سُنیں!

ہم اُوپر دیکھ چکے ہیں کہ جب قوم پرست ترکوں کے لئے آزادی کی سبھی راہیں بند

ہوگئیں جب انہیں صاف نظر آنے لگا کہ دُنیا میں بجز اپنے کام اور خدا کی مدد کے اور اُن کا کوئی سہارا باقی نہیں تو انہوں نے شکوہ شکایت چھوڑ کر مستعدی اور سرد مزاجی کے ساتھ کام کرنا شروع کیا اِس طرح جیسے کہ اک خود دار مفلس چیخنے چلّانے کی بجائے ذلّت کی نوکری چھوڑ کر خاموشی کے ساتھ مٹّی ڈھونے کے کام میں لگ جاتا ہے اور جانتا ہے کہ وہ بنیادِ زیست کو اسی طور قائم و دائم رکھ سکیگا۔ پہلے پہل چند ترکوں نے حالات کو جانچا اور خطرات کو محسوس کیا۔ قوم ناامیدی کے گڑھوں میں پڑی غم کے آنسو بہا رہی تھی۔ صرف انہیں لوگوں نے دیکھا کہ اس طرح بیٹھے رہنے سے کچھ نہ ہوگا۔ خود اُٹھیں اور روں کو جگائیں اور سب مل کے کام میں لگ جائیں۔ ارض روم اور سواس کے قومی جلسوں کے بعد ۲۳ مارچ ۱۹۲۰ء کو کمال پاشا نے انگورا میں قومی مجلس ملیّہ کا افتتاح کیا اور ایک تقریر میں قوم کے نئے دستور کا خاکہ کھینچا۔ اُس کی تجاویز کے ساتھ سب نے اتفاق ظاہر کیا اور مل کر کام کرنے اور کرتے رہنے کی خواہش سب کے دلوں میں برقی رو کی طرح دوڑ گئی۔

مجلس ملیّہ۔ وہ عمارت جس میں مجلس کے اجلاس منعقد ہوتے ہیں شہر کے زیریں حصّے میں واقع ہے اور پہلے انجمنِ اتحاد و ترقی کا دفتر تھی۔ بڑے ہال میں جس میں ارکین جمع ہوتے ہیں صدرِ مجلس کی کُرسی کے اوپر جلی حروف میں عربی کا ایک فقرہ لکھا ہے کہ "آؤ مل کر مشورہ و مباحثہ کریں۔ کُرسی کے قریب منبر ہے جہاں مقرّر تقریر کرتا ہے۔ نیچے ۴۴۲ ارکین مجلس کی نشست گاہیں ہیں۔ اُن میں کوئی رومی ٹوپی پہنے ہوتا ہے کوئی ایرانی وضع کی اُونی کلاہ۔ کہیں رنگین دستاریں اور پٹکے نظر آتے ہیں اور کہیں کہیں یورپین ملبوس۔ ایشیائے کوچک کے شہروں اور بندرگاہوں کے تاجر، کردستان کے کوہستانی، اناطولیہ کے کسان، قسطنطنیہ اور تھریس کے مغربی وضع کے جنٹلمین سب اس مُشترک ایوانِ قومی میں ایک ساتھ جمع ہوتے ہیں۔ پچاس پچاس ہزار باشندوں کا ایک نمائندہ ہے۔ یونانیوں کے قبضے کے دنوں میں بھی سمرنا اور تھریس کے نمائندے موجود ہوا کرتے تھے اور دستورِ قومی میں صریح طور پر یہ بات بیان کی گئی تھی کہ ہر نمائندہ صرف اپنے حلقے یا ضلع کا نمائندہ نہیں بلکہ ساری قوم کی نمائندگی اُس کا فرض ہے اور وہ قوم کے سب لوگوں کی طرف سے

اُن کی مجموعی حالت کا محافظ و امین ہے۔ پُرانے عثمانی دستور کے مطابق سُلطان کو اختیار تھا کہ صلح و جنگ کا اعلان کرے، مجلسِ قومی کو معطل کر دے، غیر سلطنتوں کے سفیروں سے تعلقات رکھے، وزارت اور دار الاشراف کے اراکین مقرر کرے۔ اب صلح و جنگ کا اختیار مجلس کے ہاتھوں میں ہے، مجلس کو معطل کرنے کا اختیار ابھی کسی کو نہیں دیا گیا اور جب گذشتہ سال نومبر میں کابینہ نے اسے حاصل کرنا چاہا تو کمال پاشا نے اِس کی شدت کے ساتھ مخالفت کی، سفیروں سے ملنے کا کام فی الحال کمال کے ذمہ ہے اور وُزرا کو مقرر کرنے کا حق خاص مجلس کا ہے جنہیں صدرِ مجلس تجویز کرتا ہے اور اُن میں سے ہر ایک جدا جدا کثرتِ رائے سے منتخب کیا جاتا ہے۔ کابینہ میں گیارہ وزیر ہیں جو مجلس کے سامنے اپنے کام کے ذمہ دار ہیں۔ اور مجلس ہی سب انتظامی آئینی اور دیوانی اختیارات کا منبع و مرجع ہے۔ مجلس کی عمارت کے پہلو میں وزرا کے دفتر ہیں جو دُور تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ مجلس میں فرقہ بندیوں کی گنجایش نہیں۔ سب اراکین قومِ ترکی کے خادم ہیں۔ سب کے پیشِ نظر ایک ہی مقصد ہے قومی آزادی اور قومی تقویت! ہر رُکن پیمانِ قومی کے مقاصد کی تکمیل کے لئے حلف اُٹھاتا ہے۔

پیمانِ قومی۔ اِس پیمانِ قومی کے مطابق حکومتِ انگورہ عربوں کے علاقوں پر اپنا تسلط جمانے کی ہرگز خواہشمند نہیں۔ مغربی تھریس کی حکومت کا دار و مدار وہاں کے باشندوں کی مرضی پر رکھا گیا ہے۔ علاقۂ ترکی کی قلیل التعداد جماعتوں کے حقوق کی محافظت ہو گی اس شرط کے ساتھ کہ غیر مسلم ریاستوں میں مسلمانوں کے حقوق کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ آبناؤں کو کھلا رکھا جائیگا لیکن قسطنطنیہ پر ترکی قبضہ ہر حیثیت سے مکمل ہو گا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ تُرکوں کو اپنے وطن میں کامل اختیارات دیئے جائیں اور اُن پر کسی قسم کی بندشیں عائد نہ کی جائیں۔ وہ جس طرح چاہیں رہیں جو چاہیں کریں اور اُن کے ملک میں غیر ملکیوں کو امتیازی حقوق حاصل نہ ہوں۔

کمال پاشا نے مارچ (۱۹۲۲ء) میں مجلسِ ملیہ کی دوسری سالگرہ کے موقع پر اپنی تقریر میں کہا کہ واشنگٹن کانفرنس میں جو فیصلہ چین کے متعلق دُولِ عظمٰی نے کیا ہے کہ آئندہ وہ اس ملک کو اپنے اپنے "اثر" کے علاقوں میں منقسم نہ کریں گی اور چین کو اپنی حالت پر چھوڑ دینگی وہی فیصلہ تُرکی پر عائد ہونا چاہیئے۔ اِسی تقریر میں کمال پاشا نے مجلسِ ملیہ کی کارروائی کا ذکر کرتے ہوئے

بیان کیا کہ گذشتہ سال (مختتمہ مارچ ۱۹۲۲ء) میں مجلس کے ۱۶۷ اجلاس ہُوئے جن میں ۳۵۹ نشستیں ہوئیں۔ اس سے پہلے سال میں ۷۷ قوانین وتجاویز پیش ہُوئے ابکی بار یہ تعداد ۵۵۳ تک پہنچ گئی اور علاوہ بریں دس رپورٹیں بھی پیش ہوئیں اور ان پر غور کیا گیا +

انفرادی کوششیں - اہلِ قوم نے سینکڑوں "غیر مجلسی" خدمتیں بھی انجام دیں۔ انہیں اراکین مجلس میں بیسیوں نے فوج میں قائد یا کپتان بن کر جنگ میں شرکت کی۔ بعض مشرق کو بعض مغرب کو اہم سیاسی پیغامات لے کر گئے، بعض ایشیا کے مختلف حِصّوں میں تفتیش و مطالعہ کرتے رہے + بعض مجلس کے آگے آ کر فوجی حالت کا خاکہ کھینچتے ہیں اور بعض لوگوں کو بدخواہ دشمنوں کی غلط بیانیوں سے بچاتے رہتے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں کہ فوج کے عقب میں اُس کے حفظانِ صحت اور سامانِ خور و نوش کے انتظام میں مصروف ہوتے ہیں اور چند ملک کے مختلف حِصّوں میں عدالت و نظم و نسق کے ضروری فرائض سے سبکدوش ہو کر قوم کے شیرازے کو مجتمع رکھتے ہیں + اور پھر وہ ہیں جو خاکِ وطن کے لئے سینہ سپر ہُوئے جنہوں نے ملک و قوم کی عزت کو اپنی جانوں سے زیادہ عزیز سمجھا اور میدانِ کارزار میں جا کر دُنیا کے عارضی آرام و آسائش کو خیر باد کہی +

مالیہ - لیکن قوموں کے کام فقط جوش و انہماک سے انجام نہیں پاتے۔ اس کل کے چلنے کے لئے اُس تیل کی ضرورت رہتی ہے جسے سیم و زر کہتے ہیں + مسلمانوں کی مفلس قوم اس معاملے میں بیکس تھی لیکن غور کیا جائے تو ناداری بھی کچھ اتنی نادار نہیں ہوتی کہ اپنے حقِ زیست کی محافظت نہ کر سکے + قوم پرستوں نے مغربی طاقتوں کی شرائط اور بندشوں سے آزاد ہو کر جی کھول کر اہلِ ملک پر ٹیکس لگایا اور محصول کو پانچ گنا بڑھا دیا۔ علاوہ بریں چالیس فی صدی ایک اور جبری ٹیکس عائد کیا لیکن ابھی بجٹ میں سخت کمی نظر آئی + اراکینِ مجلس کو تو اُنکے حلقہ ہائے نیابت کے اوقاف سے مشاہرے دیئے گئے مگر بہت سے کم درجہ افسروں کو کبھی تنخواہ میں ایک پائی نہ ملی + پھر تعجب ہے کہ حکومت نے کوئی قرضہ نہیں لیا بلکہ اپنا کام کفایت و دُور اندیشی کے ساتھ چلاتے رہے۔ آمد کی بعض مدات میں بجائے زیادتی کے کمی ہو گئی مثلاً شراب نوشی کے قانوناً بند کر دینے کے باعث چالیس لاکھ ترکی پونڈ خسارہ برداشت

کرنا پڑا۔

تمدنی ترقی ستمبر ۱۹۲۱ء تک جب یونانی اکیس روز کی جنگِ شدید کے بعد دریائے سقاریہ سے واپس ہوئے اناطولیہ کی حکومت تین آدمیوں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ تینوں ایک طرف دیوانی اختیارات رکھتے تھے تو دوسری طرف فوجی اختیارات بھی ان کو حاصل تھے۔ مصطفےٰ کمال جو صدرِ حکومت تھا قائدِ اعظم بھی تھا، فوضی پاشا جو وزیرِ اعظم تھا افسرانِ فوج کا سرکردہ بھی تھا اور رافت پاشا (جس کا نام آج کل صلح کانفرنس کے سلسلے میں سننے میں آتا ہے) وزیرِ جنگ بھی تھا اور وزیرِ داخلہ بھی۔ ملک کی دیوانی اور فوجی حالت میں کچھ فرق نہ تھا۔ یونانی ترکوں کو پسپا کر رہے تھے، پہلے وطن کا بچانا لازم تھا، ترقیات کی نسبت غور و عمل کرنے کی مطلق فرصت نہ تھی۔ ساری قوم فوج بنی ہوئی تھی اور سارا ملک ایک میدانِ جنگ۔ سقاریہ کے بعد یونان کا خطرہ جاتا رہا اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ حملہ آوروں کی قوت ہمیشہ کے لئے پاش پاش ہو چکی ہے تو مجلس نے اصرار کیا کہ اب فوجی قانون کو ملکی زندگی میں نافذ ہونے کا کچھ حق حاصل نہیں اور عام قانون کو رواج دینا چاہیئے۔ فتحی پاشا کو وزیرِ داخلہ اور رؤف پاشا کو وزیرِ اعظم مقرر کیا گیا اور اگرچہ ملک ابھی جنگ کے پنجے سے رہا نہ ہوا تھا۔ دیوانی افسروں نے ملک کے نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور فوجی کامرانیوں کے ساتھ اناطولیہ ترقی و تہذیب کی شاہراہ پر بھی چلنے لگا۔ صرف ایک آدابازار کے ضلعے میں حکومتِ انگورا نے ۲۶۵ مدرسے کھول دیئے۔ زراعت و تجارت کو ہر سو فروغ حاصل ہونے لگا اور جو علاقہ چند ہی ماہ پیشتر یونانیوں کے ہاتھوں دشت و ویرانہ بن چکا تھا اب جلد جلد خوشحالی کے پھول پھل سے آراستہ پیراستہ ہونا شروع ہوا۔ اس زمانہ میں انگورہ سے تین روزانہ اخبار نکلتے تھے جو ترکوں کو صحیح معلومات سے آگاہ کرتے اور اُن میں جذبۂ قومی پھونکتے رہتے تھے۔

عیسائیوں کے ساتھ سلوک۔ یہ بات سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہے کہ اگرچہ بعض موقعوں پر یونانی ریشہ دوانیوں کا سدِّ باب کرنے کے لئے ترکوں کو فوجی کارروائی کرنی پڑی لیکن اُن کا عام سلوک عیسائیوں کے ساتھ برادرانہ رہا ہے۔ کلئیر پرائس لکھتا ہے کہ حکومتِ انگورہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تمیز نہیں کرتی۔ وہ سب کو عثمانی رعایا تصور کرتی

ہے اور اول اول اس نے سب باشندوں پر بلا امتیاز ناقابل برداشت ٹیکس عائد کر دیئے لیکن اناطولیہ کے زمینداروں نے اس بارِ گراں کو خوشی سے قبول کیا۔ البتہ جہاں کہیں ناوفاداری کا شبہ ہُوا مجرموں کو بے دھڑک جلاوطن کر دیا۔ بلکہ بعض امور میں عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کے مقابل میں رعایت برتی گئی یہاں تک کہ بہت سی چھوٹی اور پرانی مسجدوں کو فوجی کاموں کے لئے استعمال کیا حالانکہ کہیں ایک گرجا کو بھی ایسی باتوں کے لئے مخصوص نہ کیا" ارمنوں سے فوجی خدمت کا کام نہیں لیا گیا، نہ سلیشیا میں اُن پر چالیس فیصدی والا ٹیکس لگایا گیا۔ خلاصہ یہ کہ اناطولیہ میں بھی قومیت کا وہی اثر ظاہر ہو رہا ہے۔ جو شام فلسطین اور مصر میں پایا جاتا ہے یعنی عیسائی اور مسلمان مذہب کو ملکی معاملات میں رکاوٹ نہیں سمجھتے اور سب کے سب قومیت کے رشتے میں منسلک ہُوئے جاتے ہیں۔ کلیئر پرائس کہتا ہے کہ جب یہ حال ہے تو پھر مغربی لوگ کس لئے ترکوں سے قلیل التعداد جماعتوں کے لئے خاص حقوق طلب کرتے ہیں۔ ایسے خاص حقوق سچی قومیت کا خون کر دیں گے اور حکومتِ ترکی کی مشکلات میں ایک خطرناک اضافہ کرینگے +

جذبۂ قومی کی شدت۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ترکوں کی کامرانی بالآخر اسی قومی جذبے اور رُوحِ اتحاد کے زور سے ہُوئی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارا معاملہ نیک نیتی پر مبنی ہے اور اُس کے طے کرنے میں ہمیں صرف ایسے ہی ذرائع اختیار کرنے پڑینگے جو انسانیت صداقت کی محافظت میں اختیار کیا کرتی ہے + ایک مشہور امریکن کا بیان ہے کہ آدین میں شکست خوردہ یونانیوں نے ایک مسجد میں مسلمانوں کو جمع کر کے اُن پر بم کے گولے پھینکے اور پھر مسجد کو آگ لگا دی۔ ایک اور گاؤں میں عورتوں اور بچّوں کو اسی طرح جلا دیا گیا (یہ غریب ترکوں کے تراشے ہُوئے جھوٹے الزام نہیں بلکہ مقامی عیسائیوں اور امریکنوں کے بیانات ہیں) + جہاں ایسے لوگوں سے واسطہ ہو وہاں روحِ قومیت کب تک سوئی رہے ؟ مصطفیٰ کمال نے اپنی مارچ (۱۹۲۲ء) کی مشہور تقریر میں ان جذبات کو جو قوم ترکی کا فرد فرد محسوس کرتا رہا ہے پُرزور لفظوں میں بیان کیا اور کہا "ہم اُن لوگوں کی دوستی میں ہرگز سرد مہری سے کام نہ لیں گے جو سب شعبوں میں ہماری مکمل آزادی کو تسلیم کریں۔ ہماری تمام کوشش اس بات

پر صرف ہونگی کہ ہم اپنے پیدائشی اور قومی حقوق کی حفاظت کریں اپنی ہستی اپنے ملک اور اپنی عزت کے بچاؤ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں اور بالخصوص اس آخری کام میں تو ہمارے قدم کبھی نہ لڑکھڑائیں گے۔ تہذیب انسانی نے اپنے تازہ ترین بین الاقوامی تعلقات میں یہ صداقت عیاں کر دی ہے۔ کہ سب قوموں کی ہستی اپنے اپنے ہاتھ ہے۔ ہم دنیا کی سبھی دوسری قوموں کا یہ حق تسلیم کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ ساری قومیں اسی طرح ہمارے حقِ آزادی کو بھی تسلیم کرلیں۔ جو لوگ ہمارے اس سچے مطالبے کی مخالفت پر آمادہ رہیں پھر اس فتنہ و فساد سے جو خونریزی ہوگی اُس کا الزام ہمارے سر پر نہ رہیگا۔ ہمکو نہ کوئی ڈرا سکتا ہے نہ بہلا پھسلا سکتا ہے۔ اپنی قوم کی حفاظت کرنے میں ہم فی الحقیقت اپنی جانوں کو بچا رہے ہیں۔ دُنیا بھر میں کوئی ایک بھی تو چھوٹے سے چھوٹا کیڑا ایسا نہیں کہ اُس کی جان جوکھوں میں پڑجائے تو وہ اپنے اخیر دم تک جان توڑ کر نہ لڑے اور بقائے حیات کی خواہش کو اپنے رگ و ریشہ میں محسوس نہ کرے؟ کیا ہماری قوم وہ قوم جس کے کارنامے صفحۂ تاریخ کی زینت ہیں اپنے عزم و ثبات میں متزلزل ہو جائے گی یا اس جہد للبقا میں ایک قدم بھی پیچھے ہٹیگی وہ جس کی قوتِ دافعہ کا اندازہ نہیں ہو سکتا جس کی اخلاقی طاقتیں ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں؟ بلکہ ہر نئی مشکل جو اس قوم پر آکے پڑتی ہے۔ اُس کی رُوح کے زور و قوت کو دُگنا چوگنا کر دیتی ہے! ہماری فوج جو ہر روز زیادہ مضبوط و قوی ہوتی جاتی ہے جانتی ہے کہ وہ قوم کی آزادی کے لئے لڑ رہی ہے ایسی آزادی جس کی شیرینیاں اناطولیہ ابھی سے مزے لے لے کر چکھ رہا ہے۔ اگر ہمارے دشمن یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ترکی قوم جنگ کرتے کرتے مضمحل ہوگئی ہے تو وہ بڑی غلطی میں مبتلا ہیں۔ وہ یاد رکھیں کہ کسی قسم کی کمزوری کسی طرح کا تامل ہمارے اس عزم کو ضعف نہیں پہنچا سکتا کہ ہم اُن بندشوں اور آلایشوں کو جو ہم پر ڈالی جاتی ہیں ہرگز برداشت نہ کریں گے۔ "اگر تم صلح چاہتے ہو تو جنگ کے لئے تیار رہو" یہ اک پرانا اصول ہے اور اس جنگِ آزادی میں یہ ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہنا چاہیئے۔ عزیز و محترم بھائیو! ہماری آخری فتح کا بہترین ثبوت قومی مجلس کی یک جہتی اور اُس جوش و انہماک میں ہے جن کے ساتھ ہم اپنے پے درپے مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے

رہے ہیں۔ صاحبو! اگر ہم اُن نتائج کو دیکھیں جو گذشتہ دو سال میں بتدریج ہماری کوشش کے باعث مترتب ہوئے ہیں تو ہم اطمینان سے کہہ سکتے ہیں کہ ظفر مندی کا زمانہ اب بہت دُور نہیں۔ اس نئے سال کے ساتھ ہماری خود اعتمادی اور ہماری تسکین بڑھ گئی ہے اضمحلال کا کہیں نام نہیں اور عزم و یقین بات بات میں پیدا ہیں۔ ہم کڑے دل کے ساتھ اُس مطمحِ نظر کی طرف پیش قدمی کریں گے جو ہمارے لئے شعلۂ مقدس سے کم نہیں اور جو آنے والی نسلوں کے لئے اپنے اندر اُمیدِ فلاح کو مستور رکھتا ہے۔ یہ ہمارا پیارا وطن کیسے تباہ ہو سکتا ہے؟ اسے تباہ نہ ہونا چاہیئے! اگر بفرضِ محال خدا نہ کرے وہ برباد ہو جائے تو کیا یہ دُنیا اُس کے مُردہ جسم کا بارِ گراں اُٹھا سکے گی۔

بشیر احمدؐ

عصمت پاشا

عصمت پاشا ۱۸۸۲ء میں بمقام سمرنا پیدا ہُوا۔ اُس کا باپ ایک زمیندار تھا۔ جنگِ عظیم میں عصمت پاشا جرمن جنرل لیمان فون سونڈرز کے تحت میں نہایت کامیابی کے ساتھ کام کرتا رہا۔ آغازِ جنگ کے دنوں میں وہ درِ دانیال میں انور پاشا کے ساتھ جنگی مقامات کا معائنہ کرتا رہا اور اِس معائنہ میں اُس کی فہم و فراست نمایاں ہُوئی۔ بعد میں اُسے قفقاز کے محاذ پر بھیجدیا گیا جہاں اُس نے بار بار جرمن افسروں کو اپنی فوج میں لینے سے صاف انکار کر دیا۔ جب التوائے جنگ والی وزارت مقرر ہُوئی تو عصمت پاشا کو وزیرِ جنگ کا ایک نائب بنا یا گیا۔ پھر داماد فرید کے کابینہ میں وہ مجلس فوجی میں ناظم اعلیٰ ہو گیا۔ یہاں سے وہ مارچ ۱۹۲۰ء میں مستعفی ہو کر کمال پاشا سے جا ملا کیونکہ وہ بھی اُن ترکانِ احرار میں سے تھا جنہیں اتحادیوں کا قسطنطنیہ پر قبضہ کئے رہنا سخت ناگوار تھا۔ وہ افواجِ انگورہ کے جنرل اسٹاف کا چیف مقرر ہُوا اور بعد میں مغربی محاذ پر قائد بنا دیا گیا۔ جنگ کے چوتھے اور آخری دور میں عصمت پاشا ہی ترکوں کا قائد تھا اور یونانیوں کی شکست و فرار میں اُس کے استقلال و فراست جنگی کو بہت دخل تھا۔ مدانیہ کانفرنس میں جو التوائے جنگ کے لئے اکتوبر گذشتہ میں منعقد ہوئی تھی عصمت پاشا کی خوش مزاجی اور صاف گوئی کی انگریزی افسر سر چارلس ہیرنگٹن نے بہت تعریف کی۔ نومبر میں عصمت پاشا نے لوزان کانفرنس میں ترکی سفیرِ صلح کی حیثیت سے حصّہ لیا۔

غازی مصطفیٰ کمال پاشا

ابتدائی حالات۔ مصطفیٰ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوا۔ اُس کے آبا و اجداد مشرقی رومیلیا کے رہنے والے تھے۔ اور خود اُس کی صورت و سیرت میں اُس علاقے کے باشندوں کی بہترین خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ وہ ایک پتلا دُبلا آدمی ہے لیکن چُست و چالاک۔ اُس کی نظر ہر بات کو پل میں تاڑ جاتی ہے۔ اور یہ اُس کی فطرت ہے کہ جو کام کیا جائے وہ پوری طرح سے انجام کو پہنچے۔ اُس کا باپ محکمۂ محصولات میں ایک معمولی افسر تھا۔ وہ جوانی ہی میں اپنے بال بچوں (پس ماندگان میں اس کی بیوہ ایک بچی اور ننھا مصطفیٰ تھے) کی معاش کے لئے کچھ کئے بغیر مر گیا اور مصطفیٰ کو دُنیا میں پھولنے پھلنے کے لئے آپ ہی ہاتھ پاؤں مارنے پڑے۔ سب سے پہلے وہ سالونیکا کے ابتدائی مدرسے میں داخل ہوا اور وہاں سے وظیفہ پاکر اس قابل ہوگیا کہ مناستر کے ثانوی مدرسے میں تعلیم حاصل کرے ابھی نو عمر ہی تھا کہ اُسے قسطنطنیہ کے مدرسۂ حربیہ میں جو ترکی فوجی افسروں کے لئے مخصوص ہوتا تھا جگہ مل گئی۔ زمانۂ تعلیم ہی میں اُس کی زبردست شخصیت نمایاں ہونے لگی۔ اوروں کو یکجا کرنے اور ہر شخص سے اُس کا خصوصی کام کرانے کی قابلیت اُس میں شروع ہی سے عیاں تھی۔ اُس کی شگفتہ مزاجی و خوش طبعی کا ہر کہ و مہ دلدادہ تھا۔ وہ دوستوں کا سچا اور پکا دوست تھا لیکن کوئی رفیق اُس پر بُرا یا اچھا اثر نہ ڈال سکتا تھا۔ طبیعات اور ریاضی کا اُسے خاص ذوق تھا اور یہ ذوق اُس انضباطِ قلبی کا اک نتیجہ تھا جو عمر بھر اُس کے ہر کام میں ظاہر ہوتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ اُس زمانے میں مصطفیٰ کی طبیعت میں شعریت کا مادہ بھی موجود تھا چنانچہ وہ فرصت کے اوقات میں تُرکی حکومت کی مطلق العنانی اور جور و استبداد کے متعلق شعر لکھا کرتا اور آزادی اور حیات و ممات اور محبت کے ترانے گاتا۔ کوئی ہم مکتب نوجوان اپنی شخصیت کو اس قدر ربط و ضبط کے ساتھ برقرار نہ رکھتا تھا جیسا کہ تُرکی کا یہ مُحبّ وطن!

سلطان عبد الحمید کو ایسے دلدادگانِ حریت سے خاص طور پر نفرت تھی۔ مصطفیٰ خفیہ

طور پر ایک اخبار نکالا کرتا تھا۔ اُس کا رہایشی مکان خفیہ انجمنِ آزادی کا دفتر بھی تھا۔ صرف اس کا ایک دوست اس کے ساتھ رہتا تھا۔ جس روز اُس نے حربیہ مدرسے کا آخری امتحان پاس کیا۔ سُلطانی طلبی کا فرمان آ پہنچا۔ تین ماہ کی عید کے بعد اُسے دمشق میں جلاوطن کر دیا گیا۔ یہاں رہ کر اُس نے ۱۹۰۲ء میں شامی سیاسیات میں حصہ لینا شروع کیا اور انجمنِ حریت کا رُکن و ناظم بنگیا حمیدی دستِ شفقت پھر اُس کی طرف بڑھا اور سخت احکام صادر کر کے اُسے یافہ میں بھیجدیا۔ یہاں سے بھاگ کر وہ اسکندریہ پہنچا اور وہاں سے پھر سالونیکا کا رُخ کیا۔ سالونیکا میں وہ آٹھ ماہ تک روپوش ہو کر باغی کمیٹیوں کی کارروائی میں حِصّہ لیتا رہا۔ دوستوں کے کہنے سننے سے سلطان نے اُس سے درگذر کیا اور وہ سالونیکا ہی میں سرکاری فوج میں افسر مقرر کر دیا گیا۔ پھر بھی وہ اپنے قومی آزادی کے کام کو نہ بھولا اور انور پاشا جمال پاشا اور فتحی بے کے ساتھ مل کر اُس نے ۱۹۰۸ء کی تحریک کی بنا ڈالی اور ترکی قوم کو استبداد کے پنجے سے چھڑانے میں معتدبہ حِصّہ لیا لیکن انور پاشا اور اُس میں سخت اختلافات پیدا ہو جانے کے باعث وہ سیاسی معاملات سے علیحدہ ہو گیا۔ ۱۹۰۸ء کا انقلابِ قومی جس سے برطانیہ کی ہمدردی طلب کی گئی تھی قطعی ناکام رہا اور ترک ترقی کے لحاظ سے جہاں تھے وہیں رہے۔ مصطفےٰ کمال (پہلے اُس کا نام صرف مصطفےٰ تھا زمانۂ تعلیم میں اُس کے معلم ریاضی نے اُس کی قابلیت دیکھ کر اُسے کمال کا لقب دیا) مصطفےٰ کمال اُن لوگوں میں سے ہے جن کی سیرت کا جزوِ اعظم صبر و ضبط اور استقلال ہوتا ہے۔ یہ لوگ جب کسی کام کو شروع کر دیتے ہیں تو جب تک وہ تکمیل کو نہ پہنچ لے اپنے ارادے سے باز نہیں آتے۔ کمال نے ان خطرناک دلوں میں بہتر یہی جانا کہ اپنے آپ کو جس قدر ہو سکے تشہیر سے بچائے اور گمنام لوگوں میں جگہ پالے۔ کام اَور کرتے تھے تجویز و تحریک اس کی ہوتی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ مستقبل میں مجھے ملک کے لئے بہت کچھ کرنا ہے۔ ضرورت نہیں کہ میں اپنے جوش کو نازک وقتوں میں ظاہر ہو جانے دوں۔ اور بن جانے والا کھیل پہلے ہی بگاڑ لوں۔ وہ محمود شوکت پاشا کی فوج کا سب سے بڑا افسر تھا۔ جب کہ شوکت نے قسطنطنیہ کی طرف پیش قدمی کی اور پُرانی حکومت کو جڑ سے اُکھیڑ دیا۔ مصطفےٰ کمال نے اِس فوج کو اپنے خیالات کے مطابق اصلاح و ترتیب دی۔

دورِ جدید میں وہ فوج کی جنگِ مصنوعی میں قائد مقرر ہوا۔ ۱۹۱۰ء میں اسی سلسلے میں فرانس گیا۔ جہاں اُسے پہلی بار فرنساوی زندگی اور فرنساوی خیالات سے واقفیت حاصل ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں وہ انور اور فتحی کے ساتھ جنگِ طرابلس میں لڑتا رہا لیکن جلد ہی اِن سب کو یورپ میں جنگِ بلقان چھڑ جانے پر لوٹنا پڑا۔ اس جنگ میں ملک کے لئے ہزاروں مشکلات کا سامنا تھا اور ہر طرف بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ مصطفیٰ کمال اِن دِنوں درِ دانیال میں ایک حصّہ فوج کا سرکردہ تھا۔ مادام گوبیس جسے مصطفیٰ کمال نے خود اپنی زبانی اپنی کہانی سُنائی ہے لکھتی ہے کہ یہیں سب سے پہلے مصطفیٰ کمال اور انور پاشا میں وہ اختلافات پیدا ہوئے جو جلد ذاتی عداوت کی حد تک پہنچ گئے۔ جنگ کے بعد فتحی بے بلغاریہ میں تُرکی حکومت کی طرف سے سفیر مقرر ہوا اور مصطفیٰ اُس کا اٹاچی ہوکر اُس کے ہمراہ گیا۔

کمال درِ دانیال میں۔ لیکن تھوڑی ہی مدت کے بعد جنگِ عظیم چھڑ گئی اور سلطنتِ عثمانیہ بھی اُس میں شریک ہوئی۔ مصطفیٰ کمال کو حکم ملا کہ درِ دانیال میں جا کر فوج کے ایک دستے کی تنظیم و ترتیب کرے۔ یہ دستہ صرف نام کو موجود تھا اور کام جو اُسی کے ذمے دیا گیا۔ مشکلات سے لبریز تھا۔ درِ دانیال اس وقت سب سے زیادہ خطرناک مقام تھا۔ اور اتحادیوں نے اپنی تمام بحری کوششیں صرف کر دیں تاکہ اس مقامِ مدافعت کو اپنے زور و قوت سے منہدم کر کے ترکی دارالسلطنت پر جا ڈٹیں۔ انور پاشا اور جرمن افسر سر توڑ کوشش کرتے تھے کہ حملہ آوروں کو روکا جائے لیکن بات بنتی نظر نہ آتی تھی۔ طُرّہ یہ کہ اِن تمام اہم و دشوار کارروائیوں میں مصطفیٰ کمال کی رائے اَور تھی اور ان مشہور جنگی مدبروں کی قطعی اَور۔ شروع ہی سے اُس نے اتحادیوں کو ساحل پر فوجیں اُتار دینے سے روکے رکھا اور مدافعت میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا۔ فوج میں وہ غایت درجہ ہردلعزیز تھا اور ہر معرکے میں وہ اپنے جنگجوؤں کے خون کے ایک ایک قطرے کو عزیز جانتا تھا۔ فوج یہ جانتی تھی اور اُس کی دل سے قدر کرتی تھی۔ اُس کا مرتبہ تھوڑے ہی دنوں میں بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔ اور اُس کا رُتبہ بڑھائے بغیر اُسے زیادہ فوجوں کا کمانڈر بنا دیا گیا۔ سونے پر سہاگا

یہ کہ اتحادیوں کا حملہ ایسے منصوبۂ جنگ کے مطابق کیا گیا جو انور پاشا اور جرمن افسروں کی امیدوں کے خلاف لیکن مصطفیٰ کمال کے خیالات کے عین مطابق نکلا۔ اسکی دوراندیشی اُنکی ذکاوت پر سبقت لے گئی۔ اور جب سب سے زیادہ خطرے کا وقت آپہنچا اور جرمن افسرِ اعلیٰ بھی کامیابی کو ہاتھ سے جاتا دیکھ کر مایوس ہو چلا تو اُس نے اس آڑے وقت میں مصطفیٰ کمال سے کہا کہ اب کیا کیا جائے؟ کمال نے جواب دیا کہ "فوجوں کی قیادت سب میرے ذمے کر دیجئے تو میں بگڑی ہوئی بات کو بنانے کی کوشش کر سکتا ہوں"۔ جرمن افسرِ اعلیٰ نے اپنی جگہ خالی کر دی اور مصطفےٰ کمال نے ایسی دانشمندی سے کام لیا کہ صبح ہوتے تک معاملہ دگرگوں تھا۔ ایک لاکھ ساٹھ ہزار جنگجو اُس کی کمان میں تھے۔ لیکن سرکاری بیانات میں اُس کی خدمات کا کہیں ذکر تک نہ تھا۔ ابھی جنگی حالت کچھ سُدھری ہی تھی کہ اُس کے افسروں نے متفق الرائے ہو کر اُسے درِدانیال سے اُٹھا کر قفقاز کے محاذ پر بھیجدیا جہاں اُس نے مسلمانوں میں سلسلۂ اتحاد قائم کر کے اُنہیں دشمن کے مقابل میں لاکھڑا کیا۔ اس کے بعد وہ انگریزوں کے خلاف کُردستان میں لڑتا رہا اور پھر ساتویں ترکی فوج کے ساتھ فلسطین میں شامل ہوا۔ جرمن جنرل فالکن ہائین اور انور پاشا سے یہاں وہ برسرِ پرخاش رہا اور جب جرمن جنرل کا ارادہ بغداد کی طرف پیشقدمی کرنیکا ہوا تو مصطفیٰ کمال نے اس منصوبے سے شدّت کے ساتھ اختلاف کیا اور اُسکی بات نہ مانی گئی تو اپنا استعفا پیش کر دیا۔

کمال کی عاقبت اندیشی۔ ابکی بار وہ حلب میں منتقل کر دیا گیا جہاں ۲۰ ستمبر ۱۹۱۷ء کو ایک عرضداشت میں جو اُس نے طلعت اور انور کے سامنے پیش کی اُس نے اپنی تشویش و بیزاری کے وجوہات پر روشنی ڈالی اور کہا کہ "جنگ نے ہمارے ملک کے تمام عناصر کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ غیر جنگجو رعایا حکومت سے بیزار ہے اور دیوانی تنظیم و تنسیق کا خون ہو چکا ہے۔ اگر جنگ جاری رہی تو سلطان کا اقتدار ہمیشہ کے لئے مٹ جائیگا"۔ مصطفےٰ کمال کو اتحادیوں کی آخری فتح کا یقین تھا۔ اس کی وجوہات اُس نے مفصل طور پر بیان کیں اور کہا کہ ترکی فوجیں مضمحل ہو چکی ہیں مغربی محاذ، قفقاز، عراق، سینا، حجاز

تُرک کہاں کہاں لڑیں گے اور کہاں کہاں سے دشمن کو نکال دینے کی سعیٔ لاحاصل میں مصروف رہیں گے اور پھر کب تک ؟ انگلستان کی زبردست طاقت کا مرکزِ اسلام میں جم جانا فلسطین میں عیسائی حکومت کا ظہور، ہمیشہ کے لئے مصر سویز اور بحرِ قلزم پر انگریزی تسلط ہو جانا، تُرکی سلطنت کا اپنی مذہبی قوتوں کو کھو بیٹھنا یہ ہمارے لئے ایسے صدمات ہونگے کہ ہماری طاقت پاش پاش ہو جائے گی + ہمیں اپنے ذرائع و وسائل کو اخیر تک بچائے رکھنا چاہیئے اور جرمنوں کا ڈر دل سے نکال کر صرف حقیقی مفاد ہی پر نظر رکھنی چاہیئے + یہ میں سمجھتا ہوں کہ بالفعل ہم اس مصیبت سے نکلنے کے لئے جرمنی ہی سے استمداد کر سکتے ہیں لیکن میں اس کی شدید مخالفت کرتا ہوں کہ وہ اس بات سے فائدہ اٹھائیں اور جنگ کے بعد ہمارے مُلک کو اپنی نوآبادی بنا کر اُس کی ساری دولت و ثروت اپنے میں جذب کر لیں +

اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ مستقبل کی کون تصویر کھینچ سکتا تھا۔ زمانۂ جنگ کے دوران ہی میں ترکی قوم کا سچا نمائندہ بن کر وہ مغربی طاقتوں کی خودغرضی کو اپنی آنکھوں دیکھ رہا تھا۔ اُس نے جرمنی کے زہریلے اثر کو محسوس کیا جیسا کہ جنگ کے تھوڑی ہی مُدت بعد اُس نے انگلستان کی ریشہ دوانیوں کو بھی تاڑ لیا + اُس کی پالیسی ہمیشہ تُرکی مفاد کی پالیسی رہی ہے وہ نہ جرمنوں سے محبت رکھتا تھا نہ انگریزوں سے وابستہ ہے اور نہ اِن قوموں سے نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ جو دولتِ یورپ ترکی سلطنت کو اپنے حال پر چھوڑ دے وہ تُرکوں کی بہی خواہ ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اُس سے تُرک عداوت رکھیں۔ عرصۂ حیات میں وہ اپنا حقِ زیست قائم کریں، غیروں کو وہاں دخل پانے سے روکے رکھیں کسی کی ظاہرا یا چھپی حکومت یا حکم برداری کو نہ مانیں۔ گھُسنے والے اجنبی کو زورِ شمشیر سے اپنے علاقے سے باہر نکالنا قومیت کا پہلا فرض سمجھیں۔ ملک کے نا استعمال شدہ وسائل کو استعمال میں لائیں، شعبہ ہائے سلیم وصنعت کو ترقی دیں۔ کسی کی نقل نہ اُتاریں کسی کے قدم بقدم نہ چلیں بلکہ اپنی ہی فطرت کے مطابق اپنی قوتوں کو منزلِ ارتقا کی طرف لے چلیں۔ دُنیا میں آزاد رہیں اور آزادی کے ساتھ دُنیا میں دوستانہ تعلقات قائم کریں +

یہ رپورٹ جرمن افسروں نے دیکھی تو وہ مصطفےٰ کمال پر دانت پیسنے لگے اور غصے میں

آکر اُسے مشرقی محاذ پر بھیجدیا جہاں اُس نے روسیوں سے متعدد مقامات چھین لئے۔ اس وقت قسطنطنیہ میں موجودہ سلطان محمد ششم تخت پر جلوہ افروز ہُوا۔ کمال اُسے ذاتی طور پر جانتا تھا۔ موقع پاکر طلعت اور انور کے خلاف سلطان کے حضور عرضداشت کی کہ اُن کے غیر محدود اختیارات کو کم کیا جائے۔ جنگ کی صورت بد سے بتر ہو رہی تھی۔ ترک اور جرمن اعلےٰ افسروں نے باتفاق رائے کمال کی خدمت میں درخواست کی کہ وہ اپنے گرتے ہُوئے ملک کو سنبھالے۔ اُسے فلسطین کی طرف بھیجا گیا جہاں ایلنبی کی بڑھتی ہُوئی فوجوں کے سامنے اُس کی مراجعت ایک فتح کے برابر سمجھی گئی ہے۔ یہاں سے اُسے بغداد کی طرف بھیجا گیا کہ اُس شہر کو جلد سے جلد تسخیر کرے۔ اُس کی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی کیونکہ اُسے یقین تھا کہ وہ اس مہم کو سر کرلے گا۔ بدقسمتی سے جب اُس نے پہلی منزل پر مقام کیا تو اُسے خبر ملی کہ سلطنت عثمانیہ نے اتحادیوں کے آگے بلا شرط ہتھیار ڈالدیئے ہیں۔ وہ غصے سے بے تاب ہوگیا اور قسطنطنیہ میں اُس روز پہنچا جب اتحادیوں کی فوجیں وہاں داخل ہو رہی تھیں۔ فرانس کا رویہ سرد مہری اور زبردستی کا تھا چنانچہ کمال کو خیال پیدا ہُوا کہ ترکوں کو انگلستان سے دوستی پیدا کرنی چاہیئے سال بھر وہ دارالسلطنت میں مقیم رہا اور حالات کو جانچتا رہا۔

کمال کا اخراج قسطنطنیہ سے۔ مصطفےٰ کمال نے دیکھا کہ اتحادی اُس کے وطن کو پاؤں تلے روندے ڈالتے ہیں۔ اُس نے خود سُلطان کے پاس جاکر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور خطرات سے آگاہ کیا۔ اس پر انگریزی خفیہ پولیس اُس کے درپے ہوگئی اور داماد فرید کی وزارت کو حُکم دیا گیا کہ اس ناشکرے کو دارالخلافے سے کہیں دُور بھیج دیا جائے۔ انہوں نے اپنے حاکموں کے حکم کو سر آنکھوں پر جگہ دی اور کمال کو مشرق میں افواجِ ترکی کا انسپکٹر مقرر کرکے قسطنطنیہ سے نکال دیا۔ کیا تھا کچھ اور ہوگیا کچھ اَور! یہ کسے خبر تھی کہ یہ فریادی ایک روز باغی بننے والا ہے۔ اور یہ جسے فوجوں کے معائنے کے واسطے بھیج رہے ہیں جلد ہی اُن کا ناظم و قائد بن کر میدانِ جنگ میں اُترنے والا ہے؟ علاج نے خود مرض پیدا کردیا۔

جنگی کامرانی۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ کس طرح کمال کی رہنمائی میں چند منچلے اور جانفروش اہلِ وطن نے اناطولیہ میں قومی تحفظ کا سامان فراہم کیا۔ کیسے ایک منزل سے دوسری منزل تک وہ

استقلال کے ساتھ بڑھتے گئے۔ کامرانی نے اُن کے قدم لئے۔ بتدریج ترکوں نے ارمنوں فرانسیسیوں انگریزوں اور یونانیوں کو پسپا کیا اور بتدریج وہ خاکِ وطن کو اُن کی زبردست گرفت سے چھڑاتے گئے۔ فوج جو پہلے چند پرانے تھکے ماندے تُرکی سپاہیوں سے شروع ہُوئی اُس میں آہستہ آہستہ ایشیائے کوچک کے شہر و دیہات کے تاجر اور کسان شریک ہُوئے اور وہ کمال اور فوضی کی انتظام بندی کے ساتھ یورپ کی بہترین فوجوں سے ٹکرّ کھانے لگی۔ پہلے صرف چند بے قاعدہ رضاکار رہی تھے بعد میں حکومتِ قسطنطنیہ کے مقرر کردہ فوجی افسر جوق جوق قومی فوج میں داخل ہونے لگے۔ رضاکاروں نے بُرا مانا کہ یہ بعد کے آئے ہُوئے ہم پر سبقت لے جائیں لیکن جلد ہی تاڑ گئے کہ یہ نفاق و برتری کا وقت نہیں۔ فوج قطعی طور پر متحد ہوگئی اور اہلِ وطن نے بھی اس کی پشت پناہ بن کر یک جہتی اختیار کر لی اور اس طرح یک دل و یک سو ہو کر غنیم کے مقابلے میں آ کھڑے ہُوئے۔ حکومت نے قومی خدمت کی دعوتِ عام دی۔ اٹھارہ برس سے کم عمر کے نوجوان اور پینتالیس برس سے زیادہ عمر کے بوڑھے شریک ہوگئے۔ اشتہاروں تقریروں اور جلوسوں کے ذریعے سے لوگوں کو آئے دن ترغیب دی جانے لگی کہ آؤ تمہارا وطن تمہیں طلب کرتا ہے! انگورہ کے بازاروں میں رنگروٹوں کے دستے نظر آتے تھے۔ کہیں کہیں عورتیں اپنے مردوں کے لئے آخری تحفے لے کر کھڑی ہُوئی دکھائی دیتیں اُن کے لئے جنہیں مادرِ وطن کی پاسداری کی خاطر شائد ہمیشہ کے واسطے اپنے سے جُدا کر دیا ہے۔ حکومت اِن لوگوں کو نہایت ہی مختصر سی وردی دے سکتی تھی اور انکے فوجی تھیلے میں بجز تھوڑی سی روٹی اور گولیوں کے اَور کچھ سامان نہ ہوتا تھا۔ روٹی اور گولیاں! اور ان میں بھی ضرورت آ پڑے تو پہلے گولیاں پھر روٹی۔ روٹی رہے نہ رہے گولیوں سے تھیلا ضرور بھرا رہے۔ بارود اور دیگر ذخائرِ حرب کچھ تو سرحد پر ادھر اُدھر سے چھینے گئے۔ باقی اطالویوں اور روسیوں کے توسط سے ملک میں لائے جانے لگے۔ مشکل یہ آ پڑی کہ یہ سامانِ حرب پرانے بچے کھچے آلاتِ حرب میں استعمال نہ ہو سکتا تھا۔ بصد دشواری پُرانے گولوں کو توڑ پھوڑ کر انہیں درست کیا۔ اور توپوں کو اپنے کارخانوں میں ازسرِ نو ڈھالا اور مفید کار بنایا۔ کلیئر پرائس لکھتا ہے کہ موجودہ جنگی تاریخ میں غالباً اس سے زیادہ تعجب انگیز کارنامہ اور کوئی نہیں

کہ ترکوں نے کیسے پرانی اُکھاڑی ہُوئی توپوں اور بیکار ذخائرِ حرب کو نئے فوجی کام کے لئے تیار کیا۔ ایشیائے کوچک کے فلاکت زدہ علاقے کے لئے یہ ایک شدید بار تھا لیکن اس کی تکمیل بلاشبہ ایک معجزے سے کسی طرح کم نہ تھی +

کمال کی سیرت و شخصیت ۔ یہ سب کچھ اُس سراپا ایثار و شجاعت ہستی کی مستقل مزاجی اور مردم شناسی کا نتیجہ ہے جو انگورہ سے تین میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ان کڑے وقتوں میں اپنے وطن کی محافظ رہی ہے! کمال پاشا کو یہاں ایک رُکنِ مجلس نے یہ محل پیشکش کیا۔ کمال نے اسے فوج کی نذر کر دیا اور خود اس میں اپنے جنگجوؤں کا مہمان بن کر رہنے لگا + اپنی ذات کے لئے کسی شئے کا حصول اُس کے اصول کے خلاف ہے + یہاں وہ دن رات اپنے مُلک کی خدمت میں منہمک رہتا ہے + تمام بڑے رہنماؤں کی طرح اُس کے اوقات مقررہ ہیں۔ وہ سویرے ہی اُٹھتا ہے۔ اراکینِ مجلس اور وزرا اُس سے ملنے کے لئے انگورہ سے آتے ہیں اور وہ ان سے ملاقات کرتا ہے اور دن کا نصفِ اول دیوانی اور فوجی کاموں کے متعلق مشورے میں صرف ہوجاتا ہے + ایک دو بجے کے درمیان وہ انگورہ جاتا ہے اور وہاں اجلاسِ مجلس اور دوسری مصروفیتوں میں حِصّہ لے کر ڈیڑھ دو پہر رات گئے اپنے مکان کی طرف لوٹتا ہے + وہ لوگوں سے الگ تھلگ رہ کر اُن پر حکمرانی نہیں کرتا۔ کبھی کبھی اپنے محل چانکیہ سے نکل کر قرب و جوار میں سیر کے لئے تنِ تنہا نکل جاتا ہے اور بے اطلاع دیئے دوستوں اور عام لوگوں کے دروازے جا کھڑا ہوتا ہے۔ ایک دفعہ اُسکے ایک مخالف نے کہا کہ "وہ نیک دل ہے صادق اور نیک دل ایسا جیسا کہ کوئی اور شخص نہیں ہے" اُس کی نیکی اور صلح جوئی مسلّمہ ہے۔ وہ خون بہانے کو گناہِ کبیرہ سمجھتا ہے اور اس خیال سے کانپ اُٹھتا ہے لیکن با ایں ہمہ وہ کمزوری کا اظہار نہیں کرتا۔ برائی اس کی سنگین گرفت سے رہائی نہیں پاسکتی + وہ ایک ان تھک جنگجو ہے اپنے فوجی کام میں ہمہ تن منہمک وہ اس بات سے قطعی بے پروا ہے کہ لوگ اُس کی نسبت کچھ بھی کہا کریں، نیت کا صاف، اِس بات سے ناآگاہ کہ وہ تعریف کا مستحق ہے، اپنے جذبۂ رحم کو اس طرح چھپائے ہُوئے جیسے کہ کوہستانی گھاٹی کسی چشمے کے پانی کو اپنے پہلو میں چھپائے رہے، ایک ہی وقت میں

صابر اور خوش مزاج، دوستوں کا پکا دوست لیکن اُن کے اثرِ صحبت سے قطعی محفوظ۔ وہ کبھی کسی دوست کو نہیں سراہتا لیکن اُس پر مُصیبت ٹُوٹ پڑے تو بات بات میں اُس کا ہاتھ بٹانے کو تیار رہو جاتا ہے۔ اُسے سب سے زیادہ خوشی اس بات سے ہوتی ہے کہ اپنے سے زیادہ بڑی قوت سے مصروفِ پیکار ہو۔ جنگ کرنے کا منصوبہ وہ پہلے سے تیار کر لیتا ہے۔ پھر دشواریوں پر کامل عبور حاصل کر کے وقت آئے پر زبردست و شدید حملہ کرتا ہے۔ اُسے شان و شکوہ سے نفرت ہے وہ ڈینگ مارنا نہیں جانتا لیکن عزت کرانا جانتا ہے اور یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ کہ کوئی جان بوجھ کر اُسے نظر انداز کرے۔ وہ زندگی کی نعمتوں کی قدر کرتا ہے خوبصورت قالین اور سامانِ آرایش، مجلّد و مُطلا کتابیں، موسیقی، شعر و سخن وہ اِن سب کے حسنِ ظاہر و باطن سے محظوظ ہوتا ہے لیکن بوقتِ ضرورت ایک کسان کے جھونپڑے میں بھی خوش ہے اور اسی کو خدا کا بہترین عطیہ سمجھتا ہے!

وہ جب باتیں کرتا ہے تو اُس کی طرزِ گفتگو مُدلّل اور سنجیدہ ہوتی ہے اور ہر فقرے میں اک آہنی عزم اور اک زرّیں دلکشی پائی جاتی ہے۔ برمحل فقرے بیان کی صفائی اور دوسرے کے اغراض کو پہلے سے تاڑ لینے کی قوت حیرت انگیز ہے۔ اُس کی فہم غایت درجہ حسّاس واقع ہُوئی ہے۔ وہ بعض لمحات میں سراپا سادگی ہوتا ہے اور بعض میں مجسّم معمّا! اپنا کام وہی بیان کر سکتا ہے۔ اور کسی قدر جوش و انہماک کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ انصاف پسندی اُس کے بُشرے میں کھیلتی ہے، قوتِ فیصلہ کی پہنچ اور تیزی آنکھوں میں عیاں ہے، چہرے پر خوش اخلاقی لہلہاتی ہے اور منہ سے خوش کلامی کے پھُول جھڑتے ہیں اور پھر ان سب کے ساتھ ایک رہنمائے قوم کا جلال اُس کے سراپا میں اِس طرح صورت اختیار کئے ہُوئے ہے کہ دیکھنے والا شوکتِ قوم کو اپنی آنکھوں دیکھ سکتا ہے۔

مشہور انگریزی قائد جنرل ٹاؤن زینڈ لکھتا ہے کہ کمال کو فوج اور رعایا دونوں محبوب رکھتے ہیں۔ اناطولیہ میں تو ایک فرد بھی ایسا نہیں جو اُس کا پیرو نہ ہو۔ قسطنطنیہ میں بھی ۹۰ فیصدی اُس کے ساتھ ہیں۔ اُس کا ہر حکم قانون کا درجہ رکھتا ہے اور لوگ اُس کا کہنا سر آنکھوں سے بجا لاتے ہیں۔ اُس کی نیلی نیلی آنکھیں بھورے بھورے بال اور ترشی ہوئی چھوٹی مونچھیں

خوشنما ہیں۔ اُس کا ملبوس سادہ ہوتا ہے۔ وہ بہت کم بولتا ہے لیکن جب کسی ایسے معاملے پر رائے زنی کرے جس سے اُسے خاص دلچسپی ہو تو فصیح و بلیغ بن جاتا ہے + ایک رات ہم اکٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ ہم نپولین کے محاربۂ آسٹرلٹز پر بحث کرنے لگے۔ اس پر ہم دونوں کا اتفاق رائے تھا کہ نپولین کا غنیم کے قلب پر حملہ کرنا اس لڑائی کی سب سے بڑی خصوصیت تھی اور اس طرزِ جنگ کی درستی اور صحتِ اصول آج سو برس کے بعد بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ اُن دنوں میں تھی۔ کمال نپولین کی یلغارِ اطالیہ (۱۷۹۹ء) کا بڑا مداح ہے اور جنگی تاریخ پر اُسے کامل عبور حاصل ہے۔ وہ محنت اور کام سے کبھی نہیں اُکتاتا اور نہ کبھی تھکتا ہی ہے + اُسے یورپین سیاسی حالات سے پوری آگاہی ہے اور وہ مغربی مدبرین کی ریشہ دوانیوں کو خوب سمجھتا ہے + وہ ایک محبِ وطن ہے۔ وہ اپنے ملک کی رہائی اور آزادی چاہتا ہے۔ ترکی ترکوں کے لئے یہ ہے اُس کا اصول۔ وہ صلح کا خواہاں ہے لیکن صرف ایسی صلح کا جو قومی مفاد کے خلاف نہ ہو۔

اُس کی کامیابی کے تین صریح اسباب ہیں۔ وجدان دُوربینی اور مطالعہ + مشاہدے کی قوت انتہائی حد تک موجود ہے اور کوئی شئے اتفاقِ محض پر نہیں چھوڑ دی جاتی + اپنے پر اُسے کامل اعتماد ہے اور اُسے اپنی خوش قسمتی کا یقین ہے لیکن وہ عجلت میں کسی بات پر نہیں جھپٹتا بلکہ اپنے صبر و خموشی سے دشمن کو تھکا کر چور کر دیتا ہے حتیٰ کہ پیشقدمی کی ساعت آ پہنچے پھر وہ مخالف پر ایک پہاڑ کی طرح ٹوٹ پڑتا ہے اور اُسے ملیامیٹ کر دیتا ہے!

کسی کو اُس کے دل کے سب خیالات کا پتہ نہیں ہاں! جب اظہار کا وقت آتا ہے تو اسکا طرزِ بیان انوکھا اور اس کی منطق لاجواب ہوتی ہے۔ مجلس اُس کے سامنے غلامانہ روش اختیار نہیں کرتی لیکن جب وہ بولتا ہے تو ایوان کے در و دیوار سے خاموشی برستی ہے اور توجہ ہر رُکنِ مجلس کی آنکھوں سے آنکھیں ملائے رہتی ہے۔ جہاں کسی دشواری کا سامنا ہوتا ہے اور رائوں میں اختلاف پیدا ہو کر طریقِ عمل دکھائی نہیں دیتا تو بلا ارادہ سب کے دل میں یہی خیال اُٹھتا ہے کہ پاشا کی رائے اس کی نسبت کیا ہے؟

وہ روئے زمین کے تمام مسلمانوں کو اُکسا کر ایک عظیم الشان اسلامی ریاست قائم کرنیکا ہرگز خواہاں نہیں اگرچہ اسلامیوں اور تمام ایشیا والوں کے لئے وہ خود اختیاری کا حق ضرور

چاہتا ہے۔ وہ ایک تُرک ہے اور سب سے پہلے وہ تُرکوں کی قومی ہستی کو بچانے کا آرزومند ہے۔ وہ ایک مسلمان ہے اور مسلمانوں کی گری ہُوئی مِلّت کو شاہراہ ترقی کی طرف لے جانیکی تمنا رکھتا ہے۔ وہ ایشیا کا رہنے والا ہے اور سمجھتا ہے کہ ایشیا کو جلد ایک روز دائرۂ تہذیب میں یورپ کے دوش بدوش کھڑا ہونا ہے۔ اُس کا منصوبۂ قوم سازی اس قدر سادہ درست اور مکمل ہے کہ خالص اسلامی ریاستیں یقیناً مستقبل قریب میں اُس کے خیالات کو اپنا اصولِ کار بنالیں گی۔

وہ تُرکوں کی بعض گذشتہ فروگذاشتوں کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس پر راضی نہیں ہو سکتا کہ مخالفین ان الزامات میں رنگ آمیزی کرکے ترکوں کی اس قومی زندگی کو اُن سے غصب کریں جو ہر جماعتِ انسانی کا فطری حق سمجھا گیا ہے۔ اپنے ملک میں بھی وہ ہر فرد کے حقوقِ آزادی کا معاون ہے۔ ایک موقع پر اُس نے کہا کہ "ہم ایک کام کرنے والی قوم ہیں ایک غریب قوم جو اپنی معاش کے لئے کام کرتی ہے جو اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کرتی ہے۔ اس لئے ہم میں سے ہر ایک کو سیاسی حقوق اور سیاسی اختیارات حاصل ہیں لیکن یہ حقوق کام کرنے ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ہم کسی اَور قوم سے مشابہت نہیں رکھتے کسی کی نقل نہیں اُتارتے اور اسی پر ہمیں فخر و ناز ہے!"

اُس کا کام آسان نہیں۔ سب امور کی دیکھ بھال اور اندرونی و بیرونی خطرات کا دفعیہ لوگوں کے بے موقع جوش کو کم کرنا اور بے جا نکتہ چینیوں کا خاطر خواہ جواب دینا، حاسدوں کے حسد پر صبر کرنا اور بلا تامل اپنا کام کئے جانا آج اسلامی دُنیا میں کتنے رہنما ہیں جو سرد مزاجی اور دیانت کے ساتھ یہ سب کچھ کر سکتے ہیں!

اُس نے مجلس کو یہ کہہ کر قومی حالت سے آگاہ کیا کہ "قوم نے اپنی راہ چُن لی ہے۔ اور منزل قریب ہے۔ وہ ظلمت میں بڑھے جاتی ہے اور اب دُور سے اُسے اک روشنی نظر آرہی ہے۔ یہ اس کی خوشیوں کا سُورج چمکتا ہے! دُنیا میں کوئی طاقت نہیں جو اُسے وہاں تک رسائی پانے سے روک سکے!

یہ کمال پاشا جس نے مفتوح ترکوں کو فاتح قوم بنادیا ہے جس نے ایک مُلک کا مُلک

"مہذب و مسلح" دشمنوں کی گرفت سے چھڑا لیا، انگورہ کے سے دور دراز مقام کو مشہور عالم بنا دیا، مسلمانوں کو یاس انگیز گھٹاؤں میں امید کی شیرین و تاباں کرن دکھا دی، یورپ کے مدبروں کو انگشت بدنداں کر دیا اور ایک دوسرے سے لڑا دیا، روس کو جو صدیوں سے علاقۂ ترکی پر دانت پیستا چلا آتا تھا حکومتِ اناطولیہ کا حلیف و رازدار بنا لیا، مختصراً یہ کہ ناممکن کو ممکن کر کے دکھا دیا۔ اس شخص کا دل حرص و ہوا سے قطعی مبرا اور ذاتی مفاد کے خیال سے بالکل خالی ہے! اپنا محل اس نے فوج کی نذر کر دیا ہے، اپنا روز و شب وہ قومی خدمتوں میں صرف کرتا ہے، نہ کوئی بیوی ہے نہ بچہ، ملک ہی اس کا رفیق زندگی اور وطن ہی اس کا چہیتا بچہ! باوصف اس قدر بلند رتبہ ہونے کے اس کا شاہرہ صرف چھ سو روپیہ ماہوار ہے! دعا ہے کہ خدا اسے برسوں تک زندہ رکھے اور ہمت و استقلال کے ساتھ اسے قوم و وطن کی خدمت کرتے رہنے کی توفیق دے!

بشیر احمد

اے ہم سفر!

حرکت کرنا اے ہم سفر! گویا ہر لمحہ تجھ سے ملتے رہنا ہے۔ وہ گویا تیری آوازِ قوم کے ساتھ گیت گاتا ہے۔ جسے تیری سانس اک بار چھو لیتی ہے وہ کنارے کے سائے میں نہیں رینگتا وہ تیز ہواؤں کے سامنے اپنے بادبان کو دلیری سے پھیلا کر طوفانی پانیوں پر سوار ہو جاتا ہے!

جو اپنے دروازے کو کھول دیتا ہے اور قدم آگے کو بڑھاتا ہے وہ تیرا خیر مقدم پا لیتا ہے۔ وہ اپنے نفع پر شاداں یا اپنے خسارے پر غمگین ہونے کے لئے انتظار نہیں کرتا اس کا دل پیش قدمی کے لئے طبل بجاتا ہے کیونکہ ایسا کرنا اے ہم سفر! گویا ہر ہر قدم پر تیرے ساتھ چلنا ہے!

گلچیں

خالدہ خانم

وہ قوم جو آج اپنے طبقۂ اناث میں اس قدر پست اور پس ماندہ ہے اپنی نشاۃ الثانیہ کے دور میں کم از کم ایک ایسی نازک شخصیت ضرور رکھتی ہے جس کا وجود یورپ کی متمدن اقوام کے لئے بھی فخر کا باعث ہو!

خالدہ خانم (جسے جناب یلدرم ناظرینِ ہمایوں سے بارہا روشناس کر چکے ہیں) مشرق و مغرب میں اپنی ادبیات اور اپنی تعلیمی و ملکی خدمات کے لئے مشہور ہو چکی ہے۔ اس وقت اُس کی عمر تقریباً ۳۲ سال کی ہے۔ حُسن ذہانت عزم و استقلال یہ اُس کی بدیہی خوبیاں ہیں وہ پہلی تُرکی عورت تھی جو قسطنطنیہ کے امریکی کالج میں داخل ہُوئی جس پر ملک میں ہلچل مچ گئی لیکن اُس نے خفیہ طور پر اپنا درس جاری رکھا اور بعد میں تعلیم پانے کی غرض سے لندن اور پیرس کا سفر کیا۔

وہ ۱۶ سولہ برس کی تھی کہ اُس نے ترکی معاشرت پر اپنی پہلی کتاب لکھی اور "نقاب و حرم کی سی ذلیل چیزوں" کے خلاف اپنی آواز بلند کی۔ جنگِ عظیم کے دوران میں وہ تُرکی افواج کے لئے فلارنس نائٹ انگلیل کی طرح کام کرتی رہی اور باوجود ملک کی ناپسندیدگی کے اُس نے اپنی تُرکی بہنوں کو زخمیوں کی مرہم پٹی کی خدمت کے لئے بزور آمادہ کیا۔

جب اتحادیوں نے قسطنطنیہ پر اپنا قبضہ جمالیا اور قوم پرستوں نے اناطولیہ میں آزادی کا جھنڈا بلند کیا تو خالدہ خانم کی ترغیب پر سینکڑوں محبِ وطن سمندر پار کر کے ایشیائے کوچک میں جا پہنچے۔ کہا جاتا ہے کہ دو سال ہُوئے وہ ایک ہلالی رات چاند کی مدھم روشنی میں ایک کشتی میں سوار ہو کر ایشیا کے ساحل پر اُتری۔ وہ "عشقِ ایزدی میں اس طرف" آئی اور اپنے تئیں وطن کی محبت کے حوالے کر دیا۔ ایک دوست کی بے اختیار چیخ نے اُسے ایسی جگہ پر کنارے لگنے سے بچالیا جہاں وہ پھر سے اتحادی گرفت میں آجاتی۔ بعضوں کا قول ہے کہ اُس کی آمد نے مصطفیٰ کمال کو دل شکن نہ ہونے دیا اور گذشتہ سال

اُس نے کمال کو حملے میں تامل کرتے رہنے پر طعنہ دیا کہ اس کمزوری سے کام نہ چلیگا۔

انگورہ پہنچ کر اُس نے ترکی وطن کے گوشے گوشے میں دارالعلوم کھول دیئے۔ اور چارسو اُس کے اثر سے تمدن کی روشنی پھیلنے لگی۔ اُس نے عورتوں کو آزادی کا مردوں اور عورتوں کے لئے سبق دیا انہیں لکھنا پڑھنا سکھایا اور معاملاتِ ملکی میں حصہ لینے کی ترغیب دی۔ اُس نے برباد شدہ ترکی سلطنت کو ازسرِ نو زندہ کرنا اپنا مقصد قرار دیا اور صاف اعلان کیا کہ بغیر آزادی یافتہ عورتوں کے ترکی کبھی متحد نہیں ہو سکتی۔

گذشتہ سال کی خوں ریز جنگ میں وہ قوم پرست فوج میں شامل ہوئی اور خود بندوق سے مسلح ہو کر نہایت دلیری کے ساتھ میدان میں اُتر آئی۔ مصطفےٰ کمال نے اُسے ایک فوجی افسر کا رُتبہ دیا۔ تعلیمی کام میں اُس کا حوصلہ بڑھایا اور بالآخر اُسے وزیرِ تعلیم بنا دیا۔

وہ قوم جو ایک ایسی دلیر صادق اور فہیم عورت کو پیدا کر سکتی ہے یقیناً اِدبار کی وادی سے نکل کر بہت جلد تمدن کی چوٹیوں پر جلوہ افروز ہونے کو ہے!

بشیر احمد

ناظرینِ ہمایوں کو

ایک ماہ کے لئے خاص رعایت

آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں (مرحوم) کا کلامِ بلاغت نظام "جذباتِ ہمایوں" بہت پسند کیا گیا ہے۔ خریدارانِ ہمایوں سے ایک ماہ تک بجائے عہ کے صرف ۱۲؍ فی جلد قیمت لی جائیگی۔ سینکڑوں فرمائشیں آ رہی ہیں۔ تاخیر نہ کیجئے!

اعلیٰ درجے کا سرورق۔ ۱۷۰ صفحات۔ دو عکسی تصاویر۔

مینیجر

اے مادرِ وطن!

(ایک تُرک کا خطاب اپنے وطن سے)

تیرے بچے، مُصیبت و فلاکت کے سمندر کی سب سے زیادہ تاریک گہرائیوں میں ڈوب رہے ہیں، اُن کے سینوں سے خون کے فوارے نکل رہے ہیں، اور وہ دل خون اور سینہ چاک تیرے مبہم مگر زمِ قلب میں جمع ہوئے ہیں۔ اپنے سینے کو کھول، اے تیرہ خاک! اور اپنے شہیدوں کے لئے جنہوں نے تیرے چھوٹے سے روڑے کی خاطر، لمبے لمبے زخم کھائے مگر دُشمن کو تجھ سے دُور رکھا، ہمارے بہادر آباؤ اجداد کے پہلو میں جگہ تیار کر۔

تیری متروک، تیری خشک، تیری فراموش شدہ پتھریلی وادیوں کو سفید ریش بڈھوں سے لے کر معصوم تُرک بچّوں تک کا اپنے آنسوؤں سے تر کرنا کیا کافی نہیں ہے؟

کیا تو ہم سے ناراض ہوگئی، اے مادرِ وطن؟ اس بیگناہ، اس مرد قوم سے نہ پوچھ کہ کن قزاقوں نے، کن خائنوں نے اپنے پاؤں سے تجھے پامال کیا، تیری ہڈیاں توڑیں، کن درندوں نے اپنے ناخنوں سے تجھے مجروح کیا۔ اے مادرِ وطن! تو جو نیلی موجوں کی آغوش میں سو رہی ہے۔ تو جس کے پہاڑوں کے خطوط نازک، جس کا سایہ رنگین، جس کا افق رنگین، جس کا سما شفق گوں، جس کی سحر لطیف، جس کے بادلوں کی رفتار دلبر و غشی آور ہے، تو ہمیں یتیم چھوڑ کر کن بیگانہ آرزؤں کے تعاقب میں جا رہی ہے۔

سُن! تجھے نہ محتشم قدیم روما، نہ فیلسوف قدیم یونان نے، ایسے وفاکار، ایسے آتشیں، ایسے نفس واپس تک کے جذبہ سے چاہا ہے جیسا ہم چاہتے ہیں، اور نہ کوئی قوم مستقبل میں چاہ سکتی ہے۔ تُرکوں کی سب سے زیادہ دلدوز خشوع و تضرع، ترکوں کے منزہ و مجرد امید و استغراق تیرے لئے ہیں۔ ترک تیرے لئے زندہ رہتا ہے، تیرے لئے مرتا ہے، تیرے لئے برباد ہوتا ہے، تیرے لئے آہ و زاری کرتا ہے۔ سب تیرے لئے۔

کسے معلوم ہے کہ تیرے خمیر میں کتنے تُرک شہدا کا خون ہے جنہوں نے اپنے قیمتی قطرہائے خون تیرے سینے پر گرائے، کتنے ترک سپاہیوں کی ہڈیاں ہیں، جنہوں نے اپنی جان و شان تیرے

قدموں پر فدا کردی۔ تیرے سینے پر جان دینے کے لئے، اور اپنی ہڈیاں تجھے سپرد کرنے کے لئے صدہا سال تک، غربت زدہ، آبلہ پا، رہ پیما، خستہ اور اُس پر بے یار و مددگار ترک آئیگا۔

اس خطرناک زمانے میں، وہ باعظمت تُرک فاتح جو تیرے لئے شہید ہوئے اور جنہوں نے تیرے لئے مرنا ہی اپنی مکافات ابدی سمجھی، انکی روحیں تیری لطیف ہوا میں، تیرے افق پر جہاں دشمن کے تاریک سائے پڑ رہے ہیں پھر رہی ہیں، ماضی کی وسعت میں سے یہ خاموش، مگر دقور و معظم روحیں آرہی ہیں اور تیرے زندہ فدائیوں کی بلند پیشانیوں کو اپنے پراں بازوں سے مس کرتی ہیں

ہماری قسمت میں اگر جینا ہے، تو تیرے لئے جینا ہے، لیکن اگر قسمت میں یہ ہے کہ ہمارے قلب کے نازک ترین احساسات کو دشمن اپنے ہاتھوں سے ٹھیس لگائے۔ تو بہتر یہی ہے کہ ہمیں مار ڈال اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اے تیرہ خاک، اپنے میں دفن کرلے۔

اے مادر وطن! جو دن تیرے لئے خطرے کا دن ہو، اُس دن وہ معصوم سر جو پالنے میں بلند ہو رہے ہیں، اُن سے لیکر اُن کہنہ کمروں تک جو مزار کی طرف جھک رہی ہیں سب اپنا خون تیرے لئے بہانے کو تیار رہتیں۔ اُس دن وہ موت کے ڈراؤنے چہرے سے اُلفت کرتے ہیں۔

اے کمال کی، اے مدحت کی ماں! اے فاتح، اے سلیم کی آغوشِ خواب! اگر تیرے پاک گوشوں میں تیری منزہ وصافت محرمیت میں کسی بے ادب کا قدم داخل ہو جائے، تو ہم سب، ہمارا سرفروش النور، ہمارا بہادر نیازی، (ہمارا مصطفٰی کمال اعظم) ہماری شیر فوج کے ساتھ، مرد عورت، یتیم بچے، سب کے سب اُس نجس اجنبی قدم کو تیرے پاک سینے سے ہٹا دینگے لیکن اگر نہ ہٹا سکیں تو ہم تیرے سب سے گہرے گڑھے میں گر جائیں، مگر اس وقت تو ہمیں ایسا گہرا گاڑیو کہ تیرے نرم سینے میں دشمن کے ناخن پڑیں تو ہمیں احساس تک نہیں نہیں، اگر تو ہماری ماں ہونے سے گریز کرتی ہے، تو تو بھی ہماری طرح محو ہو جا۔ اپنے شاندار محلوں اپنے اونچے گنبدوں، اپنے پراسرار جنگلوں اپنے شاداب مرغزاروں سمیت محو ہو جا۔

قعر دنیا کی سب سے تاریک، سب سے دور تنہائی میں جا سو۔

نہ انسانوں کے حافظے میں، نہ کتابوں کی سیاہ تحریر میں تیرا نام و نشاں باقی رہے۔

ہم سب کے ساتھ، تو بھی اُن معموروں کو لیکے جو راکھ ہو چکے ہوں، کتم عدم میں چھپ جا۔

(خالدہ خانم)

سید سجاد حیدر

دُنیائے اِسلام کے انحطاط کی ایک ظاہری اور مُسلّمہ وجہ

کوئی مُسلمان جو اِسلامی تاریخ کے اِبتدائی مراحل سے ذرہ برابر بھی واقفیت رکھتا ہوگا وہ اِس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ سب سے اول دنیا میں اسلام کا خیر مقدم کرنے والی ایک عورت ہی تھی اور اِس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ پودا جس کو اللہ تعالیٰ عرب کی سنگِ لاخ اور ریتلی زمین میں لگا کر اُس کو اس قدر نشو و نما دینا چاہتا تھا کہ جس کے سائے تلے تمام روئے زمین کی اقوام کسی وقت میں آجائیں اُس کو ابتدائی حوادث سے بچانے میں ایک عورت ہی نے رسولِؐ پاک کی امداد کی تھی۔ اِس کے بعد جب کفار کے تشدّد کی وجہ سے حضرت رسالتمآبؐ کو اپنا وطن ترک کرنے کی مجبوری پیش آئی تو ایک عورت ہی تھی جو اندھیری راتوں میں بیابان جنگل اور پہاڑوں کا راستہ طے کرکے آنحضرتؐ کو غار میں کھانا پہنچاتی تھی۔ پھر جب کفار سے اِبتدائی اِسلامی خونریز لڑائیاں ہوئیں تو اُس میں عورتیں برابر مردوں کے پیچھے پیچھے رہتی تھیں اور اُن کو لڑائی میں ہر قسم کی امداد دیتی تھیں اور خود بھی لڑتی تھیں اور بیماروں اور زخمیوں کی اُسی طور پر خدمت کرتی تھیں جیسے کہ گذشتہ یورپ کی جنگ میں عورتوں نے خدمت کی ہے۔ شام اور فارس میں جو اسلامی لڑائیاں ہوئیں اُن میں عورتیں برابر میدانِ جنگ میں مردوں کے ہمراہ رہتی تھیں اور لڑائی میں ہر قسم کی امداد دیتی تھیں۔ تاریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض بعض موقعوں پر محض عورتوں ہی کی امداد سے عساکر اسلام غالب آئے تھے اگر عورتیں نہ ہوتیں تو شکست اور تباہی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ مگر جب عورتوں کی امداد سے مردوں نے دُنیا میں اپنا اثر قائم کر لیا تو پھر اُن کو صنفِ نازک اور جنس کمزور اور کیا کیا خطابات دیکر گھروں میں مقید کر دیا کہ بیٹھی بچے پالا کرو اور چکّی چولہے کا دھندہ کیا کرو۔ بس اس سے زیادہ تمہارا کوئی کام نہیں ہے۔ پردے میں بٹھایا تو بٹھایا تھا مگر غضب یہ کیا کہ چہار دیواری سے باہر نکل کر تازہ ہوا کھانے کی بھی ممانعت کر دی اور اس بدعت کو جو سراسر ناعاقبت اندیشی پر مبنی تھی اسلامی جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی کہ یہ شعارِ اِسلام

ہے کہ عورت نہ گھر سے باہر نکلے اور ہوا کھائے اور نہ کوئی کام اپنی اور اپنی اولاد و قوم کی بہبودی کے لئے کرے۔ خدا جانے یہ کہاں کا اسلام تھا جو غریب عورتوں کی گردن پر سوار کیا گیا کہ جس سے اُنکے جسمانی و دماغی قویٰ مضمحل ہوتے ہوتے اب نوبت یہانتک پہنچی ہے۔ کہ چہار دیواری کی محدود چند قدم زمین سے باہر پیدل چلنا اُن کو دشوار ہے اور چہار دیواری سے باہر دنیا سے اُنکو قطعی لاعلمی ہے اور بجز بچوں کی پرورش اور آٹے دال کے سودے کے دُنیا کے معاملات سے بالکل بے خبر ہیں۔ قانون کی نگاہ میں اب اُنکا شمار نابالغ بچوں اور نیم پاگل انسانوں میں ہونے لگا ہے۔ اُن کا کوئی معاملہ یا معاہدہ جائز نہیں سمجھا جاتا۔ جب تک کوئی مرد اُن کا ہمدرد و رفیق جو خود اُس معاملہ سے بے تعلق نہ ہو اُس کے مشورے اور امداد سے وہ معاملہ نہ کیا گیا ہو۔ کیا ہمارا پاک مذہب جس نے مردوں اور عورتوں کے حقوق کی دُنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ و نہایت واضح طور پر صراحت کر دی ہے اور جس نے مساوات کا درجہ قائم کرنے کے لئے مردوں سے صاف صاف کہدیا ہے کہ عورتوں کے تم پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے تمہارے حقوق اُن پر ہیں اور پھر یہ بھی فرمایا کہ عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم عورتوں کا لباس ہو۔ کیا اُس مذہب کے سر اِس کا الزام تھوپنا کہ اُس نے عورتوں کو دُنیا کی تمام نعمتوں سے محروم کر کے محض مردوں کی خدمت کے لئے مقرر کر دیا ہے کسی طور پر قرینِ انصاف ہو سکتا ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ناعاقبت اندیش لوگ اپنی جاہلانہ طرز زندگی اور اپنے فاسد خیالات کی تائید کے لئے اسلام جیسے پاک۔ سچے اور حکیمانہ مذہب کو بدنام کرتے ہیں اور اُس کی ناجائز آڑ میں اُن جملہ غلط طریقوں کے قائم رکھنے پر مُصر ہیں جو پست خیالی اور انحطاط کے زمانے میں سوسائٹی پر غالب آ گئے تھے۔ جب سے مسلمانوں نے عورتوں کو بیکار کیا ہے۔ اُس وقت سے وہ خود بھی بیکار ہو گئے اور جب تک وہ اُن کو بیکار رکھیں گے وہ خود بھی بیکار رہینگے۔ عورتوں کو بیکار رکھنا مشیت ایزدی اور احکام ایزدی کے خلاف ہے۔ پس جو لوگ قوانین قدرت اور احکام ربانی کی نافرمانی کرتے ہیں اُن کو لامحالہ اسکا خمیازہ بھگتنا پڑیگا۔

دیگر تاریخی واقعات کو اس وقت نظر انداز کر کے صرف ایک واقعہ ناظرین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے جس سے یہ بات کافی طور پر اُن کی سمجھ میں آجائیگی کہ عورت کی امداد کے بغیر دُنیا میں کوئی دِقت حل نہیں ہوسکتی اور نہ کسی بڑے کام میں کامیابی ہوسکتی ہے۔ ہم اسکی بہت سی مثالیں تاریخ سے بہم پہنچانے کو تیار ہیں مگر اس وقت جو تازہ ترین مثال ہمارے سامنے ہے اُسی کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔

غازی مصطفےٰ کمال پاشا کے نام نامی اور برگزیدہ شخصیت سے کون ایسا مُسلمان ہوگا جو ناواقف ہوگا۔ نام سے واقفیت تو ایک معمولی امر ہے میرے نزدیک دُنیا میں کوئی ایسا مُسلمان نہ ہوگا جس کے دل میں اس بے نظیر شخص کی محبت نہ ہو۔ وہ تیس کروڑ دُنیا کے مسلمانوں کی ناک ہے اور موجودہ زمانہ کے مُسلمانوں کی عزت و آبرو کی محافظت کی خدمت اللہ تعالیٰ نے اسی شخص کے ہاتھ میں سپرد کردی ہے۔ خدائے برتر و اعلیٰ خود اُس کا محافظ بنے اور اُس کے مدارج میں ترقی دے اور اُس کو اپنے اعلیٰ مقاصد میں کامیاب کرے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس اسلامی ہیرو کی کامیابیوں میں اُس غریب جنس کا بھی کچھ حصہ ہے یا نہیں جس کو ہم صنفِ نازک کہتے ہیں۔ یہ بات واقعات سے پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ بہت سی ٹرکی خواتین کا انگورہ کی لازوال کارکردگیوں میں حصہ ہے۔ انگورہ کی تحریک اور مصطفےٰ کمال پاشا کی اسلامی خدمات کی ابتدا اس طور پر ہوئی کہ جب اتحادیوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا اور سُلطان ٹرکی کو مثل بہادر شاہ اخیر بادشاہ دہلی کے اپنے محل میں نظر بند کر کے تمام ترکی سلطنت پر ایک جابرانہ قبضہ کرنا چاہا تو حسب معمول وحسب عادت قدیم خود ترکوں کے ہاتھ سے ہی ترکوں کے گلے کٹوانے کا طرز اختیار کیا اور بعض مقامات پر جہاں حُریت پسند ترکوں کی کچھ پریشان افواج اتحادیوں کی مخالفت پر اڑ رہی تھیں وہاں ٹرکی فوجوں کو ہی اُن کی سرکوبی کے لئے بھیجا جاتا تھا منجملہ اُن کے مصطفےٰ کمال پاشا کو بھی ایک دستہ کے ہمراہ اناطولیہ کے ایک علاقہ میں باغی فوج کی سرکوبی کو بھیجا تھا۔ مصطفےٰ کمال پاشا جب موقع پر پہنچا اور اُس نے دیکھا کہ اُس کے بھائی اور عزیز قوم کے نوجوان اپنی آزادی کے لئے سرفروشیاں کر رہے ہیں تو اُس کی حمیت نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ اتحادیوں کا ایک تنخواہ دار افسر بن کر اپنی قوم سے لڑے۔ اُس نے اپنے عہدے سے

فوراً علیحدگی کی اور حرّیت پر جان دینے والوں میں جا ملا اور آخر کو اُن کا سرغنہ وسپہ سالار بنگیا ہمیں یاد ہے کہ لارڈ بالفور نے پیرس کے مقام پر اس غریب مصطفےٰ کمال پاشا کو ڈاکو اور لوٹیرے کا خطاب عطا کیا تھا۔ ہمیں یاد ہے کہ انگلستان کے وزراء نے اس غریب محب وطن کو پانی پی پی کر کوسا تھا۔ لیکن خدائے تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ عزت اُسی شخص کا حق ہے جس کو میں عزت دیتا ہوں اور ذلت اُسی بدنصیب کو ملتی ہے جس کو میں ذلیل کرنا چاہتا ہوں۔ خدا کو یہ منظور تھا کہ مصطفےٰ کمال پاشا دُنیا میں عزت حاصل کرے اور آج خدا کے فضل سے وہ دُنیا کے بڑے بڑے سپہ سالاروں اور مُدبروں کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ الحمد للّٰہ۔ ہاں ہجوم محبت کی وجہ سے غازی مصطفےٰ کمال پاشا ہی کا ذکر بار بار قلم سے نکلتا ہے اور جس واقعہ کا ہم یہاں پر خاص طور پر ذکر کرنا چاہتے تھے اُس کے بیان کی نوبت نہیں پہنچتی۔ ہم اس مضمون میں یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جیسے کہ ابتداء میں خدا نے ہمارے پاک مذہب کی تائید عورتوں کے ذریعہ سے کرائی تھی ویسے ہی غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی امداد بھی عورتوں کے ذریعہ سے ہوئی ہے۔ ان عورتوں میں ادیبہ خلید سب سے زیادہ نامی اور قابل ذکر ترکی خاتون ہیں۔ یہ خاتون نہایت تعلیمیافتہ اور بڑی مصنفہ ہیں۔ یہ سب سے پہلی ترکی خاتون ہیں جنھوں نے قسطنطنیہ کے امریکن مشن کے کالج میں اعلےٰ تعلیم حاصل کی تھی اُس وقت کے پُرانے خیالات کے کُل مُسلمان اُسکی تعلیم کے مخالف تھے اور اُس کے والدین پر سخت زور ڈالا تھا کہ وہ اُسکو کالج سے نکال لیں مگر آفریں ہے اُسکے والدین کی روشن خیالی پر کہ اُنھوں نے اُسکو کالج سے نہیں نکالا۔ قسطنطنیہ کے مشن کالج میں تعلیم حاصل کرنیکے بعد وہ فرانس اور انگلستان کو بھیجی گئی اور وہاں پر اُس نے اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔ پھر جب وہ لوٹ کر آئی تو اُسکے ملک میں چاروں طرف تباہی کے آثار تھے۔ بلقان کی جنگ کی خونریزیاں اور لاکھوں مسلمانوں کا قتل و غارت ہونا اُس کے آنکھوں دیکھے واقعات ہیں۔ اس کے بعد ٹرکی کا جنگ یورپ میں شریک ہونا اور ترکی افواج اور آخری شکست او قسطنطنیہ پر اتحادیوں کا قبضہ اور لاکھوں مسلمانوں کا تھریس اور اناطولیہ میں یونانیوں کے مظالم کا شکار ہونا یہ واقعات سب اُسکے چشمدید تھے۔ جنگ کے دوران میں وہ زخمیوں کے اسپتالوں میں ٹرکی خواتین کے ساتھ برابر کام کرتی رہی۔ لیکن جب قسطنطنیہ پر اتحادیوں کا قبضہ ہوگیا اور غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے اناطولیہ میں آزادی کا جھنڈا

بلند کیا تو اس وقت حریت پسند ترکی مرد اور عورت جو قسطنطنیہ میں مثل قیدیوں کے تھے وہ وہاں سے نکل نکل کر اناطولیہ میں آکر مصطفےٰ کمال پاشا کی فوج میں شریک ہونے لگے۔ اتحادیوں نے یہ دیکھکر قسطنطنیہ سے باہر جانیکی ممانعت کر دی اور آبنائے باسفورس اور بحیرہ مارمورا کے کناروں پر پہرے کے جہاز کھڑے کر دئے کہ کوئی شخص قسطنطنیہ سے نکلکر اناطولیہ جانے نہ پائے۔ مگر آزادی پر مرنے والے کو آزادی حاصل کرنے سے کون روک سکتا ہے ہزاروں آدمی عورت اور مرد قسطنطنیہ سے نکلکر اناطولیہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ ان میں سے اکثر پکڑے گئے۔ سلطان کی مردہ گورنمنٹ کے ہاتھ سے انکو سزائیں دلوائی گئیں کیونکہ سلطان بھی مصطفےٰ کمال پاشا اور اُس کی فوج کو باغی قرار دینے پر مجبور تھے۔ مگر بہت سے لوگ پہرہ والوں کے حلقہ سے نظر بچا کر نکل بھی جاتے تھے۔ اُن میں جو اس طور پر نکلکر اناطولیہ پہنچے ادیبہ خلید بھی تھیں وہ کشتی میں جب کنارے کے قریب پہنچیں تو قریب تھا کہ وہ اتحادیوں کے پہرہ دار کے پھندے میں پھنس جاتیں، مگر خوش قسمتی سے اسی وقت کچھ فاصلے پر انکو وہ روشنی دکھائی دی جو اُنکے دوستوں نے بطور نشانی کے مقرر کر رکھی تھی کہ اس قسم کا نشان مصطفےٰ کمال پاشا کی طرف سے سمجھا جائے۔ اس طور پر ایک بڑے خطرہ کے مقام سے نکلکر وہ انگورہ پہنچی۔ وہاں جاکر وہ اپنی پوری قوت اور جوش کے ساتھ فوجی اور انتظامی معاملات میں شریک ہونے لگی۔ ترکوں کو اُبھارتی تھی۔ رسالے لکھتی تھی۔ اخبارات میں مضامین لکھتی تھی اور قومی نظمیں لکھتی تھی۔ فوج کے سامان کی تیاری میں ہزاروں عورتوں کو اپنے ساتھ شریک کیا اور ایک موقع پر خود فوج کے ساتھ دشمنوں سے لڑنے گئی اور لڑی۔ اب ان دنوں وہ وزیر تعلیمات کے عہدے پر ممتاز ہے اور قومی تعلیم کے پھیلانے میں دن رات منہمک رہتی ہے۔ پردے کی سخت مخالف ہے اور مسلمانوں کو غیرت دلاتی رہتی ہے کہ تم نے جب سے عورتوں کو گھروں میں بند کیا ہے تم خود بھی غلامی میں مبتلا ہوگئے۔ صورت کی نہایت حسین ہے اور پاکدامنی میں ترک اُسکو بطور مثال کے پیش کرتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر فوج سے اُسکی شادی ہوگئی ہے۔ شوہر سے نہایت عمدہ تعلقات ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی کامیابی اور شہرت میں اس خاتون کا بہت بڑا حصّہ ہے۔

عزیز و زمانہ کی آواز کیا کہہ رہی ہے اسکو پہچانو اور اس پر عمل کرو۔ عورتوں کو بیکار کرکے تم نے کچھ نہیں پایا۔ اور اگر انکو یونہی بیکار کئے رہو گے تو اور گروگے اور سخت ذلیل ہوگے۔ شرع کے مطابق چلو تو کبھی خرابی پیدا نہ ہو مگر آپ تو اپنے من گڑہت قانون کے بندے بنگئے ہیں اسکے لئے تو آپ خدا سے بھی تائید کی امید نہیں کرسکتے۔

(عبد اللہ از علی گڈھ)

دوشیزۂ فرانس

۴

نفسِ انسانی کی صحیح غرض و غایت فداکاری ہے!

دُنیا میں سینکڑوں رضا کار ایسے گذرے ہونگے جنھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصّہ تکلیفوں اور مصیبتوں میں بسر کیا لیکن انجام کار راحت و آرام کی نعمت حاصل کرلی، اُن کی جدوجہد دلگداز ہوتی ہے لیکن حصولِ آسایش تسکین دہ، ہمارا دل جو اُن کی صعوبتوں کو دیکھ کر کڑھتا تھا انکی کدوکاوش سے سراپا اضطراب تھا اب مطمئن ہے کہ انہوں نے تکلیفیں اُٹھائیں لیکن آخر اُن کا اجر بھی پالیا، ہماری جان جو عسرت میں اُن کے ساتھ وابستہ تھی اب خوشیوں میں نہیں تنہا چھوڑ کر الگ ہوجاتی ہے۔" اس کے برعکس وہ رضا کار جن کا مطمحِ نظر فداکاری ہے ہماری ہمدردی عمر بھر اُن کی کنیز بنی رہتی ہے وہ ہمارے دل کو سُنہری زنجیروں سے اپنی زندگی کے ساتھ جکڑ لیتے ہیں ایسا کہ پھر کوئی وفا پرست اُن سے مُنہ نہیں پھیر سکتا!

مورخین ناحق اک بے سود مباحثے میں مصروف ہیں کہ کیا ژان نے فرمانِ ایزدی سے سرتابی کی؟ یا فقط اپنی ہٹ پر قائم رہ کر اُس مقصد کے حصول میں عمر ضائع کردی جو خود اُس کی قوتِ واہمہ کا آفریدہ تھا؟ یہ لوگ نہیں سمجھتے اور اگر سمجھتے ہیں تو اس حقیقت کا احساس نہیں کرتے کہ نیتِ صالح کی ہٹ ہی عزمِ اُستوار ہے، دلِ پاکیزہ کا وہم ہی الہامِ ربانی سے عبارت ہے؟"، پھر جو عظمت پرست اُسے خدارسیدہ اور حق فرستادہ مانتے ہیں اُنہیں یقین ہے کہ ژان کی آئندہ زندگی کی مُصیبتیں نتیجہ تھیں صرف ہدایاتِ غیب کی نافرمانی کا!۔ کیا ژان کی گذشتہ زندگی صرف آرام و آسائش ہی میں گذری؟ کیا اُسے اندوہ و کشمکش سے واسطہ نہیں پڑا؟ یا کیا احکامِ ربانی کی اطاعت کا لازمی ثمرہ خوشی اور وہ بھی دُنیا کی خوشی ہوتا ہے؟ کیا عزم و راستی کی زندگی کرب و عنا میں نہیں کٹتی؟ دنیا میں کوئی حقیقت آشنا ایسا نہیں گذرا جس نے سکونِ نفس کی تلاش میں اطمینانِ قلب حاصل کیا ہو! جو جسم و رُوح کی عام و خاص خوشیوں میں مگن ہو کر

راضی ہوگیا ہو کہ مقصدِ حیات یہی ہے جو میں نے پالیا! اور اس رُوحانی کشمکش میں مبتلا نہ رہا ہو کہ جو کچھ پالیا ہے اگر پالیا ہے تو وہ صرف اک راہ ہے جو ایسے مقامات کی طرف جاتی ہے جہاں واقعی پالینے کے قابل اشیاء ہمارا انتظار کر رہی ہیں؟!

ژان دارک دوشیزۂ فرانس کا "مقررہ کام" اگر سرانجام ہوگیا تو ہُوا کرے، جب تک اُس کے دم میں دم ہے وہ ایسے انجام میں آرام نہیں پاسکتی، آرام ہے تو کام ہی میں، مسرّت ہے۔ تو مشقّت ہی کے اندر! ژان کے گذشتہ ایثار کو اپنی آئندہ قربانیوں کا درس لینا تھا، ابھی اُس کی نازک رُوح میں وہ ربط و ضبط پیدا نہ ہوا تھا جو جسم کی جان اور دل کا ایمان ہوتا ہے! اُس کا جی اُسے چین نہ لینے دیتا تھا، بہت کچھ ہو چکا تھا لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی تھا!

ژان کی کامرانی کا دور مختصر تھا، ۲۹ راپریل کی رات تھی جب وہ اورلیاں میں داخل ہُوئی ۱۷ر جولائی کو ریمز میں بادشاہ کی تاج پوشی ہوگئی! اس کے آٹھ روز بعد وہ شہر سے نکلی، اُس کے عَلَم کا رنگ ذرا مدھم تھا لیکن اُس سے اک خاص شان ٹپکتی تھی، اُس کی زرہ چمکتی تھی۔ اگرچہ جنگ کے آثار اُس سے آشکار تھے ـــــ لیکن اُس کے دل کو پہلا سا اطمینان نہ تھا اور اُسکا مقصد بھی ویسا صاف و صریح نہ تھا + سب سے بہتر بات یہی معلوم ہوتی تھی کہ بلا تاخیر پیرس پر حملہ کیا جائے، قائد بھی سب کے سب ژان کے ساتھ متفق تھے، بڑی مشکل یہ تھی کہ خود کام دور اندیش درباری موجودہ کاوش سے بہت گھبراتے تھے اور ہر بات کا ٹال دینا اُنہیں مرغوب تھا۔ اُس پر طُرّہ یہ کہ پیرس والوں کا مزاج بگڑا ہُوا تھا وہ سب کے سب دشمن کے نام لیوا اپنے بادشاہ کے نام پر جھٹ تلواریں کھینچنے کو تیار ہو جاتے تھے" یہاں اورلیاں کا معاملہ نہ تھا۔ جہاں محبّانِ وطن غنیم کے خلاف شہر میں اڑے بیٹھے تھے بلکہ پیرس کی چالاکی اور خود غرضی سے واسطہ تھا جہاں کے رہنے والے غیروں سے لَو لگائے ہُوئے فلپ برگندوی کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے + اس حال میں ژان ریمز سے چلی۔ اُس کی "آوازیں" خاموش نہ ہوگئی تھیں، تینوں صورتیں اب بھی آیا کرتیں لیکن پہلے کی طرح لمبی چوڑی ہدائتیں نہ دیتی تھیں کہ یہ کر اور وہاں جا! صرف اعانت کا مشکوک وعدہ کرتیں اور آنے والی مصیبت کا مبہم سا پتہ دیتیں اور کہتیں کہ "خوف نہ کھا خدا تیرا ساتھ دیگا"! وہ سمجھتی کہ یہ پہلے کی سی تسلیاں ہیں، زخمی ہونگی بھی تو اچھی ہو جاؤنگی، جان کو دُکھ بھی ہوگا

تو اُس کے بعد سکھ ہی سکھ ہے! لیکن ساتھ ہی وہ کچھ پریشانی سی محسوس کرتی کہ مجھ میں ان میں اب وہ باتیں کیوں نہیں ہوتیں جو ہوا کرتی تھیں؟

فرنساوی فوج (۲۱ جولائی کو) پیرس کی طرف بڑھی۔ رستے میں جو شہر اور قصبے تھے وہ ایک ایک کر کے چارلز کے حلقۂ اطاعت میں آنے شروع ہوئے" لاؤن اور سواسون نے ہتھیار ڈال دیئے۔ سانلی اور بووے حلقہ بگوش ہوگئے۔ اس کے بعد بادشاہ ذرا جنوب کی طرف ہولیا، فوجی اور ژان سخت برہم ہوئے کہ قیمتی وقت ہاتھ سے جاتا ہے پیرس پر جس قدر جلد ممکن ہو سکے حملہ کرنا چاہیئے۔ شاتو تیئری کو مطیع کر کے چارلز نے مجبوراً پھر شمال کا رُخ کیا۔ ایک دو جگہ انگریزوں کا سامنا ہوا۔ انہوں نے خندقیں کھود کر فوج کے آگے نوکدار کھمبے گاڑ دیئے تاکہ فرانسیسی ایک ہی ہلّے میں اُن پر غالب نہ آسکیں۔ ژان اور آلانسوں نے اُنہیں کہلا بھیجا کہ ذرا میدان میں آیئے اور لڑیئے۔ یہ بھی وعدہ کیا کہ فرنساوی فوج پیچھے کو ہٹ جائیگی، اتنے میں وہ صف آرائی کرلیں۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے، صرف ژان کے جواب میں ایک جھنڈا بلند کیا جس پر ایک چھڑی اور ایک تکلا بنا ہوا تھا۔ شاتو تیئری میں چارلز نے ڈیوک برگنڈی کے ساتھ یہ سمجھوتا کیا کہ پندرہ روز تک لڑائی بند رہے اور اس مدت کے اندر اندر ڈیوک بے لڑے پیرس قوم پرستوں کے حوالے کر دے۔ غالباً چارلز بھی سمجھتا تھا کہ یہ تھوڑی سی مہلت حاصل کرنیکا بہانہ ہے لیکن وہ خوش تھا کہ بلا سے لڑائی کے جنجال سے تو کچھ دنوں رہائی ملیگی۔ اس فریب کاری سے اُس نے فوج اور ژان دونوں کو چند دنوں کے لئے خاموش کر دیا۔ بایں ہمہ دوشیزہ اس ظاہرا خاموشی میں سراپا اضطراب ہو رہی تھی۔ ریمز والوں نے اُس سے اس توقف و تاخیر کا سبب پوچھا کہ پیرس پر حملہ کرنے میں دیر کیوں ہو رہی ہے۔ اس کے جواب میں ژان نے یہ خط لکھا:-

پیارے اور اچھے دوستو! شہر ریمز کے نیک و وفادار فرانسیسیو! ژان دوشیزہ تمہیں اپنا حال لکھتی ہے۔ یہ درست ہے کہ بادشاہ نے ڈیوک برگنڈی کے ساتھ پندرہ روز کی اک عارضی صلح کر لی ہے اور ڈیوک کا وعدہ ہے کہ وہ اِس مدت کے اندر شہر پیرس کو بے لڑے ہمارے حوالے کر دے۔" لیکن حیران نہ ہونا اگر میں اُس سے پہلے ہی پیرس میں داخل ہو جاؤں

اس لئے کہ مجھے ایسی عارضی صلحیں مرغوب نہیں ہیں اور میں نہیں جانتی کہ اس معاملے میں میں معاہدہ پر کاربند رہونگی یا نہیں لیکن اگر رہی تو صرف بادشاہ کی عزت کی خاطر ایسا کرونگی!"

یہ تھے ژان کے احساسات لیکن اب وہ پہلے کی طرح بے دھڑک بادشاہ سے ردوقدح نہ کرتی تھی، وہ ایک تجربہ کار قائد کی طرح فوج کی رہنمائی تو اب بھی کرنا چاہتی تھی لیکن پہلے کی طرح اُس کی بات بات سے غیبی رہبری کا انداز نہ ٹپکتا تھا۔ کچھ نہ کچھ ضرور تھا جس کے باعث ژان وہ ژان نہ تھی۔ پھر بھی حب الوطنی کا جوش اور ضرورتِ وقت کا احساس اتنا زبردست تھا کہ وہ نچلی نہ بیٹھ سکتی تھی + فرنساوی فوج یوں زیاں کاری کی گود میں پڑی سورہی تھی کہ انگریزی فوج نے موقع پاکر اپنا ڈیرا اُٹھایا اور پیرس جا پہنچی۔ شاہِ فرانس کے بجائے کوئی بھی قائد ہوتا تو پیرس کا مار لینا آسان تھا، اب وہ وقت ہاتھ سے جا چکا تھا۔ چارلز نے بہتر جانا کہ علاقۂ کومپئین میں جاکر ڈیرے ڈال دے اور پھر غدار ڈیوک کے ساتھ ایک دوسری عارضی صلح کے لئے سلسلہ جنبانی کرے جو کرسمس تک قائم رہے + ژان کا دل غم وغصہ سے نڈھال ہوگیا چند قائدوں نے تنگ آکر فوج کے کچھ حصے کو لیا اور شمال کی طرف نارمنڈی کے صوبے پر جا پڑے۔ پیرس اس قدر خطرے میں پڑ گیا کہ بیڈفورڈ کو نکل کر دارالسلطنت کو بچانے کی فکر پڑگئی اب پھر موقع تھا کہ فرانسیسی جنوب سے بڑھیں اور پیرس پر حملہ کردیں لیکن حضرت چارلز کومپئین میں پڑے زندگی سے حظ اُٹھا رہے تھے اور حرکت کا کوئی نشان نظر نہ آتا تھا + ژان سے زیادہ ضبط نہ ہوسکا۔ ایک دن موقع پاکر اُس نے آلانسوں کو بلایا اور کہا اچھے ڈیوک! اپنی اور دوسرے کپتانوں کی فوجیں تیار کرو۔ خدا گواہ! مجھے اپنے عصا کی قسم! میں پیرس کو زیادہ قریب سے دیکھ لونگی" + فوج میں خوشی اور جوش کی اک لہر دوڑ گئی۔ فرانسیسیوں نے ایک ماہ ضائع کرنے کے بعد ۲۳ر اگست کو کوچ کیا۔ سانلی میں کچھ دیر غالباً بادشاہ کا انتظار کرنے کو ٹھیرے لیکن جلد ہی چل کھڑے ہوئے اور ۲۶ر کو وہ سیں دنی پہنچ گئے + سیں دنی فرانس کا دوسرا مقدس شہر موجودہ پیرس کے ملحقاتِ شہر میں ہے۔ ریمز میں فرنساوی حکمرانوں کی تاجپوشی ہوتی تھی، سیں دنی میں وہ سپردِ خاک کئے جاتے تھے + ریمز میں ژان کتنی مسرت سے داخل ہوئی تھی، سیں دنی میں اُس کا دل یاس وحسرت سے لبریز تھا۔ اُس کی تجاویز پر

عمل نہ ہُوا۔ بیش بہا وقت ضائع کیا گیا تھا۔ اورلیاں کے حملے کے وقت وہ ہمہ تن امید تھی اُسے یقین تھا کہ وہ کامیاب ہوگی، یہاں یہ حالت نہ تھی لیکن خیر یہاں پہنچ جانا ہی غنیمت تھا اور اگر خدا کی مرضی ایسی ہو تو پھر پیرس کی فتح کوئی بڑی بات نہ تھی۔ بادشاہ کے انتظار میں دن اور راتیں گذریں۔ ۵ ستمبر کو پندرہ روز کے بعد وہ سُست خرام نازک اندام نمودار ہُوا۔ فوج میں یکسر خوشی کے شادیانے بجنے لگے اور ہر کہ ومہ کی زبان پر یہی تھا کہ اگر" بادشاہ نے اجازت دی تو ژان اُسے پیرس کے اندر لے چلے گی"۔

شاہی قاصد پیرس والوں کے نام بادشاہ کے خطوط لے کر گئے کہ تم فرانسیسی ہو، اب وقت آ گیا ہے کہ تم شاہِ فرانس کی مدد کو نکلو۔ وہاں حالت دگرگوں تھی۔ عدالتیں، مجالسِ شوریٰ، دارالعلوم، کلیسا سب بیڈفورڈ کے نمک خوار اور انگریزوں کے نام لیوا تھے۔ انہیں اجنبی حاکموں نے خوب ڈرایا دھمکایا کہ اگر تم چارلز کے قابو میں آ گئے تو تمہاری جان کی سلامتی نہیں۔ پیرس والوں کو سب سے زیادہ انگریزوں کا پاس تھا پھر دیوک برگنڈی کا۔ وہ یہ دیکھتے تھے کہ ہمارے لئے فی الحال نفع کس بات میں ہے یہ نہ سمجھتے تھے کہ انجام کار مفید ومناسب کیا ہوگا! قصہ کوتاہ پیرس میں فرانس کا نام لیوا کوئی نہ تھا!

۷ ستمبر کو فرنساوی فوج یعنی صرف اُس کا ایک حصہ (کیونکہ اک معتدبہ حصہ تو حضرتِ چارلز کی رکاب میں دُور سیں ڈونی ہی میں موجود تھا ہم نہیں جانتے کیوں، شاید شاہِ مقدس کی حفاظت کے لئے اس لئے صرف باقیماندہ چھوٹی فوج) پیرس پر حملہ کرنے کو بڑھا! معلوم ہوتا ہے کہ حملہ آوروں نے پہلے سے مقامِ حملہ کی نسبت پوری معلومات بہم نہ پہنچائی تھیں۔ سینٹ آنور کا دروازہ اور برُج تو شدتِ جوش وخروش سے فتح ہو گئے لیکن اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ شہر کے گرد دو خندقیں ہیں پہلی خشک اور دوسری پُرآب۔ ژان کا طرزِ جنگ ہم دیکھ ہی چکے ہیں، فصیل کی طرف بڑھنا وہاں جا کر اپنا عَلَم نصب کر دینا اور نبرد آزماؤں کو مرنے مارنے پر برانگیختہ کرنا! یہی طرزِ عمل یہاں دیکھا گیا۔ وہ بڑھی، پہلی خندق میں اُتر کر چڑھی، پھر دونوں خندقوں کے درمیان کھڑے ہو کر جگہ جگہ دوسری خندق میں اپنی برچھی سے پانی کی گہرائی کا اندازہ کرنے لگی۔ یہ ایک نہایت خطرناک مقام تھا، ہر طرف سے اُس پر تیروں کی

لگاتار بارش ہو رہی تھی لیکن وہ دو بجے سہ پہر سے لے کر برابر رات ہوتے تک وہیں جم کے کھڑی رہی۔ محصورین کو پکار پکار کے کہتی تھی کہ "خدا کی راہ میں شاہِ فرانس کے مطیع فرمان ہو جاؤ" اُدھر تیر انداز اور توپچی تاک کر اُسی کو نشانہ بناتے تھے۔ "کتنا شاندار ہوگا وہ منظر جب دوشیزۂ فرانس تیروں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں سب سے زیادہ ہولناک مقام پر تن تنہا کھڑی خود بے وار کئے جانفروشوں کو وطن کی خدمت کے لئے پکارتی ہوگی۔ آگے غنیم گالیاں دے رہا ہے پیچھے ہم وطن بڑھے چلے آتے ہیں، بیچ میں یہ عفت و شجاعت کی دیوی استادہ ہے اور دونوں کو راہِ راست کی طرف بُلاتی ہے کہ اپنے پروردگار کا کہنا مانو، اپنے فرائض کو سرانجام دو + لڑائی گھمسان کی ہو رہی تھی، محاصرین کے لئے حوصلہ ہار دینے کی کوئی وجہ نہ تھی، اُن میں "خدا کی برکت اور دوشیزہ کی خوش قسمتی سے" بہت کم جنگجو زخمی ہوئے تھے۔ لیکن بدنصیبی سے شام کے وقت ایک تیر سیدھا ژان کی ران میں آ کے لگا۔ وہ گری اور سنبھلی لیکن ابھی سنبھلی ہی تھی کہ ایک اور تیر اُس کے عَلَم بردار کو لگا۔ وہ تیر کھینچ کے نکال رہا تھا کہ ایک اور تیر اُس کے لگا، وہ بل کھا کے ژان کے قدموں میں گرا اور گرتے ہی جاں بحق ہوا + ژان نے عَلَم کو تھام لیا لیکن اُس کی طاقت جواب دے چکی تھی، وہ بمشکل رینگتی ہوئی ایک جھاڑی یا پتھروں کے ڈھیر کے پیچھے جا چھپی اور وہاں چت لیٹ گئی + فوجی افسر اُس کے گرد جمع ہو گئے اور واپس چلنے کو کہا۔ لیکن اُس نے انکار کیا۔ وہ لیٹی ہوئی جنگجوؤں کو پکار پکار کے کہتی تھی کہ ہمت نہ ہارو + پیرس تمہارا ہی ہے! "اب رات ہو چکی تھی۔ آلانسوں اور دوسرے کپتانوں نے اُسے مجبور کر کے گھوڑے پر سوار کرایا اور واپس کمپ کو چلے۔ وہ راہ میں بار بار کہے جاتی تھی "کتنا افسوس ہے۔ کتنا افسوس ہے"! "اگر رات بھر ہم اڑے رہتے تو باشندوں کو پتہ چل جاتا" اُس کا خیال تھا اگرچہ یہ محض غلط فہمی تھی کہ پیرس والے اُس کا ساتھ دیں گے اور اپنے اجنبی حاکموں کے خلاف باغی ہو جائیں گے"۔ رات کے وقت دشمن کے چند آدمی فرانسیسوں کی امان میں اپنے مُردوں کو لینے کے لئے آئے۔ اُن میں سے ایک کا بیان ہے، کہ فرانساوی فوج میں ژان کے خلاف لے دے ہو رہی تھی۔ فوجی کہتے تھے کہ دوشیزہ کا وعدہ تھا کہ آج رات ہم پیرس کے اندر محوِ خواب ہونگے اور وہاں کے سونے چاندی سے اپنی جیبیں

بھر لیں گے، اُس نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا!

دوسرے روز ژان نور کے تڑکے جاگ اُٹھی اور آلانسوں سے کہا کہ "بگل بجاؤ، میں اس مقام سے جنبش نہ کرونگی جب تک پیرس فتح نہ ہو جائے!" ظاہر ہے کہ دوشیزہ کی ہمت اُس کے عزمِ راسخ سے پھر بندھ گئی تھی اور اُسے یقین تھا کہ پیرس فتح ہو جائیگا۔ اس لمحہ میں ایک نیک فال نکلی، مونمورنسی اپنے ہمراہ ساٹھ شرفا کو لئے ہُوئے برگندی کو چھوڑ کے ان لوگوں میں آملا، فرانسیسی خوشی سے پھُولے نہ سماتے تھے، اتنے میں ایک اَور جماعت دو چار شخصوں کی پیچھے سے آتی ہُوئی نظر آئی، شائد یہ بھی کمک ہو؟ نہیں! یہ اک فالِ بد تھی۔ یہ قاصد بادشاہ کا سخت و درشت حکم لے کر آئے تھے یعنی واپسی کا حکم! پیرس نظروں کے سامنے ہے، اُس کی فصیل پر حملہ کی تیاریاں ہیں اور بادشاہ کا حکم ہے کہ سب واپس چلیں! فوج بہت چیخی چلائی لیکن بآلاخر افسروں کو بادشاہ کا کہنا ماننا ہی پڑا، ژان کے عزم میں بھی وہ پہلی سی بات نہ تھی۔ اور یوں وہ کر بھی کیا سکتی تھی، بادشاہ سلامت سات میل کے فاصلے پر متمکن ہیں، شائد وہاں چل کر کچھ ہو سکے، اُدھر سے بھی ایک پُل دریا کے اوپر بنایا جا چکا تھا اگر بادشاہ مان گیا تو دوسرے روز وہاں سے پیرس پر حملہ ہو سکے گا۔ فوج کے کچھ حصے نے صبح ہی چپکے چپکے اُدھر کا رُخ کیا۔ لیکن بادشاہ پہلے سے اُن کا ارادہ تاڑ گیا تھا۔ جب وہ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ پُل توڑ دیا گیا ہے! یہ غنیم کا کام نہ تھا، یہ اُن کے اپنے ہی بادشاہ کی عنایت تھی!

فرانساوی مورخ کیشیرا اس غلطی کا سارا الزام طریمول پر دھرتا ہے جو بادشاہ کا مشیرِ اعلیٰ تھا لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چارلز بھی اس شدید قصور میں حصّہ دار تھا۔ وہ دوشیزہ کی جوشیلی فطرت سے بہت گھبراتا تھا اور چاہتا تھا کہ جب موقع ملے وہ ان نت نئے جنگی منصوبوں کو چھوڑ کر خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے حظ اُٹھانے میں منہمک ہو جائے۔ وگرنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ پیرس کے سامنے ایک دن کی مدافعت کے بعد محاصرہ سے دست بردار ہو لیا جاتا، اورلیاں کے محاصرے میں متعدد بار آگے پیچھے آنا جانا پڑا، پیرس میں اس سے کم استقلال دکھانا اک فریب کاری کے سوا اَور کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ ہر چند فوج والے بزدل نہ تھے لیکن بدقسمتی سے وہ اُن پُرانے جنگجوؤں میں سے نہ تھے جو دوشیزہ کی پیروی میں فتح و

ظفرمندی کے خوگر ہو گئے تھے۔ اُن میں سے اکثر نئے رنگروٹ تھے جو اُس کی ایک آدھ شکست پر بھی شک وشبہ میں اپنا سر ہلانے لگتے تھے کہ شائد یہ جادوگرنی ہی ہو جس کے جادو کی قوت اب صرف ہو چکی ہے۔ سین دنی واپس آکر تین روز سخت مباحثہ جاری رہا، بعض اوقات تو کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ژان بادشاہ کے حکم سے سرتابی کرکے اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے پر آمادہ ہو جائیگی۔ اس لئے کہ اب پھر اُس کی "آوازیں" جو اس سے قبل وعدۂ کامرانی نہ دیتی تھیں صاف صاف بولنے لگیں کہ پیرس کا محاصرہ جاری رکھنا چاہیئے۔ اُس نے بعد کو اپنی رُوبکاری کے موقع پر کہا کہ "آوازیں مجھے سین دنی ہی میں ٹھیرنے کو کہتی تھیں اور میں بھی ٹھیرنا چاہتی تھی لیکن اُمرا مجھے باوجود میرے اصرار کے لے گئے" "اگر میں زخمی نہ ہو جاتی تو میں کبھی جنبش نہ کرتی"۔ مراجعت کے بعد اب پھر حملے کو بڑھنا یوں بھی دُشوار تھا۔ فوج کا حوصلہ پست ہو گیا اور لائیر وغیرہ بھی جو کبھی دوشیزہ کے ادنے سے اشارے کی تعمیل کیا کرتے تھے خاموش ہو گئے۔

فرانساوی فوج نے اپنے بادشاہ کی مصاحبت میں جنوبی علاقے کی طرف کوچ کیا اور ژان بھی طوعاً وکرہاً ہمراہ ہو لی۔ چلنے سے پہلے اُس نے سین دنی کے گرجا کی قربان گاہ پر اپنی زرہ اُتار کے رکھ دی۔ یہ اُس زمانے کا دستور تھا کہ جب کوئی جنگجو لڑائی سے واپس آتا تو وہ ایسا ہی کرتا لیکن شاید ایسا کرنا نااُمیدی کا اظہار تھا کہ وہ ملبوس جس کی یوں توہین ہُوئی اُس کا اُتار پھینکنا ہی مناسب تھا جب دوشیزہ وہ دوشیزۂ فاتح نہ رہی جسے دیکھ کر انگریز بھاگ جایا کرتے۔ اور فرانسیسی شیر بن جاتے تھے۔ ژان اس ذلت کو دل سے محسوس کرتی تھی کہ اب وہ اک قیدی کی طرح بادشاہ کی مصاحبت میں لیجائی جاتی تھی، وہ اب اک آسمانی رہبر نہ تھی فقط اک ارضی جنگجو تھی۔ بادشاہ نے مختلف مفتوحہ شہروں کی حکومت کا انتظام کیا اور منصرم مقرر کئے۔ جو فلپ برگنڈوی کے ساتھ عارضی صلح کے متعلق جُملہ امور طے کریں۔ پھر اپنی فوج کو لئے ہُوئے جنوب کے زیادہ زرخیز و پُرعشرت علاقے کی طرف رُخ کئے ژیاں پہنچ گیا جہاں سے جون کے آخر میں وہ شمال کی جانب ژان کی سرپرستی میں فتوحات حاصل کرنے کو چلا تھا۔ اب ژان چارلز کی سرپرستی میں جاتی معلوم ہوتی تھی، دربار میں اُس کی خاص طور سے عزت کی جاتی تھی، ملکہ اُس کو سر آنکھوں پر لیتی تھی، اُس کے لئے مصاحب عورتوں کا اک خاص دائرہ مقرر

کیا گیا اور اُسے شریف خاتونوں کی طرح طلائی ملبوس سے آراستہ کرنے میں بادشاہ نے کوئی حجت اُٹھا نہ رکھی۔ بعد میں جب کوئی اَور حیلہ بہانہ نہ سوجھا تو اُس پر یہ الزام تراشا گیا کہ وہ خوش نما ملبوس پسند کیا کرتی تھی۔ ژان کی سی سادہ مزاج بلند فطرت لڑکی کیونکر ان بناوٹوں میں پھنس سکتی تھی، یہ ہم ماننے کو تیار نہیں ہیں، البتہ اگر اُس کے مخالفین اصرار ہی کریں تو ہمیں اتنا اعتراف کرنے میں تامل نہیں ہو سکتا کہ اُس کی انسانی فطرت بعض اوقات نفاست سے محظوظ ہوتی ہوگی۔ لیکن یہ ظاہر تھا کہ بادشاہ اور اُس کے مشیر اس پر تلے بیٹھے تھے۔ کہ آئندہ ژان اُن کے صریح حکم کے بغیر کچھ نہ کرنے پائے۔ آلانسوں نے اک آخری کوشش کی کہ کسی طرح اُس کی رہبر و رفیق اس جنجال سے رہائی پائے۔ اُس نے منصوبہ باندھا کہ شمال مغربی علاقہ نارمنڈی پر اک یورش کی جائے تاکہ انگریز غنیم کو اپنے عقب میں دیکھ کر پیرس کو غیر محفوظ حالت میں چھوڑدیں، لیکن درباریوں نے ژان کو اُس کے ہمراہ جانے سے روک دیا اور آلانسوں نے اپنی جمعیت کو توڑ دیا۔ حالت اَور کی اَور ہوگئی، ساری فوج تتر بتر ہونی شروع ہوئی اور سارے بادشاہ کے خاصہ برداروں کے کوئی مسلح جنگجو باقی نہ رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ جو فرنساوی فوج کی آمد کی خبر سُن کر مطیع ہو جاتے برہم ہو گئے اور انگریزوں کا ساتھ دینے لگے سردیوں میں دربار نے مناسب جانا کہ بعض غیر مفتوح شہروں کے خلاف ایک مہم کی تیاری کی جائے۔ پس ژان کو بُورژ بھیجا گیا جہاں وہ "مُشیرِ شاہ" ریناز کے مکان پر ٹھیرائی گئی ریناز کی بیوی مارگریت جس نے ژان کی وفات کے مدت بعد اس کی "بحالی" کے وقت اُس کی عصمت و عفت کی شہادت دی ان دنوں ژان کی رفیق تھی۔ مارگریت نے دوشیزہ کی سیرت کی تصویر کھینچی ہے جیسی کہ وہ اس زمانۂ اندوہ و ملال کے دوران میں تھی۔ ہرچند دومرمی کی کسان لڑکی اور فرانس کی مشہور ترین خاتون کی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق آگیا تھا ژان کی فطرت اب بھی ویسی ہی سادہ و بے لوث تھی جیسی کہ گئے گذرے دنوں میں جب وہ اپنے ماں باپ کے گھر کی دہلیز پر یا درختوں کے سائے میں سینے پرونے میں مصروف رہتی تھی۔ وہ لوز کے تڑکے نمازِ سحر کے لئے گرجا جانے کی بہت مشتاق تھی، مارگریت کو ساتھ لے لیتی تاکہ صبح سویرے اکیلی باہر نہ جائے، شام ہوتے وہ سب سے قریب کے گرجا میں

جاتی اور وہاں بچپن کی طرح گرجا کے گھنٹوں کے بجنے میں مزے لیتی۔ آدھ گھنٹہ تک صرف اُس کی خوشی کے لئے گھنٹہ بجایا جاتا، وہ مفلسوں بھکاریوں کو وہاں بُلا بھیجتی اور یہ اُسکے ساتھ نماز ودُعا میں شریک ہوتے۔ اُس کی سب سے بڑی مسرت اس میں تھی کہ حضرتِ مریمؑ کی مدح میں سب مل کے گیت گائیں یہاں تک کہ شام کا جھٹ پٹا رات کی تاریکی سے تبدیل ہو جائے اور قربان گاہ پر بتیوں کے جھلملاتے تارے اندھیرے میں اپنا نور برسانے لگتے؛ جب اُس کے پاس کچھ دینے کو ہوتا تو وہ نادار پجاریوں کو جو اُس کے ساتھ محوِ عبادت ہوتے خیرات کرتی۔ شام وعشا اس طرح گذر جاتیں۔ دن کو وہ رنگروٹوں کے بھرتی کرنے میں مصروف رہتی۔ شہر کی عورتیں مادام مارگریت کے ہاں سینکڑوں کی تعداد میں آتیں اور تاکہ اس شہرہ آفاق غازیہ کو اک نظر دیکھیں۔ اُس سے بیسیوں قسم کے سوال پوچھتیں۔ کہ کیا تم زخمی ہونے سے ڈرتی ہو؟ یا کیا تم زخم کھانے سے بالکل محفوظ ہو؟" وہ جواب دیتی "میرا بعینہٖ وہی حال ہے جو دوسروں کا۔" وہ اپنے زیور اور مقدس تمغے لاتیں تاکہ ژان اُنہیں اپنے نفس سے متبرک بنادے، وہ یہ دیکھ کر مُسکراتی اور مادام یا کسی اَور سے کہہ دیتی کہ تم چھُو دو میرے تمہارے چھُونے میں کچھ فرق نہیں"! اُن میں سے بعض کے تمغوں پر اُسی کی شبیہ بنی ہوتی تھی، وہ اس بُت پرستی سے منع کرتی اور ہنس دیتی۔ باوجود ان تفریحات کے اُسکی زندگی میں اُداسی اپنی جھلک دکھانے لگی تھی۔ ان دنوں میں اُس نے "اعترافِ گناہ" کے اوقات میں متعدد بار اپنی موت کا تذکرہ کیا اور کہا کہ "اگر میرے نصیبے میں جلد مر جانا لکھا ہو تو بادشاہ سے میری جانب سے کہدینا کہ ملک میں جابجا اُن لوگوں کی یادگاریں جو اپنے وطن کے لئے جانیں دے چکے ہیں عبادت گاہیں قائم کرے"۔ وہ بار بار اس بات کا ذکر کرتی تھی اور رات کی سی تاریکی اُس کے خیالات پر چھارہی تھی، اُس کے شریکِ جنگ ساتھی منتشر ہو چکے تھے اور نئے شخص جنہیں وہ جانتی بھی نہ تھی فوج کے سرکردہ تھے۔ فوجی باگ ڈور والیئر کے ہاتھ میں تھی جو ژان کے بڑے دشمن طریموئیل کا داماد تھا۔ اس حالت میں مستقبل اُسکے لئے خوشگوار نہ ہو سکتا تھا۔

اس تاریک وقت میں پیئر لُو موتیئے کا محاصرہ ایک حیرت انگیز واقعہ تھا جو اگرچہ

تاریخی حیثیت رکھتا ہے تاہم اک معجزہ سے کسی طرح کم نہیں۔ پہلا حملہ ناکام رہا۔ مراجعت کا حکم دیا جاچکا تھا کہ ژان دولوں نے جو دوشیزہ کا دائمی مصاحب تھا اُسے صرف چار پانچ آدمیوں کے ساتھ شہر پناہ کے نیچے کھڑا ہوا دیکھا۔ دولوں مجروح تھا۔ بصد مشکل گھوڑے پر چڑھ کر قریب آیا اور کہا کہ تم یہاں کیا کر رہی ہو جب کہ سب لوگ جا چکے ہیں؟ ژان بولی میں تو اُسی وقت یہاں سے جنبش کرونگی جب یہ مقام فتح ہو جائیگا۔ یہ کہہ کر وہ شہتیروں اور گٹھوں کے لائے جانے کے لئے بآوازِ بلند پکارنے لگی تاکہ خندق کو پُر کرکے پیشقدمی کا حکم دیا جائے۔ اس نے لوگوں کے بھاگ جانے کی چنداں پروانہ کی اور برابر چلاّئے گئی پل کو چلو سب پل کو! گٹھے لاؤ! گٹھے لاؤ! کسی نے قریب سے کہا "ژان لوٹ آؤ! لوٹ آؤ! تم اکیلی ہو!" برہنہ سر چہرہ تمتایا ہوا، دوشیزہ نے جواب دیا " ابھی میرے ہمراہ میرے پچاس ہزار آدمی ہیں!" یہ اُس نے نہ بتایا کہ وہ کون ہیں؟ زمین کے انسان یا آسمان کے فرشتے؟ وہ چلاّئے گئی "کام کئے جاؤ! کئے جاؤ!" تاریخ کی دیوی اس تن تنہا صورت کو آنکھیں پھاڑے حیرت سے دیکھتی ہوگی کہ مرد میدان چھوڑ کر چل دیئے ہیں لیکن ایک نوجوان عورت کی سیمیں آواز ہنوز پکار رہی ہے "کام کرو، کام کئے جاؤ!"۔ اس کا اثر حیرت انگیز ہُوا، بھاگے ہُوئے سپاہی واپس آگئے، قلعہ بندیاں مضبوط تھیں، شہر میں سامانِ رسد وافر تھا اور محصورین کی تعداد معتدبہ تھی مگر دوشیزہ کی شخصیت کے آگے کسی کی کچھ پیش نہ گئی اور شہر فتح ہو گیا! پھر کیا تعجب ہے کہ جیسا کہ ژان نے کہا اگر فرانسادی افواج پیرس کے سامنے ذرا سا استقلال دکھاتیں تو دار السلطنت ضرور اُن کے قبضے میں آجاتا!

لیکن اب پیرس کے مُسخر نہ ہونے پر اظہارِ تاسف کرنا بے سُود تھا۔ اب تو کامرانی صرف گذرے دلوں کی یاد میں تھی اور مستقبل تاریک ہی تاریک تھا۔ انگریزوں اور برگندیوں نے پہلے اچھی طرح پیرس پر قدم جما لئے پھر اُسے تنہا چھوڑ دیا لیکن ہمارے چست و چالاک شاہِ چارلز نے اس زرّیں موقع سے کچھ فایدہ نہ اُٹھایا۔ غنیم یہ دیکھ کر اور دلیر ہو گیا، اُس نے شاہِ فرانس کی دلاوری کا اندازہ کر لیا۔ بیڈفورڈ نے گردونواح کے شہروں کو تاخت وتاراج کرنا شروع کیا اور جو جو شہر انگریزوں کے قبضے سے نکل گئے تھے انہیں ایک ایک کرکے شمشیر

انگلستان کے آگے سرنگوں کیا۔ دریائے سین کے کنارے جتنا علاقہ شاہِ فرانس کا مطیع ہوگیا تھا قریب قریب سارا اُس کے تصرف سے نکل گیا۔ کہیں کہیں کوئی شہر یا قصبہ باقی رہا۔ اور اُن کے مضافات بھی تباہی کا افسانہ بنے ہوئے تھے۔ لاشاریتی کے محاصرے میں دوشیزہ کا سامانِ رسد اور ذخائرِ حرب ختم ہوگئے۔ کسی نے اعتنا نہ کیا کہ کمک بھیجی جائے۔ مجبوراً محاصرے سے دست بردار ہونا پڑا۔ بادشاہ مستِ عیش ہوکر برگنڈی کے ساتھ ایک جھوٹی صلح کے سلسلے میں گرفتار رہتا اور کبھی کبھی کسی مقام کو کمک بھیج دیتا۔ ژان اس کے ہمراہ تھی لیکن دربار کی عشرتوں کو دیکھ دیکھ کر جی ہی جی میں کڑھتی تھی۔ شاہِ فرانس اور اُس کے غریب کار درباریوں نے جس بے بیدردی اور سرد مہری سے دوشیزہ کی تواضع کی وہ تاریخ کا اک شرمناک واقعہ ہے۔ لیکن یہ بے اعتنائی اُن کے جی خوش کرنے کو نا کافی تھی۔ وہ اس فکر میں تھے کہ کسی طرح ژان کی غیبی پیام رسانی کو جھوٹا کر دکھائیں۔ آخر کسی دغا شعار درباری کے بہکانے سے ایک ذلیل عورت کاترین دلا روشل نے دعوے کیا کہ مجھے بھی "آوازیں" سُنائی دیتی ہیں اور صورتیں نظر آتی ہیں۔ دوشیزہ جو کچھ کہتی تھی کاترین اُس کی تردید کرتی تھی۔ اس جھوٹی پیغمبرہ نے کیا کرایا خاک نہیں، صرف دعوے ہی کرتی رہی! ناقدرشناسی اور احسان فراموشی کی کوئی مثال اس سے زیادہ دل شکن اور جاں گداز نہ ہوگی، ژان کے دل کی جو حالت ہوئی وہ قارئین خود اندازہ کر سکتے ہیں!

بالآخر دوشیزہ ضبط نہ کر سکی اور قلعہ چھوڑ کر چل کھڑی ہوئی اس کے بعد اُس نے چارلز اور اُس کے درباریوں کا مُنہ کبھی نہ دیکھا۔ جنگ کی چیخ پکار ان عشرت گاہوں کے قریب قریب سُنائی دینے لگی تھی۔ ژان نے اپنے چند رفقا کے ساتھ جن میں اُس کے دونوں بھائی شامل تھے ملاں کا رخ کیا جس پر انگریز قبضہ کرنے کو تھے۔ یہاں وہ خندق کا معائنہ کر رہی تھی اور اپنی موجودگی میں قلعہ بندیوں کی مرمت و مضبوطی میں مصروف تھی کہ اُسکی "آوازیں" جو مدت سے خاموش تھیں گویا ہوئیں اور یہ پیام دیا "تم سین ژان کے روزِ متبرک سے پہلے پہلے گرفتار کرلی جاؤ گی"! سین ژان کا دن جُون کے اخیر میں پڑتا ہے، یعنی ژان کی گرفتاری میں صرف دو ماہ کی مدت باقی رہی اس میں اُسے فرانس کے لئے جو کچھ کرنا ہے کر گذرے!

اِس فوری اطلاع سے ژان چونک اُٹھی۔ وہ کیا کیا منصوبے باندھ رہی تھی اور یہاں کیا ہو جانے والا ہے؟ دوشیزہ نے گڑگڑا کر دعا مانگی کہ خدایا! تو مجھے اک طویل قید کی مشقتوں سے بچا کر جلد ہی اپنی پناہ میں لے لیجیو! وہ جانتی تھی کہ اُس کے دشمن اُس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے اور اُسے اُن سے کیا توقع رکھنی چاہیئے؟ آسمانی آوازوں نے اس کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ صرف اُسے ہمت نہ ہارنے کی نصیحت کی جیسا کہ ہر شہید کو ہوتی ہے۔ کہا کہ خدا تیری مدد کریگا خدا تجھے اپنی پناہ میں لیگا! انسان نہیں سمجھتا کہ یہ مدد کیا ہے؟ اسے آرام و آسائش سے تعبیر کرتا ہے۔ لیکن خدا وہی کرتا ہے جو اُس کے حسب منشا ہو! بعد میں ژان نے اپنے بھولے پن کے ساتھ اعتراف کیا کہ اگر مجھے اُس دن کا علم ہوتا جب میں گرفتار ہوئی تو میں لڑنے کو باہر نہ نکلتی۔ اُس نے آوازوں سے پوچھا کہ کہاں؟ کس روز؟ مگر کچھ جواب نہ پایا!

ملاں سے وہ لائی گئی۔ رستے میں برگندیوں کے ایک دستے سے مٹھ بھیڑ ہو گئی۔ وہ اور اُن کا سرکردہ فرانکے داراس قید کر لئے گئے، یہ شخص اپنے زمانے کا مشہور ڈاکو تھا جس نے سینکڑوں گھرانوں کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اب وہ قانون کی زد میں آیا اور اُس پہ مقدمہ چلا کر اُسے پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ ژان کو بعضوں نے الزام دیا کہ وہ اس قتل میں شریک تھی اگر مجرم کو سزا دینا غلطی ہے تو ژان نے حقیقت میں اس غلطی کا ارتکاب کیا!

ایک اَور واقعہ پیش آیا جس کا ذکر بعد کو اُس کے الزامات میں کیا گیا۔ شہر میں ایک بچہ مُردہ پیدا ہُوا۔ اس زمانے میں عیسائی دستور تھا کہ ایسے بچے کو قربان گاہ پر لٹا دیتے کہ شاید کرامات کے ذریعے سے وہ زندہ ہو جائے۔ اِس مُردہ بچہ کو بھی گرجا میں لے جایا گیا۔ شہر کی کنواری لڑکیوں نے دُعا کی، ژان کا قول ہے کہ وہ بھی اس دُعا میں شریک تھی، بچے نے اپنی آنکھیں کھولیں تین چار بار انگڑائی لی، اُسے اصطباغ دیا گیا جس کے بعد وہ پھر مر گیا! آج کل ان باتوں کا ماننے والا کوئی نہیں، خدا جانے واقعہ کیا تھا۔ بہر حال مخالفین کو کہنے کا موقع مل گیا۔ کہ یہ صریح جادو ہے!

ہر روز بلا ناغہ اور دن بھر اُس کی آوازیں، اُس کے کان میں اپنا پیام پھونکتی

رہتیں سیں ژان سے پہلے"! آخر ژان نہ رہ سکی اور اپنے رفقا میں سے بعض کو اُس نے یہ بات بتلادی"۔ لانی سے وہ دو تین مرتبہ کومپی این کو گئی جہاں دشمن کا زور تھا۔ ایک بار اُس نے شواسی کا محاصرہ اُٹھانے کی غرض سے کوچ کیا + ایک دفعہ جب وہ کومپی این میں تھی وہ گرجا میں چند بچوں کی رسمِ عشائے ربّانی میں شریک ہوئی + بچوں کے ساتھ محوِ عبادت رہنا اُسکی روحانی مسرّت کا منتہائے کمال تھا۔ اثنائے ریاضت میں نہ جانے اُس کے جی میں کیا آئی کہ وہ نظروں سے اوجھل ہوکر ایک ستون سے جا لگی، چند لوگ جن میں بچے بھی شامل تھے اُسے دیکھنے کے لئے قریب ہو لئے۔ ژان کا کوئی محرمِ راز نہ تھا، اُس کا جی بھر آیا اور وہ بے اختیار ہوکر بولی" پیارے دوستو! پیارے بچّو! مجھے تم کو اطلاع دینی ہے کہ میرے ساتھ دغا اور بیوفائی کیگئی ہے اور جلد ہی میری جان کے لالے پڑ جائیں گے"۔ خدارا! میرے لئے دعا کرو کیونکہ تھوڑی ہی مدت بعد میں بادشاہ اور ملک کی خدمت نہ کرسکونگی" +

آخرکار خبر آئی کہ کومپی این کو انگریزوں اور برگنڈیوں نے گھیر لیا ہے، کومپی این جو کبھی چارلز کی قیامگاہ تھا اور جہاں زور شور سے اُسکی آؤ بھگت ہوئی تھی + اس کا بچانا لازم تھا، ژان کریسپی میں تھی جب اُسے یہ خبر ملی۔ وہ بلاتوقف (۲۲ رمئی ۱۴۳۰ء کو) محصورین کی کمک کو چل دی، اُس نے کہا میں اپنے کومپی این کے اچھے دوستوں سے ملنے جا رہی ہوں"۔ یہ الفاظ ژان کے اُس بُت کے نیچے کندہ ہیں جو کومپی این کے چوک میں دوشیزہ کی یادگار میں نصب کیا گیا ہے + اُس کے کوچ اور پیش قدمی میں فتحیابی کے زمانے کا جوش پھر رونما ہوا۔ وہ مطلق نہیں جھجکی، شاید یہ سمجھتی تھی کہ ابھی اُس کی گرفتاری میں کم ازکم ایک ماہ کی مُدت ہے اور اس عرصے میں کچھ بھی ہو وہ سب خطروں سے محفوظ رہے گی + شہریوں نے بڑے تپاک سے اُس کا خیر مقدم کیا اور اگرچہ اُس کی مرضی نہ تھی کہ دشمن کو اُس کے آنے سے آگاہی حاصل ہو لیکن گھنٹوں کے بجنے اور نعروں کے بلند ہونے سے غنیم کو پتہ چل گیا کہ ہو نہ ہو یہ دوشیزہ ہی ہے جس کی آمد میں اس قدر شور وغل سُنائی دیتا ہے + وہ صبح ہی شہر میں پہنچ گئی تھی۔ تیاریوں میں سارا دن صرف ہوگیا۔ شام کے پانچ بجے وہ اپنی جمعیت لے کر دشمن پر حملہ کرنے کو نکلی + کومپی این کا شہر پیرس سے ۴۵ میل شمال مشرق

ل پیرس کے شمال مشرق میں ایک مقام ہے۔